

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ
پاکستان
کراچی

اکتوبر 2015

گلران اعلیٰ
محرران ارشول

سوریا

ط کا

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆ نگہت سیماء، قیصرہ حیات اور ڈرٹس بلال کے سلسلے وارناول

☆ شیریں نوا گلوکارہ، سارہ رضا خان بنی ہماری مہمان

☆ قاریہ نگار لچپی کے نئے خصوصی سلسلے

READING

Section

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1

WWW.PAKSOCIETY.COM



پاکینہ

کراچی

نگرانِ اعلیٰ: معراج رسول

مدیرہ اعلیٰ: عذرار رسول

مدیرہ: انجم انصار

معاون: آمنہ حماد



رکن آل پاکستان خیر و برکت

شعبہ اشتہارات

فیجراشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانالے حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور سید فراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچہ (پاکستان) 60 روپے

قیمت فی پرچہ (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

READING
Section

ماڈل: رانیہ خان
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر: موسیٰ رضا

مکمل ناول

228 سحر ساجد حقیقت

افسانے

64 وہ طلبہ گارتھا عنیقہ محمد بیگ

93 اکر چیاں دل کی شمیم فضل خالق

119 ایک حقیقت ایک فسانہ رفاقت جاوید

125 صدق آصف وقعت

155 غزالہ عزیز جیت

225 فاطمہ خان اکہاٹی محبت کی

خصوصی مضامین

18 ڈاکٹر زکیہ بلگرامی یادوں کی مالا

260 اختر شجاعت پن شہادت

268 رفعت شبانہ شادی کی رسمیں

270 شائستہ زریں پاکیزہ کے مہمان

مستقل عنوانات

16 ادارہ دین کی باتیں

اداریہ

15 مدیرہ مجھے کچھ کہنا ہے

سلسلے وار ناول

24 نگہت سیما اعتبار و وفا

98 ڈر ٹمن بلال اے عشق تیرے ہیں کھیلانے عجب

166 قیصرہ حیات آخری امرید

منی ناول

132 شیریں حیدر زندگی خاک نہ تھی

ناولٹ

70 نیلہ ابر راجا متاعِ دل

187 اقبال بانو دہن کچھ نہیں کھلے کے جاوے گا

201 ام ایمان قاضی شناخت

پبلشر پرو پرائنڈر: نیشن رسول ہبقا اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 قیرا ایکس نیشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: اے بی ایچ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

READING Section



| | | | | | |
|-----|---|--------------------|-----|-----------------|----------------------|
| 297 | ماہ جبین | حسن نکلھار کو آریے | 279 | مدیرہ | بہنوں کی محفلا |
| 298 | پاکیزہ بہنیں | بزمِ آبا پیڑہ | 288 | عظمیٰ آفاق سعید | پاکیزہ ڈائری |
| 300 | ادارہ | روحانی مشورے | 291 | انجم انصار | جلا ترنگ |
| 302 | | ہومیوکلینک | 294 | صغریٰ زیدی | میں اکثر گنگنائی ہوں |
| | قارئین کے لیے خصوصی سلسلہ صفحہ نمبر 95 پر | | 295 | پاکیزہ بہنیں | خوش ذائقہ |

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
 Postal Address: Box No. 662, G.P.O., Karachi-74200
 Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

Section

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ڈائجسٹ
ماہنامہ



میں نیا سحر انگیز طویل سلسلہ

شیش محل

ہرول عزیز اور معروف قلم کار

اسما قادری

کے قلم سے

کبھی خوش امید اور کبھی مایوس کن جذبات میں

ابھی زندگی کے تیکھے انداز... آپ کی دلچسپی کا ہر رنگ لیے

READING
Section



عام طور پر حج کی تیاری کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی مہنگا قسم کا بیچ لے لیا جائے۔ جس میں بہترین ہوٹلوں کی رہائش ہو..... سامان سفر بہترین ہو، احرام کا کپڑا عمدہ ہو..... اور خورد و نوش کی سہولت اتنی اچھی ہو کہ زبان کے چنخارے سے محروم نہ ہونا پڑے..... اور پھر واپسی پر اتنی شاپنگ کر کے آیا جائے کہ لوگ حیران رہ جائیں اور اگر حج کے ایام میں کسی دوسرے کو ان کی وجہ سے کوئی تکلیف ہو جائے تو وہ اس کی پروا بھی نہیں کرتے..... (بس انہیں تکلیف نہیں ہونی چاہیے) جبکہ حج نام ہے اپنے والہانہ عشق و محبت کے اظہار اور اپنی بے تابانہ حاضری کا..... حج مسلمانوں کا وہ سالانہ روح پرور اجتماع ہے جس میں تمام بدنی اور روحانی عبادات کی بھرپور جھلک نظر آتی ہے، یہ ایک جامع عبادت ہے کیونکہ اس میں تمام عبادات کامل روحانیت کے ساتھ یک جا ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے خاتم الانبیاء ﷺ نے فرمایا۔ ”حج نام ہے انہماک اور عجز کے ساتھ تلبیہ کرنے کا..... اے اللہ میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں..... تیرا کوئی شریک نہیں..... میں حاضر ہوں۔ تمام تعریفیں اور تمام ملک تیرے ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں۔“ اور حج کے دنوں میں یہی صدا میں نہ صرف دلی طمانیت کا سبب بنتی ہیں بلکہ اپنے مسلمان ہونے پر ایک فخر سا ہوتا ہے.....

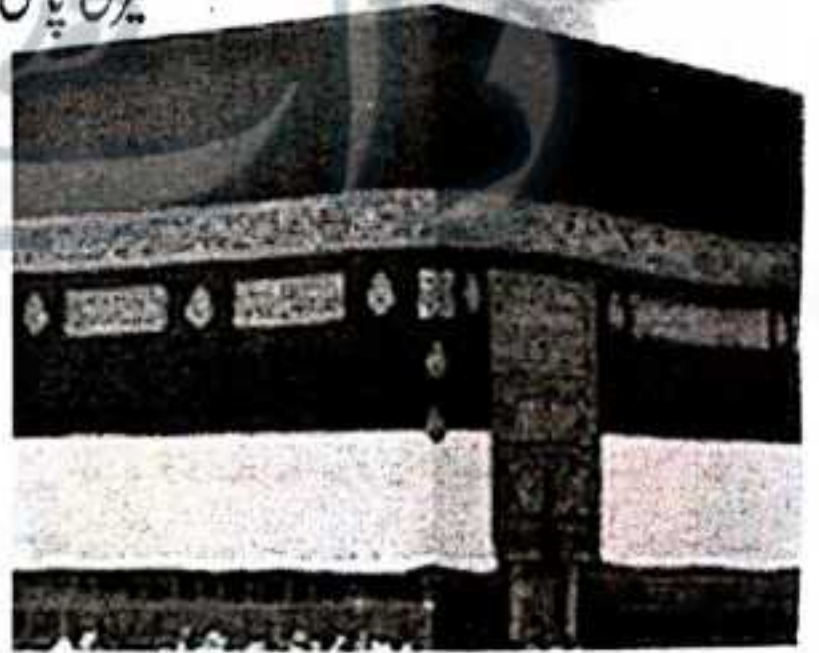
حج کی ادائیگی میں جہاں بے شمار حکمتیں پنہاں ہیں وہاں اس کی ایک بڑی حکمت اتحاد امت مسلمہ بھی ہے۔ دنیا کے گوشے، گوشے کے مسلمان اس موقع پر جمع ہوتے ہیں جن میں ہر رنگ و نسل کے لوگ ایک ہی جگہ، تمام تفرقات سے بالاتر ہو کر ایک ہی صف میں ایک ہی امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں۔

بلاشبہ یہ نظارہ دنیا کا خوب صورت ترین نظارہ ہوتا ہے کہ انسانوں کا ایک سمندر ہے، جس پر ایک وارفتگی کا عالم ہے، کسی کو کسی سے کوئی مطلب نہیں، چاہت ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کو منانے کی..... جلال کبریائی سے قلوب پکھل، پکھل کر پانی ہو رہے ہیں۔ دعائیں ہیں، التجائیں ہیں، گناہوں کا اقرار ہے اور توبہ و استغفار ہے، یہ موقع زندگی میں خوش نصیبوں کو ہی ملا کرتا ہے کہ جو مانگنا ہے مانگ لو..... دین کے لیے بھی، دنیا کے لیے بھی، اپنوں کے لیے بھی دوسروں کے لیے بھی..... اور آج ہماری بھی یہی دعا ہے کہ یارب العالمین ہر مسلمان کو حج کی توفیق اور استطاعت عطا فرما اور ہم سب کے گناہ معاف فرما، آمین۔ اس کے ساتھ آپ سب کو عید الاضحیٰ مبارک ہو۔

مدیرہ
انجم انصار

READING
Section

اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ بے شک ہم مسلمان ہیں (۱۱۱) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تمہارا پروردگار یہ کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل کرے (عیسیٰ نے) کہا کہ اللہ سے ڈرو اگر تم مسلمان ہو (۱۱۲) کہنے لگے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ تم نے سچ بیان کیا اور ہم اس پر گواہ رہیں (۱۱۳) (تب) عیسیٰ ابن مریم نے عرض کی کہ ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرما کہ وہ (دن) ہمارے اگلوں اور ہمارے پچھلوں کی عید ہو جائے اور تیری ایک نشانی ہو اور (اے پروردگار) ہمیں روزی دے اور تو اچھا روزی دینے والا ہے (۱۱۴) اللہ نے فرمایا بے شک میں اسے تم پر نازل کرنے والا ہوں پھر اس کے بعد تم میں سے جو کوئی کفر کرے گا تو اس کو ایسا (سخت) عذاب دوں گا کہ سارے جہان میں کسی کو ایسا عذاب نہ کروں گا (۱۱۵) اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب اللہ فرمائے گا اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو الہ بنا لو۔ (عیسیٰ) کہیں گے کہ (میں) تیری پاکی (بیان کرتا ہوں اور تو پاک ہے) مجھے ہرگز (سزاوار) نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے (کسی طرح) حق نہیں اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو بے شک تو اسے جانتا ہوگا (کیونکہ) تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیری ذات میں ہے (اس لیے کہ) بے شک چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا تو ہی ہے (۱۱۶) (سورہ مائدہ آیت نمبر ۱۱۱ تا ۱۱۶)



سیدنا محمود علیہ السلام

۳۔ محمد ﷺ انسانی سانچے (وجود) میں خدائی صفات کے مظہر تھے اور اس وجود کے دو نمایاں پہلو ہیں جو مثلث کے آغاز اور انتہا تک ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور یہ شرافت و پاکبازی ہیں۔ شرافت میں سخاوت اور قوت کا عنصر ملا ہوا ہے جبکہ تقویٰ اور پرہیزگاری میں دانشمندی کا تقدس یکجا ہے۔

(شاؤن)

۴۔ حضرت محمد ﷺ جمال کبریائی کی وہ شعاع رنگ و نور ہے جو ایک پیکر انسانی میں جلوہ گر ہو کر ظلمت کدہ جہاں کو رشک صد جہاں بنانے آئی تھی۔ اور بنا گئی انسانیت کا وہ مظہر اتم جس کی انسانیت کے سامنے فرشتوں کی گردنیں جھک گئیں وہ نادر روزگار ہستی جس کے مافوق الفطرت کمالات کو سمجھنے سے عقل انسانی باوجود اپنی بلند پروازیوں کے یکسر قاصر رہے گی۔
(حکیم پنڈت کرشن کنوردت شرما)

۵: الاعداد

اسم مبارک محمود: حروف: ۵

م + ح + و + د + ہ =

۸۲ = ۶ + ۳ + ۶ + ۳ + ۸ + ۲ +

خصوصیت عدد ۸:

یہ نمبر قابل عزت اور قابل تعظیم لوگوں کا نمبر ہے۔ یہ لوگ مفکرانہ ذہنیت اور بردبارانہ صلاحیتوں سے انسانیت کی مشکلات کا حل سوچتے رہتے ہیں اور اپنے مقصد حیات میں کامیاب ہونا جانتے ہیں۔ لوگ ان کے قول و فعل کے اثرات کی وجہ سے ان کی عزت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ایسے لوگ زیادہ تر اپنی نسبت دوسروں کی بھلائیوں اور خوشیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسما النبی ﷺ سے اقتباس

READING
Section



پرعقیدت روحانی سفر کی حیرت انگیز روداد

یہ داستان جو میں رقم کر رہی ہوں یہ کوئی عام داستان نہیں نہ ہی عام لوگوں کے لیے کشش کا باعث ہوگی۔ یہ داستان عشق ہے۔ اس عشق کی داستان جو اللہ کی کتاب سے کیا گیا۔

کے ایک قصبے بلگرام میں پیدا ہوئی۔ یہ قصبہ ہردوئی میں واقع ہے۔ ہردوئی سے بلگرام کا فاصلہ 16 میل ہے۔ میرے والد کے دادا سید قربان احمد بلگرامی ایک قابل وکیل تھے۔ انہوں نے میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایل ایل بی میں ٹاپ کیا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت کمایا اور بہت سارے گاؤں اور زمینیں خریدیں۔ میرے دادا بیرسٹر سلطان احمد بلگرامی نے 1910ء میں انگلینڈ سے بار ایٹ لا کیا تھا۔ میرے والد نے اگرچہ اکاؤنٹس میں ڈگری لی تھی مگر چند سال کی سروس کے بعد دادا کی زمینیں سنبھال لیں اور کاشت کاری

قارئین کرام.....! آپ کی پُر زور فرمائش پر ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی آپ بیتی ”پادوں کی مالا“ دوبارہ شائع کی جا رہی ہے۔ یہ ایک روحانی سفر کی روداد ہے جس سے پڑھنے والے بھی یقیناً بہت کچھ سیکھیں گے۔ ہمارے اصرار پر ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی نے اس میں مزید یادداشتیں شامل کر دی ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ موتی، ہیرے جیسی تحریر پڑھ کر آپ کی اپنی زندگی میں مثبت تبدیلیاں ضرور آسکتی ہیں..... اگر آپ چاہیں تو.....

(مدیرہ)

☆☆☆

میں اتر پردیش کی رہنے والی ہوں۔

READING
Section

18 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

ہی ہوتا تھا جب کبھی بلگرام سے ہردوئی جانا ہوتا تو تیل گاڑی میں پردہ باندھا جاتا اور ہم سب اس پر سوار ہو جاتے۔ اگرچہ ہردوئی کا فاصلہ صرف 16 میل تھا مگر ان دنوں یہ بہت زیادہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ آدمی دور پر ایک مقام تھا منجھلا..... ہم وہاں قیام کرتے تھے۔ یہاں پر ایک بڑھیا کا گھر تھا۔ درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے بان کے پلنگ پڑے ہوتے تھے۔ وہیں بیٹھ کر ہم کھانا کھاتے جو ہم ساتھ لے کر چلتے تھے۔ کھاپی کرتا زہ دم ہو کر تیل گاڑی پر سوار ہو جاتے۔ ہردوئی پہنچتے تو وہاں ماحول دوسرا تھا۔ یہ شہر تھا اور دادا بیر سٹریٹ تھے۔ ان کا بڑا نام تھا۔ ان کی کوٹھی بھی بہت شاندار تھی۔ لوگ بھی بہت رہتے تھے۔ ان کا دسترخوان وسیع تھا۔ رشتے ناتے کے بے شمار لڑکے ان کے گھر رہ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے یعنی اپنے، اپنے اسکول، کالج اپنے خرچ پر جاتے تھے اور رہنا کھانا فری تھا۔ دادامیاں کے گھر رہنے اور کھانے، پینے کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی جس کا دل چاہتا وہ وہاں قیام کرتا تھا۔ میری سگی دادی کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میرے والد چار سال اور میرے چچا دو سال کے تھے اس کے بعد دادا کی دوسری شادی ہوئی..... دوسری بیوی سے دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں اس طرح یہ کل آٹھ بھائی بہن تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے دادا کے گھر بہت لوگ تھے۔ خوب رونق ہوتی تھی جبکہ میرے اپنے گھر میں یعنی بلگرام میں..... ہم تین بھائی بہن ہی رہتے تھے۔ بڑی بہن دادا کے گھر اور ایک سب سے بڑے بھائی ہمایے چچا کے گھر شاہ جہاں پور میں رہتے تھے۔ ان کی تعلیم وہیں ہو رہی تھی۔ بلگرام میں مجھ سے بڑے دو بھائی بی جی آر اسکول میں پڑھتے تھے اور میری تعلیم گھر پر ہو رہی تھی۔ میرے والد کا خیال تھا کہ لڑکے سائنس کی تعلیم حاصل کریں اور لڑکیاں آرٹس پڑھیں گی۔ چنانچہ بڑی بہن کی طرح مجھے بھی اسی لائن پر ڈالا جا رہا تھا۔ میں صبح سویرے ڈرائنگ سیکھنے جاتی۔ بی جی آر اسکول کے ڈرائنگ ماسٹر مجھے ڈرائنگ

کرنے لگے۔ وہ گنے اور گیہوں کی کاشت کرتے تھے۔ ہم پانچ بھائی بہن ہیں۔ سب سے بڑی ایک بہن اس کے بعد تین بھائی اور سب سے چھوٹی میں۔ ہم سب نے ایک زمین دار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ قصوں میں بڑے، بڑے گھر ہوتے ہیں۔ ہمارا گھر بھی بہت بڑا تھا، نوکر چاکر کی افراط تھی۔ ہم سب بھائی بہنوں کی اپنی، اپنی بوائے تھیں۔ میرے والد یا مین احمد بلگرامی غصے کے تیز مگر رحم دل انسان تھے جبکہ میری امی بہت خاموش طبیعت، صابر و شاکر خاتون تھیں۔ انہیں کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ شاعری کی کتب شوق سے پڑھتی تھیں اور خود بھی شعر کہتی تھیں۔ اگرچہ امی کے پاس کوئی دنیاوی ڈگری نہیں تھی پھر بھی ان کا مطالعہ وسیع تھا اور مذہب کی بھی اچھی معلومات رکھتی تھیں۔ بچپن میں ہم امی سے نبیوں، پیغمبروں کے واقعات سنتے تھے۔ وہ باتوں، باتوں میں ہمیں زمانے کی اونچ نیچ سمجھایا کرتی تھیں۔ میری امی نے سیکڑوں ناولز پڑھے اور اسی حساب سے افسانے بھی..... میں نے بھی امی کی تقلید میں وہ سب کچھ کم عمری ہی میں پڑھ ڈالا جو امی پڑھا کرتی تھیں۔ میری سب سے بڑی بہن سیدہ فاطمہ دادامیاں کے گھر ہردوئی میں رہتی تھیں۔ وہ کبھی اسکول، کالج نہیں گئیں۔ ان کی مکمل تعلیم گھر پر ہوئی۔ انہوں نے بہت قابل لوگوں سے علم حاصل کیا۔ انگریزی ادب، اردو اور فارسی میں ڈگریاں حاصل کیں وہ بہت عمدہ ستار بجاتی تھیں۔ استاد کلن ہمارے خاندانی استاد تھے جو سب کو ستار بجانا سکھاتے تھے۔ ستار بجانا، گیت گانا..... یہ سب کوٹھی کے اندر ہوتا تھا۔ ہمارے گھرانے میں پردہ تھا بلگرام میں خواتین ڈولیوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے گھر جایا کرتی تھیں۔ خواہ وہ گھر چند قدم کے فاصلے پر ہی کیوں نہ ہو۔ میری امی کو جب کبھی کسی کے گھر جانا ہوتا تھا تو کہار ڈولی لے کر آتے تھے۔ ڈولی کے گرد پردہ باندھا جاتا تھا۔ امی ڈولی میں بیٹھ جاتیں اور ہم ڈولی کے ساتھ، ساتھ بھاگ کر چلتے۔ جس گھر جانا ہوتا وہ بالکل قریب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

سکھاتے تھے۔ اس وقت میری عمر مشکل سے چھ سال تھی۔ دس بجے مولوی صاحب آجاتے جو اردو حساب اور ہندی پڑھاتے تھے۔ دوپہر کے بعد حافظ جی آجاتے جو قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔ شام کے وقت استاد کلن آجاتے جو مجھے ستار بجانا سکھا رہے تھے۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ مجھ سے ستار نہیں اٹھتا تھا۔ اس وجہ سے ستار کو لٹا کر بجاتی۔ میرے لیے منی سی مضراب بنوائی گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اس مضراب کو انگلی میں پہن کر دادرا، دادرا کی مشق کرتی تھی۔

گھر میں ہم تینوں بھائی بہن طرح، طرح کے کھیل کھیلتے تھے۔ ہمارے ساتھ ملازموں کے بچے کھیلتے تھے۔ کھیلوں میں پہلے دو ج، چھپن چھپائی، اونچ نیچ اور گلی ڈنڈا کھیلتے، مجھے گڑیاں اچھی لگتی تھیں۔ میرے پاس بہت سی کپڑے کی گڑیاں تھیں۔ ہم سب مل کر گڑیا کی شادی خوب دھوم سے کرتے۔ گڑیا کا جہیز تیار کیا جاتا۔ ریشمی گوٹا لگے کپڑے بنتے۔ ایک بار میری پیاری گڑیا کی ٹانگ مجھ سے بڑے بھائی حتی نے کاٹ دی تھی، میں خوب روئی..... پھر انہوں نے مجھے بہلانے کے لیے ایک خوب صورت سی گڑیا خود بنا کر دی۔ وہ خود بھی اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ گڑیا کے خوب لے، لے، بال لگائے۔ اس گڑیا کو اچھے، اچھے کپڑے پہنائے گئے۔ میں بہت خوش ہوئی۔ بچپن کی یہ چھوٹی، چھوٹی یادیں ہیں جو ذہن کے گوشے میں چھپی بیٹھی ہیں۔ جب چھٹیاں ہوتیں تو میرے بڑے بھائی بھی شاہ جہاں پور سے بلگرام آجاتے۔

ہمارے گھر کا آنگن بہت بڑا سا تھا اور پھلوری بھی بڑی سی تھی جس میں بیلا، موگرا، چنبیلی اور جوہی کے پودے تھے۔ ہار سنگھار کے درخت تھے اور مہندی کے بھی دو درخت تھے۔ ابا نے پھلوری میں چھ درخت انار کے لگوائے تھے۔ سب بھائی بہنوں کا ایک، ایک درخت تھا۔ جب انار کے درخت لگے تھے تب ہم تین بہنیں اور تین بھائی تھے۔ مجھ سے چھوٹی بہن جس کا نام

پھول تھا وہ بے حد حسین تھی بالکل پری لگتی تھی۔ وہ چار سال کی عمر میں انتقال کر گئی تھی۔ عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس کے انتقال کے بعد اس کے نام کا انار کا درخت سوکھ گیا تھا۔

پھلوری کے اندر کنارے پر کنواں تھا ہم سب چھوٹے، چھوٹے ڈول ڈال کر پانی بھرتے اور پودوں میں ڈالتے۔ یہ ہمارا مشغلہ تھا۔ چکنی مٹی سے کھلونے بنانا اور غلیل کے لیے غلے بنانا بھی اچھا لگتا تھا۔ پتنگ بازی بھی خوب ہوتی تھی گھر میں کبوتر بھی پلے ہوئے تھے اور مرغیاں بھی بلگرام کی جس کوشی میں ہم رہتے تھے، وہاں جن بھی رہتے تھے جس کا تجربہ سب گھر والوں کو بار بار ہوا تھا۔ ایک بار دوپہر کو میری ملازمہ سہیلی رشدیا مجھے آتی نظر آئی۔ میں نے بہت آوازیں دیں مگر اس نے ایک نہ سنی بس چلتی چلی گئی۔ میں نے بھاگ کر باہر جا کر دیکھا تو آہنی دروازہ بند تھا۔ ظاہر ہے جب کسی نے دروازہ کھولا ہی نہیں تو وہ آئی کیسے پھر دوسری طرف غائب بھی ہو گئی۔

جب ہم لوگ پاکستان آگئے تو اس گھر میں ہندو رہنے لگے تھے مگر وہ بس نہ سکے۔ ان کے پتنگ الٹ جاتے، کرسیاں اونڈھی ہو جاتیں۔ وہ گھر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بات یہ جانے کدھر نکل گئی۔ میں اپنے بچپن کی بات کر رہی تھی۔ بچپن کے وہ آٹھ برس جو میں نے بلگرام میں گزارے۔ جیسا کہ میں کہہ رہی تھی ہمارا آنگن بڑا سا تھا۔ گرمیوں میں وہاں صحن میں سونے کا رواج تھا۔ سب کے پتنگ بچھا دیے جاتے اور سفید چادریں بچھ جاتیں۔ نیلے اور جوہی کی خوشبو بسی ہوتی اور ہم سب آرام سے سوتے۔ صبح آنکھ کھلتی تو امی برآمدے میں بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی ہوتی تھیں۔ وہ بلند آواز میں سورہ رحمن اور سورہ فتح کی تلاوت کرتی تھیں، میں نے ہوش سنبھالنے پر یہی دیکھا۔

مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے قرآن پاک کب ختم کیا۔ میری امی نے مجھے بتایا تھا کہ میں نے چھ سال کی عمر میں قرآن پاک ختم کر لیا تھا۔ مجھے تو صرف ایک

ماموں وغیرہ کے گھر کسی دوسرے شہر چھٹیاں گزارنے جاتے تھے۔

1966ء میں جب چھٹیاں ہوئیں تو میں اپنے منجھلے بھائی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے بہاول پور گئی۔ ان دنوں میرے چچا ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی بہاول پور اسلامک یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان دنوں وہ قرآن حکیم پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کا بہت اچھا ترجمہ کیا ہے جو 1968ء میں شائع ہوا۔ فیوض القرآن کے نام سے۔

جب چچا جان قرآن حکیم کے ساتھ مصروف ہوتے تو میں ان کے پاس چپک کر بیٹھ جاتی اور غور سے ان کے کام کو دیکھا کرتی۔ وہ میرے شوق کو ناکارے اور پھر انہوں نے مجھے ایک قرآن حکیم تحفے میں دیا اور دعائیہ کلمات لکھے۔

چچا جان نے جو دعائیہ الفاظ قرآن حکیم پر تحریر کیے وہ یہ ہیں۔

”اپنی پیاری بیٹی حور کو ان دعاؤں کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ اس کلام پاک کی لذت اس کی حلاوت سے اس کا قلب معمور فرمائے اور اسے ہدایت اور مقامات سے نوازے۔“

احقر حامد بلگرامی
۲۳۔ ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ
مطابق

۱۱ اگست ۶۶ء جمعرات
(میرا گھر کا نام حور ہے) یہی قرآن پاک جہیز میں میرے ساتھ گیا اور جب سے انہوں نے مجھے دیا تبھی سے میں نے باقاعدہ قرآن پاک پڑھنا شروع کیا۔ یہی نسخہ مولانا سمس الحق افغانی نے چچا جان کو تمغہ پاکستان ملنے پر تحفے میں دیا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا قابل ذکر تحفہ ہے جس نے میری زندگی پر گہرے اثرات دکھائے۔ میں نے ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ قرآن پاک کو پڑھنا شروع کیا پھر یہ سلسلہ مختلف

سپارہ روزانہ کے حساب سے دہرائیا ہے۔ 1952ء کے شروع میں ہم لوگ پاکستان چلے آئے۔ اس وقت تک ایک محتاط اندازے کے مطابق میں... بارہ مرتبہ قرآن پاک ختم کر چکی تھی۔ ہم لوگ کراچی سیٹل ہو گئے۔

میری بڑی بہن انڈیا سے اپنی تعلیم ختم کر کے آئی تھیں۔ بڑے بھائی ڈی جے سائنس کالج میں پڑھنے لگے باقی سب اسکول میں تھے۔ میں نے لڑکیوں کے جیکب لائن اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں یہ بہت اچھا اسکول تھا۔ لڑکوں کے لیے جیکب لائن اسکول علیحدہ تھا۔ میں نے ابتدائی تعلیم انڈیا میں گھر پر ہی حاصل کی تھی۔ پاکستان آ کر جیکب لائن اسکول میں پانچویں جماعت میں نام لکھا۔

میری اردو اچھی تھی۔ میں بہت اچھے مضامین لکھا کرتی تھی۔ میری اردو کی ٹیچر کو یقین نہیں تھا کہ میں اس طرح کے افسانوی مضامین لکھ سکتی ہوں۔ جب میں ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی تو باقاعدہ افسانے نما کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ میٹرک کرنے تک میں بے شمار ناولز اور افسانے پڑھ چکی تھی اور تب مجھے خیال ہوا کہ اس طرح کے ناول میں خود بھی لکھ سکتی ہوں لیکن چونکہ میں سائنس کی طالب علم تھی اس وجہ سے چھ سال تک یعنی ایم ایس سی کرنے تک وقت نہیں مل سکا لیکن 1965ء میں جوں ہی میں ایم ایس سی کے امتحان سے فارغ ہوئی میں نے قلم کاغذ سنبھال لیا اور اکیس سال کی عمر میں اپنا پہلا ناول ”غم دل“ صرف دس روز میں مکمل کر لیا۔ یوں ناول نگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایم ایس سی کا امتحان دینے کے بعد جبکہ رزلٹ بھی نہیں نکلا تھا۔ سرسید کالج میں میرا تقرر ہو گیا۔ میرا مضمون نباتیات تھا۔ میں وہاں پڑھانے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ میں زولوجی پریکٹیکل بھی کرواتی تھی۔ فرسٹ ایئر سائنس کے کورس میں مینڈک ہوتا ہے چنانچہ مینڈک سے خوب اچھی شناسائی ہو گئی۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم کہیں نہ کہیں کسی چچا یا پھوپھی

ایر کا بھی ایک گروپ دے دیا گیا جس میں کاروچ اور ارتھ وارم کا ڈائی سیکشن کروایا جاتا ہے۔ میں نے وائس پرنسپل جو کہ زولوجی کی تھیں بہت منع کیا مگر وہ نہ مانیں۔ میرے ساتھ یہ مسئلہ تھا اور آج بھی ہے کہ کاروچ سے شدید الرجی ہے۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے ملازمت چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کورس میں کلاسفیکیشن کا بھی پورشن ہوتا ہے (ٹرائی سیکشن) عارضی طور پر میں نے وہ شروع کروا دیا اور لڑکیوں سے کہا یہ کر لو تمہارا ٹرائی سیکشن دو ماہ بعد شروع ہوگا۔ دو ماہ پلک جھپکتے گزر گئے اب میرے پاس صرف ایک ہفتہ تھا۔ یعنی اگلے ہفتہ سے لازمی طور پر مجھے کاروچ کا ڈائی سیکشن کروانا تھا اور میں نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ استعفیٰ دے دوں گی پھر اچانک مجھے قرآن پاک کا خیال آیا۔ میں نے جلدی، جلدی قرآن پاک پڑھنا شروع کیا اور چند دن کے اندر ختم کیا اس نیت کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ میرے لیے بہتری پیدا کر دے اور مجھے مشکل سے نکال دے۔

اگلے دن ورکنگ ڈے پر جب میں کالج پہنچی تو مجھے پتا چلا کہ وائس پرنسپل جنہوں نے مجھ پر زبردستی سیکنڈ ایر تھوپی تھی وہ کالج سے چلی گئی ہیں اور اب زولوجی کی کوئی نئی لڑکی اپائنٹ کی جائے گی..... میری حیرت، خوشی اور تعجب سے عجب حالت تھی۔ اسی دن سے میں نے وہ کلاس چھوڑ دی اب مجھ پر کوئی زبردستی کرنے والا نہیں تھا۔ قرآن حکیم کی بدولت مجھے جس کرب سے نجات ملی اور وہ بھی ایک دن کے اندر اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اگر میں اپنی پوری زندگی پر نظر دوڑاؤں تو میری زندگی میں دو چیزیں اہم ہیں، ایک قلم اور دوسری قرآن شریف۔ ان ہی دو چیزوں کے ارد گرد پوری زندگی گھوم رہی ہے۔ میں نے ہمیشہ لکھنے کا عمل جاری رکھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ ایم ایس سی کے بعد ہی میں نے 1965ء میں پہلا ناول ”غم دل“ لکھا تھا اس کے بعد دوسرا ناول ”اپنی منزل“ بھی لکھ ڈالا..... سرسید گریز کالج میں بائنی پڑھانے کے

انداز سے جاری و ساری رہا جو آج تک میری زندگی میں اسی طرح شامل ہے جس طرح جسم کے ساتھ روح ہوتی ہے۔ روح نکل جائے تو جسم بے جان ہو جاتا ہے۔ میری زندگی سے قرآن پاک کو مانس کر دیں تو کچھ بھی نہیں بچے گا۔

میں نے قرآن حکیم پابندی سے اور بہت زیادہ پڑھنا شروع کر دیا تھا پھر مجھے اچانک خیال پیدا ہوا کہ اگر میں پورا قرآن پاک پڑھ کر کسی خاص مقصد کے لیے ختم کر کے دعا کروں تو وہ دعا ضرور پوری ہو جائے گی اور ایسا کئی بار ہوا۔ ایک ہفتے کے اندر قرآن پاک پڑھا، دعا مانگی، پوری ہو گئی اب میرے ہاتھ ایک نسخہ آ گیا۔ میں ایسا ہی کرنے لگی۔

جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکی ہوں۔ سرسید گریز کالج میں بائنی کے ساتھ مجھے زولوجی بھی لینی پڑی تھی۔ یہ پہلے سال ہوا تھا یعنی 1965-66ء میں۔ دوسرے سال عجب تماشا ہوا۔ ہماری پرنسپل نے کہا کہ ہمیں ایسی ٹیچر کی ضرورت ہے جو کیمسٹری کے پریکٹیکل کروا سکے اور ہمیں ایک لڑکی مل گئی ہے وہ کیمسٹری میں ایم ایس سی ہے اور بائنی پریکٹیکل بھی کروا لے گی اس کے پاس آنرز میں بائنی تھا یعنی انہیں اب میری ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کہا کیمسٹری پریکٹیکل کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، میں کروا دوں گی۔ بی ایس سی میں میرے پاس کیمسٹری تھی۔ اگر وہ لڑکی بائنی کروا سکتی ہے تو میں کیمسٹری کیوں نہیں کروا سکتی۔ قصہ مختصر پرنسپل مجبور ہو گئیں اور مجھے فارغ کرنے کا ان کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ اس طرح 66-67ء میں، میں بائنی کے ساتھ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں کام کرنے لگی لیکن تیسرے سال میرے ذمے پھر زولوجی تھوپ دی گئی۔ واضح رہے کہ ان دنوں تمام کالجز پرائیویٹ تھے اور ٹیچر سے خوب کام لیا جاتا تھا اور جس کو چاہے فارغ کر دینا عام سی بات تھی۔ میں یہاں یہ بات اس لیے بیان کر رہی ہوں کہ مجھے قرآن حکیم کی برکت سے دعا کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔

مجھے فرسٹ ایر کی زولوجی کے ساتھ، ساتھ سیکنڈ

پڑھتے تھے اور اشعار تو ہزاروں کی تعداد میں یاد تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں طالب علمی کے دور میں انہوں نے بہت سارے ایوارڈز حاصل کیے۔ ٹیبل ٹینس اور کیرم کے اچھے کھلاڑی تھے۔ باغبانی اور فوٹو گرافی میں اول انعام کے سرٹیفکٹ رکھتے تھے۔ بیت بازی میں بھی اول آنے کا سرٹیفکٹ موجود ہے۔ ان کے والد قاضی عزیز الدین بلگرامی ماہر قانون دان تھے، قانون بنانے پر 1930ء میں انہیں خان بہادر کا خطاب ملا۔ انڈیا میں آج بھی یہی قانون نافذ ہے۔ مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ بھرت پور میں وزیر تعلیم بھی رہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں Acting V.C رہے آنریری ٹریڈر کئی سال تک رہے (اپنی وفات تک) انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی بلا معاوضہ خدمت کی۔ میرے شوہر ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے جب یہ نویں کلاس میں تھے تبھی ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ قاضی صاحب نے 1920ء میں ایک کتاب لکھی تھی۔ ”کھلا خط مہاتما گاندھی کے نام“ جسے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی عبدالقدیر کے نام سے شائع کروایا کیونکہ وہ سرکاری ملازمت (ڈپٹی کلکٹری) کی وجہ سے اپنے نام سے شائع نہیں کروا سکتے تھے۔ اس کتابچے میں ہندوستان کی صوبہ جاتی تقسیم کا ایک انتہائی مکمل اور بہترین نقشہ لکھا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کا یہ سب سے پہلا منصوبہ ہے اس بات کو ہسٹوریکل سوسائٹی آف پاکستان نے شائع کیا۔ جس میں پبلشر محمد مقتدی خاں شیروانی کا خط بھی شائع کیا گیا ہے کہ دراصل یہ کتاب قاضی عزیز الدین بلگرامی کی لکھی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنے بھائی عبدالقدیر کے نام سے شائع کروائی۔ یہ کتاب اور پبلشر کا خط میرے پاس موجود ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی لکھی ہوئی کتاب ”سرخ ہائے گراں مایہ“ میں قاضی عزیز الدین بلگرامی پر مضمون شامل ہے جو ان کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔

(جاری ہے)

دوران میں نے فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کی طلباء کے لیے ایک پریکٹیکل کی کتاب لکھی جس کا نام ہے ”بائٹنی اسپانگ“ اسے میں نے صرف تین دن میں زبانی تحریر کیا۔ اس زمانے میں چھپے ہوئے جرنل نہیں ملتے تھے۔ چنانچہ یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی۔ پہلا ایڈیشن ایک ہفتے میں ختم ہو گیا۔ دوسرا ایڈیشن شائع کروانا پڑا۔ ایس ایم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر حشمت اللہ لودھی ہمارے کالج میں ہیڈ ایگزامینر بن کر آئے تو انہوں نے اس کتاب کے بارے میں ایک بات کہی کہ اس کتاب کی یہ خوبی ہے کہ اس میں کوئی غلطی نہیں ہے نہ ہی اسپیلنگ کی اور نہ بائٹیکل میرے لکھنے کی رفتار بہت تیز ہے جو کام کرتی ہوں بہت جلدی کرتی ہوں جس چیز کو لکھنے میں لوگ سال یا مہینے لگاتے ہیں، میں ہفتوں اور دنوں میں ختم کرتی ہوں..... یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لیے کوئی خاص انعام ہی معلوم ہوتا ہے۔

یادوں کا اکٹھا کرنا مشکل کام ہے یادوں کی مالا بکھری ہوئی ہے۔ ہر موتی الگ، الگ کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی نیلا اور کوئی سیاہ..... کسی پردھول پڑی ہوئی اور کوئی نور کی طرح روشنی بکھیرتا ہوا..... مجھے ان موتیوں سے صرف خوب صورت موتی ہی چننا ہیں۔ خصوصاً وہ موتی جس سے نور کی شعاعیں نکل رہی ہیں اور میری روح کو منور کر رہی ہیں۔ یادوں کی ایک خوب صورت مالا تیار کرنی ہے جس میں نہ کوئی سیاہ موتی اپنی جگہ بنائے گا اور نہ ہی دھول میں اٹا ہوا یاد اعدار موتی۔

میرے دونوں ناول ”غم دل“ اور ”اپنی منزل“ شادی سے قبل ہی شائع ہو گئے تھے۔ 1968ء میں میری شادی طے ہو گئی۔ میرے شوہر عبدالرحمن بلگرامی میری امی کے ماموں زاد تھے اور اپنی تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے مکمل کر کے 1965ء میں پاکستان آئے تھے۔ مجھ سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے۔ میرے دونوں ناول شائع کروانے والے وہی تھے۔ انہیں میری ادنیٰ دلچسپیاں پسند تھیں کیونکہ ان کا تعلق بھی علمی اور ادبی گھرانے سے تھا۔ وہ خود بھی بہت کتابیں



اعتبارِ وفا

قطعہ 14

نگہت سیما

یہ سچ ہے کہ محبت میں وقت کا وزن نہیں ہوتا... گفتگو کا وزن نہیں ہوتا، ہر طرف تو کیا دل و دماغ تک پر ایک بے وزن سی کیفیت محسوس ہوا کرتی ہے... کہ دل و دماغ کو کوئی دوسری بات سُجھائی تک نہیں دیتی۔ ایسے حالات میں کسی بھی انسان کے پاؤں جمے نہیں رہتے اور وہ ہر وقت لڑھکتا رہتا ہے۔

مگر خود کو سنبھال کر متوازن رکھنا ہی محبت کا اصل پلیٹ فارم ہے... لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اس بے وزنی کے اصول کو بھی محسوس کر لیا جائے... اور مان لیا جائے... کہ محبت کا اولین قانون اعتبار ہے... اور وفا کے غنچے وہیں کھلتے ہیں... جس گلشن میں اعتبار کا بیج بویا جاتا ہے۔

گلاب چہروں پہ دھول کتنی مسافتوں کی جھی ہوئی ہے
چراغ آنکھوں میں جانے کتنے سفر کے جالے تنے ہوئے ہیں
نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی حصہ
کہاں کا ذکر سفر کہ پہلے قدم سے ہم تو رُکے ہوئے ہیں



READING
Section

ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

25



”شمر تم صوفی نصیر کے بیٹے تھے، مہذب، دین دار، تعلیم یافتہ لیکن میری وجہ سے تم کیا بن گئے۔“

”تمہاری وجہ سے نہیں فرجی، ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔“

”تم کچھ بھی کہو شمر لیکن میں نے اس کے لیے ہمیشہ خود کو ہی قصور وار جانا..... میری ایک ذرا سی لغزش، ذرا سی جذباتیت نے ہماری زندگی کے دھارے بدل دیے..... لیکن اب نہیں..... اب تم میری وجہ سے قاتل نہیں بنو گے..... میں نے اپنا قتل معاف کیا..... وعدہ کرو شمر کہ میرے بیٹے کو لے کر اس زندگی سے کہیں دور چلے جاؤ گے۔ کسی ایسی جگہ جہاں اس زندگی کی پرچھائی تک میرے بیٹے پر نہ پڑے۔ وعدہ کرو تم قاتل نہیں بنو گے..... میرا بیٹا ایک قاتل کا بیٹا نہیں کہلائے گا۔“ اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی لیکن وہ بالٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میں وعدہ کرتا ہوں فرجی کہ میں تمہارے بیٹے کو لے کر کہیں کسی اور ملک میں چلا جاؤں گا۔ میں یہاں نہیں رہوں گا فرجی، ہم تینوں اس ملک سے چلے جائیں گے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ اور فرجی کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

اس کا پورا وجود ایک ان دیکھی آگ سے جل اٹھا اس نے مٹھیاں بھینچ کر زور سے بیڈ کی پٹی پر ماریں اور مضطرب ہو کر ایک بار پھر کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ اندر جلتی آگ ٹھنڈی نہیں ہوتی تھی۔ ایک الاؤ تھا جو بھڑکتا تھا اور شعلے چاروں اور لپکتے جیسے اسے بھسم کیے دیتے ہوں۔ وہ ٹہلتے، ٹہلتے تھک گیا تو نڈھال ہو کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں بہت دنوں بعد آج اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں۔ اس نے جھک کر جوتے اتارے اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں سے آنکھوں کو دبایا جیسے وہ آنکھوں میں پھیلتی نمی کو باہر آنے سے روکنا چاہتا ہو..... آنسو باہر تو نہیں نکلے تھے لیکن اندر گرنے لگے تھے قطرہ، قطرہ کر کے، اندر بھڑکتے الاؤ کو ان آنسوؤں نے مدھم کر دیا تھا لیکن نم آنکھوں کے آئینے میں ماضی کے بہت سارے منظر جھلملانے لگے تھے۔ ان دنوں زندگی کتنی خوب صورت ہو گئی تھی۔ آنے والے بچوں کے ادران کے مستقبل کے متعلق باتیں کرتے ہوئے وہ تھکتے نہ تھے۔ جلیل خان نے اس کے لیے فیصل آباد میں ایک چلتا ہوا ہوزری کا کارخانہ خریدنے کا فیصلہ کیا تھا..... کارخانے کا مالک، ملک چھوڑ کر جا رہا تھا۔

”اس چھوٹے سے کارخانے سے ابتدا کرو شمر انشاء اللہ ایک دن بڑے بزنس مین بنو گے۔“ جلیل خان کو اس کی صلاحیتوں پر اعتبار تھا اور فرجی کو یقین.....

”بہت جلد ہم اپنا تلخ ماضی بھول جائیں گے شمر، ہمارا ایک گھر ہوگا، ہمارے بچے ہوں گے اور ہم نارمل لوگوں کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ عام لوگوں جیسی زندگی..... جیسی زندگی سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں لوگ گزار رہے ہیں۔“ فرجی کی آنکھوں میں ان دنوں ہزاروں خواب سج گئے تھے۔ وہ خود بھی تو ان خوابوں میں اس کا شریک تھا۔ بچوں کے ناموں سے لے کر انہوں نے ان کی تعلیم تک پر بحث کر ڈالی تھی کہ وہ کہاں اور کس، کس ادارے میں اپنے بچوں کو پڑھائیں گے۔

Downloaded From Paksociety.com

وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ وہ ایک بوجھ سا جو ہمیشہ اس کے سینے پر دھرا رہتا تھا، سینہ اب اس بوجھ سے خالی تھا۔ وہ بوجھ کیسا تھا۔ اس نے کبھی کھوجنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید غلط راستے پر چلنے کا بوجھ تھا کسی احساسِ جرم جیسا لیکن اب وہ اس بوجھ سے آزاد تھا۔

لیکن کبھی، کبھی وہ اماں اور ابا کو یاد کر کے اداں ہو جاتا، وہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے اور اماں فرجی کے کتنے لاڈ اٹھاتیں..... اس روز اماں کو یاد کر کے بے اختیار ہی اس کے لبوں پر شکوہ آ گیا تھا۔

”ہمارے اتنے نقصان ہوئے فرجی کیا تھا اگر اللہ اماں کو ہمارے پاس رہنے دیتا..... صرف اماں ہمارے پاس

READING
Section

26 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

ہوئیں تو۔۔۔۔۔ یہ زندگی نے ہمارے ساتھ کیسا مذاق کیا ہے فرجی۔۔۔۔۔ بے جرم کی سزا کاٹ رہے ہیں ہم۔۔۔۔۔ اس روز اسے وہ ساری زیادتیاں یاد آئی تھیں جو اُن کے ساتھ ہوئی تھیں۔ وہ سارے دکھ جو انہوں نے اٹھائے تھے۔۔۔۔۔ وہ ظلم جو ماموؤں نے کیا تھا۔

”لیکن شکر کرو شکر اللہ نے ہمیں تھام لیا، بچا لیا، کچھ اور بھی تو ہو سکتا تھا۔ کچھ اس سے بھی بھیا نک، تمہیں پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اگر خان بابا اچھے نہ ہوتے۔۔۔۔۔ اگر ان کے دل میں میرے لیے رحم نہ پیدا ہوتا تو میں کہاں ہوتی۔ اللہ نے مجھے محفوظ رکھا۔۔۔۔۔ میری عزت بچائی تو اللہ کا شکر ہے۔“ فرجی ڈر گئی تھی۔

”جو ہو گیا سو ہو گیا شمر۔۔۔۔۔ اسے مت یاد کرو بس آئندہ کے لیے دعا کیا کرو کہ سب اچھا ہو۔“

اس نے فرجی کی بات سن لی تھی اور خاموش ہو گیا تھا لیکن دل کے اندر شکوے جاری تھے۔

”اگر یوں نہ ہوتا اللہ۔۔۔۔۔ یوں ہو جاتا تو۔۔۔۔۔“

اور فرجی اسے خاموش دیکھ کر اپنی اون سلاپاں لے آئی تھی۔۔۔۔۔ وہ چھوٹا سا سویٹر بن رہی تھی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ کتنے دنوں سے وہ اسے چھوٹی، چھوٹی ٹوپیاں اور سویٹر بننے دیکھ رہا تھا۔ خالہ زیتون بھی ہر وقت مصروف نظر آتی تھیں۔ کبھی مشین کے آگے بیٹھی ہوتیں، کبھی سوئی دھاگا اور اون سلاپاں لیے ہوتیں کچھ دیر وہ اسے یوں ہی دلچسپی سے بننا دیکھتا رہا پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”سب کچھ بازار سے مل جاتا ہے فرجی۔۔۔۔۔ اتنے ڈھیروں اونی سیٹ تو لایا ہوں میں۔۔۔۔۔ کیوں جھکتی ہو، کل شاپنگ کے لیے چلتے ہیں جو کچھ اور لینا ہے لے آتے ہیں۔“

”نہیں، مجھے اپنے بچوں کے لیے اپنے ہاتھوں سے سویٹر بنانا اچھا لگتا ہے شمر۔۔۔۔۔“ اس کے چہرے پر اس وقت ممتا کی الوہی روشنی تھی اور اس روشنی نے اس کے چہرے کو ایسا نکھار بخشا تھا کہ وہ مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

”میں نے خالہ سے سیکھا ہے بننا۔۔۔۔۔ مجھے تنگ نہیں آتی تھی لیکن میں نے سیکھ لی۔۔۔۔۔ بازار سے لائے گئے شاید اس سے خوب صورت ہوں گے شمر لیکن ان میں ممتا کی وہ گرمی نہیں ہوگی جو ان میں ہوگی۔۔۔۔۔ ان میں میری ممتا کی گرمی اور محبت بھی شامل ہے۔“

اس نے نظریں اٹھائی تھیں اس کے ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اور وہ وارنگلی سے اسے تک رہا تھا۔

”میری اماں بھی میرے لیے اپنے ہاتھ سے سویٹر بناتی تھیں فرجی۔۔۔۔۔ اور وہ مجھے بازاری جرسیوں اور سویٹروں سے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ اور گرم بھی تم صحیح کہتی ہو ان میں ممتا کی گرمی بھی شامل ہوگی تب ہی تو۔“ اس کے اندر یکا یک نہا نہیں اتر آئی تھیں پچھلے چودہ سالوں میں اس کے اندر عجیب سی کرخنگی اور سختی بھر گئی تھی لیکن اس وقت ایک دل پکھلا دینے والی کیفیت تھی جو اس کے اندر کی کرخنگی کو نرمی میں بدل رہی تھی اسے لگا جیسے وہ پہلے والا شرجیات ہو۔۔۔۔۔ نزل اور گداز دل۔۔۔۔۔

اس نے آہستگی سے فرجی کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے۔

”اللہ کا شکر ہے فرجی کہ اس نے ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازا اس نے ہمیں تھاما اور بچا لیا۔“

اس نے کچھ دیر پہلے کہی گئی اس کی بات کا جواب دیا تھا۔ اور فرجی کے لبوں پر ہی صرف مسکراہٹ نہیں آئی تھی بلکہ اس کی آنکھیں بھی جگمگاتی تھیں۔

اور اس روز وہ بہت دیر تک جاگتا رہا تھا۔ فرجی کے سونے کے بعد بھی۔۔۔۔۔ اس نے گزرے چودہ سالوں اور

اس سے پہلے کے بیٹے گئے سالوں کے ایک، ایک لمحے کو یاد کیا تھا۔ اس زندگی کا اس زندگی سے موازنہ کیا تھا..... اور سوچا تھا کہ انتخاب کا حق تو میرے پاس تھا۔ فرح صحیح کہتی ہے اور میں نے اپنے لیے خود اس راستے کو چنا تھا..... اور اب اس نے سوچا تھا صبح ہوتے ہی وہ جلیل خان کو فون کر کے پوچھے گا کہ وہ بزنس سے کب آ رہا ہے..... اگر اسے دیر سے آنا ہے تو وہ خود ہی کارخانے کا سودا پکا کر کے بیاندے دے دے کہیں کوئی اور ہی نہ خرید لے۔ اب اگر بزنس اشارت کرنے کا ذہن بن گیا تھا تو پھر دیر نہیں کرنی چاہیے۔

وہ یونہی منصوبے بناتے، بناتے سویا ہی تھا کہ فون کی بیل سے آنکھ کھل گئی۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے سامنے کلاک کی طرف دیکھا تھا۔ تین بجنے والے تھے۔ فرحی نے کروٹ بدلی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور فوراً ہی بیڈ سائڈ ٹیبل پر پڑے فون کا ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف شیر خان تھا۔

”خیریت شیر خان اس وقت؟“ وہ پریشان ہو گیا تھا۔

”باس نے آج دو بجے کی فلائٹ سے آنا تھا بزنس سے.....“

”تو کیا ہوا.....؟“ اس نے سوئی ہوئی فرحی پر نظر ڈالی تھی۔

”باس کو انٹرنیٹ سے ہی پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔“

”کیوں.....؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”پتا نہیں استاد..... ابھی تو کچھ پتا ہی نہیں چل رہا کہ وہ باس کو لے کر کہاں گئے ہیں..... صبح ہی وکیل سے

بات کروں گا۔“

”اوکے..... تم پریشان مت ہو شیر خان، میں کچھ دیر تک نکلتا ہوں لاہور کے لیے.....“

فرحی اس کی باتوں کی آواز سے اٹھ بیٹھی تھی اور اب متوحش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا شمر.....؟“

اور جب اس نے جلیل خان کی گرفتاری کا بتایا تو وہ رونے لگی تھی۔

”میں اسی دن سے ڈرتی تھی شمر.....“

گو وہ خود بھی پریشان تھا لیکن منہ اندھیرے ہی لاہور کے لیے روانہ ہو گیا تھا..... اور پھر دو تین روز بعد ہی اس کی جلیل خان سے ملاقات ہو سکی تھی۔ جلیل خان بہت مطمئن تھا۔ اسے پریشان دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”پریشان کیوں ہوتا ہے جیاتیے..... یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ بس ہڈی ڈالنے میں کوتاہی ہو گئی تھی۔ چھ سات

روز میں باہر آ جاؤں گا۔ بس تو اتنی مہربانی کر کہ یہ چند دن یہاں لاہور میں گھر پر ہی رک جا..... جو لوگ آ میں ان سے ملنا اور..... کئی لوگوں کو ٹائم دے رکھا تھا اور جانتا ہے ناں تو اس طرح سا کھ خراب ہوتی ہے..... اور باقی کے

کاموں کا تو سارا تجھے پتا ہی ہے ناں.....“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”اور فکر نہ کر باہر نکلتے ہی پہلا کام کارخانہ لینے کا کروں گا..... فرحی بیٹی کیسی ہے، اسے سمجھا دینا۔“

اور وہ ایک ماہ پہلے جس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا تھا اس میں پھر آ گیا تھا۔ وہ جلیل خان کو انکار نہیں

کر سکتا تھا..... جلیل خان کے اس پر بہت احسان تھے۔ اس کے احسانوں کے بوجھ سے اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

”صرف چند دن کی بات ہے فرحی.....“ گھر آ کر اس نے فرحی کو تسلی دی تھی..... لیکن اس وقت وہ خود بھی

نہیں جانتا تھا کہ یہ چند دن کتنے سالوں پر محیط ہو جائیں گے۔

”تم اپنا بہت خیال رکھنا اور دو دن بعد تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے..... یاد ہے ناں..... اور جو ڈاکٹر نے

ڈیٹ بتائی تھی میں اس سے دودن پہلے ہی آ جاؤں گا بلکہ اگر جلیل خان آگئے تو میں اس سے بھی پہلے آ جاؤں گا تم دعا کرنا..... یوں تو جلیل خان کے کافی تعلقات ہیں لوگوں سے پھر بھی وکیل کہہ رہا تھا کہ شاید کچھ دن لگ جائیں۔
 ”وہ رہا تو ہو جائیں گے ناں شمر..... انہیں سزا تو نہیں ہوگی ناں.....“ فرجی بہت پریشان ہوگئی تھی۔
 ”ہاں..... جلیل خان کہہ تو رہے ہیں کہ بس چند دن میں باہر ہوں گے..... وکیل فی الحال ضمانت کی کوشش کر رہا ہے۔“ اس نے پھر اسے تسلی دی تھی۔

لیکن جلیل خان چند دن تو کیا اگلے کئی مہینے تک باہر نہیں آسکا تھا..... اس دوران وہ دو پیارے، پیارے بچوں کا باپ بھی بن گیا تھا۔ ریحان اور روحان.....
 ”ہم نے کیا سوچا تھا شمر کہ ہمارے بچے.....؟“

”اب بھی ایسا ہی ہوگا فرجی، ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ ہمارے بچے ایک مختلف ماحول میں پرورش پائیں گے..... میرا وعدہ ہے تم سے فرجی کہ جلیل خان آگئے تو میں پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھوں گا۔“ اس روز وہ خانیوال آیا تھا اور چاہتا تھا کہ فرجی اور بچوں کو اپنے ساتھ لاہور ہی لے جائے لیکن فرجی..... بہت مایوس اور دلگرفتہ تھی۔
 ”اتنے دن گزر گئے خان بابا ابھی تک باہر نہیں آسکے۔ ضمانت بھی نہیں ہوئی۔ ایسا کیا، کیا ہے انہوں نے؟“
 ”وکیل کوشش کر رہا ہے فرجی.....“ اس نے اس کے باقی سوال کو نظر انداز کر دیا تھا۔

”پتا نہیں خان بابا کب آئیں گے اور اگر انہیں سزا ہوگئی اور اگر تمہیں بہت سارے دن وہاں رہنا پڑا تو.....؟“ خدشے اور خوف اس کے لفظوں سے ہی نہیں اس کی آنکھوں سے بھی جھلک رہے تھے۔ وہ بے حد مضطرب اور بے چین تھی۔

”ہم نے اپنے بچوں کے لیے جو خواب دیکھے تھے شمر.....“ ایک بار پھر اس نے کہا تھا اور ایک بار پھر اس نے اسے یقین دلایا تھا کہ ان کے خواب ضرور پورے ہوں گے۔ ان کے بچے وہی زندگی جنیں گے جن کے خواب فرجی دیکھتی ہے..... ایک نارمل اور عام لوگوں جیسی زندگی.....

”پہلے اور بات تھی، میں اور خالہ اکیلے تھے، اب یہ بچے ہیں تین دن پہلے ریحان کی طبیعت آدھی رات کو خراب ہوگئی تھی..... ہم دو عورتیں آدھی رات کو کیا کرتیں..... پتا نہیں کیسے رات گزاری..... اور صبح خالہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئیں۔“

”اسی لیے تو میں نے سوچا ہے کہ تمہیں اپنے ساتھ لاہور ہی لے جاؤں گا۔ ہم اکٹھے وہاں ہی رہیں گے۔ میں بھی ان دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتا..... بہت یاد آتے ہیں۔“ اس نے فرجی کی گود میں لیٹے ریحان کے رخسار کو ہولے سے چھوا تھا۔

”لیکن میں لاہور نہیں جاؤں گی۔ مجھے اپنے بچوں کے ساتھ خان بابا کے گھر میں نہیں رہنا شمر.....“ اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”وہ دنیا والوں کی نظر میں ایک بد معاش کا گھر ہے..... اور میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے اس گھر میں رہیں۔“

”تھوڑے سے دنوں کی بات ہے فرجی.....“ اس نے سمجھایا تھا۔

”میں بچوں کے ساتھ تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا.....“

تھوڑے دنوں کے لیے بھی نہیں۔“ فرجی کا انداز حتمی تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

”ہم الگ گھر کرائے پر لے لیں گے۔“ وہ فرجی کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

”میں لاہور جانا ہی نہیں چاہتی شرم.....“ فرجی کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔
 ”وہاں میں کیسے خود کو روک پاؤں گی شرم..... میرا جی چاہے گا میں اس گھر کو دیکھوں جہاں میں نے زندگی کے اتنے سال گزارے..... میں اپنے، نمی، ڈیڈی کی قبروں کی مٹی آنکھوں سے لگاؤں.....“ اور وہ بلک، بلک کر رونے لگی تھی۔

لوگ کہتے ہیں وقت ہر زخم پر مرہم رکھ دیتا ہے لیکن اس کے زخم تو روزِ اول کی طرح تھے اور ان سے خون رستا تھا۔

”ٹھیک ہے.....“ اس نے فرجی کو گلے لگایا تھا..... تسلی دی تھی۔
 ”جلیل خان باہر آ جائیں تو ہم لاہور نہیں جائیں گے۔ کسی اور شہر میں جا بسیں گے۔“ وہ مرد تھا پھر بھی کئی بار اس کا دل ان گلیوں میں جانے کو مچلتا تھا جہاں کھیل کود کروہ بڑا ہوا تھا۔ اس گھر کو دیکھنے کے لیے مچلتا جہاں اس کا بچپن، لڑکپن اور جوانی کا بہت سا حصہ گزرا تھا۔ کیسے، کیسے اس نے اپنے دل پر پتھر رکھے تھے۔ اور فرجی تو..... اور وہ اسے بہت ساری تسلیاں اور دلا سے دے کر آ گیا تھا..... اور یہ تسلیاں اور دلا سے اسے بھی اگلے کئی سال تک دینے تھے۔ وہ ہفتے میں دو چکر خانوال کے لگاتا تھا۔

جلیل خان نے بہت سارے بکھیڑے پال رکھے تھے اور وہ مستقل خانوال نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ صرف ہڈی ڈالنے کی بات نہیں تھی۔ معاملہ کچھ اور بھی تھا۔ جلیل خان کے خلاف بہت مضبوط کیس بنایا گیا تھا۔ ڈوریاں کہیں اوپر سے ملی تھیں اور جلیل خان کو پانچ سال کی سزا ہو گئی تھی..... قتل کے کیس میں بھی ہوشیار وکیل ضمانت کروا لیتے ہیں یہاں تو محض اسمگلنگ کا جرم تھا۔ اور بھلا اتنی جلدی فیصلے کب ہوتے ہیں۔ مہینوں عدالتوں میں کیس چلتا ہے..... پیشیاں ہوتی ہیں اور یہاں تو چھ ماہ کے اندر، اندر سزا بھی ہو گئی تھی۔ وہ بے حد دلگرفتہ اور دل شکستہ سا خانوال آیا تھا۔ اسے فرجی کا سامنا کرتے ہوئے شرمندگی ہو رہی تھی کیونکہ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے جلیل خان کے باہر آنے تک اس کی نمائندگی کرنی ہے..... جلیل خان برا تھا، اسمگلر تھا، غنڈا تھا لیکن بہت سارے لوگوں کے لیے اچھا بھی تھا۔ محلے میں کئی گھرایے تھے جو صرف جلیل خان کی وجہ سے خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔ جلیل خان کے گھر تالا لگنے کا مطلب تھا کہ وہ غیر محفوظ ہو گئے۔

”پچھلی گلی میں ایک بیوہ عورت اپنی تین جوان بچیوں کے ساتھ رہتی ہے..... تمہیں ان کا خاص خیال رکھنا ہے شرم..... لڑکیاں جوان ہوں، خوب صورت ہوں اور سر پر کوئی سا تباہ نہ ہو تو بہت سوں کی رال ٹپک پڑتی ہے۔ میں نے بیگم عبدالغفور سے وعدہ کیا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی ان کے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا اور شرم تمہیں میرے وعدے کی لاج رکھنی ہے۔ اگر کسی کو میری گرفتاری اور سزا کی بھنگ پڑ گئی تو.....“ جلیل خان نے گرفتار ہونے کے بعد اس سے پہلی ملاقات میں کہا تھا اور اب تو اسے سزا ہو گئی تھی اور اس نے جلیل خان کی جگہ سنبھالنی تھی۔ جلیل خان بھی یہی چاہتا تھا گو اس نے زبان سے نہیں کہا تھا اور اسے زبان سے کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، وہ جانتا تھا کہ شرم حیات بہت خوش اسلوبی سے اس کے حصے کا کام سنبھالے ہوئے ہے اور آئندہ بھی سنبھال لے گا..... لیکن فرجی وہ اسے قبول کرے گی بھی یا نہیں..... وہ تو گن، گن کر دن گزار رہی تھی کہ جلیل خان کے آتے ہی وہ جلیل خان کی زندگی سے نکل جائیں گے۔ دور کہیں کسی اور شہر میں..... ہوزری کا کارخانہ بک گیا تھا اور نہ بھی... بکنا تب بھی فرجی فیصلہ کر چکی تھی کہ ایک بار وہ جلیل خان کی زندگی سے نکل گئے تو وہ پھر کبھی مڑ کر نہیں دیکھیں گے۔ بھلے جلیل خان انہیں احسان فراموش کہیں، وہ اپنے بچوں کے لیے سب کچھ سننے کو تیار تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ جلیل خان کے لیے اس کے دل میں احترام تھا..... وہ ایک بیٹی کی طرح ہی اس سے محبت کرنے لگی تھی اور جلیل خان نے

بھی ایک باپ کی شفقت دی تھی اسے لیکن وہ کیا کرتی، وہ اپنے بچوں کے لیے ایک صاف ستھرا پاکیزہ ماحول چاہتی تھی وہ ان کے ساتھ کوئی ایسا حوالہ نہیں چاہتی تھی جن پر انہیں کبھی شرمندگی ہو اور اپنے ان خیالات کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً شریات کے سامنے بھی کرتی رہتی تھی سو شریات سر جھکائے اس کے سامنے بیٹھا لفظوں کی تلاش میں اپنے اندر بھٹک رہا تھا جب اس نے ریحان کے کپڑے تبدیل کرتے، کرتے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے شرمتم کچھ پریشان ہو؟“

”ہاں.....“ وہ چونکا تھا۔

”جلیل خان کو سزا ہو گئی ہے پانچ سال کی.....“ اس کے ہاتھ لمحہ بھر کور کے تھے اور وہ پھر مصروف ہو گئی تھی..... اس نے کچھ کہا نہیں تھا لیکن اس کی آنکھیں اسے منجمد سمندروں کی طرح لگی تھیں۔

اور پھر ریحان کو تیار کر کے بیڈ پر لٹا کر تھپک، تھپک کرسلانے لگی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے اس نے سنا نہیں۔

”جلیل خان کو سزا ہو گئی ہے فرجی.....“

اس نے ڈہرایا تھا..... ریحان کو تھکتے، تھکتے اس نے بس ایک نظر شریات کی طرف دیکھا تھا۔

”تم کچھ کہو گی نہیں پوچھو گی نہیں.....“ اس کی خاموشی سے وہ الجھ رہا تھا۔

”کیا کہوں اور کیا پوچھوں.....؟“

برقی سطح کے نیچے جیسے پانی زور مارنے لگا تھا اور برف کی تہ جگہ، جگہ سے تڑخ رہی تھی۔

”چند دن، مہینوں اور اب سالوں پر محیط ہو گئے ہیں شرمتم..... جانتی ہوں تم نے خود کو جلیل خان کا قائم مقام بنا لیا ہے۔“

”فرجی بہت مجبور ہوں، کتنی بھی کوشش کروں خود غرض نہیں ہو سکتا..... اس شخص کا ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا جس نے

بے حد مشکل لمحوں میں میرا ہاتھ تھاما تھا۔ فرجی بس چند سال کی بات ہے..... پانچ سال کا مطلب پانچ سال نہیں

ہے..... دن رات شمار ہوں گے اور پھر سزا میں تخفیف بھی ہوتی رہتی ہے۔“

پتا نہیں وہ خود کو تسلی دے رہا تھا یا اسے فرجی نے کچھ نہیں کہا تھا بس بیڈ پر پڑا چھوٹا کبیل اٹھا کر ریحان پر ڈالا تھا

جو سو گیا تھا۔

”تم یہاں رہو گی خانیوال اور میں جو زندگی گزارا ہوں اس کا سایہ تک بچوں پر نہیں پڑے گا فرجی..... میرا

یقین کرو.....“

”مجھے تم پر یقین ہے شرمتم لیکن.....“ بات ادھوری چھوڑ کر فرجی دروازے کی طرف بڑھی تھی اور زیتون خالہ کو

آواز دینے لگی تھی۔

”خالہ روحان سو گیا ہے تو اسے ادھر لٹا جائیں۔“

”لیکن کیا فرجی..... پتہ اس نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا۔“

”لیکن..... تقدیر سے ڈر لگتا ہے، میں نے تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کی چاہ کی..... میں تمہارے سنگ

زندگی گزار رہی ہوں لیکن کس قیمت پر..... میں نے چاہا کہ میرے بچے وہ زندگی نہ گزاریں جس زندگی میں ان کا

باپ حادثاتی طور پر آ گیا ہے تو پتا نہیں اس چاہت کا کیا انجام ہوگا..... میں اپنی تقدیر بدلنے کی قدرت نہیں رکھتی شرمتم

اور نہ ہی اپنے بچوں کی..... میں نے خود کو تقدیر کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے جو ہو سو ہو.....“

”اتنی مایوسی فرجی.....؟“ اس نے بہت دل شکستگی سے فرجی کو دیکھا تھا۔

”پتا نہیں یہ مایوسی ہے یا صبر..... شکر ہے یا قناعت، یقین ہے یا بے یقینی.....“ فرجی نے ایک گہری سانس لے

کرزیوں خالہ سے روحان کو لے کر بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ وہ ساکت بیٹھا تھا۔ اور گا ہے گا ہے نظر اٹھا کر فرجی کو دیکھ لیتا تھا جو بیڈ پر بچوں کے پاس ہی نیم دراز ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن پلکوں میں کبھی، کبھی لرزش ہوتی تھی اس کا ایک ہاتھ بچوں پر تھا اور دوسرا بازو سر کے نیچے تھا۔ وقت نے اس کے چہرے کی شوخی اور آنکھوں کی شریر چمک چھین لی تھی..... اب وہاں سنجیدگی تھی، ایسی سنجیدگی جس میں بلا کا سوز تھا۔ ایک پگھلا دینے والی کیفیت تھی۔ اور یہ سوز، یہ کیفیت پچھلے چودہ سال سے وہ اس کے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اپنے چہرے کی سنجیدگی میں ایک پتھر یا پن تھا۔ پتھروں جیسی سخت بے مہری تھی۔ وقت نے اس کے چہرے کو پتھر کر دیا تھا لیکن اس کا دل تو ویسا ہی تھا۔ گداز، نرم وہ زیادہ دیر تک فرجی کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ جب بھی اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا تو اس کا دل پکھل کر پانی ہونے لگتا تھا۔ اس نے فرجی کے چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اور اپنا دایاں بازو اس کے گرد حائل کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

”آئی ایم سوری..... فرجی.....“ فرجی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا اس کی آنکھوں کے زیریں کنارے سرخ ہو رہے تھے، لمحے بھر بعد اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا تھا۔

”میں دو تین دن تک لاہور جاؤں گا۔ وکیل نے کہا تھا کہ وہ جلیل خان سے ملاقات کا بندوبست کر دے گا۔ پھر پتا نہیں وہ اسے لاہور میں رکھیں گے یا کہیں اور بھیج دیں گے۔ میں جلیل خان کو بتا دوں گا کہ میں.....“ بات ادھوری چھوڑ کر اس نے فرجی کی بند آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو بائیں ہاتھ سے پونچھا۔

”اور تم جہاں کہو گی فرجی ہم وہاں چلے جائیں گے۔“ وہ ایک بار پھر اس سے وعدہ کر رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنا وعدہ پورا بھی کر سکے گا یا نہیں..... فرجی کے آنسو اور زیادہ تیزی سے بہنے لگے تھے اور اس کے دل پر جیسے کوئی بوجھ آگرا تھا۔ پتا نہیں یہ بوجھ کیسا تھا، کیوں تھا..... وہ جلیل خان سے کیا کہے گا نہیں جانتا تھا۔ جلیل خان کا سر مدد عمل کیا ہوگا..... وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا۔

کیا وہ جلیل خان کو کچھ بھی بتائے بغیر خاموشی سے فرجی کے ساتھ کہیں چلا جائے..... اور اس صورت میں یہ بوجھ جو اس کے دل پر اچانک آگرا تھا یونہی دھرا رہے گا۔

اگلے دو دن فرجی کے اور اس کے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی..... نہ فرجی نے کچھ کہا تھا نہ اس نے کوئی بات کی تھی..... حالانکہ وہ فرجی سے بات کرنا چاہتا تھا، پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں جا کر سیٹل ہوں گے..... لیکن ان کے درمیان گفتگو کا موضوع زیادہ تر بچوں کی بیماری رہی تھی خصوصاً ریحان کی..... گو وہ دونوں صحت مند تھے لیکن روحان سرخ و سپید تھا جبکہ ریحان کا رنگ زرد تھا اور وہ اکثر بیمار ہو جاتا تھا۔

میرا خیال ہے اس بار میں لاہور جاؤں گا تو کسی چائلڈ اسپیشلسٹ سے ٹائم لے لوں گا۔“ اس نے فرجی سے کہا تھا۔

”ٹھیک ہے.....“ فرجی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ ”ویسے تو یہاں میں نے ڈاکٹر سے چیک کروا لیا ہے لیکن پھر بھی اپنی تسلی کے لیے لاہور سے چیک کروا لیتے ہیں کسی اسپیشلسٹ سے.....“

”میں جلیل خان سے مل کر اسے لاہور لے جاؤں گا۔“ اس نے فرجی سے کہا تو فرجی نے پوچھا تھا کہ اسے کب ملنے جانا ہے۔

”پتا نہیں، مجھے وکیل کے فون کا انتظار ہے۔ اس نے کہا تھا وہ دو تین روز میں ملاقات کا بندوبست کر دے گا۔“ اس نے فرجی کو بتایا تھا اور اگلے روز ہی وکیل کا فون آ گیا تھا کہ اس نے ملاقات کا بندوبست کر دیا ہے۔ جلیل خان کو جیل میں کافی سہولتیں حاصل تھیں۔ جیلر سے اس کی پرانی باری تھی جب بھی وہ جلیل خان سے ملاقات کرنے

جانا ایک الگ کمرے میں بہت آرام و سکون سے وہ جب تک چاہتے بات کرتے تھے۔

”مجھے صبح جلیل خان سے ملنے لاہور جانا ہے۔“ اس نے رات سونے سے پہلے فرجی کو بتایا تھا۔ روحان کو تھکتے ہوئے اس کے ہاتھ لٹخہ بھر کو تھمتے تھے۔

”یہ گھر جلیل خان کا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ جلیل خان کو اپنا فیصلہ سنانے کے بعد ہمیں مزید یہاں رہنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے مجھے لاہور میں تین، چار دن لگ جائیں، تم اپنے استعمال کی ضروری چیزیں پیک کر لینا..... لاہور سے آتے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے..... عارضی طور پر پہلے ہم فیصل آباد جائیں گے، وہاں ہوزری کی فیکٹری کے سلسلے میں تین چار بار جانا ہوا تو کچھ لوگوں سے اچھی دعا سلام ہو گئی تھی۔ ان کے ذریعے کوئی گھر کرائے پر لے لیں گے۔ پھر وہاں بیٹھ کر سکون سے آئندہ کا لائحہ عمل طے کریں گے۔ تم خالہ سے پوچھ لینا اگر وہ ہمارے ساتھ جانا چاہیں تو.....“

فرجی نے اس کی پوری بات سنی تھی لیکن نہ اس کی تائید کی تھی نہ تبصرہ کیا تھا بلکہ ذرا سا رخ موڑے روحان کو تھکتی رہی تھی جس کا سونے کا کٹھنٹی موڈ نہیں لگ رہا تھا۔

”ہم ہمیشہ فیصل آباد نہیں رہیں گے۔“ ذرا سے توقف کے بعد اس نے پھر کہا تھا۔

”بلکہ تم جہاں کہو گی ہم وہاں ہی سیٹل ہوں گے یہ تو بس عارضی طور پر ہوگا..... ہم ایک چھوٹا سا اسٹور کھول کر بھی کام کا آغاز کر سکتے ہیں۔“ اس نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے مزید جلیل خان کے ساتھ نہیں رہنا..... بات مکمل کر کے اس نے فرجی کی طرف دیکھا تھا لیکن اس نے اب بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اٹھ کر صحن میں چلا آیا تھا۔ اوپر آسمان تاروں سے بھرا تھا۔ خانیوال کے اس گھر سے آسمان نظر آتا تھا وہ اکثر صحن میں چار پائی پر لیٹ کر آسمان کو تکتا رہتا تھا۔ لاہور والے گھر کے صحن سے بھی تو آسمان یوں ہی نظر آتا تھا۔ وہ چار پائی پر لیٹ کر اکثر تاروں کو تکتے، تکتے وہاں صحن میں ہی سو جاتا تھا آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ صحن میں پڑی چار پائی پر لیٹ گیا تھا اور اوپر جگمگاتے تاروں کو دیکھتے، لاہور والے گھر اور اماں، ابا کو یاد کرتے ہونے جانے کب سو گیا تھا۔ صبح اذان کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی تھی اس کا دل اب بھی بہت بوجھل تھا۔ وہ خاموشی سے چار پائی پر لیٹے فرجی کو کچن میں جاتے اور بچوں کے لیے فیڈ تیار کرتے کمرے میں لے جاتے اور پھر برآمدے میں نماز پڑھتے دیکھتا رہا۔ نماز کے بعد فرجی نے صحن میں آ کر پوچھا تھا۔

”کب لاہور جانا ہے؟“

”نوبے تک نکل جاؤں گا۔“ فرجی کو جواب دے کر اس نے پھر آنکھیں موند لی تھیں۔ اور دل ہی دل میں وہ لفظ ترتیب دینے لگا تھا جو اسے جلیل خان کو کہنے تھے۔ وہ احسان فراموش نہیں کہلوانا چاہتا تھا لیکن وہ فرجی کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی خاموشی جیسے اب بھی اس کے دل پر ضربیں لگا رہی تھی۔ وہ یونہی آنکھیں موندے جملے سوچتا اور رد کرتا رہا اور جب دھوپ صحن میں اتر کر آنکھوں میں چھینے لگی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور جب تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلا تو ناشتا برآمدے میں کچھی گول ٹیبل پر لگا ہوا تھا۔ وہ جب خانیوال والے اس گھر میں ہوتا تو وہ تینوں فرجی، خالہ زیتون اور وہ ناشتا کھانا سب اکٹھا یہاں ہی برآمدے میں اسی ٹیبل کے گرد بیٹھ کر کرتے تھے لیکن آج وہ اکیلا تھا اس نے فرجی کو آواز دی تو اس نے کمرے سے ہی جواب دیا تھا کہ وہ اور خالہ ناشتا کر چکے ہیں۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ انہوں نے اس سے پہلے ہی ناشتا کر لیا وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔ شاید فرجی کو اس کی بات کا یقین نہیں ہے اور شاید وہ اس سے کچھ ناراض ہے لیکن اسے ابھی لاہور کے لیے نکلنا تھا اس لیے وہ ناشتا کرنے لگا تھا اور جب وہ ٹھہرا س میں سے اپنے لیے چائے نکال رہا تھا تو فرجی بھی چادر اوڑھے کمرے سے نکل آئی تھی وہ کہیں

جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔
 ”تم کہیں جا رہی ہو فرجی؟“ اس نے بے حد حیرت سے پوچھا تھا۔
 ”مجھے بھی تمہارے ساتھ جانا ہے شمر.....“
 ”کیوں.....؟“ اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”خان بابا سے ملنے.....“

”لیکن تم نے تورات کو ذکری نہیں کیا تھا۔“

”تم باہر آ کر سو گئے تھے تو میں نے جگایا نہیں.....“ اس نے فرجی سے مزید سوال نہیں کیے تھے اور چائے پینے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فرجی، جلیل خان سے ایک بیٹی کی طرح ہی محبت کرتی ہے اور اس کی سزا کا سن کر اس کا جذباتی ہو کر اس سے ملنے کے لیے جانا فطری تھا۔ اس کا اپنا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ جب وہ جلیل خان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرے گا تو اس کا کیا رد عمل ہوگا..... اسے اپنے دل پر ایک نامعلوم سا بوجھ دھرا محسوس ہو رہا تھا تاہم وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ دوران سفر بھی ان کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ہاں بچوں کے متعلق چند باتیں ہوئی تھیں۔ لاہور پہنچ کر انہیں گھر چھوڑ کر وہ وکیل سے ملنے چلا گیا تھا۔ ملاقات کا وقت اگلے روز دس بجے تھا، واپسی پر وہ ڈاکٹر سے ٹائم لیتا آیا تھا اور پھر رات وہ فرجی اور ریحان کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ خانیوال والے ڈاکٹر کی طرح اس نے بھی یقین دلایا تھا کہ پریشانی والی کوئی بات نہیں..... ریحان کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے باوجود اس کی رات بہت بے چین اور مضطرب گزری تھی۔ اس نے فرجی کو بھی کروٹیں بدلتے ہوئے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ بھی بے چین تھی یہ وہی بیڈروم تھا جس میں جلیل خان نے پہلی بار انہیں ٹھہرایا تھا۔

صبح جب وہ سو کر اٹھا تو نہ صرف فرجی تیار تھی بلکہ اس نے بچوں کو بھی تیار کر رکھا تھا۔ وہ ناشتا کر کے اٹھا تو خالہ زیتون بچوں کو لے آئی۔ فرجی نے روحان کو اس کی طرف بڑھا دیا۔
 ”کیا مطلب تم بچوں کو بھی ساتھ لے کر جاؤ گی۔“ اس نے روحان کو گود میں لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا تھا۔
 ”ہاں، میں چاہتی ہوں خان بابا ایک بار اپنے نواسوں سے مل لیں۔ فرجی کے چہرے پر وہی سوز بھری سنجیدگی تھی جو اسے پکھلا کر پانی کر دیتی تھی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ مختلف مراحل سے گزر کر وہ اسی مخصوص کمرے میں آئے تھے۔ آج جلیل خان پہلے سے ہی کمرے میں موجود ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔
 ”خان بابا.....“ فرجی نے پہلے اندر قدم رکھا تھا۔

”ارے تم فرجی بیٹی.....“ جلیل خان حیران رہ گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر فرجی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

”خان بابا آپ کو سزا ہو گئی ہے۔“ فرجی کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

”اوائے، اوائے یا گل نہ ہو تو، رو کیوں رہی ہے۔ یوں گزر جائیں گے یہ سال.....“

اس نے چنگی بجائی تھی لیکن فرجی کے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔

”جھلی دھی.....“ (بیٹی) جلیل خان اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

”میں کوئی پہلی بار ادھر تھوڑا ہی آیا ہوں، پہلے بھی دو بار آچکا ہوں۔ ادھر سب اپنے ہیں، بہت خیال رکھتے ہیں، کچھ نہیں ہوگا بس اب چپ کر جانہ رو.....“

”ایسا تو ہونا ہی تھا خان بابا..... ایسے کاموں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔“

”اوائے کیسے کام چھپے..... (پاگل) یہ تو اس (گالی دے کر) کی شرارت ہے۔ اس بڑے سیاست دان سے پنگالے بیٹھا تھا۔ خیر باہر نکل کر میں بھی دیکھ لوں گا اسے۔“

”نہیں خان بابا رہا ہو کر آپ کچھ نہیں کریں گے، یہ سب چھوڑ دیں گے۔ ہمارے ساتھ چلیں گے۔ ہمارے پاس رہیں گے شمر کوئی چھوٹا موٹا کام کر لیں گے۔“

”اوائے..... ہاں تیری اس ہوزری فیکٹری کا کیا بنا جاتے.....“ جلیل خان نے فرجی کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پہلی بار دروازے کے قریب بچوں کا stroller تھا مے کھڑے شمر حیات کی طرف دیکھا تھا اور پھر اس کی نظر بچوں پر پڑی تھی وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا تھا۔

”آپ کے نواسے ہیں خان بابا.....“ فرجی نے آگے بڑھ کر بیلٹ کھولی تھی۔ اور باری، باری اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا تھا۔

”آپ سے ملوانے لائی ہوں۔“

”یہ تم نے اچھا کیا.....“

جلیل خان نے دونوں بچوں کو دبوچ لیا تھا۔

”لو بچوں کا نانا چارہ پانچ ماہ بعد بچوں کو دیکھ رہا ہے۔“ وہ انہیں چوم رہا تھا۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو کے بال بچوں کو چھبے تو وہ کسمسائے اور پھر رونے لگے۔

فرجی نے انہیں جلیل خان سے لے کر پھر stroller میں لٹا دیا تھا۔ وہ تھوڑا سا بسور کر پھر سو گئے تھے۔ فرجی نے وہاں سے ہی بات شروع کر دی تھی جہاں سے ختم کی تھی۔

”خان بابا میں نے سوچا ہم ایبٹ آباد میں رہیں گے..... بہت خوب صورت جگہ ہے۔ میں دو تین بار وہاں گئی تھی۔ میری ایک دوست کا گھر وہاں ہی تھا۔ آپ کو ایبٹ آباد پسند آئے گا..... شمر کا ارادہ اسٹور کھولنے کا ہے اور.....“

”میں..... میں کیسے.....“ جلیل خان شپٹایا تھا۔

”میرے ادھر سب بکھیڑے ہیں، تم اور شمر چلے جانا..... میں کبھی کبھار ملنے آ جایا کروں گا۔ یہاں جیل کے اندر سے بھی میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں بہت سوز سز ہیں میرے..... میں اپنے وعدے پر قائم ہوں، میں تمہیں روکوں گا نہیں..... میرا خیال تھا چند دن کی بات ہے اس لیے شمر حیات کو روکا تھا لیکن اب.....“ اس نے شمر حیات کی طرف دیکھا تھا۔

”دو تین روز تک کراچی سے ممتاز خان کو بلوالوں گا۔ نیا لڑکا ہے لیکن مخلص اور وقادار ہے..... تم اسے سمجھا دینا اور.....“

”لیکن خان بابا..... ہم آپ کے بغیر کہیں نہیں جائیں گے۔“ فرجی نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

”میرے بچوں کے پاس کوئی رشتہ نہیں ہے، بس آپ ہیں..... میں چاہتی ہوں جب میرے بچے بڑے ہوں تو ان کا نانا ان کے پاس ہو..... کوئی ایک رشتہ تو ہو..... وہ اپنے نانا کی گود کی گرمی محسوس کریں..... ان کی انگلی پکڑ کر پہلی بار اسکول اور مسجد جائیں۔“ اب وہ پھر رو رہی تھی اور روتے، روتے اپنے سارے خواب جلیل خان سے شیئر کر رہی تھی جو بچوں کی پیدائش سے پہلے سے لے کر جلیل خان کی گرفتاری تک اس سے شیئر کرتی رہی تھی۔

”آپ نے مجھے بیٹی کہا لیکن سمجھا نہیں خان بابا.....“ اس کے لہجے میں ہی شکوہ نہیں تھا بلکہ اس کا پورا وجود شکوہ بنا ہوا تھا۔

”کیسے نہیں سمجھا.....“ جلیل خان جھلایا ہوا کبھی اسے اور کبھی شمر حیات کو دیکھ رہا تھا۔
 ”کہہ تو رہا ہوں تم لوگ اپنی مرضی سے اپنی زندگی گزارو، اپنے وعدے سے تھوڑی مکرہوں میں، وہ تو یہ پھٹا
 پڑ گیا ورنہ اب تک شمر حیات اپنا کام شروع کر چکا ہوتا۔“

”نہیں سمجھاناں خان بابا..... اگر یہ سکے ہوتے تو آپ کبھی نہ چاہتے کہ یہ بڑے ہو کر اسمگلر یا غنڈے بنیں۔
 لیکن یہ سکے نہیں ہیں نا تو اب یہ اسمگلر اور غنڈے ہی بنیں گے۔“

”اوائے ہوئے حیاتے دیکھ میں نے کچھ ایسا کہہ لیا کہہ تو رہا ہوں..... کہ تم لوگ.....“
 ”لیکن ہم آپ کے بغیر نئی زندگی شروع نہیں کریں گے۔“ فرجی نے اس کی بات کاٹی تھی۔
 ”بھلے شمر حیات سرحد پر گولی کا نشانہ بن جائے..... عمر بھر کے لیے جیل میں چلا جائے..... ریحان اور روحان
 اسمگلر، ڈاکو کچھ بھی بن جائیں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی..... آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں مچلے تھے۔

”اچھا خان بابا خدا حافظ.....“

جلیل خان ساکت کھڑا تھا۔ اور وہ اب..... زارو قطار رو رہی تھی۔

”نہ رو..... بس کرو اب، ٹھیک ہے رہا ہو کرو ہی کروں گا جو تم کہو گی، باہر تو آ جاؤں.....“ جلیل خان جیسے...
 بے بس ہو کر بولا تھا۔

”لیکن یہ سب اتنی جلدی نہیں ہو سکے گا ہمارے ہاں زبان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کڑیے.....“ (لڑکی)
 ”تو شمر آپ کے رہا ہونے تک آپ کے گھر پر ہی رکھیں گے؟“ فرجی آنسو پونچھ کر اب پھر آئندہ کے پروگرام
 بنانے لگی تھی، وہ خاموش کھڑا تھا۔ جلیل خان اور فرجی کے درمیان وعدے ہو رہے تھے، پیمانے کیے جا رہے
 تھے..... پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسا تھا۔

”سیانے صحیح کہتے ہیں حیاتے، عورت کے آنسوؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے..... سلطنتیں الٹ دیتے ہیں یہ
 آنسو.....“ وہ ہولے سے ہنسا تھا اور جھپٹ کر بچوں کو اٹھایا تھا، چوما تھا، گدگدایا تھا اور اس کی شیو کے بالوں نے
 انہیں پھر مڑ لادیا تھا اور اسے اپنے سینے سے بوجھ سرکتا ہوا سا محسوس ہوا تھا۔ اس نے ممنون نظروں سے فرجی کو دیکھا
 تھا..... وہ احسان فراموش نہیں کہلوانا چاہتا تھا اور فرجی نے ناممکن کو ممکن کر دیا تھا۔

”دو چار روز تک ایک ملاقات کا پھر بندوبست کرنا شمر حیات بہت سے معاملات سمجھانے اور سمجھنے والے
 ہیں۔ اور ہاں ایبٹ آباد میں ایک اچھا سا گھر ضرور دیکھ لینا۔“ رخصت ہوتے ہوئے جلیل خان ہنسا تھا۔

”آپ رہا ہو کر آ جائیں تو ہم گھر بھی دیکھ لیں گے خان بابا.....“ فرجی کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اور لبوں پر
 مسکراہٹ تھی۔ اس روز اس پر فرجی کی اس خوبی کا پہلی بار ادراک ہوا تھا کہ وہ اپنی بات منوانے کی طاقت رکھتی ہے۔
 شاید ہر عورت میں یہ طاقت ہوتی ہے یہ الگ بات ہے کہ ہر عورت اپنی بات نہیں منواتی۔

اس روز وہ فرجی کو چھوڑ کر واپس لاہور آیا تو بہت مطمئن تھا جلیل خان جب سے جیل گیا تھا یہ پہلی رات تھی کہ وہ
 بہت پرسکون اور گہری نیند سویا تھا۔

اسے جلیل خان کے رہا ہونے تک سب کام سنبھالنے تھے اور پھر جلیل خان کے رہا ہوتے ہی انہیں یہاں سے
 چلے جانا تھا۔ فرجی نے آتے ہوئے کہا تھا۔

”خان بابا کے رہا ہونے سے کچھ پہلے ہی تم ایبٹ آباد میں گھر خرید لینا اور باقی سب بھی طے کر لینا۔“ فرجی کی
 ہدایت پر وہ مسکرایا تھا اور سر خم کیا تھا۔

”او کے میم.....“
ابھی تاریکی تھی لیکن دور روشنی کی ایک کرن چمک رہی تھی..... ایک گھر، بچے، فرجی اور ہرٹینشن سے ہلاک
میر سکون زندگی..... ساری رات وہ خواب دیکھتا رہا تھا صبح اس کی آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے ہی کھلی
تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا سامنے کلاک پر نظر پڑی تو دس بج رہے تھے۔
وہ تیزی سے بیڈ سے اتر اٹھا..... دروازے پر شیر خان تھا۔

”ایک خاتون آئی ہے، دادا سے ملنے کو کہتی ہے میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔“
اس کا ذہن فوراً بیگم عبدالغفور کی طرف گیا تھا اگرچہ اس نے دلدار کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ ان کی خیر خبر لیتا رہے
اور کوئی پرابلم ہو تو اسے بتائے..... وہ جلدی سے تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ سیاہ ریشمی برقع کا نقاب پیچھے
کیے وہ بالکل سامنے ہی بیٹھی تھی اس کا رنگ بہت گورا تھا۔ گول چہرہ، موٹے، موٹے ہونٹ، بڑی، بڑی آنکھیں عمر
اندازاً چالیس، پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوگی وہ بیگم عبدالغفور نہیں تھی پھر کون تھی۔ سوچتے ہوئے اس نے سلام
کیا تھا۔

”مجھے خان دادا سے ملنا ہے۔“ سلام کا جواب دے کر اس نے کہا تھا۔
”دادا تو ملک سے باہر ہیں۔“ خاتون کے چہرے پر مایوسی نظر آنے لگی تھی۔
”آپ کو جو بھی مسئلہ ہے مجھے بتائیں، میں یہاں دادا کی جگہ پر اسی لیے بیٹھا ہوں کہ ان کے حصے کے کام
نہاؤں.....“ خاتون نے پہلی بار غور سے اسے دیکھا تھا۔
”ہم ایک بڑی مصیبت میں پڑ گئے ہیں اور صرف خان دادا ہی ہمیں اس مصیبت سے نکال سکتے ہیں۔“
”آپ بتائیں تو خاتون کیا مسئلہ ہے؟“ وہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا تھا۔ ”پھر مسئلے کا حل بھی نکال
لیں گے۔“

”میں..... شاہجہان ہوں، شاہجہان بیگم..... شاہی محلے میں میرا چو بارہ سب سے بڑا ہے۔“
ٹرن ٹرن فون کی بیل مسلسل ہو رہی تھی۔ اس نے یک دم چونک کر پاس پڑا اپنا سیل اٹھایا۔ اسکرین پر ممتاز
خان کا نام چمک رہا تھا۔
”ہاں ممتاز..... کیا بات ہے کہو.....“ اس نے سر جھٹک کر فون آن کیا..... ذہن ابھی تک ماضی کی بھول
بھلیوں میں الجھا ہوا تھا۔

”عظام صاحب آئے تھے کل.....“
”کیوں، کیا کہہ رہا تھا؟“ وہ یک دم الرٹ ہوا تھا۔
”آپ کا پوچھ رہے تھے کہ کہاں ہیں..... کب آئیں گے؟“
”ادا اس ہو گیا ہوگا۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔
”کچھ پریشان سے بھی لگتے تھے۔“
”اوہ.....“ وہ مضطرب سا ہو گیا تھا۔
”کیا..... کچھ کہا تھا، تمہیں کیسے لگا کہ وہ پریشان ہے؟“
”کہہ رہے تھے کہ اگر آپ کا فون آئے تو پیغام دے دوں کہ آپ انہیں فون کر لیں..... بہت ضروری بات
کرنی ہے انہیں۔“

”اچھا ایسا کہا اس نے؟“ اس کے اضطراب میں اضافہ ہوا تھا۔

”آج رات بگ با سے بات کر کے میں کل صبح کسی وقت گھر آ جاؤں گا۔“ فون بند کر کے اس نے پھر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن اب وہ عظام کے متعلق سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

ایمل دونوں ہاتھ گود میں رکھے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی تھی۔

”نہیں، یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔

”ضرور ہمدانی صاحب کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ ہمدانی صاحب اپنے کسی کام کے سلسلے میں کراچی آئے ہوئے تھے اور انہیں کچھ کاغذات پر ایمل کے دستخط بھی کروانے تھے۔ ایمل کو فون کرنے کے بعد وہ گھر آئے تھے۔ بابر آفس چلا چکا تھا جس پر ہمدانی صاحب نے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

”یہ اچھی بات ہے کہ بابر صاحب اس وقت گھر پر نہیں ہیں، ہم اطمینان اور سکون سے بات کر سکیں گے۔“ وہ ہمدانی صاحب کی بات پر حیران تو ہوئی تھی لیکن اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا..... اور ان کاغذات کے متعلق دریافت کرنے لگی تھی جس پر اس نے دستخط کرنے تھے۔

”ہم بہت جلد لاہور شفٹ ہو جائیں گے اور میرا خیال ہے کہ میں بابر کو اتھارٹی لیٹر دے دوں..... وہ میرے مقابلے میں بزنس کے معاملات کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔“

”ایسا غضب مت کرنا بیٹی.....“ ہمدانی صاحب کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”کیوں.....؟“

”دراصل کرل صاحب کو بابر پر ٹرسٹ نہیں تھا اس لیے انہوں نے میجر طاہر کو تمام معاملات کا نگران بنا دیا تھا۔ بابر نے آپ کو بتایا ہوگا بیٹی.....“

”نہیں تو انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اور پھر تو آپ کو کرل صاحب کی وصیت کے متعلق بھی کچھ علم نہیں ہوگا؟“

”جی..... لیکن مئی سے کل بھی بات ہوئی تھی انہوں نے بتایا تھا کہ وکیل صاحب ابھی واپس نہیں آئے۔“

”وہ تو ابھی نہیں آئے لیکن بابر صاحب کے اصرار پر میں نے انہیں بتایا تھا لیکن شاید انہوں نے آپ سے ذکر نہیں کیا۔“

اس نے صرف اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”کرل صاحب کی تمام پراپرٹی وغیرہ کا آپ اور بیگم صاحبہ کے سوا اور کوئی وارث نہیں..... تاہم کچھ پراپرٹی کرل صاحب نے ایک ٹرسٹ کے نام کی ہے اور کچھ ارتفاع بیٹی کے نام.....“

”ارنی کے نام؟“ اسے حیرت ہوئی تھی۔

”آپ کے بعد ظاہر ہے آپ کی جائداد کے وارث آپ کے بچے اور شوہر ہی ہوں گے لیکن شاید کرل صاحب کو ارتفاع کے معاملے میں بابر پر بھروسہ نہیں تھا۔“

”ارے نہیں ہمدانی صاحب ڈیڈی کو اس سلسلے میں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ بابر تو مجھ سے زیادہ ارتفاع کو چاہتے ہیں۔“ اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

”ہو سکتا ہے۔“ ہمدانی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”اور بابر.....؟“ اسے یک دم خیال آیا تھا۔

”بابر کو بھی تو مئی، ڈیڈی نے بیٹا بتایا ہوا تھا۔ وہ بھی تو وارث.....“

READING
Section

38 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

”نہیں ایمل بیٹی، وارثت میں اس کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”کیا مئی کو پتا ہے کہ باہر.....؟“

”یقیناً علم ہوگا اور نہیں بھی ہوگا تو ایک ہفتے تک وکیل صاحب انشاء اللہ واپس آ جائیں گے۔ مکمل تفصیل کا علم تو انہیں ہی ہے۔“ وہ ہمدانی صاحب کو گیٹ تک چھوڑ کر واپس آئی تو لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی تھی۔ آخر ڈیڈی کو باہر پر ٹرسٹ کیوں نہیں تھا..... حالانکہ ڈیڈی تو پہلے یہی چاہتے تھے کہ باہر ان کا سارا بزنس سنبھال لیں۔ یہ تو باہر نے خود ہی منع کر دیا تھا۔ ہمدانی صاحب یقیناً مخلص آدمی ہیں لیکن باہر کے متعلق ان کی رائے صحیح نہیں تھی۔ باہر کے ساتھ گزری زندگی کا ہر لمحہ اس کے سامنے تھا۔

”مجھے مئی سے بات کرنی چاہیے۔“ اس نے اٹھ کر لاہور کا نمبر ملا یا۔

فون ملازمہ نے اٹینڈ کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور کچھ دیر پہلے ہی وہ میجر طاہر اور ان کی بیگم کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف گئی ہیں۔

”کیا مئی کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔

”پتا نہیں..... شاید بی بی ہائی ہو گیا تھا۔“

”ٹھیک ہے جیسے ہی مئی آئیں تم ان سے میری بات کروادینا۔“ تب ہی باہر باہر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور پھر گیٹ کھلنے کی آواز آئی.....

”یہ باہر آج جلدی کیوں واپس آ گئے ہیں۔“ اس نے سوچا اور ریسیور رکھ کر مڑی ہی تھی کہ بیل ہونے لگی تھی..... اس نے مڑ کر ریسیور اٹھالیا۔

”ہیلو جی کون.....؟“

”مجھے مسز باہر سے بات کرنی ہے۔“ دوسری طرف کوئی خاتون تھیں۔

”جی میں مسز باہر ہی بات کر رہی ہوں..... آپ کون.....؟“

”میں..... میں عنبرین ہوں.....“

”کون عنبرین.....“ اس نے پوچھا اور اندر آتے باہر نے عنبرین کا نام سنا تو تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا..... باہر اس کے پیچھے ریسیور کان سے لگائے کھڑا تھا۔ دوسری طرف عنبرین کہہ رہی تھی۔

”مسز باہر مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”میں باہر نوید بات کر رہا ہوں میڈم، آپ کو جو بات مسز باہر سے کرنی ہے مجھ سے کر لیں۔“ باہر نے عنبرین کی آواز پہچان لی تھی اور دل ہی دل میں بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ عنبرین نے اس کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ عنبرین نے ایمل سے کیا بات کرنے کے لیے فون کیا..... اور پھر اس کو یہاں گھر کا نمبر کہاں سے ملا..... اس نے دو تین بار ہیلو ہیلو کہا اور پھر ریسیور کریڈل پر ڈال کر ایمل کی طرف مڑا اور انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

”یہ عنبرین کون ہے، تمہاری کوئی دوست؟“

ایمل نے جو باہر کے اس طرح پیچھے سے آ کر ریسیور پکڑنے پر حیران سی کھڑی تھی چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے نہیں معلوم کون ہے..... ابھی تو اس نے صرف نام ہی بتایا تھا، تعارف نہیں کروایا تھا اور اس نام کی کسی لڑکی کو میں نہیں جانتی۔“



”دیکھو..... ایمل.....“ اندر ہی اندر عنبرین کی اس جرات پر کھولتے ہوئے اس نے ایمل کو سمجھایا۔ ”آئندہ کسی اجنبی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں، چاہے وہ کوئی مرد ہو یا کوئی عورت، آج کل لوگ بہت فراڈی ہو گئے ہیں۔ ڈائریکٹری سے نمبر دیکھ کر کسی گھر میں فون کرتے ہیں اور گھریلو عورتوں کو خاص کر اپنی چکنی چپڑی باتوں سے پھنسا لیتے ہیں۔ کبھی کسی انعامی اسکیم کا لالچ دے کر اور کبھی کچھ کہہ کر گھروں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ مال و دولت تو جاتی ہے عزت جانے کا بھی..... خطرہ ہوتا ہے۔“

وہ نہیں چاہتا تھا کہ عنبرین اگر پھر فون کر لے تو اس کی ایمل سے بات ہو، اب نہ جانے اس نے اتنے سالوں بعد کس مقصد سے فون کیا تھا۔

”ایسے کئی کیسز ہو چکے ہیں کہ پہلے ایک خاتون گھر کے اندر آئی اور پھر اس نے دوسرے ساتھیوں کو بھی بلا لیا اور لوٹ کر چلتے بنے..... بعض اوقات جان بھی چلی جاتی ہے اور عزت بھی.....“ اس نے اپنی بات کو پورا اثر بنانے کے لیے مزید کہا۔ اس میں کسی حد تک حقیقت بھی تھی۔ ایسی باتیں سننے میں آرہی تھیں۔

ایمل نے اثبات میں سر ہلادیا، وہ اس وقت اس اجنبی لڑکی کی کال کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی۔ اس نے بابر کی بات سن تو لی تھی لیکن اس کا ذہن ممی کی بیماری میں الجھا ہوا تھا۔ ضرور ممی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگی تب ہی تو میجر طاہر اور ان کی بیگم ممی کو لے کر اسپتال گئے ہیں۔ ورنہ چھوٹی موٹی تکلیف میں تو ممی خود ہی ڈاکٹر زیادہ سے فون پر ڈسکس کر لیتی تھیں۔ ضروری ہوتا تو ڈاکٹر زیادہ گھر بھی آجاتے تھے۔ اس کے بچپن سے ہی ڈاکٹر زیادہ گھر آرہے تھے۔ ممی بھی اب ڈیڈی کی طرح اس سے اپنی تکلیف چھپانے لگی تھیں۔

”کیا بات ہے، تم کچھ پریشان ہو پئے بابر۔ بند اسے بغور دیکھ رہا تھا۔“

”ہاں.....“ اس نے چونک کر بابر کی طرف دیکھا۔ ”ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا لاہور بات ہوئی؟“

”ہاں، میں نے ابھی لاہور ہی فون کیا تھا۔ ممی سے بات نہیں ہو سکی۔ میجر طاہر اور ان کی مسز انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے ہوئے تھے۔ رات ممی سے اتنی دیر بات ہوئی لیکن انہوں نے ذکر تک نہیں کیا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔“ وہ پریشان سی وہاں ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”یہ میجر طاہر..... who is he“ بابر نے بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔ ”مجھے سمجھ نہیں آتی کہ آخر ہمارے گھریلو معاملات میں اس کا اتنا عمل دخل کیوں ہے۔ اگر ممی کی طبیعت اتنی خراب تھی تو انہیں یہاں فون کرنا چاہیے تھا ہمیں..... نہ کہ میجر طاہر کو لیکن بھلا وہ ہمیں کیوں فون کریں گی۔ ہم ان کے کیا لگتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز در آیا تھا۔

”بابر.....“ ایمل کو اس کا یہ طنز یہ انداز اچھا نہیں لگا۔

”ہم یہاں ہیں کراچی میں اور کیا وہ ہمیں فون کرتیں کہ ہم انہیں اسپتال لے جائیں؟“

”تو.....“ بابر نے بھویں اچکائیں۔ ”کون سا ہمیں پیدل چل کر جانا تھا پہنچ جاتے دو تین گھنٹے تک۔“ بابر پتا

نہیں کیوں اتنا چڑچڑا ہوا رہا تھا۔

”انکل مجیب ڈیڈی کے بہت اچھے دوست ہیں۔ آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ہمیشہ سے ہی ان کے خاندان سے ہمارے فیملی ٹرمز بہت اچھے رہے ہیں۔ میجر طاہر پر ڈیڈی کو بہت ٹرسٹ تھا۔ میرے بچپن میں اکثر ڈیڈی طاہر بھائی کو گھر لے آتے تھے پھر ڈیڈی نے تو آرمی کی جاب چھوڑ دی تھی لیکن انکل آرمی میں ہی تھے اور ان کی پوسٹنگ مختلف علاقوں میں ہوتی رہی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ آپ کے آنے کے بعد بہت کم طاہر بھائی ہمارے گھر آئے۔“

انہیں کمیشن مل گیا تھا پھر ان کی بھی مختلف جگہوں پر پوسٹنگ ہوتی رہی لیکن انکل مجیب کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں..... ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے لاہور میں ہی رہائش اختیار کر لی تھی..... ہم جن دنوں کراچی شفٹ ہوئے تھے طاہر بھائی کو بھی آری چھوڑنا پڑی..... ایک حادثے میں وہ زخمی ہو گئے تھے۔ ایک سال بیڈ پر رہے انہیں چلنے میں پرابلم بھی رہا اس لیے مجبوراً آری چھوڑ دی۔“ ایمیل نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے ساری تفصیل بتائی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

”جانتا ہوں سب۔“ بابر کے لہجے میں بیزاری تھی۔

”ڈیڈی کی بیماری کے دنوں میں انکل اور طاہر بھائی نے بہت خیال رکھا..... ہر وقت ان کے ساتھ رہے اور بہت محبت کرتے تھے ڈیڈی ان سے۔“

”تمہارے ڈیڈی.....“ بابر اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ ”انہیں خدا جانے ان کرنل مجیب اور میجر طاہر میں ایسی کیا خوبی نظر آگئی تھی کہ انہوں نے آخری وقت تک نہ تو ہمیں اپنی بیماری سے آگاہ کیا اور نہ ہی دوسرے معاملات کے متعلق کچھ بتایا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارے ڈیڈی.....؟“ ایمیل نے اس کی باقی بات پر غور نہیں کیا تھا۔ ”کیا وہ آپ کے ڈیڈی نہیں تھے؟“

”میں تو ایسا ہی سمجھتا تھا لیکن.....“ اس نے یک دم اپنا لہجہ نرم کیا۔ ”وہ صرف تمہارے ڈیڈی تھے، تمہیں جلد ہی پتا چل جائے گا۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔“ وہ جو ابھی تک کھڑا تھا ایمیل کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”مجھے یہ میجر طاہر صحیح بندہ نہیں لگتا، مجھے ڈر ہے کہ یہ کہیں تم لوگوں کو کوئی بڑا دھوکا نہ دے جائے۔“

”لیکن میجر طاہر بھلا ہمیں کیا دھوکا دیں گے؟“ ایمیل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

ماہ اکتوبر کی بدلتی رتیں
جاسوسی کے شمارے کی نگہتیں

ڈائجسٹ
ماہنامہ جاسوسی

انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کا ہولناک قتل عام سسپنس
سے بھر پور شاہکار **امجد رئیس** کا انصاف

شریف آدمی کو بدعاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عسکر کی یکجائی
جنم لینے والا ہولناک سلسلہ **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے

چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تنہا مسافر کی آبلہ پائی...
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

سرورق کی کہانیاں
ہمارے معاشرے کے وہ کردار جو بلند ہونے کے باوجود
پسپائی کا درجہ رکھتے تھے..... **منظر امام** کی کیشلی تحریر

آج نہیں تو کل ہر شخص کا حساب بے باق ہونا ہے.....
کاشف زبیر کی اس حوالے سے یادگار تحریر

ایبولا

انگارے

آوارہ گرد

بڑا کام

یوم حساب



آپ کے تہرے...
مشورے... محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

”اب یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ تمہارے ڈیڈی نے اسے کہاں تک اختیار دیے ہیں۔ یہ تو ہمدانی صاحب کو پتا ہوگا یا می کو..... لیکن جس طرح وہ تمہارے ڈیڈی کے آفس میں بیٹھا ہوتا ہے اس سے تو لگتا ہے کہ اس کے پاس ضرورت سے زیادہ ہی اختیار ہیں۔“

”کیا آپ کی ملاقات ہوئی طاہر بھائی سے..... آپ گئے تھے آفس؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں..... میں نے سنا ہے۔“

”آپ کو یقیناً طاہر بھائی کے متعلق کچھ غلط فہمی ہوئی ہے..... انکل مجیب اور طاہر بھائی سب ہمارے ساتھ بہت مخلص ہیں۔ وہ کبھی ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“

اس کے لہجے میں یقین تھا۔

”یہ تو وقت آنے پر ہی پتا چلے گا کہ کون کتنا مخلص ہے۔“ بابر کے چہرے پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

”یہاں ہر دوسرے شخص نے چہرے پر نقاب لگا رکھا ہے۔ جس کے پیچھے اصل چہرہ چھپ جاتا ہے اور تمہارے ڈیڈی کو معاف کرنا آدمیوں کی پہچان ہرگز نہیں تھی..... اگر انہیں پہچان ہوتی تو وہ تمہارے لیے مدثر حسن جیسے شخص کا انتخاب ہرگز نہیں کرتے۔ وہ تو خیر خود ہی بے نقاب ہو گیا اتفاقاً ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔“ وہ پھر کھڑا ہو گیا تھا۔

”تم اپنے وکیل سے بات کر کے اس میجر طاہر اور انکل مجیب سے جان چھڑاؤ فوراً اور سارا کام کسی بھروسے والے شخص کے سپرد کرو۔“ وہ بات کر کے رکنا نہیں تھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ایمل ہاتھ گود میں دھرے

ساکت بیٹھی تھی۔ مدثر کے متعلق بابر نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا۔ اس کے معاملے میں ڈیڈی ضرور دھوکا کھا گئے تھے لیکن نہیں..... اس میں بھلا ڈیڈی کا کیا قصور تھا۔ مدثر ان کا انتخاب کب تھا۔ مدثر کے لیے تو وہ خود پاگل ہوئی تھی اور

ڈیڈی اس کے آنسو برداشت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ اس سے بے حد محبت کرتے تھے اور مدثر..... اس نے کیا، کیا تھا اس کے ساتھ..... ہم لڑکیاں بھی کتنی پاگل ہوتی ہیں کوئی محبت کے محض دو لفظ بول دے تو دل و جان سے اس پر

ایمان لے آتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی نہیں..... سب رشتے سارے تعلق اس ایک نئے رشتے کے سامنے بے معنی لگنے لگتے ہیں..... وہ بھی تو مدثر کی محبت کے سحر میں گم سمجھتی تھی کہ اس کے لیے مدثر سے بڑھ

کر کوئی نہیں..... اور اگر مدثر کا ساتھ نہ ملا تو وہ جی نہیں پائے گی۔ کتنا یقین تھا اسے مدثر پر اس کی محبت پر اور کس بری طرح ٹوٹا تھا اس کا یقین..... وہ مدثر کو دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ می، ڈیڈی،

مدثر کے بابا جان سب نے ہی اسے سمجھایا تھا لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ مدثر کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ اسے صرف طلاق چاہیے تھی اور اگر مدثر نے طلاق نہ دی تو وہ خلع لے لے گی لیکن اس روز جب بابا جان

نے اسے آنے والے بچوں کا واسطہ دیا، سمجھوتا کرنے کی درخواست کی..... ان بچوں کی خاطر جو ابھی دنیا میں نہیں آئے تھے تو وہ ہارنے لگی تھی۔ اسے مدثر کے بابا جان سے کبھی کوئی گلہ نہیں رہا تھا۔ وہ بہت محبت کرنے والے بہت

نقیس انسان تھے۔ جتنا وقت اس نے مدثر کے گھر گزارا تھا انہوں نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ تھکے ہارے نڈھال سے بابا جان اس کی منت کر رہے تھے، ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

”ایک بار صرف ایک بار ان بچوں کے متعلق سوچ لو جو ابھی اس دنیا میں نہیں آئے۔ کیا انہیں باپ کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ کیا بڑے ہو کر وہ تم سے باپ کے متعلق سوال نہیں کریں گے اور اگر وہ باپ کے پاس رہے تو کیا

وہ ماں کے لیے نہیں ترسیں گے؟“

”نہیں، میں اپنے بچوں کو مدثر کے حوالے نہیں کروں گی۔“ وہ تڑپ اٹھی تھی۔

”نہیں، میں اپنے بچوں کو مدثر کے حوالے نہیں کروں گی۔“ وہ تڑپ اٹھی تھی۔

”مدثر اتنا ظالم نہیں ہے بیٹا کہ وہ ایک ماں سے اس کے بچے جدا کر دے اور پھر ماں بھی وہ جسے اس نے اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع جانا..... وہ تمہارے دل کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا بھلے اس کا اپنا دل خاک ہو جائے۔ بیٹی تم نے مدثر کو سمجھا ہی نہیں۔“ وہ دکھی تھے۔

”بابا جان.....!“ اس نے بے حد شاک کی نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔
 ”آپ پلیز مدثر کے متعلق کوئی بات نہیں کریں۔ آپ باپ ہیں، آپ کبھی مدثر کو غلط نہیں سمجھیں گے۔“
 ”سوری..... بیٹا! میں یہاں مدثر کی صفائی پیش کرنے نہیں آیا کیونکہ میں جانتا ہوں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بعض اوقات بدگمانی کے نقش اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ کوئی بھی دلیل، کوئی بھی کوشش اس نقش کو مٹا نہیں سکتی۔ وقت شاید کبھی خود ہی فیصلہ کر دے۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لی تھی اور قدرے توقف کے بعد پھر کہا تھا۔
 ”میں ان بایوں میں سے نہیں ہوں بیٹا جو اولاد کی غلطیوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ مجھے اگر یقین ہوتا کہ مدثر غلط ہے اور وہ سب کچھ صحیح ہے جو تم نے کہا ہے تو میں اس کے بجائے تمہارے ساتھ کھڑا ہوتا لیکن اس وقت مجھے مدثر کے لیے کچھ نہیں کہنا..... اور نہ میں اس کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں صرف تمہارے اور اس کے بچوں کے لیے آیا ہوں، جن کے لیے ہم سب نے مل کر خواب دیکھے ہیں۔ ایک بار صرف ایک بار تم ان کے متعلق سوچ لو۔ میں جانتا ہوں تم انہیں زندگی کی ہر نعمت دے سکتی ہو لیکن کیا تم انہیں ان کا باپ اور اس کی محبت و شفقت بھی دے سکتی ہو؟ ان کو باپ کی محبت سے محروم مت کرو بیٹی۔“

اور تب کتنے کرب اور اذیت سے گزر کر اس نے بچوں کی خاطر سمجھوتا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مدثر کے ساتھ..... اب وہ کیسے رہے گی..... لیکن اسے رہنا تھا۔ بچوں کی خاطر..... بابا جان کی باتوں نے اس کے اندر بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا تھا وہ صحیح ہی تو کہہ رہے تھے کہ وہ دنیا کی ہر نعمت ان کے سامنے ڈھیر کر دے لیکن انہیں ان کا باپ نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے بابا جان سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ بچوں کی خاطر یہ زہر پینے کے لیے تیار ہے۔ وہ اب زندگی بھر مدثر کی محبت پر اعتبار نہیں کر سکتی لیکن وہ گھر واپس آ جائے گی صرف بچوں کے لیے لیکن اسے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ بابا جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
 ”شکر یہ بیٹے!“ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

ان کی آنکھوں کے آنسو..... ان کا وہ نڈھال سا شکستہ وجود اسے بے چین کر گیا تھا..... انہوں نے آج مدثر کی صفائی میں کچھ نہیں کہا تھا نہ ہی اس کی وکالت کی تھی۔ ان کے جانے کے بعد وہ مٹی کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ مٹی نے اس کے فیصلے کو سہا ہا تھا۔

”تم نے سچ فیصلہ کیا ہے، مزد کا کیا ہے وہ سو غلطیاں بھی کر لے تو عورت کو اپنی اولاد کی خاطر اپنا گھر بچانے کے لیے معاف کرنا ہی پڑتا ہے۔ مدثر تو بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ ایسا تو نہیں تھا۔“

”ہاں، وہ ایسا تو نہیں تھا۔“ اس روز بہت دنوں بعد اس نے سوچا تھا، پھر اس نے ایسا کیوں کیا..... کیا وہ لڑکی مجھ سے بہتر تھی یا ہو سکتا ہے وہ مجھ سے پہلے ہی اس لڑکی سے محبت کرتا ہو..... اور اس نے مجھ سے محبت کی ہی نہیں تھی۔ با بر سچ ہی کہتا ہے کہ اس نے صرف دولت کی خاطر مجھ سے شادی کی تھی..... اس کی محبت جھوٹی تھی۔ اس نے محبت کا ڈراما رچایا تھا لیکن کیا جھوٹ میں بھی اتنا اثر ہوتا ہے۔“ وہ تو مدثر کے محبت بھرے لفظوں کی اسیر تھی۔ اس کی وہ محبت لپٹاتی نظریں..... وہ شدتیں..... واٹکیاں اسے کبھی نہیں لگا تھا کہ وہ سب ایک جھوٹ ہے..... ڈراما ہے، وہ کتنی وارثی سے اسے تکتا تھا۔ کیسے اس کی ذرا، ذرا سی بات کا خیال رکھتا تھا۔

اور کیا خبر مدثر نے سچ ہی کہا ہو کہ وہ لڑکی اس کے لیے انجان ہی ہو..... اور اس سے مدد حاصل کرنے کے لیے

ہی ملی ہو..... اس روز پہلی بار اس نے سوچا لیکن پھر خود ہی اپنی سوچ رد کر دی تھی۔
 ”نہیں، یہ صرف ایک روز کی بات تو نہیں تھی۔ پابر نے پہلے بھی کتنی ہی بار اسے اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا
 لیکن وہ تو بالکل ہی مگر گیا اور اگر نہ مکرنا تو شاید میں خود کو تسلی دے لیتی کہ اس کے ساتھ کوئی کوئی دوست ہوگی
 لیکن.....“ سوچتے، سوچتے وہ گھبرا کر کمرے سے لاؤنج میں آگئی تھی۔ بابر لاؤنج میں اکیلا بیٹھائی وی دیکھ رہا تھا۔
 ”پتا نہیں، میں نے صحیح کیا ہے یا غلط.....“ اپنے فیصلے کے متعلق بتاتے ہوئے اس نے بابر سے پوچھا تھا۔ وہ
 بابر سے کبھی بے تکلف نہیں رہی تھی۔ کبھی ان کے درمیان فالتو بات نہیں ہوئی تھی شادی سے پہلے بہت رسمی سی بات
 ہوتی تھی لیکن آج کل ان میں مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ جب سے بابر نے مدثر کے حوالے سے
 بات کرنا شروع کی تھی، ان کے درمیان سے تکلف کی دیوار گر گئی تھی۔ بابر اکثر اس کے پاس آ کر اس کی دلجوئی کرتا
 رہتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے بابر سے پوچھا تھا اور وہ بے حد حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”تم نے مدثر کے گھر واپس جانے کا فیصلہ کر لیا؟“
 ”ہوں.....“ اس نے سر ہلایا تھا۔

”ڈیڈی اور می کا بھی یہی خیال ہے کہ مجھے بچوں کی خاطر واپس چلے جانا چاہیے۔“
 ”لیکن وہ شخص ہرگز بھی تمہارے جیسی شفاف، پاکیزہ دل رکھنے والی لڑکی کے قابل نہیں ہے۔“ بابر بے حد
 مضطرب لگ رہا تھا۔

”می کہتی ہیں طلاق یافتہ عورت کو معاشرے میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بھلے وہ بے قصور ہی کیوں نہ
 ہو۔ طلاق یافتہ عورت کے بچوں کو بہت سزا کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر بڑے ہو کر وہ کیا سوچیں گے کہ ان کی ماں نے ان
 کے باپ سے طلاق لے لی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے ہی قصور وار سمجھیں۔“ وہ بے حد افسردہ تھی۔
 ”کیا ضرورت ہے ایمل کہ بچوں کو بتایا جائے کہ ان کی ماں نے طلاق لے لی تھی۔ یہ بات ان سے چھپائی
 بھی تو جاسکتی ہے۔“

”کب تک؟ جب وہ بڑے ہوں گے تو انہیں پتا چل ہی جائے گا۔ ایسی باتیں بھلا کہاں اور کب تک چھپ
 سکتی ہیں۔“

”کوئی دوسرا شخص بچوں کو یہ احساس دلانے بغیر کہ وہ اس کے بچے نہیں ہیں انہیں باپ کا پیار دے سکتا ہے۔
 تم اگر کسی ایسے انسان سے شادی کر لو تو.....“ بابر کی نظریں اسی پر تھیں۔

”ایسا شخص..... کون ہوگا بھلا.....؟“ وہ بے حد دلگرفتہ تھی۔ ”کوئی بھی شخص دوسروں کی اولاد کو اپنا نہیں سمجھ
 سکتا..... اور پھر اگر میں مدثر سے طلاق لے بھی لیتی تو میرا ارادہ دوبارہ شادی کرنے کا نہیں تھا۔“

”زندگی تنہا نہیں گزر سکتی ایمل.....“ بابر کا انداز سمجھانے والا تھا۔ ”دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے..... ہر
 شخص مدثر نہیں ہوتا..... تم اپنے ارد گرد نظر ڈالو تو شاید تمہیں محسوس ہو جائے کہ کوئی ہے جو تمہارے بچوں کو باپ کی کمی
 محسوس نہیں ہونے دے گا۔“

لیکن اس نے بابر کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا اور اسے ڈیڈی کے متعلق بتانے لگی تھی۔
 ”ڈیڈی کہتے ہیں ہو سکتا ہے وہ سب سچ ہو جو مدثر نے کہا ہے۔ ہمیں کوئی غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے اور مجھے ضرور
 اسے ایک چانس دینا چاہیے۔“

”غلط فہمی.....؟“ بابر کا رنگ سرخ ہوا تھا۔
 ”تم نے خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ایمل، پھر بھی تم اسے غلط فہمی کہہ رہی ہو؟“ پتا نہیں کیوں بابر کو غصہ

آ گیا تھا۔ ”اگر وہ اتنا ہی سچا ہے تو اب تک اپنا سچ ثابت کرنے کے لیے اس لڑکی کو لے کر کیوں نہیں آیا یہاں.....“

بابر نے کہا تھا۔

”یہ تو ہے لیکن کبھی، کبھی بصارتیں دھوکا بھی تو کھا جاتی ہیں۔ انسان جو کچھ دیکھتا ہے وہ اصل حقیقت نہیں ہوتی۔“ بالکل غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے مدثر کے کہے الفاظ نکلے تھے۔

”تم احمق ہو۔ ایمیل..... بھلا اس طرح آنکھوں دیکھی کبھی کون نگل سکتا ہے۔“ بابر جھنجھلا یا تھا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں بابر بھائی لیکن کبھی، کبھی انسان مجبور ہو جاتا ہے، میں بھی اپنے بچوں کی خاطر یہ مکھی نکلنے پر مجبور ہوں، میں نے بابا جان سے کہہ دیا تھا کہ میں چند دنوں تک گھر آ جاؤں گی لیکن مدثر.....“

”لیکن تم یہ کیسے کر سکتی ہو ایمیل۔“ بابر نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”تم ایک سچی اور کھری لڑکی ہو، تم کیسے ایک دغا باز جھوٹے اور فریبی مرد کے ساتھ رہ سکتی ہو۔“

”ہاں، یہ آسان نہیں ہوگا۔“ اس نے بے بسی سے بابر کی طرف دیکھا تھا۔

”لیکن میں نے اسے اپنے بچوں کی خاطر معاف کر دیا ہے۔ عورت کو اولاد کی خاطر سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے بابر بھائی اور میری بھی مجبوری ہے کہ وہ میرے ہونے والے بچوں کا باپ ہے۔“

”تمہاری کوئی مجبوری نہیں ہے ایمیل.....“ بابر نے اسے سمجھایا تھا۔ ”عورت وہاں مجبور ہوتی ہے جہاں اسے معاشی پر ابلمز کا سامنا ہو..... تمہیں اور تمہارے بچوں کو ایسا کوئی پر ابلمز نہیں ہے۔“

”بابر بھائی بات صرف مالی آسودگی کی ہی تو نہیں ہوتی۔ بڑی سے بڑی دولت بھی باپ کی شفقت و محبت کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔“ بابا جان کی بات دہراتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں اس کا اعتراف بھی کیا تھا۔ بھلے وہ بچوں کے سامنے دولت کے ڈھیر لگا دے ان کے لیے دنیا کی ہر آسائش مہیا کر دے لیکن کسی روز اگر انہوں نے پوچھ لیا.....

”ہمارا باپ کہاں ہے تو وہ پھر کیسے انہیں مطمئن کرے گی۔“

”اوکے، اگر تم فیصلہ کر چکی ہو تو میں کہہ کیا سکتا ہوں، سوائے اس کے کہ تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتا نا نہ پڑے۔“

”آمین.....“ اس نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

بابر نے اس کے بعد اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر وہاں ہی بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی اتنے دنوں میں پہلی بار وہ مدثر کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ محسوس کر رہی تھی۔ وہ بستر پر سونے کی غرض سے لیٹی تھی مگر وہ مدثر کو ہی سوچے جا رہی تھی۔

کہیں کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں تھا کہ اسے احساس ہوتا کہ مدثر اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ اس کی واہنگیاں اس کی محبتیں..... اس کے جذبوں کی حدت میں لپٹے الفاظ اس کا کہا ایک، ایک لفظ اسے یاد آیا جو اسے ہمیشہ معتر کر دیتا تھا۔ وہ عجب طرح سے نازاں ہوتی اور اس کی محبت اسے مغرور کرتی تھی۔ اسے فخر تھا کہ مدثر اس کا

شریک زندگی ہے اور وہ دنیا کی سب سے خاص بلکہ خوش قسمت ترین لڑکی ہے اور پھر اس کا یہ غرور خاک میں مل گیا تھا۔ وہ خاص نہیں رہی تھی ایک عام عورت ہو گئی تھی، ایک ایسی عام عورت جس کا شوہر صرف اس کا شوہر نہ تھا۔

وہ بچے دنوں کو یاد کرتی رہی تھی اور اس کا تکیہ اس کے آنسوؤں سے بھیلتا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کب سوئی لیکن صبح اٹھی تو وہ پچھلے دنوں کے مقابلے میں زیادہ فریش تھی اور اپنے فیصلے پر بے حد مطمئن..... مدثر نے ان بچے دو سالوں میں اسے بے حد اور بے حساب چاہا تھا وہ کوئی ایک لمحہ بھی ایسا یاد نہ کر سکی تھی جب اسے مدثر کی محبت میں کمی محسوس ہوئی ہو تو اسے ایک چانس دیا جاسکتا تھا۔

”ممی میں سوچ رہی ہوں کہ آج شام واپس گھر چلی جاؤں آپ مدثر کو فون کر دیں کہ وہ کالج سے واپسی پر

مجھے لے جائیں۔" ناشتا کرتے ہوئے اس نے بہت اطمینان سے می سے کہا تھا۔

پتا نہیں کیوں اس کا جی چاہا تھا کہ وہ مدثر کے سنگ ہی گھر واپس جائے۔

ناشتا کرتے ہوئے بابر نے بے حد چونک کر اسے دیکھا تھا اتنے سارے دنوں سے اس کے چہرے پر جو تناؤ تھا اور جو بیزاری کی کیفیت ہر وقت اس پر طاری رہتی تھی اب نہیں تھی۔

"وہ می آج مجھے اماں، ابا سے ملنے جانا ہے۔ ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، وہ کئی دنوں سے فون کر کے بلا رہے ہیں۔" وہ ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا چلے جاؤ، میری طرف سے بھی بھائی صاحب کی مزاج پر سی کرنا لیکن بیٹا ڈھنگ سے ناشتا تو کر لو۔"

"میں نے ناشتا کر لیا ہے، می آپ لوگ کب اسلام آباد کے لیے نکلیں گے۔"

"کچھ دیر تک، جنازہ تو رات آٹھ بجے ہے۔" بابر سے بات کر کے وہ ایمیل کی طرف متوجہ ہوئی تھیں جو سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میں اور تمہارے ڈیڈی ایک گھنٹے میں اسلام آباد کے لیے نکل رہے ہیں۔ دراصل تمہارے ڈیڈی کے دوست کرنل شفیق کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ کل شام تک واپس آ جائیں گے تو تم ہمارے واپس آنے کے بعد ہی اپنے گھر چلی جانا لیکن اپنے سر یا مدثر کو فون ضرور کرنا وہ بیچارے بہت پریشان تھے..... اکلوتے بیٹے کے حوالے سے تم بھی انہیں بہت عزیز ہو گئی ہو..... بہت محبت کرتے ہیں تم سے۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" کرنل حامد نے ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ناشتا اپنی اسٹڈی میں ہی کیا کرتے تھے اور آج بھی انہوں نے وہاں ہی ناشتا کیا تھا اور اب تیار ہو کر باہر آئے تھے۔

"گھر بنتے مشکل سے ہیں مگر بہت آسانی سے ٹوٹ بھی جاتے ہیں..... اور ٹوٹے ہوئے گھر دوبارہ نہیں بنتے اور اگر بن بھی جائیں تو ویسے نہیں بنتے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ڈیفیکٹ رہ جاتا ہے۔" وہ اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

"جی ڈیڈی....." ایمیل نے سراٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔ "ہو سکتا ہے مدثر کے لیے میرے دل میں وہ مقام کبھی پیدا نہ ہو سکے جو پہلے تھا لیکن مجھے اپنے بچوں کی خاطر سمجھوتا کرنا پڑا۔ میں نہیں چاہتی ڈیڈی کہ میرے بچے جب بڑے ہوں تو ان کی شخصیت میں کہیں کوئی کمی یا خلل رہ جائے۔"

"میری بیٹی بہت عقلمند ہے اور اس نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے۔" انہوں نے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے باہر کی طرف دیکھا تھا جو اپنی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔

"میاں تم کیوں کھڑے ہو بیٹھ کر ناشتا کرو۔"

"میں نے ناشتا کر لیا ہے ڈیڈی..... مجھے ابا، اماں سے ملنے جانا ہے اور بس جا ہی رہا ہوں۔ یونہی آپ لوگوں کی بات سننے کے لیے رک گیا تھا۔"

"اپنے اماں، ابا کو میرا بھی سلام کہنا۔"

"جی....." اس نے آہستگی سے کہا اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے بولا تھا۔

"وہ ڈیڈی....." می سے تو وہ ہمیشہ سے ہی بے تکلف تھا اور ہر بات بلا جھجک کہہ دیتا تھا لیکن ڈیڈی سے بات کرتے ہوئے آج بھی ہچکچاتا تھا اسے جھجکتے دیکھ کر ایمیل کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

”ہاں، ہاں کہو.....“ ہمیشہ کی طرح کرنل حامد کا لہجہ نرم اور حوصلہ دیتا ہوا سا تھا۔
 ”وہ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ایمل کچھ غلط نہیں کر رہی..... مدثر قابل اعتبار نہیں ہے، کیا ایسے شخص پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے جو ایک بار آپ کو دھوکا دے چکا ہو؟“

”شاید نہیں۔“ کرنل حامد کے لبوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ”لیکن میاں، بیوی کا معاملہ بالکل الگ ہوتا ہے بیٹا از دو واجی زندگی کے معاملات کچھ مختلف اصولوں پر چلتے ہیں، کبھی بیوی کو سمجھوتا کرنا پڑتا ہے کبھی شوہر کو..... ایک دوسرے کی غلطیوں، خامیوں اور کمزوریوں کو نظر انداز کیے بنایا گیا نہیں چلتی۔ اپنے ابا، اماں کو ہی دیکھ لو..... تمہارے ابا سال میں کتنی بار تمہاری اماں کا اعتبار توڑتے ہیں اور ہر بار وہ پھر ان پر یقین کر لیتی ہیں۔“ ان کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی اور بابر کا سر جھک گیا تھا..... اس کے پاس دینے کے لیے کوئی دلیل نہیں رہی تھی..... ایمل کو تب لگا تھا کہ ڈیڈی کو خالہ، خالو کی مثال نہیں دینی چاہیے تھی تاہم وہ خاموش رہی تھی اور بابر خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تھا اور ڈیڈی، مٹی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”بیگم صاحبہ دس بجنے والے ہیں اور آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ بارہ بجے کی فلائٹ ہے اور گھنٹا تو.....“
 ”میں بس تیار ہی ہوں، بیگم میں ایک جوڑا کپڑوں کا رکھنا ہے بس.....“ مٹی نے اپنے لیے چائے بناتے ہوئے جواب دیا تھا۔

”آپ کے لیے چائے بناؤں ڈیڈی.....؟“ ایمل نے پوچھا تو وہ اسی نرم لہجے میں بولے تھے۔
 ”ویسے تو پی چکا ہوں لیکن میری بیٹی بنائے گی تو ضرور پیوں گا۔“
 وہ اس کے لیے اتنے ہی شفیق اور مہربان تھے۔ وہ ان کے لیے چائے بنانے لگی تھی اور مٹی چائے پی کر تیار ہونے چلی گئی تھیں۔

مٹی، ڈیڈی کے جانے کے بعد اس نے ہاتھ (غسل) لیا تھا، فریش ہونے کے بعد کچھ دیر اخبار پڑھتی رہی تھی اور پھر بہت ریلیکس ہو کر ٹی وی لاؤنج میں آ کر ٹی وی دیکھنے لگی تھی۔ ان دنوں اس کے پاؤں ذرا سالٹکانے سے بہت سوج جاتے تھے سو وہ پاؤں کے نیچے کیشن رکھے ٹانگیں تھوڑی سی پھیلائے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بہت آرام سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ جب ملازمہ نے آ کر بتایا تھا کہ کوئی لڑکی اس سے ملنے آئی ہے۔
 ”اوہ، ضرور مونی ہوگی۔“ وہ یک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”ارے بھئی اسے اندر لے آؤ باہر کیوں روک رکھا ہے۔“ ملازمہ نئی تھی اور مونی کو پہچانتی نہیں تھی۔
 کتنے سارے دن ہو گئے تھے مونا سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جب سے مونی کی شادی ہوئی تھی صرف دو تین بار ہی اس کی بات ہو سکی تھی۔ ایک تو اس کے سسرال میں اتنے بچے تھے کہ جب بھی فون کرو کوئی بچہ اٹھا لیتا تھا۔
 ”اچھا ماما سے بات کرنی ہے۔ ہولڈ کریں بلاتا ہوں،“ اور پھر ریسور اٹھائے، اٹھائے ہاتھ تھک جاتے اور ٹوں، ٹوں کی آواز آنے لگتی۔ بچہ شاید ماما کو بتانا بھول جاتا..... یا پھر کوئی بچہ کہتا۔
 ”اچھا چاچی سے بات کرنی ہے لیکن چاچی تو کچن میں ہیں.....“ یا پھر یہ کہ ”کمرے میں ہیں باہر آئیں گی تو بتادوں گا۔“

”ارے بھئی کمرے میں جا کر بتادو۔“

”توبہ، توبہ.....“ بچہ توبہ کرنے لگتا۔

”ہمیں چاچو سے ڈانٹ کھا۔ نہ کا کوئی شوق نہیں ہے، آپ اپنا نام بتادیں جب چاچی نظر آئیں گی تو پیغام

اور پھر پیغام دینے والا وعدہ کر کے شاید بھول جاتا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اس کی سسرال فون کرنا چھوڑ دیا تھا اور آٹھی سے کہہ دیا تھا کہ جب وہ لاہور آئے تو اس کی بات کروادیں اور اس کا تو ایسا دل لگا تھا اپنی سسرال میں کہ وہ شادی کے بعد دو تین بار ہی آئی تھی اور اسے ان دنوں اس کی کتنی ضرورت تھی ایک وہ ہی تو تھی اس کی اکلوتی دوست..... اس کی ہمزاز جس سے وہ دل کی ہر بات کہہ سکتی تھی..... اور جس نے ہمیشہ اسے مدثر کی محبتوں کا یقین دلایا تھا اور جو اس کی قسمت پر رشک کرتی تھی کہ مدثر جیسا شخص اس کا دیوانہ ہے۔ دل جیسے آبلہ بنا ہوا تھا۔ وہ بہت اشتیاق سے اس کے استقبال کے لیے کھڑی ہوئی تھی لیکن اندر لاؤنج میں قدم رکھنے والی موٹی نہیں تھی۔ کندھوں تک کٹے بال، جدید تراش خراش کا لباس پہنے وہ لڑکی اسے جانی پہچانی سی لگی تھی لیکن اسے یاد نہیں آیا تھا کہ اس نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے۔

”مجھے مسز مدثر حسن سے ملنا ہے۔“ لڑکی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”جی، میں ہی مسز مدثر ہوں۔“ اس کا دل جیسے ایک لمحہ کو ڈوب کر ابھرا تھا۔

”تشریف رکھیں پلیز.....“ اس نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ بیٹھ گئی تھی لیکن بہت مضطرب اور بے چین لگ رہی تھی۔ کچھ دیر تو وہ یونہی بیٹھی انگلیاں چٹختی رہی تھی اور پھر پہلو بدلتے ہوئے اس نے یونہی انگلیاں چٹختے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”میں بہت مجبور ہو کر آپ کے پاس آئی ہوں مسز مدثر، میں کبھی یہاں نہ آتی اگر.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی یوں جیسے اسے اپنی بات کی وضاحت کے لیے لفظ نہ مل رہے ہوں..... پھر اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ وہ اپنے ہونٹ بے دردی سے دانٹوں تلے چل رہی تھی اور ایمل کو لگا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی اس کا وجود ہولے، ہولے ہل رہا تھا۔

”پلیز مت روئیں، بتائیں تو سہی کیا ہوا ہے۔“ ایمل گھٹنوں پر کہنی کا دباؤ ڈال کر تھوڑا سا آگے جھکی تھی۔ کسی انہونی کا خوف اس کے دل کو جیسے اپنے پنجوں میں جکڑے ہوا تھا کسی خوفناک عفریت کی طرح.....

”آپ..... صرف آپ ہیں جو میری مدد کر سکتی ہیں۔“ کچھ دیر بعد اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تھے اور دوپٹے کے پلو سے رگڑ کر چہرہ صاف کیا تھا۔

”میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں آپ بتائیں تو اگر میرے اختیار میں ہو تو ضرور آپ کی مدد کروں گی۔“ ایمل کا دل اس کے لیے گداز ہوا تھا۔

”آپ کے اختیار میں ہی تو ہے سب کچھ۔“ وہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی تھی اور ایمل کے پاس نیچے بیٹھے ہوئے اپنے ہاتھ ایمل کے پاؤں پر رکھ دیے تھے۔

”نہیں..... نہیں یہ کیا کر رہی ہیں آپ.....“ اس نے یک دم اپنے پاؤں کھینچ کر صوفے پر رکھ لیے تھے اور اضطراری کیفیت میں ہولے، ہولے دبانے لگی تھی۔

”میں آپ کی کنیز بن کر رہ لوں گی، ساری زندگی آپ کی نوکرانی بن کر گزار دوں گی بس آپ مدثر سے کہیں مجھ سے شادی کر لے۔“

اور اسے لگا تھا جیسے خوف کے اس عفریت نے اپنے نوکیلے ناخن اس کے دل میں چھو دیے ہوں اور وہ بھرائی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”آپ سے شادی کی اجازت دے دیں، بس ایک بار وہ مجھ سے شادی کر لے پھر چاہے ساری زندگی آپ

معروف اور مقبول قلم کار

طاہر جاوید مغل

کی نئی سلسلے وار کہانی



انگاریے

جاسوسی ڈائجسٹ

میں پیش کی جا رہی ہے

زندگی کی رعنائیاں اور ہولناک سچائیاں

اپنے دامن میں سمیٹے

ایسی طویل، سنسنی خیز اور تحیر انگیز کہانی

جسے تارنیں ایک ہی نشست میں پڑھنے پر

خود کو مجبور پائیں گے

READING
Section

مجھے گھر کے ایک کونے میں ڈال دیجیے گا۔ پڑی رہوں گی، آپ جو کہیں گی، کروں گی لیکن خدا کے لیے مجھے بچالیں۔ میرا باپ بہت سخت ہے، وہ مجھے مار ڈالے گا، اگر اسے پتا چل گیا تو..... وہ مجھے ہی نہیں میری چھوٹی بہنوں کو بھی مار ڈالے گا اور ہم سب کو مار کر خود بھی مر جائے گا..... میں مدثر کے بچے کی ماں بننے والی ہوں..... میں خودکشی نہیں کر سکتی، مجھے مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ورنہ اپنی زندگی ختم کر لیتی۔“ اور ظالم عفریت نے اس کا دل مٹھی میں دبا کر مسل ڈالا تھا۔

وہ ہاتھ جوڑ رہی تھی اور منتیں کر رہی تھی لیکن وہ ساکت بیٹھی تھی جیسے پتھر کی ہو، اس کے اندر جو وہ ایک نرم گوشہ پیدا ہوا تھا مدثر کے لیے وہاں کی زمین جیسے یک دم سخت، پتھریلی چٹانوں میں بدل گئی تھی۔ وہ جو رات کو اس نے اس نرم گوشے سے ننھی، ننھی کوپلیں پھوٹی محسوس کی تھیں معافی کی، امید کی، درگزر کی، نرمی کی، وہاں اب کسی کوپیل کا نشان تک نہیں تھا۔ بس سخت پتھریلی زمین تھی، جہاں نہ پھول کھلتے ہیں نہ سبزہ..... اس نے خالی، خالی نظروں سے اس اجنبی لڑکی کو دیکھا تھا وہ بلاشبہ وہی تھی جسے اس نے اس رات مدثر کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو اضطرابی کیفیت میں پرے کرتے ہوئے وہ انھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی اور پھر پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی تھی اسے خبر نہیں تھی۔ وہ یونہی اپنے بیڈ پر ساکت بیٹھی تھی۔

وہ لڑکی کب گئی تھی اسے یہ بھی خبر نہیں تھی۔ بہت دیر بعد اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی تھی۔ اور اس کی کھنچی ہوئی آنکھوں کی سطح پر نمی پھیلی تھی۔

مدثر نے اس کا اعتبار توڑا تھا۔ وہ کسی اور لڑکی کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونے والے بچوں کی خاطر اسے معاف کر دیا تھا لیکن وہ اتنا گھٹیا ہو سکتا ہے؟ اتنا گرا ہوا اسے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ اس لڑکی کو بھلا کیا ضرورت تھی جھوٹ بولنے کی اور مدثر پر اتنا بڑا الزام لگانے کی جبکہ اس الزام کی زد میں اس کی اپنی ذات بھی آرہی تھی۔

اسے لگا تھا جیسے اس کی زندگی ختم ہو رہی ہو۔ کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا اس نے مدثر کی محبت پر اعتبار کر کے..... اسے اپنی ناقدری پر رونا آیا اور اس کی نم آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور پھر پتا نہیں کتنی ہی دیر تک وہ روتی رہی تھی گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ملازمہ نے ایک دو بار دستک دی تھی لیکن اس نے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔ بڑی دیر بعد جب وہ روتے، روتے تھک گئی تو انھی تھی۔

”میں اپنے بچوں کو کسی بد کردار شخص کے سائے تلے نہیں پلنے دوں گی..... بھلے ان کی زندگی میں کوئی خلا ہو یا کوئی کمی.....“ اس کے دل میں اب مدثر کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا..... دل کی زمین پر نفرت کے کیلکس تھے جن کے کانٹے خود اس کے اپنے دل کو بھی زخمی کرتے تھے لیکن نفرتوں کے پودوں پر اب محبتوں کے پھول کبھی نہیں کھلنے تھے اس نے منہ ہاتھ دھو کر مدثر کا نمبر ملایا تھا۔

”ہیلو.....“ مدثر کی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اسے لگا تھا وہ اس فریبی شخص سے کبھی بات نہیں کر سکے گی اس کی ہیلو اس کی سماعت پر جیسے کسی ہتھوڑے کی طرح پڑی تھی۔

”ہیلو.....“ مدثر نے پھر کہا تھا۔

”یہ تم ہونا، میں تمہاری خوشبو سے بھی پہچان لیتا ہوں۔“

”اور کس، کس کو اس کی خوشبو سے پہچانتے ہو؟“ وہ بولی تو اس کی آواز بے حد سرد اور ٹھنڈی تھی۔ لیکن اس نے شاید محسوس نہیں کیا تھا کیونکہ اس کی آواز میں ایک چہکار اور ایک سرخوشی سی تھی۔

”بابا جان، ایما کا فون ہے۔“ اس نے بابا جان کو بتایا تھا وہ شاید قریب ہی بیٹھے تھے اور پھر اسی چہکتی آواز

میں اس نے اسے مخاطب کیا تھا۔
 ”تھینک یو ڈیر..... تم نے بچوں کی خاطر ہی سہی گھر آنے کا فیصلہ تو کیا..... مجھے یقین ہے میں بہت جلد تمہاری غلط فہمی دور کر دوں گا..... کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی تو وہ لڑکی مجھے دوبارہ نظر آئے گی۔“
 ”میری غلط فہمی دور ہو چکی مدثر حسن صاحب کیونکہ وہ لڑکی خود چل کر میرے پاس آگئی ہے۔“ اس کی آواز اب بھی اتنی ہی سرد اور بے مہر تھی۔

”ریٹلی جانم.....“ وہ چہکا تھا۔ ”مجھے یقین تھا۔“

”بس مسٹر مدثر حسن..... بس.....“ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ ”وہ لڑکی میرے پاس آئی تھی لیکن تمہاری بے گناہی ثابت کرنے کے لیے نہیں بلکہ یہ بتانے کے لیے کہ تم اس کے بچے کے باپ بننے والے ہو، تم اتنے گھٹیا ہو میں تصور نہیں کر سکتی تھی۔ تم اتنا گر سکتے ہو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ... سرد مہری تھی۔

بیٹھیوں سے اترتے باہر نے حیرت سے اسے دیکھا اور قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”تم ابھی تک یہاں بیٹھی ہو تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا.....“

”ہاں.....“ اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“ اس کے لہجے میں ایسی تسکین تھی جیسے کہیں دور کا سفر طے کر کے آئی ہو۔ ہاں اس کے ماضی کا سفر تھکا دینے والا ہی تو تھا۔
 ”پھر کوئی فون آیا تھا کیا؟“ اس نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”نہیں.....“ ایمل نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ عنبرین نے یہاں کیوں فون کیا تھا اور وہ کیوں ایمل سے بات کرنا چاہتی تھی..... اس نے اپنے بیڈروم میں جا کر کتنی ہی بار عنبرین کا نمبر ملایا تھا لیکن عنبرین فون ریسپونڈ نہیں کر رہی تھی۔ کیا اس کے دل میں کوئی چور تھا..... اس نے اس کی آواز سن کر فون بند کر دیا تھا..... وہ الجھ گیا تھا سو اس نے اسی وقت لاہور جانے کا فیصلہ کیا تھا..... اس میں فوری فیصلے کرنے کی صلاحیت تھی اور زندگی میں جب، جب اس نے فوری فیصلے کیے تھے وہ پچھتایا نہیں تھا..... عنبرین اگر اب ایمل کو سب کچھ بتا بھی دیتی تو کچھ خاص فرق پڑنے والا نہیں تھا اور یہ بات عنبرین بھی جانتی تھی پھر یہاں فون کرنے کا مقصد.....
 ”میں ایک دو روز کے لیے لاہور جا رہا ہوں۔“ اس نے ایمل کے چہرے سے نظریں ہٹالیں۔

ایمل نے پہلی بار اس کے ہاتھ میں موجود بریف کیس کی طرف دیکھا۔

”میں بھی آپ کے ساتھ چلتی..... آپ مجھے بتا دیتے تو..... می کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی..... ان سے مل لیتی، انہیں دیکھ لیتی تو.....“ اس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ محسوس کر کے باہر مسکرایا۔

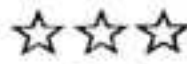
”بس اچانک ابھی چند منٹ پہلے ہی آفس سے فون آیا ہے۔ بہت ضروری کام ہے، پہلے سے پروگرام نہیں تھا..... ایمر جنسی میں جانا پڑ رہا ہے۔ تھینک گاڈ کہ ایک سیٹ مل گئی ہے۔ تمہیں پتا تو ہے ان دنوں بزنس کے معاملات کچھ گڑبڑ سے ہیں۔ جن کی وجہ سے آپ سیٹ ہوں..... ایک بندے سے ملنا ہے، اچھا بزنس ملنے کی امید ہے۔“
 ”آپ می سے ملیں گے نا.....“ ایمل نے پوچھا۔

”کیوں نہیں، کام سے فارغ ہو کر سیدھا می کی طرف ہی جاؤں گا۔ اگر می کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو انہیں اپنے ساتھ ہی لے آؤں گا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا نا کہ عدت کے بعد وہ کراچی آئیں گی لیکن پھر نہیں آئیں.....“
 ”ہاں یہ اچھا ہے۔“ ایمل خوش ہوئی۔ ”آپ می کو ساتھ ہی لے آئیے گا..... میں بھی می سے کہوں گی کہ وہ آپ کے ساتھ ہی آ جائیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے، تم فون کر دینا لیکن اگر مجھے لگا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو میں تمہیں فون کر دوں گا تم افنان کے ساتھ آ جانا بلکہ رتی کو بھی لے آنا..... تاہم میری پہلی کوشش تو یہی ہوگی کہ انہیں ساتھ ہی لے آؤں۔“

ایمل دل ہی دل میں اس کی ممنون ہوئی تھی۔

”ڈونٹ وری ایما..... می انشاء اللہ ٹھیک ہوں گی۔“ اس نے ایمل کا بازو تھپتھپایا اور لاؤنج سے باہر نکل گیا۔



عبرین صوفی پر خاموش بیٹھی سامنے ٹیبل پر پڑے فون کو خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی جو مسلسل بج رہا تھا لیکن اس نے فون اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔ کچھ دیر بعد ایمل آنا بند ہوگئی تو اس نے ایک گہری سانس لی۔ فون کی بیل وقفے، وقفے سے ہورہی تھی اور فون اٹھائے بغیر بھی وہ جانتی تھی کہ یہ بابر کا فون ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بابر اسے فون کیوں کر رہا ہے اور وہ اس سے کیا پوچھنے والا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ بابر کو کیسے مطمئن کرے گی اور اس سے کیا کہے گی کہ اس نے ایمل کو فون کیوں کیا..... سچ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس نے ایمل کو فون کیوں کیا تھا وہ اپنے contacts چیک کر رہی تھی کہ اس کی نظر اس نمبر پر پڑی تھی جو اس نے R, home کے نام سے سیو کر رکھا تھا۔ یہ نمبر اس نے رتی کے فون سے لیا تھا اس روز جب ارتفاع اس کے گھر آئی تھی اور بابر لاؤنج سے باہر نکل کر کارڈور میں کھڑا اپنے فون پر کسی سے بات کر رہا تھا کہ رتی اپنا فون ٹیبل پر رکھ کر واش روم گئی تھی تو اس نے یونہی بلا مقصد اس کا فون اٹھایا تھا اسے یہ اسمارٹ فون اچھا لگا تھا..... contacts میں sweet home کے نام سے موجود نمبر کو اس نے فوراً ہی اپنے فون میں محفوظ کر لیا تھا اور پھر بابر کے قدموں کی آہٹ پر اس نے فون فوراً ٹیبل پر رکھ دیا تھا جہاں ارتفاع چھوڑ کر گئی تھی۔ شاید اس کے ذہن میں کہیں ایمل کا نمبر جاننے کی خواہش تھی، یہ خواہش کیوں تھی وہ نہیں جانتی تھی۔ بابر اپنا فون بہت سنبھال کر رکھتا تھا۔ ایک بار اس نے اس کا فون اٹھایا تھا تو بابر نے اسے بہت بری طرح ڈانٹا تھا اور کہا تھا کہ اگر آئندہ اس نے اس کا فون اٹھایا تو وہ اس کے ہاتھ توڑ دے گا۔ یہ الگ بات تھی کہ بابر نے اس کے بعد کبھی اسے فون اٹھانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ واش روم بھی جاتا تو فون ساتھ لے جاتا تھا، پتا نہیں بابر کو اس سے کیا خطرہ تھا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ وہ اس کے فون سے ایمل کا نمبر لے کر اس سے کوئی بات نہ کر لے، کوئی ایسی بات جو ایمل کو بابر سے متنفر کر دے..... حالانکہ اگر وہ ایسا کرنا چاہتی تو اس کے لیے ایمل کا نمبر حاصل کرنا ناممکن نہیں تھا..... اسے ”حامد ولا“ کا پتا تھا وہ وہاں جا کر اس کی می سے ایمل کا نمبر معلوم کر سکتی تھی لیکن اس نے کبھی ایمل سے بات کرنے یا اسے کچھ بتانے کے متعلق نہیں سوچا تھا اور اب بھی اس نے ارتفاع کے فون سے غیر ارادی طور پر یہ نمبر لیا تھا اور جب وہ نمبر ملا رہی تھی تب بھی اس کے ذہن میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ اسے ایمل سے کوئی خاص بات کرنی ہے لیکن جب ایمل نے ہیلو کہہ کر جواب دیا تھا کہ وہی مسز بابر ہے تو اس کے ذہن میں ایک کشمکش جاری ہوگئی تھی۔ بہت سارے دنوں سے اس کے دل پر ایک بوجھ سا دھرا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ دل کو اس بوجھ سے آزاد کر لے، وہ اس عورت سے بات کرنا چاہتی تھی جس کا گھر برباد کرنے میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا..... لیکن بابر کی آواز سنتے ہی خوفزدہ ہو کر اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ کبھی، کبھی وہ یونہی بابر سے خوف زدہ ہو جاتی تھی اسے لگتا تھا جیسے اگر کبھی اس نے بابر کی مرضی کے خلاف کچھ کیا تو بابر کے لیے یہ مشکل نہیں ہوگا کہ اس کی زندگی ختم کر دے اور اسے زندگی سے بہت پیار تھا اس نے کبھی کچھ ایسا نہیں کیا تھا جو بابر کو ناراض یا خفا کر دے وہ اب بھی بابر کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ بابر کو ناراض کر چکی تھی اس نے بابر کی کال اٹینڈ نہیں کی تھی اور مسلسل اغنور کر رہی تھی۔ فوری طور پر اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ بابر سے کیا کہے..... بابر کا کیا رد عمل ہوگا وہ اس کے متعلق اندازہ نہیں کر سکتی تھی۔ اتنے سالوں کے بعد بھی وہ بابر کو پوری

طرح سمجھ نہیں پائی تھی کبھی تو وہ بہت مہربان ہوتا اتنا کہ وہ اس کی ہر بات مان لیتا اور کبھی اتنا سخت کہ معمولی سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا..... وہ بڑی عجیب سی زندگی گزار رہی تھی لیکن یہ زندگی اس نے خود چنی تھی۔ پیسے کے معاملے میں بابر نے کبھی کنجوسی نہیں کی تھی۔ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے اسے خرچ کے لیے ضرورت سے زیادہ ہی دے دیتا تھا لیکن خود وہ مہینے میں کبھی ایک بار کبھی دو بار چکر لگاتا تھا۔ شروع، شروع میں تو دو، دو، تین، تین مہینے بعد آتا تھا۔ اس کی کسی سے دوستی نہ تھی۔ وہ شاپنگ کے علاوہ بہت کم گھر سے باہر نکلتی تھی۔ اور اب تو بلاوجہ شاپنگ کا شوق بھی ختم ہو چکا تھا۔ میسے سے یوں بھی اس کا تعلق ٹوٹ چکا تھا اور میسے میں تھا ہی کون سوائے اماں کے اور ان کے بعد تو وہ در بھی بند ہو گیا تھا۔

بہت سارا وقت خواب دیکھتے گزر چکا تھا لیکن اب اس کا دل گھبراتا تھا اب اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کی بہنیں، بھانجیاں، بھانجے اس کے گھر آیا کریں تاکہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس فلیٹ کی جان لیوا خاموشی ٹوٹے اور سب سے بڑھ کر اسے اپنی بیٹی یاد آتی تھی، اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگتے، بھاگتے اس نے کیا کچھ گنوا دیا تھا کبھی اپنا احتساب کرنے بیٹھتی تو اسے لگتا جیسے سو دو زیاں کے اس سفر میں اس نے صرف کھویا ہی کھویا ہے..... جب کبھی وہ سوچتی صرف بابر سے شادی کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کے دل پر بوجھ سا آگرتا تھا۔ بھاری بوجھ جس سے دل پھٹنے لگتا تھا وہ بابر سے شادی کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جس کی اسے چاہ تھی لیکن بابر بھی اس سے شادی کرنا چاہتا ہے یا نہیں اس کا وہ اندازہ نہیں کر پارہی تھی۔ وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا اس کا یقین اسے بہت بعد میں ہوا تھا اور تب وہ شاید بابر سے محبت بھی کرنے لگی تھی یا شاید اسے لگا تھا کہ وہ بابر سے محبت کرنے لگی ہے۔ یا اس محبت کے پیچھے یہ احساس بھی چھپا تھا کہ اگر بابر نے اس سے شادی نہ کی تو شاید اسے کوئی اور چانس نہ ملے..... ایک اچھی زندگی گزارنے کا اس کا خواب پورا نہ ہو کیونکہ اماں نے بھی وارننگ دے دی تھی کہ اگر وہ لڑکا اس کا رشتہ لے کر نہیں آتا تو وہ شہر دکاندار کو ہاں کر دیں گی..... سوا سے ہر قیمت پر بابر سے شادی کرنا تھی لیکن بابر..... وہ اسے باہر لے کر جاتا تھا..... کتنی ہی بار انہوں نے اکھاڑ لٹچ کیا تھا وہ وقتاً فوقتاً اسے تحائف دیتا رہا تھا اور تحائف دینے کے لیے اسے کسی موقع کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

”بازار گیا تو یہ واچ اچھی لگی، تمہارے لیے لے لی۔“
 ”آپا کے لیے ہینڈ بیگ لینے گیا تو تمہارے لیے بھی لے لیا۔“ وہ بابر کے تحائف پا کر بہت خوش ہوتی تھی اور اماں کو بھی ضرور دکھاتی تھی۔ اماں نے کبھی تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن ان کی نظریں اسے ہمیشہ شرمندہ کر دیتی تھیں۔
 ”صرف تحفوں سے زندگی کا سفر طے نہیں ہوتا..... یہ امیر زادے تم ایسی لڑکیوں سے شادی نہیں کرتے۔“ بس ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

”بابر ایسا نہیں ہے اماں.....“ اس نے اس کا دفاع کیا تھا۔
 ”تو اس سے کہو کہ اپنے اماں، ابا کو بھیجے رشتے کے لیے۔“
 لیکن وہ یہ بات بابر سے کیسے کہتی، کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ہر طرح اس کا خیال رکھتا تھا..... اسے اپنی بیسٹ فرینڈ کہتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے یا یہ کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے..... اس روز وہ بڑے دل سے تیار ہوئی تھی اور بابر نے بھی بے اختیار سراہا تھا۔

”آج بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ اس کی ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ذرا کی ذرا رکا تھا۔
 ”صرف آج..... کیا پہلے کبھی پیاری نہیں لگی؟“ اس نے بے حد ادا سے اسے دیکھا تھا۔
 ”ہمیشہ ہی لگتی ہو سوئی لیکن آج تو قیامت ڈھا رہی ہو۔“ دونوں ہاتھ اس کی ٹیبل پر رکھتے ہوئے تھوڑا سا جھکتے

ہوئے وہ مسکرایا تھا اور وہ پورے دل سے مسکرائی تھی۔
 ”سنو آج لنچ کے لیے باہر چلتے ہیں۔“ ہمیشہ باہر ہی اسے دعوت دیتا تھا لیکن آج اس نے اسے دعوت دی تھی۔
 ”غلام حاضر ہے لیکن جناب یہ لنچ کس خوشی میں۔“

”بس یونہی..... آج آپ سے باتیں کرنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔“
 وہ گھر سے فیصلہ کر کے آئی تھی کہ اگر اظہار میں باہر پہل نہیں کر رہا تو وہ خود پہل کر دے گی۔
 ”گڈ..... یوں بھی بہت دن ہو گئے تھے ہمیں اکٹھا لنچ کیے ہوئے..... اگر تم نہ کہتیں تو میں تمہیں لنچ کی آفر کرنے ہی والا تھا۔“

باہر اپنے روم کی طرف چلا گیا تھا اور اس روز کھانے کے وقفے میں اپنے مخصوص ریسٹورنٹ میں جو ان کے آفس سے نزدیک ہی تھا کھانا کھاتے ہوئے اس نے اعتراف کیا تھا۔

”باہر میں آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔“

”جانتا ہوں۔“ وہ مسکرایا تھا۔ ”آئی..... لو یو ٹو.....“

اور یہ ایک جملہ سننے کے لیے اس نے دو سال انتظار کیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے اس کے ارد گرد ہر چیز رقصاں ہو، وہ جو دل میں سوچ کر آئی تھی کہ آج وہ باہر سے شادی کے متعلق بھی بات کرے گی اس کے اعترافِ محبت کے بعد سب کچھ بھول گئی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا تو ظاہر ہے شادی بھی کر لیتا..... وہ دن اس کی زندگی کا سب سے خوب صورت دن تھا۔ اس روز باہر کے سامنے بیٹھے وہ اس سے چھوٹی، چھوٹی باتیں کرتی رہی تھی۔ اپنے خواب، اپنی خواہشیں اور باہر دھیمے، دھیمے مسکراتا رہا تھا۔ اس روز پہلی بار باہر نے کچھ وعدے اس کی منہسی میں تھمائے تھے اور اس نے بھی کچھ عہد و پیمان کیے تھے۔ عمر بھر ساتھ نبھانے کے اور واپس آفس آتے ہوئے باہر نے اسے یاد دہانی کروائی تھی کہ وہ اس پر سب سے زیادہ بھروسا کرتا ہے اپنے دوستوں سے بھی زیادہ اور وہ واحد ہستی ہے جس کے ساتھ وہ اپنے سیکرٹ شیئر کرتا ہے۔

ایک بار پہلے بھی وہ یہی بات کر چکا تھا اور اس نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ کبھی اس کا بھروسا نہیں توڑے گی اور یہ اس سے صرف تین دن بعد کی بات تھی جب باہر نے اسے مدثر سے ملنے اور وہ سارا ڈراما کرنے کو کہا تھا۔
 ”یہ سب کیا ہے باہر.....؟“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”صرف ایک چھوٹی سی شرارت یا مذاق.....“ اس نے اپنے سامنے اسے مدثر حسن کو فون کروایا تھا۔

”یہ مذاق کچھ عجیب سا نہیں.....؟“

”یہ مذاق ہے بس شرارت..... عجیب کیا ہے اس میں، میں دیکھنا چاہتا ہوں اس کا باپ کتنا ایماندار ہے اور وہ خود کتنے پانی میں ہے۔“ لیکن چند دنوں بعد ہی اس نے جان لیا تھا کہ یہ نہ تو شرارت تھی نہ مذاق یہ تو کچھ اور ہی تھا کوئی بڑی بات، کوئی دشمنی، کوئی انتقام، کوئی سازش..... اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس سازش کا حصہ بننا پڑا تھا کیونکہ باہر ایسا چاہتا تھا اور باہر نوید وہ شخص تھا جو اسے وہ زندگی دینے والا تھا جس کے خواب وہ بچپن سے دیکھتی چلی آئی تھی اس روز وہ آفس آیا تو کچھ اپ سیٹ لگ رہا تھا۔

”سنو کچھ دیر بعد چھٹی لے کر باہر آ جاؤ۔“ اس کی ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ خود وہ فوراً ہی غالباً چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔ اس کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکا تھا۔

”کیا وہ اسے پروپوز کرنے والا ہے؟“ کل ہی تو اس نے باہر سے کہا تھا کہ ”اماں شادی جلد کرنا چاہتی ہیں۔ دو تین بہت اچھے رشتے ہیں، اگر تم اپنے والدین کو بھیج دو تو..... اماں مزید انتظار نہیں کریں گی۔“

”ہاں..... ہاں تم پریشان مت ہو، بہت جلد میں انہیں بھیجوں گا بس ابھی تم انہیں کسی طرح ٹال دو۔“
 ”لیکن باہر میں اماں کو بہت دیر تک روک نہیں پاؤں گی۔ انہیں ایک رشتہ بہت پسند ہے۔“ وہ چاہتی تھی کہ یہ معاملہ جلد از جلد ٹیٹ جائے ورنہ دو تین تو کیا ایک رشتہ بھی نہیں تھا۔ شہر دکاندار کو جواب دینے کے بعد اماں نے خاموشی اختیار کر لی تھی.....

”او کے یار..... آج بات کرنا ہوں گھر والوں سے۔“ اس نے وعدہ کیا تھا اور اب وہ اسے باہر بلا رہا تھا تو..... پتا نہیں کیا کہنے والا تھا..... وہ کچھ ڈسٹرب لگ رہا تھا کہیں اس کے والدین نے منع تو نہیں کر دیا لرزاتے ہاتھوں سے اس نے درخواست لکھی تھی اور کچھ ہی دیر بعد وہ باس کے سامنے کھڑی تھی۔
 ”سروہ میری اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے انہیں لے کر اسپتال جانا ہے اگر اسپتال سے جلدی فارغ ہو گئی تو واپس آ جاؤں گی۔“

”او کے.....“ یہ ادھیڑ عمر باس اچھا آدمی تھا اور سب ورکر کے ساتھ اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ باہر پارکنگ میں ہی گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا..... اسے دیکھتے ہی اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تھا، وہ خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔ آج پہلی بار وہ اس کے ساتھ نہیں جا رہی تھی بلکہ کئی بار وہ نزدیکی ریسٹورنٹ میں جانے کے بجائے کہیں اور چلے جاتے تھے لیکن آج اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پتا نہیں باہر اس سے کیا کہنے والا تھا۔ لیکن جب اپنے پسندیدہ کیفے میں چائے پیتے ہوئے باہر نے اپنا مدعا بیان کیا تو وہ لمحے بھر کو حیران سی اسے دیکھتی رہی تھی۔

”لیکن باہر یہ سب تو جھوٹ ہے ناں.....“

”ہاں تو پہلے بھی تو تم نے جھوٹ بولا تھا ناں.....“

”لیکن وہ ایک بے ضرر سا جھوٹ تھا باہر اور یہ..... یہ تو کسی شخص پر الزام ہے..... ایسا الزام جس کے نتیجے میں اس شخص کی گھریلو زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔“

”لیکن جب میں ان دونوں کو بتا دوں گا کہ یہ سب ڈراما تھا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ باہر مسکرایا تھا۔

”لیکن یہ بہت سنگین مذاق ہے باہر اور میں.....“

”او کے ایز یوش.....!“ باہر کے لہجے کی ناراضی نے اور اس کے چہرے کے تاثرات نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ باہر کی ناراضی کا مطلب تھا.....

”باہر..... وہ..... میں.....“ اس نے تھوک نلگتے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا جسے اس نے سختی سے پیچھے ہٹا دیا تھا۔

”لیواٹ عبرین..... ناؤ کلوز دس ٹاپک۔“

”باہر پلیز.....“

”میں تم پر سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اگر میں تمہیں کنویں میں بھی چھلانگ لگانے کو کہوں گا تو تم بلا جھجک چھلانگ لگا دو گی بغیر کوئی سوال کیے..... لیکن تم نے اتنی سی بات پر آ رگیو کیا، میں سمجھتا تھا کہ تم مجھ سے بہت محبت کرنی ہو..... اور محبت میں تو سوال جواب نہیں ہوتے..... کیوں.....؟ کہاں نہیں ہوتا عشق و محبت تو بے دھڑک کود جانے کا نام ہے۔“ اور وہ ہار گئی تھی۔

”او کے“ بتاؤ کیا کرنا ہے۔“ اور لڑکیاں جس سے محبت کرتی ہیں یونہی اسی طرح اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہیں اور اس سے اس نے سوچا تھا کہ وہ واقعی باہر سے محبت کرنے لگی ہے۔ ورنہ اس کے ڈرامے کا حصہ نہ بنتی اور

پھر اسکرپٹ تو باہر کا تھا ایکٹ اس نے کیا تھا۔
 ”حیران کن.....“ باہر نے جب اس روز اسے حامد والا کے نزدیک اسٹاپ سے پک کیا تھا تو کہا تھا۔
 ”یارتو غضب کی اداکارہ ہو۔“

باہر کو خود اس نے اپنی کارکردگی بتائی تھی لیکن سب کچھ بتانے کے بعد اس کا دل بچھ گیا تھا۔ پھر باہر کی تعریف بھی اسے خوش نہیں کر سکی تھی۔ اس کے دل پر ایک ان دیکھا بوجھ سا آ پڑا تھا۔ ایمل کے سوچے ہوئے پاؤں، اس کی جسمانی کیفیت بتا رہی تھی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ سب سن کر ساکت رہ گئی تھی اس کی خاموشی بے حد سنگین تھی۔ اگر اس لڑکی کو کچھ ہو گیا تو..... اس حالت میں یہ صدمہ..... کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ محض شرارت نہیں تھی، یہ تو باہر نے کوئی دشمنی نبھائی تھی اور کوئی انتقام لیا تھا..... وہ لڑکی بات کیے بغیر لاؤنج سے چلی گئی تھی اور وہ مردہ قدموں سے لاؤنج سے نکلی تھی اور ٹرائی دھکیلتی ملازمہ نے اسے بے حد حیرت سے دیکھا تھا۔

”آپ..... چائے.....“

لیکن وہ ر کے بغیر تیزی سے اندرونی گیٹ کھولتی تیز، تیز قدموں سے چلتی ہوئی گیٹ سے نکل گئی تھی۔ شاید اس نے غلط کیا تھا بلکہ یقیناً غلط کیا تھا لیکن وہ باہر کو ناراض بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سو غلط تھا یا صحیح اس نے اپنے دل کو مطمئن کر لیا تھا یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے باہر نے صحیح کہا ہو، ہو سکتا ہے یہ محض مذاق ہو..... اور اگر کچھ غلط بھی ہے تو اس میں بھلا میرا کیا قصور..... میں نے تو سب کچھ باہر کے کہنے پر کیا ہے..... اور پھر بہت سارے دن گزر گئے باہر بہت کم آفس آیا تھا اور اس کی دو تین بار باہر سے سرسری سی ملاقات ہوئی تھی..... اور باہر نے بتایا تھا کہ اس کی کوئی کزن اسپتال میں ایڈمیٹ ہے اس لیے وہ چھٹیاں کر رہا تھا۔ پھر وہ آفس بھی آنے لگا لیکن عنبرین سے کم ہی بات ہوتی تھی اس نے گلہ کیا تو تسلی دی۔

”کچھ فیملی پرابلمز ہیں عنبرین..... سو ان دنوں تمہیں وقت نہیں دے پارہا لیکن بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ مزید ایک ماہ گزر گیا وہ منتظر ہی رہی کہ باہر اپنے والدین کو بھیجنے کی بات کرے گا پھر اس نے سنا اس نے ون منٹھ نوٹس دے دیا ہے اور وہ جاب چھوڑنے والا ہے۔

”کیا واقعی تم جاب چھوڑ رہے ہو باہر.....؟“ اس روز وہ اس کے کیمین میں چلی گئی تھی۔

”ہاں.....“ باہر نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی تھی۔ ”تم جانتی ہو میں نے جاب صرف تجربہ حاصل کرنے کے لیے کی تھی اور اب میں اپنا بزنس سیٹ کروں گا۔“

وہ اندر ہی اندر پریشان ہوئی تھی..... اگر باہر چلا گیا تو کیا پھر کبھی اس کی باہر سے ملاقات ہو سکے گی..... اور کیا باہر اب اس سے شادی نہیں کرے گا۔ اور باہر اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”پریشان کیوں ہوتی ہو..... میں جاب چھوڑ رہا ہوں..... دنیا تو نہیں چھوڑ رہا..... انشاء اللہ ملاقات ہوتی رہے گی..... ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔“

”دوست.....؟“ اس نے متوحش نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”اور شادی.....“

”ہاں شادی..... ظاہر ہے وہ بھی کرنی ہے لیکن اس موضوع پر ہم پھر بات کریں گے۔ اس وقت میں بزی ہوں..... جو رپورٹ میں تیار کر رہا تھا باہر نے کہا ہے کہ جانے سے پہلے وہ مکمل کر کے دوں..... ایک دو روز تک باہر کہیں کھانا کھاتے ہیں۔ سکون سے بات کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے لیکن تم نے اپنے والدین سے بات کی باہر..... تمہیں پتا ہے ناں اماں بہت جلد میرے فرض سے

سبکدوش ہونا چاہتی ہے۔“ جاتے، جاتے اس نے پوچھا تھا۔
”ہاں کی ہے بات..... یار پریشان مت ہو۔“ وہ مسکرایا تھا۔

اور اس کے بے چین اور مضطرب دل کو قرار سا آ گیا تھا اور اس نے اماں کو بھی بتا دیا تھا کہ بابر نے اپنے والدین سے بات کر لی ہے اور وہ جلد آئیں گے۔

لیکن یہ ایک دور روز پورے پچیس دن پر محیط ہو گئے تھے۔ اس روز آفس میں اس کا آخری دن تھا جب وہ اس کے ساتھ اس کے پسندیدہ ریستورنٹ میں آئی تھی۔ بابر کا موڈ بے حد اچھا تھا اور اتنے دنوں بعد بابر کے ساتھ لہجہ کرتے ہوئے وہ بھی بے حد خوش تھی لیکن یہ خوشی بس چند لمحوں کی... ہی تھی۔ کھانا آرڈر کرنے کے بعد بابر نے کہا تھا۔
”ایک مسئلہ ہو گیا ہے عنبرین۔“

”کیسا مسئلہ.....؟“ وہ متوحش سی ہو کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”دراصل جب میں نے اماں سے بات کی تمہارے متعلق تو انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی کزن سے شادی کر لوں۔“ بابر نے نظریں جھکالی تھیں۔

”اور تم مجبور ہو گئے بابر.....“

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور وہ جو اتنے دنوں سے اماں سے کہہ رہی تھی کہ بابر بہت جلد اپنا رشتہ بھجوانے والا ہے اور بابر وہ شخص ہے جو واقعی اسے ڈیزور کرتا ہے، اب.....

اس کے تصور میں اماں کی تاسف بھری اور اپنی بہنوں کی تمسخر اڑاتی نظریں آ گئیں۔

”ہاں..... میں مجبور ہو گیا عنبرین کیونکہ میری کزن..... نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی تھی اور یہ طلاق میری ایک معمولی سی غلطی کی وجہ سے ہوئی سو مجھے ہی اپنی غلطی کی تلافی کرنا ہے۔“

”تمہاری وجہ سے طلاق.....؟“

”اوہ..... ہاں..... میرے خیال میں جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔“

اسے لگا تھا جیسے روانی میں اپنی کہی جانے والی بات پر وہ پچھتا رہا ہے اور اب بات بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔
لمحے کے ہزاروں حصے میں اس کے اندر کچھ کلک ہوا تھا۔

”ایمل سے..... تم ایمل سے شادی کر رہے ہو بابر.....؟“

”نہیں..... ہاں.....“ وہ گھبرا سا گیا تھا۔

”وہ دراصل اس نے مدثر سے طلاق لے لی ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح ری ایکٹ کرے گی۔
میں نے تو بس ایک چھوٹا سا مذاق کیا تھا..... تو..... اس کی عدت کے بعد.....“

”نہیں..... وہ مذاق نہیں تھا بابر.....“ وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ ”تم نے باقاعدہ پلاننگ سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے مجھے استعمال کیا تھا..... تم ایمل سے شادی کرنا چاہتے تھے..... اور کسی وجہ سے تمہاری شادی اس سے نہیں ہو سکی اور تم نے ایک شخص پر جھوٹا الزام لگا کر سازش سے.....“

”بس عنبرین..... بس کرو اندازے لگانا.....“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا تھا۔

”میں نے واقعی کسی بری نیت سے ایسا نہیں کیا تھا وہ تو ایمل کہتی تھی کہ اسے مدثر پر بہت بھروسہ ہے اور یہ کہ کچھ بھی ہو جائے اس کا بھروسہ نہیں ٹوٹ سکتا..... تو میں اسے.....“ وہ سوچ، سوچ کر بول رہا تھا اور عنبرین گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ جو کہہ رہا ہے وہ سچ نہیں ہے۔ سچ کیا تھا وہ اسے کھوجنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں تھا پھر بھی شاید اسے دل کی تسلی کے لیے اس نے بابر کی بات کاٹی تھی۔

”تو کیا تم نے ایمل اور مدثر کو سب سچ بتا کر ان سے معافی مانگ لی اور انہوں نے تمہیں معاف بھی کر دیا۔“
 ”ہاں.....“ اس نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”اور انہوں نے تمہیں معاف کر دیا کتنا بڑا ظرف ہے ان کا اور نہ صرف معاف کر دیا بلکہ ایمل تم سے شادی کرنے کے لیے بھی تیار ہو گئی۔ پھر تو مجھے بھی ایمل سے معافی مانگ لینی چاہیے اور مدثر سے بھی..... آخر میں بھی تو اس ڈرامے کا ایک کردار ہوں۔“

”نہیں، نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ بابر نے بے ساختہ کہا تھا۔

”کیوں..... کیا وہ مجھے معاف نہیں کرے گی؟“ اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ”اگر وہ تمہیں معاف کر کے تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو سکتی ہے تو مجھے کیوں معاف نہیں کرے گی جبکہ میں تو اس ڈرامے کا صرف ایک کردار تھی رائٹر تو تم تھے نا..... میں نے تو جو کچھ کیا تمہارے کہنے پر کیا..... جب میں اسے سب کچھ بتاؤں گی تو وہ ضرور مجھے بھی معاف کر دے گی..... میں اسے بتا دوں گی کہ چونکہ میں تم سے محبت کرتی تھی اس لیے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کر سکی اور ہر محبت کرنے والے کی طرح مجھے تمہاری ہر بات سچ لگتی تھی کہ تم صرف مذاق.....“

”میں کہہ رہا ہوں نا..... اس کی ضرورت نہیں ہے، تم ایمل کے گھر نہیں جاؤ گی۔“ بابر نے سختی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ لیکن وہ اس کے لہجے کی سختی سے متاثر ہوئے بغیر بولی تھی۔

”کیوں نہیں جاؤں گی؟ تم چاہتے ہو کہ ساری زندگی اس بوجھ کے ساتھ جیوں کہ میں نے وہ کام کیا جو شیطان کا شیوہ ہے، میاں، بیوی کے درمیان جدائی ڈالنے کا کام..... میں نے ایک ہتے بستے جوڑنے کا گھر برباد کیا..... میں ضرور جاؤں گی بابر بلکہ ابھی جاؤں گی اور ایمل کو سب لفظ، لفظ بتا کر معافی مانگوں گی..... میں اپنے ضمیر پر یہ بوجھ لے کر نہیں جی سکتی۔“ وہ تیزی سے ریٹورنٹ کے دروازے کی طرف بڑھی تھی اور بابر نے جھلا کر ویٹر کو آواز دے کر بل لانے کو کہا تھا اور پھر پلیٹ میں بل کی رقم رکھتا تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا۔ وہ اپنا آخری پتا کھیل کر تیزی سے باہر جا رہی تھی..... اس وقت حقیقتاً وہ دُہرے عذاب میں تھی۔ بابر نے اس سے شادی نہیں کرنا تھی اس نے اسے استعمال کیا تھا اور وہ اپنی خواہشوں کی طلب میں استعمال ہو گئی تھی اور اس نے ایک گھر اجاڑ دیا تھا صرف بابر کے ساتھ اپنا گھر بنانے کی چاہ میں اور اس کا گھر پھر بھی نہیں بن سکا تھا۔

آنسو اس کے حلق میں گر رہے تھے۔ اس نے اپنی چال چل لی تھی..... نہیں جانتی تھی کہ نتیجہ کیا نکلے گا لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ بابر کو بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔
 ”سنو تو عنبرین پلیز رکو تو.....!“ بابر نے قریب آتے ہوئے کہا تھا۔

وہ ذرا کی ذرا کی تھی۔

”کیا سنو.....؟“ اور پھر تیز تیز چلنے لگی تھی۔

"I love you Ambreen I am really love you"

اب وہ اس کے ساتھ، ساتھ چل رہا تھا۔

”میں نے بھی تم سے بہت محبت کی ہے، بہت چاہتی ہوں میں تمہیں، میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ لیکن خیر اب اس ذکر کا کیا فائدہ.....“ اس نے لمحے بھر کے توقف کے بعد پھر کہا تھا۔

”ایمل اور مدثر مجھے معاف کر دیں گے تو کم از کم دل پر دہرایہ بوجھ تو کم ہو جائے گا۔ تم ایمل کے ساتھ خوش رہو بابر میں.....“

”میں تمہارے بغیر کیسے خوش رہ سکتا ہوں۔“ بابر نے اس کی بات کاٹی تھی۔

”اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو میں بھی تم سے زیادہ تم سے محبت کرتا ہوں بغیر کسی غرض اور لالچ کے..... میں بھی تمہاری ہی رفاقت میں زندگی گزارنا چاہتا ہوں لیکن تم نے میری پوری بات سنی ہی نہیں اور اٹھ کر چل دیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں ایمیل کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ کیونکہ وہ میری ماں کی سگی بھانجی ہے اور پھر میری ہی غلطی سے اس کا گھر ٹوٹا..... لیکن میں تم سے بھی شادی کروں گا۔ عبرتیں بس تمہارے ساتھ شادی کے لیے میرے والدین رضامند نہیں، اس شادی میں ان کی مرضی شامل نہیں ہوگی..... میں اکیلا آؤں گا تمہاری اماں سے تمہارا ہاتھ مانگنے..... تم جانتی ہو میں دو بیویوں کو افورڈ کر سکتا ہوں..... مجھے تم سے ہی پوچھنا تھا کہ اس صورت حال میں کیا تم مجھے قبول کر لو گی..... تمہاری اماں کوئی اعتراض تو نہیں کریں گی؟“

”میں اماں کو منالوں گی۔“

”تو ٹھیک ہے، میں کل ہی تمہاری اماں سے ملوں گا۔“

”کل کا مطلب کل ہی ہے نا میں زیادہ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی اور اسے بات مکمل کرنے کی ضرورت نہیں تھی وہ جو بات بابر کو سمجھانا چاہتی تھی وہ جانتی تھی کہ بابر نے وہ بات سمجھ لی ہے..... اماں کو راضی کرنا مشکل نہ تھا..... انہوں نے بہت پہلے ہی اس کے معاملات سے ہاتھ اٹھالیا تھا..... تاہم اس نے اماں کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ بابر جب اس کا رشتہ مانگنے آئے تو وہ اسے دو تین دن کے اندر، اندر نکاح کرنے پر مجبور کریں..... کیونکہ ایمیل سے شادی کرنے کے بعد ممکن تھا کہ بابر اس سے شادی نہ کرتا..... ابھی ایمیل کی عدت پوری ہونے میں کافی دن تھے اور وہ بابر کو مجبور کر سکتی تھی..... وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے پتے کھیل رہی تھی اور اسے پچاس فی صد تو کامیابی کی امید تھی ہی لیکن بابر نے اماں کی بات مان لی کہ وہ اسی ہفتے اس سے نکاح کر لے گا تو لمحے بھر کے لیے اس کا جی چاہا تھا کہ وہ بابر کو منع کر دے اور ایمیل کو جا کر سب کچھ سچ، سچ بتا دے کہ وہ جس سے شادی کرنے والی ہے وہ کس قدر سازشی اور دھوکے باز ہے لیکن پھر جذبے پر خود غرضی کا جذبہ غالب آ گیا تھا..... ایک شاندار زندگی اس تک گلیوں والے محلے سے دور کسی پوش علاقے میں..... بابر جیسے امیر ہم سفر کے ساتھ..... یہی خواب تو دیکھا تھا اس نے اور اب جب اس کا خواب اس کی دسترس میں تھا وہ کیا بے وقوفی کرنے والی تھی۔ غلطی ایمیل کی بھی تو تھی نا..... اس نے کیوں اپنے شوہر پر بھروسہ نہیں کیا اور آنکھیں بند کر کے دوسروں کی بات پر بھروسہ کر لیا۔

اس نے اپنے ضمیر کو سلانے کی کوشش کی تھی اور اس میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

”ٹن، ٹن، ٹن! کلاک کی آواز پر چونک کر اس نے سہمی، سہمی نظروں سے اپنے سیل فون کی طرف دیکھا لیکن اس کا فون خاموش تھا اور اس کی اسکرین تاریک..... اس کی نظر سامنے دیوار پر لگے کلاک پر پڑی جو آخری بار ٹن کر کے خاموش ہو گیا۔ وہ پھر سہمی، سہمی نظروں سے فون کو دیکھنے لگی۔

اور فون کی طرف دیکھتے، دیکھتے اسے احساس ہوا کہ گھنٹے بھر سے اوپر ہو چکا ہے اور فون کی بیل نہیں ہوئی..... اب بابر اسے فون نہیں کر رہا تھا جبکہ پہلے تو دو، دو منٹ بعد بیل ہو رہی تھی..... بابر اسے فون کیوں نہیں کر رہا تھا..... ایک دم اس کے اندر کچھ کلک ہوا تھا اتنے سالوں میں وہ بابر کو اتنا تو جان ہی گئی تھی۔

وہ ایک دم اٹھی..... اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا..... اس میں موجود رقم کو چیک کیا۔ جوتے تبدیل کیے اور ہینڈ بیگ اٹھا کر اپنے فلیٹ سے باہر نکل آئی..... فون اس نے گھر میں ہی چھوڑ دیا تھا..... فلیٹ لاک کر کے وہ تیز تیز چلتی ہوئی روڈ تک آئی تھی..... اور ایک رکشا روک کر اس میں بیٹھ گئی۔

FOR NEXT EPISODE VISIT

PAKSOCIETY.COM (جاری ہے)

63 ماہنامہ پاکیزہ اکتوبر 2015ء

READING
Section

وہ طلب گار تھا

عنیقہ محمد بیگ

ہوئیں۔

”سب کچھ سامنے آ جائے گا مگر آپ..... آپ تو نظروں سے دور ہو جائیں گے.....“ اس نے قاسم کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

”اوہو..... مریم..... تم پریشان کیوں ہو رہی ہو..... میں تمہیں بھی بہت جلد وہاں بلا لوں گا..... ہم امریکا میں ایک بہترین گھر لیں گے۔“ قاسم نے پیار سے اسے تسلی دی..... اور اس کے ٹھنڈے برف ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مسلنے لگا..... جو جانتا تھا کہ مریم اس سے جدا ہونے کے تصور سے ڈر رہی ہے۔

”قاسم..... مجھے کچھ نہیں چاہیے..... بس آپ مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔“ آخر کار اس نے روتے، روتے وہ بات کر ڈالی..... جس کا اسے ڈر تھا۔

”مریم..... تم پریشان کیوں ہو رہی ہو..... میری جان..... میں تمہارے لیے بلکہ ہم دونوں کی زندگی کی تمام خواہشات پوری ہوں..... صرف اس لیے امریکا جانا چاہتا ہوں اور امریکا جانے کا خواب تو میں کب سے دیکھ رہا تھا تمہیں ڈرنے کے بجائے خوش ہونا چاہیے کہ میرا خواب پورا ہوگا۔“ قاسم نے اس کے گالوں کو چھوا..... جس پر موٹے نمونے آنسو آگرے تھے۔

وہ پھر چپ سی رہ گئی..... اور اسے چپ ہی رہنا پڑا۔ دونوں فیملیز اس کے امریکا جانے پر بہت خوش ہوئیں۔ بس صرف اس کا تنہا دل ہی تھا..... جو چیخ، چیخ کر رہا تھا..... دل کا درد اتنا بڑھ گیا..... کہ آخر اس

وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی..... اپنے اس عمل پر وہ پریشان بھی تھی۔ ہر تکلیف سہنے کے بعد پھر اچانک کیسے اس کا دل بے چین سا ہو گیا..... کاش محبت کا ٹھکانا دل کے بجائے آنکھوں پر ہوتا..... جب دل کرتا جی بھر کر رو، رو کر محبت کو دھکے دے کر نکال دیا جاتا..... اور پھر زندگی کا سفر پرسکون سا ہو جاتا..... مگر زندگی میں سکون ہی سکون ہو..... تو شاید وہ زندگی، زندگی نہیں ہوتی۔

اس نے بھی تو ایک پرسکون زندگی کا خواب دیکھا..... ”وہ“ اور صرف وہ ہو..... مگر شاید وہ اس کی قسمت میں تو تھا..... مگر صرف اس کا..... صرف اس کا نہ بن سکا۔ وہ کتنی چاہت سے اس دن تیار ہو کر بیٹھی تھی..... جب اچانک اس خبر نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی۔

”مریم..... مریم..... میرا امریکا جانے کا بندوبست ہو گیا.....“ وہ خوشی سے کمرے میں داخل ہو کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

اس کے ہاتھ پاؤں بخ ٹھنڈے ہو گئے..... ابھی شادی کو دوسرا مہینہ تھا اور ابھی سے جدائی..... وہ ڈر سی گئی۔

”مریم آج میں بہت خوش ہوں..... اب میں تمہیں دنیا کی ہر خوشی دے سکوں گا..... مہنگے، مہنگے کپڑے..... قیمتی جیولری..... میک اپ..... گھر جو تم لینا چاہو گی بس حکم کرنا..... سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے گا۔“ قاسم پر جوش ہو کر اس کے بازوؤں کو تھام کر گول، گول گھومنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہو

READING
Section

64 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

اہمیت چیزوں کی خود بخود آجائے گی۔“ فرخندہ نے بھی لفظ چبا، چبا کر اپنے برے وقت کو یاد کر کے جواب دیا۔ جب سگی ماں اس کی بات پر متفق نہ تھی تو ساس کہاں سے ہوتی۔ فاطمہ حیات تو پھولے نہ سار ہی تھیں..... وہ تو اس محبت کی شادی پر پہلے ہی خوش نہ تھیں..... کیسے انہوں نے اپنے بیٹے کی خوشی کو قبول کیا تھا، یہ اللہ ہی جانتا ہے..... مریم کو یوں لگ رہا تھا انہیں پیسوں کی اصل ضرورت نہیں..... بلکہ وہ دونوں کے درمیان ہونے والی جدائی سے خوش ہیں..... آخر کار پھر جدائی کا موسم آ گیا..... اور پھر یہ جدائی کا موسم اس کا نصیب بن کر رہ گیا..... قاسم نہ اسے امریکا بلوایا..... اور نہ خود آسکا..... اب وہی لوگ طرح، طرح کی باتیں اڑانے لگے..... کسی بھی خاندانی تقریب میں وہ سب کی نظروں میں رہتی..... کوئی کہتا۔ ”قاسم نے وہاں شاید..... دوسری شادی کر لی ہے۔“ تو کوئی اسے چالاک سمجھتا..... کہ ”پیسوں کی خاطر میاں کو پردیس بھیج دیا۔“ وہ کوئی اچھا لباس پہن

نے اپنی ماں سے بات کر ڈالی..... مگر الٹا فرخندہ اس پر برس پڑیں۔

”مریم..... تم پاگل ہو، شکر کرو اللہ کا..... جس نے تمہیں بے شمار مصیبتوں سے بچالیا۔ قاسم امریکا جائے گا تو ضرورت کی ہر چیز تمہیں آسانی سے مل جائے گی۔ اپنی دوسری بہنوں کا حال دیکھو..... پیسے، پیسے کو ترستی ہیں، مہینے کے شروع میں ہی ان کے چہرے بچھ جاتے ہیں کہ کس طرح گزارہ ہوگا اور تم اس فائدے پر آنسو بہا رہی ہو۔“ ماں کی جلتی باتیں اسے مزید پگھلا سی گئیں..... اور وہ پھٹ پڑی۔

”آپ کے نزدیک تو صرف چیزیں ہی ہمیشہ اہم رہی ہیں..... اور رہیں گی بھی.....“ اس کے آنسو اٹپکے جب اس نے اپنی ماں کا ماضی یاد کیا۔

”ہاں، ہاں میرے لیے چیزیں ہی ہمیشہ اہم رہی ہیں۔ جب تمہاری جیٹھانی، دیورانی تم سے اچھا لباس، اچھا کھانا، اچھی چیزیں استعمال کریں گی تو



مجرم ثابت ہونے لگی..... کہ اس نے ہنستا ہنستا گھرا پنا تباہ کیا ہے گھر تو شوہر کے ساتھ ہوتا ہے..... جب شوہر ہی اس کے پاس نہیں..... تو گھر کیسا؟

مگر اس کے احساسات کو کوئی نہیں سمجھ پایا..... اور سب سے پہلا طعنہ اس کی اپنی سگی ماں نے دیا..... تو وہ کانپ کر رہ گئی۔ اس دن نہ جانے اس سے کیسے ہنڈیا میں نمک تیز رہ گیا..... تو فرخندہ پھٹ پڑیں۔

”اپنے میاں کی کمائی ہونی تو تمہیں پیسوں کی قدر ہوتی..... سالن کا ستیاناس کر دیا.....“ فرخندہ نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ بھی چپ نہ بیٹھی..... اور غصے سے چیخ اٹھی۔

”ہاں آپ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں..... پیسوں کی قدر مجھے کیسے ہوگی..... میرے سارے پیسے تو آپ نے اکرم بھائی کے کاروبار میں جو لگوادے..... مجھے پیسوں کی قدر ہوتی تو اپنے سگے بھائی کی مدد کبھی نہ کرتی۔“ اس نے بھی غصے سے اپنا احسان یاد کروادیا۔

”ہاں، ہاں میں تمہارا مطلب سمجھ گئی ہوں..... اکرم تمہارے پیسے جلد لوٹا دے گا.....“ فرخندہ بیٹے کے نام پر نظریں چرانے لگیں۔ اب وہ بیچاری بھی کیا کرتیں..... انہیں اپنی بہوؤں کا ڈر تھا کہ کہیں اس سالن کی بات پر جھگڑا نہ ہو جائے..... وہ بیٹی کو اس بات کا احساس دلانا چاہتی تھیں مگر ان کا رویہ درست نہیں تھا۔ بہوؤں نے بھی اس مسئلے پر فتنہ اٹھا دیا..... وہ فتنہ کیوں نہ اٹھائیں فرخندہ بیگم بھی تو ان کی چھوٹی، چھوٹی غلطیوں پر گھر سر پر اٹھا لیتی تھیں۔ بہوؤں نے بہت شور مچایا..... تو انہیں بیٹی کا ساتھ دینا پڑا اور آخر کار بیٹوں نے یہ فیصلہ دیا..... کہ گھر میں دو ہنڈیاں بنالی جائیں۔ جس پر فرخندہ مزید پریشان سی ہو گئیں۔ دو ہنڈیا والی بات تو وہ کسی بھی طرح ہضم نہیں کر پائیں..... اور انہوں نے بیٹی کو ہی باورچی خانے میں جانے سے روک دیا۔

”اماں..... یہ میرا بھی گھر ہے۔“ اس کی آنکھوں میں نمی بھر آئی۔ جب اسے باورچی خانے

لیتی تو کھسر پھسر چل پڑتی۔ ”نہ جانے کس کے لیے جتنی سنورتی ہے.....“ کہیں باہر گھومنے پھرنے اپنے بھائیوں کے ساتھ چلی جاتی تو بھائیوں کی سرگوشیاں شروع ہو جاتیں..... ”کتنی سخت دل لڑکی ہے، میاں بیچارہ پر دیس کاٹ رہا ہے اور یہ سیر و تفریح اور شاپنگ کرنے میں لگن ہے۔“ ہر ایک کو اب اس کی ذات پر انگلیاں اٹھانے کی عادت ہو گئی تھی..... سسرال میں دیورانی، جیٹھانی اسے خاطر میں نہ لاتیں، اس کی وجہ کہ اس کا شوہر اس کے پاس نہیں ہے اور نہ اس کے بچے ہیں..... گھر بھر کا سارا کام اس کے سر پر سونپ دیا جاتا اور کسی کو بھی احساس نہ ہوتا کہ وہ اکیلی کام کر رہی ہے بلکہ اسے کاموں میں مشغول رکھنے کی بات اس لیے ہوتی..... کہ اس کا دل گھر سے اچاٹ نہ ہو جائے..... اپنی جان سے زیادہ کام کرنے کی عادت نے آخر کار اسے بیمار کر دیا..... کاموں سے جان تو چھوٹ گئی مگر جیٹھانی اور دیورانی کے منہ سوچ گئے۔ وہ سسرال کی پریشانیوں سے دور میکے آ بیٹھی تو بھائیوں کے طعنے..... بھائیوں کے رویے بدل گئے۔ کافی وقت ان مسائل کا وہ خاموشی سے مقابلہ کرتی رہی..... مگر پھر پانی اس کے سر سے گزر گیا۔ اس کے اپنے دیور سے بے تکلفی کو الٹا رنگ دیا جانے لگا..... وہ اس بات پر اپنے شوہر کے فون آنے پر لڑ پڑی کہ اب وہ مزید تنہا نہیں رہ سکتی..... اس جھگڑے کی وجہ سے گھر میں الگ مسئلہ آکھڑا ہوا..... جس پر سارا قصور مریم پر ڈال دیا گیا..... اور یوں سسرال والوں کے ساتھ اس کی ناراضی چل پڑی۔ آخر کار مجبور ہو کر وہ میکے آ بیٹھی۔ ماں نے مجبوراً اس کا ساتھ دیا..... باقی بھائیوں، بہنوں اور بھائیوں نے طرح، طرح کی باتیں شروع کیں..... اگر تھوڑا لحاظ بھائیوں نے رکھا تو اس کی وجہ اس کا پیسہ تھا..... مگر بد قسمتی سے اس کا خرچ بند ہو گیا..... قاسم کے گھر والوں نے نہ جانے ایسی کیا، کیا باتیں اس کے دماغ میں بھروسے کہ قاسم نے فون کرنا چھوڑ دیا۔ خرچ بند ہوا..... تو ہر کسی اصلیت کھلنے لگی۔ وہ بے قصور ہو کر

فیصل
 وہ مجھ سے حساب کتاب چاہتی ہے
 جس نے خود
 میٹرک میں میٹھ کی سپلی دی ہے.....!
 از: فردوس شاہی، لاڑکانہ

ساحل پہ گھر
 ابھی ہوئی ذات کو پانے کی ضد نہ کرو
 جو نہ ہو اپنا اسے اپنانے کی ضد نہ کرو
 اس سمندر میں طوفان بہت آتے ہیں فراز
 اس کے ساحل پہ گھر بنانے کی ضد نہ کرو
 مرسلہ: سیدہ غزالہ عالم، لائڈھی، کراچی

سرگوشیاں چل پڑیں۔
 ”بہت شوق سے سسرال چھوڑ کر آئی تھی.....
 اب میاں کی قدر آرہی ہے۔ ہم بھی تو اپنی، اپنی
 سسرال میں بیٹھی ہوئی ہیں..... ہر طرح کی مصیبتیں آتی
 ہیں..... مگر کبھی میکے جا کر بیٹھنے کا نہیں سوچا.....“ یہ وہ
 بھابی تھیں جس کی ہر پریشانی میں اس نے ان کا ساتھ
 دیا تھا۔

”ہمیشہ ہمیں جلانے کے لیے مہنگے سے مہنگے
 کپڑے پہنتی تھی..... اب کہاں سے کپڑے خرید سکے
 گی.....“ دوسری نے بھی تیکھے لہجے میں اس کا مذاق
 اڑایا..... یہ وہ بھابی تھیں..... جنہیں اس نے کتنے
 کپڑوں کے تحائف سے نوازا تھا..... اس کی آنکھوں
 سے آنسو برسنے لگے... وہ جو دھلے ہوئے کپڑے تار
 سے اتار کر بیڑھیاں اتر رہی تھی..... پر بھابیوں کی...
 سرگوشیاں سے وہاں بت بنی کھڑی رہ گئی۔

”اُف خدایا..... میرے سامنے تو وہ بار، بار اپنا
 پرس کھولتی تھی..... اور نیلے، نیلے لال، لال نوٹوں سے
 میری غربت کا مذاق اڑاتی تھی..... اب نہ رہا پرس.....
 اور نہ رہے وہ کرارے نوٹ.....“ سب سے چھوٹی والی

میں جانے سے روک دیا گیا..... تو وہ اپنا حق جتانے لگی۔
 ”شادی کے بعد لڑکی کا گھر اس کے شوہر کا گھر
 ہوتا ہے اور تمہارے نصیب میں وہ گھر نہیں لکھا..... اس
 لیے جیسا میں بول رہی ہوں بس وہی کرو..... وہ
 تمہارے حق میں بہتر ہے۔“ فرخندہ نے بیٹی کے دل کا
 لحاظ نہ کیا..... اور دو ٹوک بات کر ڈالی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے..... ماں
 جیسا انمول.... رشتہ بھی اس کے لیے پرایا ہو جائے
 گا..... ایسا تو کبھی اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے
 آنسوؤں سے وہ پکھل سی گئیں..... اور پھر روتے
 روتے بولیں۔

”میں یہ سب کچھ تمہارے لیے ہی کر رہی
 ہوں..... دو ہنڈیا بن جائیں گی تو تمہاری بھابیوں کے
 سر سے میری ذمے داری اتر جائے گی..... اور جب
 ذمے داریاں ان کے سر سے اٹھالی جائیں گی..... تو وہ
 ہمیں کسی خاطر میں نہیں لائیں گی..... اور ایک دن ایسا
 آئے گا..... کہ وہ مجھے اور تمہیں اس گھر سے باہر نکال
 پھینکیں گی.....“ فرخندہ نے اپنے دل کا ڈرا آخر کار بیٹی
 کو سنا دیا..... جس پر اس کے آنسو تو تھم گئے..... مگر دل
 سہم کر رہ گیا..... کہ اس نے یہاں آ کر زندگی کی سب
 سے بڑی غلطی کر دی ہے۔

ایک مہینہ گزر گیا..... مگر قاسم کا فون نہ آیا.....
 تو وہ بہت پریشان سی ہو گئی..... اپنا دکھ..... اپنے
 آنسوؤں کو چھپا، چھپا کر وہ مرجھاسی گئی۔ آخر کار اس کی
 بچپن کی سہیلی ایمان نے اسے سمجھایا..... کہ اگر قاسم نے
 فون کرنا بند کر دیا ہے تو وہ قاسم کو خود فون
 کر لے..... ایمان کی باتوں کو سوچ کر آخر کار اس نے
 فون کر ڈالا..... مگر دوسری طرف فون پک نہ ہوا..... وہ
 مزید پریشان سی ہو گئی..... اور اس بات پر رونے
 لگی..... وہ رو رہی تھی۔ جب اچانک اس کے بھتیجے
 بھتیجیاں کھیلتے، کھیلتے اس کے کمرے میں
 آگئے..... بچوں نے اسے روتے دیکھ لیا..... تو اس کی
 حالت کا گھر والوں کو علم ہو گیا..... بھابیوں کی

جس اذیت میں وہ رہی ہے..... اس کا حساب اسے کون دے گا..... کسی نے اس سے پوچھا تک نہیں..... کہ کیا وہ جانا بھی چاہتی ہے یا نہیں.....؟ اس کی ماں کی تیاریوں سے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے جلد رخصت کر دینا چاہتی ہیں۔ اگر کوئی خوش نہیں تھا تو وہ اس کی بھابھیاں تھیں..... جنہوں نے ایسا کبھی سوچا ہی نہیں تھا..... کہ قاسم اسے لینے بھی آسکتا ہے..... اور آخر کار وہ وقت آ گیا..... جب وہ ظالم شخص اس کے سامنے تھا..... اس کے کمرے میں.....

”مریم میں آخر کار سب کچھ چھوڑ کر آ گیا ہوں..... جیسا تم چاہتی تھیں۔“ اس کے لہجے میں شرمندگی تھی..... جیسے زندگی کی تمام عیاشی کر لینے کے بعد وہ لوٹا تھا۔

”آپ میرے لیے امریکا چھوڑ کر نہیں آئے.....“ اس نے غصے سے کہا۔ وہ یک دم آ کر اس پر کیسے اپنا حق جتلا سکتا تھا۔ جس نے کبھی اس کا فون پک کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

”میں تمہاری ناراضی سمجھتا ہوں..... مگر اب میں آ گیا ہوں ناں تو سب کچھ ٹھیک کر دوں گا.....“ قاسم نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہا۔

”نہیں، نہیں..... آپ پلیز مجھ سے دور رہیں۔“ وہ ایک دم پیچھے کو ہٹی..... اب اس کی آنکھوں میں نمی بھر آئی۔

”تم میری بیوی ہو..... اور میرا تم پر پورا حق ہے.....“ اب کہ اس نے خفگی ظاہر کی..... اس کے یوں پیچھے ہٹ جانے پر قاسم نے اپنی بے عزتی محسوس کی۔

”ہاں، میں آپ کی بیوی ہوں..... مگر صرف نام کی۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو اٹپکے۔

”نام کی..... ہاں..... نام کی تو ہو.....“ اس نے بھی دہرایا۔

”اماں سچ ہی کہتی تھیں۔ تمہارے تیور بدل گئے..... میرے جانے کے بعد یہاں تک کہ تم نے میرے چھوٹے بھائی.....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا.....

بھابی نے تیکھے لہجے سے اس کی گم گشتہ امیری کا پرچار کیا..... اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا..... کہ وہ اپنی دولت کو دکھائے..... اس کے نزدیک اس کی چھوٹی بھابی..... اس کی بہن جیسی تھی..... بھابیوں کی ان باتوں سے اسے اندازہ ہوا..... اس کی زندگی کوچنگ میں بہت بری نظر لگی ہے..... مگر وہ کر کیا سکتی تھی..... رونے کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

پانچ سال کیسے گزر گئے..... کوئی نہیں جان پاپا..... صرف وہ تنہا اس سفر کی تکلیف کو سمجھ پائی..... پانچ سالوں میں قاسم کی کوئی کال نہ آئی..... اور نہ ہی اس نے کبھی اس کا فون اٹھایا..... اس کی سرال والوں سے اسے جب یہ خبر ملی..... کہ قاسم نے امریکا میں دوسری شادی کر لی ہے..... تو اس نے اپنا فون بند کر دیا..... اور پھر کبھی اس نے وہ فون آن نہیں کیا..... ان پانچ سالوں میں کتنی دفعہ اس کی ماں نے اس کی ساس فاطمہ سے طلاق کا مطالبہ کیا تھا..... مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہ مل سکا..... اور جب بھائیوں تک طلاق کی بات پہنچی..... تو وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے..... کہ خاندان میں بدنامی ہو جائے گی..... اور ان کی بچیوں پر بھی انگلیاں اٹھنے لگیں گی..... ان کے نزدیک اسے صرف قاسم کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے..... انتظار ایسا..... جس کی کوئی مدت نہیں..... بس اسے اس ظالم شخص کا انتظار کرنا ہوگا۔ جس نے کبھی اس کو ٹوٹ کر چاہا تھا..... چھٹے سال اس کی دعا اللہ نے سن لی..... جب اس کی ماں نے اسے خبر دی..... کہ قاسم پاکستان لوٹ کر آ گیا ہے..... اور اس کی ساس کا فون آیا ہے..... کہ وہ لوگ اسے لینے کے لیے آرہے ہیں۔

”چھ سال کے بعد..... وہ کیسے لینے آسکتے ہیں..... کس حق سے.....“ اس کا دل چیخ، چیخ کر اس سے پوچھنے لگا..... مگر اس کے دل نے یہ جرات نہ کی..... کہ وہ اپنی ماں سے پوچھے..... کہ گزشتہ چھ سال.....

READING
Section

68 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

انگلیاں جو اس کے وجود پر اٹھتی تھیں اب ان کے جھکنے کا وقت آ گیا تھا۔

اس نے اپنے آنسوؤں کو پونچھا..... اور کمرے سے باہر آ گئی..... وہ سب لوگ اس کی ماں کے کمرے میں بیٹھے تھے..... قاسم نے شاید انہیں اس کا فیصلہ نہیں سنایا تھا..... جس کی وجہ سے وہ خوش دکھائی دے رہے تھے..... اچانک اس کی ماں نے اسے کمرے سے باہر دیکھا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔

”آؤ بیٹی آؤ..... آ جاؤ..... دیکھو تو سب لوگ تمہیں تمہارے گھر لے جانے کے لیے آئے ہیں۔“ اس نے اپنی ساس کو سلام کیا..... جنہوں نے پیار سے اسے گلے سے لگایا..... اور شائستگی سے بولیں۔

”میں اپنی بہو کو نہیں..... بلکہ اپنی بیٹی کو واپس لینے آئی ہوں۔“

اس کا دل چیخنے لگا..... سب جھوٹ ہے..... اس ظالم شخص کی وجہ سے سب رشتے تمہارے بن رہے ہیں۔ تمہارا اپنا وجود کچھ نہیں۔ وہ خاموشی سے اس کے پاس جا بیٹھی۔ جو سر جھکائے بیٹھا تھا اور فکر مند دکھائی دے رہا تھا..... قاسم کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا..... کمرے میں تو مریم نے اسے چھوڑنے کی بات کی تھی پھر اب یہاں..... اس کے ساتھ.....

”آپ یہاں سے اکیلے نہیں جائیں گے۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔“ اس نے نہ چاہ کر بھی اس کے کان میں سرگوشی کی..... مریم کے ان لفظوں سے اس کا بچھا چہرہ روشن ہو گیا..... اور وہ پیار سے مریم کو دیکھنے لگا۔

وہ بھی اسے دیکھ کر مسکرائی..... کیونکہ چور نظروں سے اس کی بھابھیاں اس کی جیٹھانیاں، دیورانیاں اسے دیکھ رہی تھیں..... جو ہمیشہ کی طرح جل بھن کر رہ گئیں کیونکہ اس کی زندگی سے اندھیرے کے بادل اس ظالم شخص نے بل میں ہی مٹا دیے تھے..... پھر وہ ظالم شخص معافی کا طلب گار ہی تو تھا..... تو اسے معافی دینی ہی پڑی۔



توڑ دیا تھا۔

”خبردار..... جو آپ نے بھی مجھ پر اتنا گھٹیا الزام لگانے کی کوشش کی..... اور اگر آپ کو یہ بات سچ لگتی ہے تو کیوں مجھے آزاد نہیں کیا..... اور آخر وہ بات آپ کی زبان پر آٹھری..... آپ ابھی اسی وقت مجھے طلاق دے دیں۔“ اس کے چھ سال کا صبر ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔ اور وہ غصے سے اسے گھورنے لگی۔

”سنو مریم.....“ وہ اس کے رونے پر پریشان سا ہوا..... اور اس کی طرف بڑھا۔

”آپ مجھے آزاد کر دیں..... بس آزاد کر دیں۔“ وہ چیخی۔

”اچھا ٹھیک ہے..... بہت جلد آزاد کر دوں گا۔“ وہ غصے سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

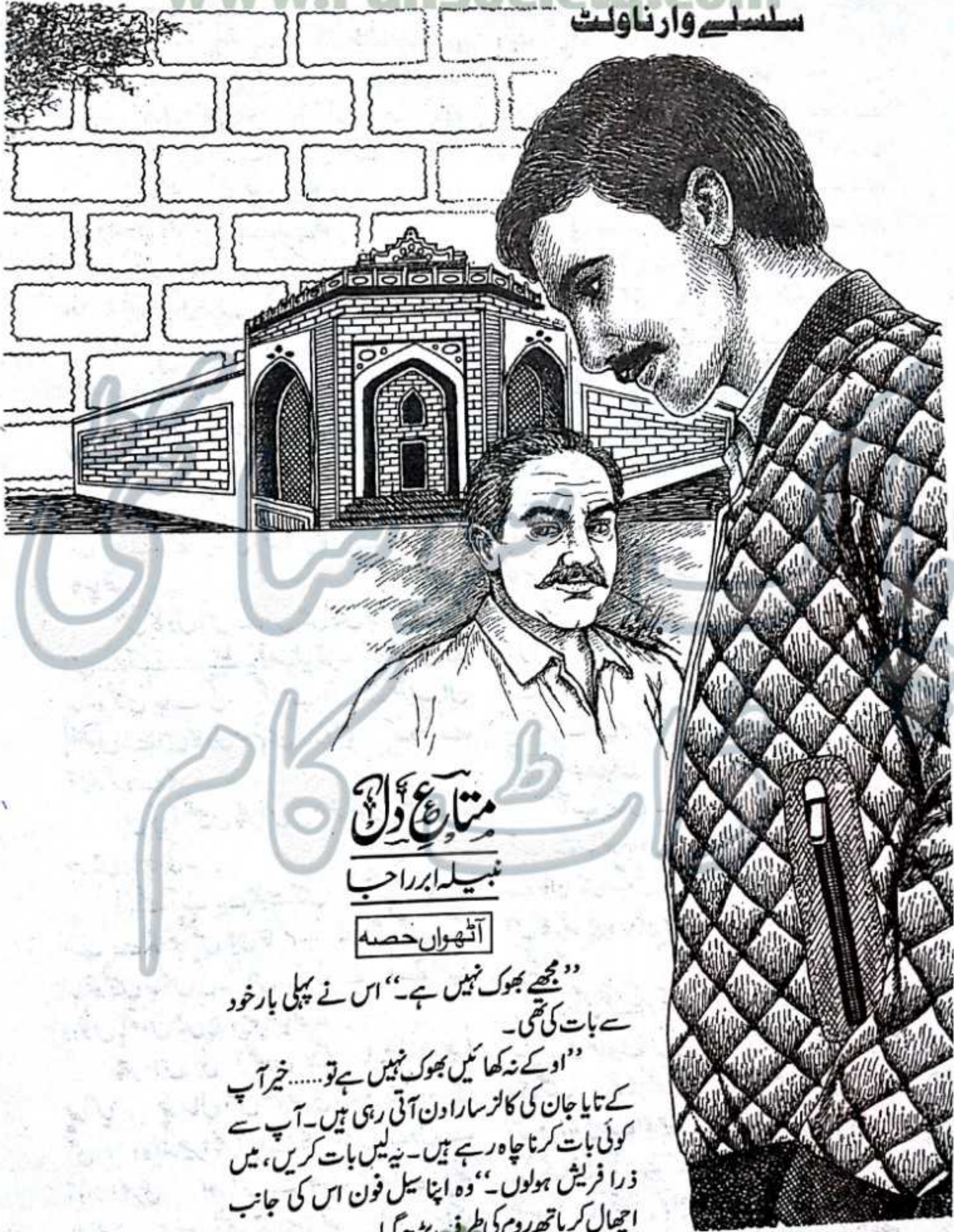
جتنے قدم اس نے کمرے سے باہر نکالنے میں اٹھائے تھے..... اتنی دفعہ اس کا دل زور، زور سے کانپا تھا۔

اس کا دل اس کے بس میں نہیں تھا۔ جس نے اس کے آنے سے پہلے یہ فیصلہ لیا تھا..... کہ وہ اس کے ساتھ نہیں جائے گی..... مگر اب اس کے صرف ان لفظوں سے اس کا دل موم بن کر رہ گیا..... کہ وہ اسے آزاد کر دے گا۔

اس کی آنکھیں پھر اس کی منتظر ہونے لگیں۔ وہ منہ میں بڑبڑائی۔

”مجھے آپ سے محبت نہیں..... آپ دنیا کے سب سے ظالم شخص ہیں قاسم..... میں کبھی آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ اس نے روتے، روتے اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا تھا۔

پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا..... چھ سال جس اندھیری زندگی میں وہ رہی تھی..... وہ اندھیرا پھر آ جائے گا..... اس کے دل سے آواز ابھری..... اور اس نے جھٹ سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے..... اسے روشنی میں جینا تھا..... اور یہ روشنی اسے صرف اسی کے نام سے مل سکتی تھی..... ہزار



میتاؤں دل پئی

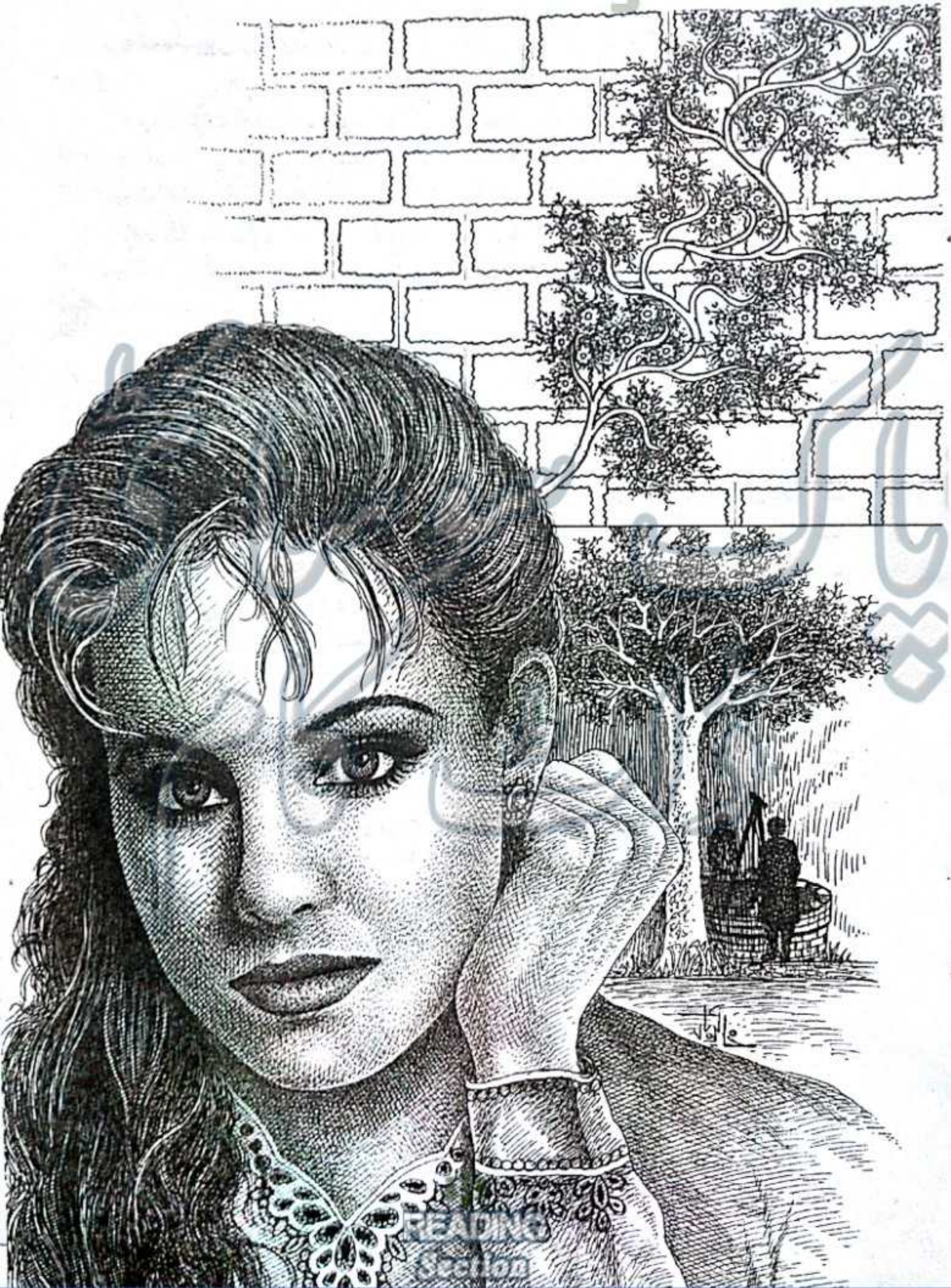
نبیلہ ابرار احب

آٹھواں حصہ

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے پہلی بار خود سے بات کی تھی۔

”اوکے نہ کھائیں بھوک نہیں ہے تو..... خیر آپ کے تایا جان کی کالز سارا دن آتی رہی ہیں۔ آپ سے کوئی بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ لیس بات کریں، میں ذرا فریش ہوں۔“ وہ اپنا سیل فون اس کی جانب اچھال کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

ڈریکٹا کو نمبر معلوم کرنا اس کی نگزیب کا..... اس نے



بیمار ہے، وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ماڑہ بھابی بھی شادی کر کے اپنی دنیا میں گمن ہو گئی ہیں۔ کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے..... پپا وہاں اکیلے پڑے ہیں، وہ میری ذمے داری ہیں۔ پلیز آپ کو خدا کا واسطہ مجھے جانے دیں۔ مجھے یہاں اس طرح بند کر کے آپ کو کیا ملے گا۔ طیب کو کچھ ہو گیا تو.....“ اس کے بعد ڈریکٹا کی ہچکیاں بند گئیں۔ اس سے کوئی اور بات کی ہی نہیں جا رہی تھی۔

اشعر نے اس کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑوائے۔

”اوپر بیٹھ کے بات کریں۔ میں یہ سب پسند نہیں کرتا جس طرح ابھی آپ نے کیا ہے۔“ اشعر کا اشارہ پاؤں پکڑنے کی جانب تھا۔

”میں خلع کا کیس واپس لے لوں گی۔ رخصت ہو کے آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ بس ایک بار مجھے یہاں سے جانے دیں۔“ اس کی آنکھوں سے اشک باری ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ امید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اسے یقین ہو اس بار وہ انکار نہیں کرے گا۔

”آپ کو میں یہاں سے جانے دوں تاکہ آپ پھر میرے خلاف عدالت میں کھڑی ہو جائیں، اپنے تایا کے ساتھ۔ میری مردانگی کا مذاق اڑائیں۔۔۔ سرعام..... نہیں، میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔“

”آپ پلیز میرا یقین کریں، میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گی۔ میں خلع کا کیس واپس لے لوں گی اور رخصت ہو کے آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“ وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

”مجھے آپ کا، آپ کے تایا کا اعتبار نہیں ہے، ہاں آپ اگر اسٹامپ پیپر پر مجھے یہ لکھ کر دیں تو میں سوچ سکتا ہوں آپ کی واپسی کا..... ورنہ نہیں..... آپ میرے پاس ہی رہیں گی۔“

”میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں جو آپ کہہ رہے ہیں بس مجھے چھوڑ آئیں۔“ لجاجت کوٹ، کوٹ

نمبر ڈائل کیا۔ پہلی بیل پر ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ تایا اور نگزیب خود ہی تھے۔ ڈریکٹا بات کرتے ہوئے رو پڑی۔

”طیب کی حالت بہت خراب ہے۔ آج بھی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ تم اشعر سے کہو، اسے بتاؤ طیب کی حالت کا..... کسی طرح اسے راضی کر لو..... طیب کسی سے بھی چپ نہیں ہو رہا ہے۔“ تایا اور نگزیب بتا رہے تھے۔ وہ اسے کچھ ہدایات دے رہے تھے۔ وہ چپ ہو کے سن رہی تھی۔

اتنے میں اشعر نہا کے آ گیا تھا سیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کان سے لگا لیا۔ ”اس کی منت کرو، بتاؤ طیب کا۔“ انہیں نہیں پتا تھا کہ اب فون اشعر کے پاس ہے۔ وہ بولا تو انہیں پتا چلا۔

”ڈریکٹا کو واپس چھوڑ جاؤ۔ سارے خاندان میں بدنامی ہو رہی ہے ہماری۔ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہم۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں، اسے چھوڑ دو۔ ہمارے گھر میں مسائل بڑھ رہے ہیں۔ ڈریکٹا، عمر کی دیکھ بھال کرتی تھی، وہ اس سے مانوس تھا اب کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ تمہیں ہم سب پر رحم نہیں آتا؟“ وہ جذباتی بلیک میلنگ پر اتر آئے تھے۔

”آپ کی بدنامی کیوں ہو رہی ہے؟ کیوں آپ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے؟ ڈریکٹا میری بیوی ہے، میں اس کا جائز، شرعی شوہر ہوں، میرے پاس ہے وہ..... کسی غیر کے پاس نہیں جو آپ کی بدنامی ہو رہی ہے۔ باقی اب آپ کی ذمے داری ہے۔ آپ کے مسائل ہیں جس طرح بھی ان کو حل کریں..... مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔“ اشعر نے جھنجلاتے ہوئے فون بند کر دیا اور اپنے کیلے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

ڈریکٹا نے اچانک ایک ایسی حرکت کی جس کی توقع اشعر نہیں کر پارہا تھا۔

اس نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اشعر کے پاؤں پکڑ لیے۔

”پلیز مجھے گھر چھوڑ آئیں..... طیب بہت سخت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

”میں نے سوچ لیا ہے، پین دیں میں سائن کر دوں۔“ وہ دانستہ طور پر اور بھی آگے کی طرف ہو گئی۔ اشعر نے اسی پوزیشن میں پین جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ میں دیا۔ ڈریکٹا نے لرزتے ہاتھوں سے پین کو اچھی طرح دبا کے سائن کر دیے۔ اشعر اس کے کندھوں پر جھکا ہوا اس کے ہاتھوں کی حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ڈریکٹا نے دونوں کاغذوں پر سائن کر دیے۔ اشعر پیچھے سے اس کے سامنے آ گیا۔ ایک اشامپ پیپر اس نے اپنے پاس جیب میں ڈال لیا اور نقل ڈریکٹا کی طرف بڑھائی۔

”یہ آپ رکھ لیں، اپنے تایا جان کو دکھا دیجیے گا۔ اصل میرے پاس رہے گی۔“ اس نے لے کے رکھ لیا اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اشعر اس کے سامنے کھڑا تھا اسے بغور دیکھتا۔ اس نے اچانک ڈریکٹا کو بانہوں میں بھر لیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکلی۔

”نہیں.....“ اشعر نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ ”میں نے سائن کرنے سے پہلے پوری طرح سوچنے کا موقع دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا مجھے سب منظور ہے تو اب یہ احتجاج کیسا؟“ اس نے اپنے اور ڈریکٹا کے درمیان موجودہ فاصلے کو کچھ اور بھی کم کر دیا۔

”نہیں، نہیں.....“ ڈریکٹا نے اسے خود سے دور کرنا چاہا۔

”یہ ضروری ہے تاکہ آپ کو اپنا وعدہ یاد رہے۔“ ”مجھے یاد رہے گا سب کچھ۔“ ڈریکٹا کے حلق سے پھنسی، پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

”او کے پھر ٹھیک ہے اگر یاد رہے تو.....“ اشعر کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ وہ تڑپ کے دور ہوئی اور اپنی اتھل پتھل ہوتی سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اشعر نے پھر کوئی مزید بات نہیں کی اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ ڈریکٹا بہت تیزی سے سائنڈ پر ہوئی۔ اس

کر بھری تھی اس سے اس کے لہجے میں۔ ”خیر کل اشامپ پیپر مل جائے گا۔ سائن کر دیجیے گا اپنے... مزید اضافے کے ساتھ کہ اگر آپ کے تایا یا خاندان کا کوئی فرد آپ کے نکاح اور رخصتی کی راہ میں حائل ہو تو آپ کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لائیں گی اور میرا یعنی اپنے شوہر کا ساتھ دیں گی۔“

”مجھے منظور ہے ہر بات۔“ وہ جلدی سے یوں بولی جیسے نہ بولی تو اشعر اپنا ارادہ بدل دے گا۔

”آہم، آہم، خاصی فرمانبردار قسم کی بیوی ہیں آپ..... کل بتاؤں گا اتنی جلدی نہ کریں۔ سوچ لیں۔ میں کچھ بھی منظوری کے لیے دے سکتا ہوں۔“ اشعر کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

ڈریکٹا اس مسکراہٹ کو کوئی نام نہیں دے پائی۔ ”اب آپ مطمئن ہیں تو کھانا کھالیں۔ کل واپس چھوڑ آؤں گا آپ کو۔“

”سچ.....؟“ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کیا واقعی وہ اسے کل چھوڑ آئے گا۔ یعنی وہ پھر سے اپنوں کے پاس ہوگی۔ یہ تصور ہی کتنا سرور آگیا تھا۔ اس کی بھوک مارے خوشی کے اڑ گئی پھر بھی اس نے اشعر کی وجہ سے کھانا کھایا۔ عجیب سا آدمی تھا کہیں اپنا ارادہ بدل ہی نہ دیتا اگر وہ اس کے کہنے پر کھانا نہ کھاتی تو..... اس نے جلدی، جلدی کھانا کھایا۔

اشعر غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی خوشی میں اتنی مگن تھی کہ محسوس ہی نہیں کر پائی۔ اشعر اسی بیڈ پر سو گیا۔ ڈریکٹا بہت دیر بعد سوئی۔ کل کا دن اس کے لیے خوشی لے کر آنے والا تھا۔

☆☆☆

ڈریکٹا کے ہاتھ میں اشامپ پیپر تھا۔ اس پر لکھی تحریر اسے حرف بہ حرف ازبر ہو گئی تھی۔ اس نے کتنی بار پڑھا تھا۔

”اچھی طرح سوچ کے سائن کیجیے گا..... بعد میں سوچنے کی گنجائش نہیں ہوگی آپ کے پاس۔“ وہ پیچھے سے جھک کے بولا۔ ڈریکٹا کرسی پر بیٹھی تھی۔ اشعر عین

وہ ہنگامہ بکا اس کے الفاظ پر غور کر رہے تھے۔ وہ کیا کہہ گیا تھا۔ اور نگزیب تو سمجھ رہے تھے کہ اس نے ہار مان لی ہے تب ہی دُور یکتا کو خود یہاں چھوڑ کے گیا ہے۔

☆☆☆

دُور یکتا کو سب گھیرے بیٹھے تھے۔ شیریں کو عجیب سی کھد بھد لگی ہوئی تھی۔ دُور یکتا کے جسم پر وہی کپڑے تھے جو اغوا والے دن اس نے پہنے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے جنہیں ہاتھ سے ہی اس نے پیچھے کر کے سنوارنے کا فریضہ انجام دیا تھا۔ حالانکہ اشعر اس کے لیے کپڑے لے کر آیا تھا اس نے دُور یکتا سے کہا بھی تھا کہ ان میں سے کوئی بھی پہن لیں پر خوشی میں اسے اپنے ناگفتہ بہ حلیے کی فکر ہی نہیں رہی تھی۔ اشعر کے ساتھ آتے وقت اس نے پورے جسم اور سر کے گرد اچھی طرح چادر لپیٹ لی تھی جس نے اس کی ہیبت کمزائی کو چھپا لیا تھا۔

مگر گھر کی عورتوں کی نظروں سے کچھ بھی چھپ نہیں سکتا تھا۔ وہ دوراتیں اور تین دن اس کے پاس گزار کے آئی تھی۔ اشعر ایک صحت مند، تنومند نوجوان دُور یکتا کے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا تھا۔ ان دوراتوں اور تین دنوں میں کیا کچھ ہوا ہوگا۔ ان میں سے کسی کے لیے بھی یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھا۔ شیریں تائی، سائرہ کو پرے کرتی اس کے قریب آ بیٹھیں۔

”دُور یکتا، اشعر نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں۔“ شیریں نے اپنی طرف سے خاصی آہستہ آواز میں کہا تھا۔

پروہاں موجود فوزیہ اور فرح نے بھی سن لیا۔

”جی تائی، دھمکیاں دی تھی۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”ارے نہیں، میرا مطلب ہے اس نے کچھ ایسا ویسا تو نہیں کیا ناں.....“

شیریں نے ”کچھ ایسا ویسا“ اس انداز میں کہا کہ شرم سے وہ کٹ کے رہ گئی۔ بچی تو وہ بھی نہیں تھی جو بس پردہ مفہوم کو نہ سمجھ پاتی۔

کانڈ دیکھ کر شیریں سر پکڑ کے بیٹھی تھیں۔

حد درجہ احتیاط پر اشعر مسکرا دیا تھا۔

”اتنا برا ہوں میں۔“ وہ مصنوعی تاسف سے خود کو دیکھتے ہوئے بولا۔ دُور یکتا نے جان کے دروازے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

”چلیں آئیں میں گاڑی اشارٹ کرتا ہوں۔“ اس بار اس کے قدموں میں بجلی کی سی تیزی تھی، دُور یکتا ساتھ، ساتھ تھی اس کے۔ واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ اشعر اس کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

حویلی کے گیٹ پر متعین چوکیدار کو اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی اجنبی شخص کے لیے گیٹ کھولے اور اسے گھر کے اندر آنے دے..... پر گاڑی میں دُور یکتا کے ساتھ بیٹھے اس نوجوان کی شخصیت ایسی تھی کہ چوکیدار کو بغیر کوئی سوال پوچھے گیٹ کھولنا پڑا۔

دُور یکتا جب تک رہائشی حصے تک پہنچی سب کو اس کی آمد کا پتا چل چکا تھا۔ فوزیہ، فرح، شیریں، ماہرہ، سائرہ اور نگزیب، نوید سب ہی تو موجود تھے۔ دُور یکتا گھبرا سی گئی۔

اشعر اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں آیا۔ پہلی بار دُور یکتا کو اس کی موجودگی سے ڈھارس ملی۔ ورنہ سب کتنی عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ گھر سے بھاگ کے اشعر کے ساتھ گئی ہو۔

”تمہیں تو میں دیکھ لوں گا۔“ اور نگزیب، اشعر کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ شیریں نے ہاتھ دبا کے اشارہ کیا کہ بات نہ بڑھائیں جب وہ دُور یکتا کو خود یہاں لے آیا ہے تو..... اشعر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ کسی کے روئے میں گرجوٹی نہیں تھی۔ وہ کسی گرجوٹی کی توقع کر بھی نہیں رہا تھا۔

”او کے انکل..... انشاء اللہ بہت جلد ملاقات ہوگی۔ پاپا آپ کے پاس آئیں گے۔ شادی کی تاریخ لینے..... تب تک میری بیوی، میری امانت کی صورت میں آپ کے پاس رہے گی۔“ اس نے اور نگزیب

”اف اب کیا ہوگا؟“ انہیں سارا کھیل ہاتھ سے نکلتا نظر آ رہا تھا۔
 ”تانی، اشعر نے اس کاغذ پر مجھ سے سائن کروائے تھے۔“

”اف دُرّیکتا تم نے کیا کر دیا..... یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ شیریں نے اسے تاسف سے دیکھا۔
 ”تانی اس کے بغیر میرا وہاں سے آنا ناممکن تھا۔ تب میں نے سائن کیے۔“

”میں تمہارے تایا کو دکھاتی ہوں۔ اب تو کیس بھی واپس لینا پڑے گا۔ تمہاری بے وقوفی نے یہ دن دکھائے ہیں۔ ہم جیتی بازی ہار گئے ہیں۔“ شیریں کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔

”ویسے اشعر لغاری اور اس کی فیملی اس طرح کی لگتی تو نہیں ہے۔ جس طرح اورنگزیب بھائی بتاتے ہیں۔“ فوزیہ پر خیال انداز میں شیریں کے وہاں سے جانے کے بعد بولی تو فرح نے بھی تائید کی۔

”میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ عمر بھائی نے کچھ سوچ کر ہی وہاں بیٹی دی ہے۔ اب کس قدر بدنامی ہوئی ہے۔ پورے خاندان کی اس ایک غلط فیصلے کی وجہ سے۔ اشعر بے شک شوہر ہے دُرّیکتا کا اگر اسے ساتھ لے گیا ہے تو..... پر یہ طریقہ تو قابلِ تعریف نہیں ہے۔ اب دُرّیکتا کے بارے میں جو باتیں ہو رہی ہیں میری بیٹی کے بارے میں کوئی کرتا تو میں مارے شرم کے کسی کا سامنا تک نہ کر سکتی۔

ہارون بتا رہے تھے، اورنگزیب بھائی نے عدالت میں کیس دائر کرنے سے پہلے اشعر کو بڑی دھمکیاں دیں کہ تم دُرّیکتا کو طلاق دے دو۔ ایسی دھمکیاں بھلا کوئی مرد سن سکتا ہے۔ تب ہی اشعر نے یہ سب کیا۔ اسے شک تھا کہ ہم لوگ پھر بھی مکر سکتے ہیں تب ہی اس نے اسٹامپ پیپر پر یہ سب کچھ لکھنوا یا۔ سوچو تو کتنے شرم کی بات ہے یہ ہمارے خاندان کے لیے۔“

فرح اور فوزیہ آہستہ آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے دُرّیکتا سے شیریں تانی کی طرح

پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ ان کی نوجوان نسل کے لیے یہ اپنی نوعیت کا اچھوتا واقعہ تھا سب دُرّیکتا سے طرح، طرح کے سوال کر رہے تھے۔ ان میں ساڑھ پیش، پیش تھی۔
 ”ویسے ایک بات ہے تمہارا ہنزبینڈ ہے بہت بولڈ ورنہ روڈ سے تمہیں اس طرح اٹھا کے اپنے ساتھ نہ لے جاتا.....“ وہ بہت مزے سے بولی تھی۔ دُرّیکتا الجھن محسوس کر رہی تھی۔

”وہاں جا کے اس نے تمہیں کیا کہا.....؟“
 دُرّیکتا کی ایک دوسری کزن بولی تو توہین کی شدت سے اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔
 اشعر تو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور سوالوں کے نئے باب اس کے لیے کھل گئے تھے۔
 ”ویسے اغوا ہونے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔ اگر اغوا کرنے والا اشعر لغاری کی طرح ہو تو میں سو پار اغوا ہونا پسند کروں..... تمہاری طرح منہ لٹکا کے نہ بیٹھوں.....“
 ”شکر ہے اشعر لغاری، دُرّیکتا کا شوہر ہے ورنہ تم ساری زندگی اغوا ہی ہوتی رہتیں۔“ ساڑھ کی بات پر ان کی ایک اور کزن بولی تو زور کا قہقہہ پڑا۔
 ”کاش یار ایسا ہی ہوتا.....“ ساڑھ کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔
 ”یعنی کہ تم اغوا ہوتی رہتیں۔“ وہی کزن حیرت سے بولی۔
 ”ہاں کیونکہ اشعر لغاری بالکل میرے آئیڈیل کی طرح ہے۔“ وہ یہ بات کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرمائی کہ دُرّیکتا پاس بیٹھی ہے۔
 ”ہاں یہ تو ہے، دُرّیکتا کا ہنزبینڈ بہت زبردست ہے۔“ دوسری کزن نے بھی تائید کی۔ ان کی باتوں سے دُرّیکتا کے سر میں درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔
 وہ پچھلے دو گھنٹے سے اشعر لغاری کو ہی موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھیں۔ مزیدار اور چیٹ پٹا قصہ ہاتھ جو آیا تھا خاص طور پر ساڑھ اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔

75

ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

READING Section

زین، طیب کو اس کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اس نے سوئے ہوئے طیب کی طرف کروٹ لی۔ کتنا معصوم اور دنیا کے غموں سے نا آشنا تھا وہ..... کاش وہ بھی طیب جتنی ہی رہتی کبھی بڑی نہ ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔ اس کی سوچ ناممکن سی تھی۔

سوچ، سوچ کر ڈر یکتا کا سر درد کر رہا تھا۔ شیریں تائی کی بات اسے پھر یاد آئی تو اکیلے میں بھی وہ شرمائی گئی۔

اشعر کے پاس وہ دورات رہی تھی۔ وہ مزے سے سو گیا تھا۔ اس کے پاؤں میں چوٹ لگی تھی اس لیے وہ درد کی وجہ سے سوتی جا گئی رہی تھی کچھ اس کی طرف سے خوف بھی تھا مگر اس کا خوف بے بنیاد تھا۔ پر آج جب ڈر یکتا نے اشامپ پیپر پرسیا کے لیے اس کے بعد جو ہوا وہ اس کے لیے ناقابل فراموش تھا۔ اشعر کی جرات اور بے باکی بھولنے والی تو نہیں تھی۔ اس کے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔ پانی کا گلاس لبوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں پی گئی۔ اس وقت تنہائی تھی وہ آرام سے ہر چیز پر غور کر سکتی تھی۔

صبح کے واقعے کی جزئیات تک اسے یاد تھیں۔ یاد کرتے ہی اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ ساتھ ساتھ ہاتھ کا تبصرہ بھی کہ ڈر یکتا کا ہر بینڈ بہت بولڈ ہے۔ اس کی نیند ہی آج پلکوں سے روٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری تاسف سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سب کچھ بتا چکا تھا۔

”اشعر تم نے یہ سب کیوں کیا..... کم سے کم مجھے بتاتے تو..... میں تمہیں ایسا کبھی نہ کرنے دیتا۔“

”پاپا اب جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ وہ لوگ اب رخصتی سے انکار نہیں کریں گے۔“

”اشعر میں پہلے ہی اپنے خاندان والوں کی باتوں سے ڈر رہا تھا کہ اشعر کی منگوجہ نے اسے عدالت میں تھسیٹ لیا ہے۔ میں ایسی بدنامی فین نہیں کر سکتا۔“

”پاپا کیسی بدنامی؟ میں کسی اور کو نہیں اپنی بیوی کو

شیریں نے وہ اشامپ پیپر کی نقل اور نگزیب کو دکھادی تھی۔ ان کے خوابوں کا تاج محل پوری قوت سے زمین بوس ہوا تھا۔ سب کچھ چکنا چور ہو گیا تھا۔ اشعر لغاری نے انہیں شرم ناک شکست دی تھی۔ اب وہ نہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

ڈر یکتا لیٹی ہوئی تھی۔ وہ ذہنی طور پر بری طرح تھک گئی تھی۔ سب کے سوالوں کا سامنا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ اشعر نے جو کرنا تھا کر لیا تھا انا اور مردانگی کی جنگ میں فتح یاب ہوا تھا۔ پر اسے جو شرمندگی اور توہین کا احساس ہو رہا تھا آنے والی جس بدنامی کا سامنا کرنا تھا وہ اس کے لیے بہت مشکل تھی۔

گھر میں جب اتنی باتیں ہو رہی تھیں تو کیا گھر سے باہر کے لوگوں نے نہیں کی ہوگی۔ اور نگزیب تاپا اپنی غلطی مان ہی نہیں رہے تھے۔ سارا قصور اشعر لغاری کے سر تھوپ رہے تھے۔

شیریں کو زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اشعر لغاری، ڈر یکتا سے اپنا حق وصول چکا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نہ مارے شرم کے ڈر یکتا اس کی وضاحت کر پائی تھی۔ اب رخصتی کرنا ضروری تھی۔ ان کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔ ادھر سے عاشر نے بھی کہا تھا۔ ڈر یکتا اغوا کے بعد واپس آئے یا اشعر اسے طلاق دے دے وہ اب اس شادی نہیں کرے گا۔ اس کے ذہن میں بھی وہی مخصوص روایتی سوچ تھی کہ بیوی ان چھوٹی اور کنواری ہو۔

اور نگزیب نے جب اپنا پورا منصوبہ اس کے سامنے رکھا تھا تو وہ خوشی خوشی راضی ہو گیا تھا کیونکہ ڈر یکتا خوب صورت ہونے کے ساتھ، ساتھ بے پناہ جائداد کی بھی مالک تھی پر اب اسے ڈر یکتا میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی خوب صورتی سے بالکل بھی نہیں..... کیونکہ اشعر لغاری اپنے سارے حق استعمال کر چکا تھا۔ شیریں کی طرح اس کی سوچ بھی یہی تھی۔

☆☆☆

READING
Section

76 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

پوچھنا تھا کہ محترمہ آپ مجھ سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہیں۔ جب وہ اسے پہلی بار زبردستی ساتھ لے کے جا رہا تھا تب وہ گاڑی میں خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ پتا نہیں اس سے کیا کہا گیا تھا جو وہ اتنی کبیدہ خاطر تھی۔

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM ☆ ☆

شیریں، مارہ کو چھوڑنے جا رہی تھیں۔ ڈر یکتا کی وجہ سے وہ اس مسئلے پر دھیان نہیں دے پائی تھیں۔ اب فرصت تھی۔ انہوں نے حمزہ احمد سے خود بات کرنی تھی۔ باسط ایک ذرا سی بات پر مارہ سے اس طرح ناراض ہو گیا تھا۔ اس انتہا تک جانا اچھا نہیں تھا۔ شیریں کے دل میں تلخی آ گئی تھی۔

بیٹا ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ مارہ کافی دن بعد واپس آئی تھی۔ بیٹا بڑی محبت سے ملی۔ شیریں اکھڑی، اکھڑی تھیں بیٹا فوراً بھانپ گئی کہ کوئی

لے گیا تھا۔ اس میں کوئی بات کرتا ہے تو کرے، میں پروا نہیں کرتا..... پتا وہ سب لوگ حتیٰ کہ خود ڈر یکتا تک نامناسب رویے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مجھے دھمکیاں دی جا رہی تھیں، خلع کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ جیسے میں کوئی زر خرید ملازم ہوں ان لوگوں کا..... تو بس دماغ گھوم گیا میرا....." وہ اپنی ذہنی کیفیت باپ کو بتا رہا تھا۔

"پاپا، میں اپنی عزت نفس اور انا پر چوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی صورت بھی نہیں..... ڈر یکتا کے تایا کی اکڑ فون نکل گئی ہے اور در یکتا کی بھی۔" آخری تین لفظ اس نے دل میں کہے..... "اب میں نے پکا کام کر دیا ہے۔ رخصتی سے انکار نہیں ہوگا۔" دل ہی دل میں وہ مسکرا رہا تھا۔

"چلو یہ تو اچھی بات ہے، بہتری اسی میں ہے کہ میں ڈر یکتا کو جلد سے جلد رخصت کروا کے لے آؤں۔" طاہر لغاری پُرسوج انداز میں بولے۔

"ہاں پاپا ٹھیک ہے۔" اشعر نے بھی تائید کی۔ ڈر یکتا کو وہ چھوڑنے گیا تو اس کے تایا کے رویے میں پہلی جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اکڑ وہ غرور کچھ بھی نہیں تھا۔

اشعر جیت چکا تھا جو چیز اس کی انا اور غیرت کے لیے چیلنج بنی ہوئی تھی۔ وہی اس کی فتح بن گئی تھی۔

ڈر یکتا کا ڈرا ڈرا خوف زدہ انداز گریز یا رو تہ یاد آتے ہی اشعر کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کہاں تو شیریں بنی ہوئی تھی اور کہاں اس کے سامنے آ کر بھیگی بلی بن گئی تھی۔ فارم ہاؤس میں اس نے خود سے اشعر سے کم ہی بات کی تھی۔ اس کا سارا زور رونے کی طرف تھا یا پھر ڈرنے کی طرف..... اس کی آنکھوں اور رو تہ میں ڈر تھا۔ جیسے اشعر کوئی ڈر کیولا یا پھر خوفناک انگریزی فلموں کا کوئی کردار ہو جو موقع ملتے ہی اسے چہر پھاڑنے کے کہا جائے گا۔ پتا نہیں وہ اتنی خوفزدہ کیوں تھی اس سے۔ اشعر کو یہ بات پوچھنی یاد ہی نہیں رہی تھی۔ جب وہ یہاں آ جاتی رخصت ہو کے تو تب اس نے اسے

" مصر میرا خواب "

سلمیٰ اعوان کا خوبصورت سفر نامہ

نجیب محفوظ اور فرعونوں کا دلیس جہاں نیل بہتا ہے۔ دنیا کی قدیم ترین اور اسلامی تہذیب کی خوبصورت آمیزش کا حامل ملک جسے سلمیٰ اعوان کی آنکھ نے دیکھا، محسوس کیا اور دماغ نے لکھا۔

دوست پبلی کیشنز 5-4102784-051

نیم وا تھا۔ اب آنے والی آوازیں واضح تھیں اور قابل شناخت تھیں۔

”حزہ بھائی کبھی بیٹا نے آپ کو شکایت کا موقع دیا۔ اس نے ساری زندگی کبھی آپ کو یا باسط کو احساس دلایا کہ وہ باسط کی سگی ماں نہیں ہے۔ میری بہن کا دل اور ظرف بہت بڑا ہے۔ اور باسط نے صرف اس بات پر کہ ماڑہ، طیب کو ڈاکٹر کے پاس کیوں لے گئی ناراض ہو گیا۔ اس حد تک کہ کوئی لحاظ بھی نہیں کیا صاف کہہ دیا کہ اب اپنی ماں کے گھر ہی رہو۔ یہ اتنی بڑی بات تو نہیں تھی۔ کاش بیٹا کا ظرف اور حوصلہ باسط میں بھی آجاتا۔ آخر کو اس کی گود میں پلا بڑا ہے۔ کچھ تو اثر ہوتا ناں کہ بیٹا نے اس کی پرورش کی ہے۔“

شیریں خالہ کی آواز ایک، ایک لفظ، سماعتوں میں زہر بن کے اتر رہا تھا۔ پر خود کو سنبھالنا ضروری تھا جو کچھ وہ سن چکا تھا اس سے زیادہ سننا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے فوری طور پر کچھ سوچا اور قدم موڑ لیے۔ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر یہاں سے لوٹنا چاہتا تھا۔

جونہی وہ گیٹ سے باہر نکلا..... اس کی نظر دائیں طرف سے آتی میروں کلر کی کرولا پر پڑی۔ یہ ایاز تھا۔ اس کی نظر ابھی تک باسط پر نہیں پڑی تھی۔ پر گاڑی قریب آگئی تھی۔ باسط گیٹ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا جیسے ابھی بھی پہنچا ہو۔

وہ یہ تاثر دینے میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ ایاز چھلانگ مار کے نیچے اتر اور اس کے گلے لگ گیا۔ ”بھائی آپ کب آئے اور اس طرح..... بتایا بھی نہیں۔“

”بس سوچا تم سب کو سر پر اتر دوں اس وجہ سے نہیں بتایا۔“ اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ پر نہ جانے کیوں آج ایاز سے ملتے ہوئے اس کے روئے میں سرد مہری سی تھی۔ ایاز نے اپنی خوشی میں اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا۔ ایاز گاڑی سے اتر کر تیزی سے اندر بھاگا۔ باسط دوبارہ جب گھر میں داخل ہوا تو سب

بات ہے، انہیں کھانا کھلا کے وہ اپنے بیڈروم میں ہی لے آئی اور پھر بات کا آغاز کیا۔

”آپا کیا بات ہے، آپ کچھ ناراض، ناراض سی لگ رہی ہیں۔“

”ہاں، میں ناراض ہی ہوں، بات ہی ایسی ہے۔ میں حزہ بھائی کے سامنے بات کروں گی تم سے۔“ شیریں اسی موڈ میں تھیں۔ بیٹا پریشان ہو گئی کہ یقیناً کوئی خاص بات ہے جو آپا، حزہ کے سامنے بات کرنا چاہ رہی ہیں۔ اس نے پھر نہیں پوچھا۔ حزہ گھر آئے تو شیریں نے پھر انہیں ساری بات بڑھا چڑھا کے بتائی۔

☆☆☆

جہاز لینڈ کرنے میں تھوڑا ہی ٹائم تھا۔ باسط فضا کی بلندی سے نیچے نظر آنے والی عمارتوں کو دیکھ رہا تھا۔ رفتہ، رفتہ چیزوں کا حجم بڑا ہوتا جا رہا تھا اور سب کچھ واضح ہو رہا تھا۔ درخت، عمارتیں، روڈ، سڑک پر بھاگتی دوڑتی گاڑیاں، قریب اور قریب سے نظر آرہی تھیں۔ جہاز کا زمین سے فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔

باسط کو پاکستان میں ایک آدمی سے ملنا تھا۔ اس کا اچانک پروگرام بتا تھا۔ اس نے سر پر اتر دینے کے چکر میں گھر میں کسی کو بھی اپنے آنے کا نہیں بتایا تھا۔ اتر پوٹ سے باہر آ کر اس نے ٹیکسی کو اشارے سے روکا اور بیٹھ گیا۔ گھر کے سامنے اتر تو چھوٹا گیٹ کھلا ہوا تھا۔

وہ لان سے گزر کر اندر آیا۔ کوئی ذی نفس بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اس نے سوچا سب آرام کر رہے ہوں گے۔ دے پاؤں اپنے بیڈروم کی طرف آیا تو لاونج میں بھی کوئی نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم سے ہلکی، ہلکی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

”اچھا تو سب وہاں ہیں۔“ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی یہ سوچتے ہوئے کہ سب اسے دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے وہ آرام، آرام سے آہستگی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف آنے لگا۔ دروازہ ہلکا سا

حسن والے

طیب ملتے ہیں پر دوا نہیں ملتی
دوا اگر ملتی ہے تو شفا نہیں ملتی
میں ساری دنیا ڈھونڈ آیا فراز
حسن والے تو ملتے ہیں پر وفا نہیں ملتی
مرسلہ: نگینہ ضیا بگلش، کراچی

ضرورت

کسی انسان کا پہلا پیار بننا کوئی بڑی بات
نہیں بننا ہے تو کسی کا آخری پیار بننا اس لیے یہ
کبھی مت سوچو کہ تم سے پہلے وہ کسی اور سے
پیار کرتا تھا کوشش یہ کرو کہ تمہارے بعد اسے کسی
اور کے پیار کی ضرورت ہی نہ رہے۔
مرسلہ: ایس انمول، بھابھو اشرف

اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ شیریں
خالہ، مائرہ، حمزہ احمد، بیٹا اس کے چھوٹے بہن بھائی۔
سب ہی تو تھے۔ اسے چمکتی محبت بھری نگاہوں سے
تکتے..... بیٹا حسب معمول اس کا ماتھا چوم کے سینے سے
لگا کر ملی۔ پر آج باسط بچھا، بچھا سا تھا۔ شیریں جو کچھ
دیر پہلے حمزہ اور بیٹا کے سامنے گرج برس رہی تھیں اس
وقت صدقے واری ہوئی جارہی تھیں۔ کتنا تضاد تھا ان
کے رویے اور سوچ میں۔

مائرہ البتہ کچھ ڈری، ڈری سی لگ رہی تھی کہ
جانے باسط اسے کیا کہے..... تنہائی ملتے ہی وہ اس کے
قریب آگئی۔ باسط کے بازو اس کی سمت نہیں بڑھے وہ
خود اس کی بانہوں میں سما گئی۔

”باسط آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ بس آخری غلطی تھی
معاف کر دو۔ اب میں طیب کی طرف پلٹ کر
دیکھوں گی بھی نہیں۔“ وہ اس کے کانوں میں سرگوشیاں
کر رہی تھی۔ جو اب میں باسط نے اسے عجیب سی
نگاہوں سے دیکھا۔ شیریں خالہ کی کہی باتیں کانوں
میں گونجنے لگیں۔ ایک دم اندر کوئی آگ سی بھڑکنے لگی
تھی۔ اس نے مائرہ کو بازوؤں کی گرفت سے آزاد
کر دیا اور خود سگریٹ سلگا لیا۔ خوب گہرے، گہرے
کش لیے کہ شاید سکون مل جائے۔ پر کہاں اس کے من
میں دور تک بے چینی اور بے سکونی پھیلی ہوئی تھی۔ کتنے
کڑے سچ کا سامنا کرنا پڑا تھا آج..... سچ کڑوا اور
جان لیوا تھا۔ بیٹا اس کی سگی ماں نہیں تھیں..... پر آج
تک کبھی ان کے رویے سے یہ بات ظاہر یا محسوس نہیں
ہوئی تھی۔ وہ ایاز سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھتی
تھیں۔ آج تک اس سے یہ بات چھپائی گئی تھی جانے
کیا مصلحت تھی اس میں..... کاش یہ بات چھپی ہی رہتی
یا پھر اسے بہت پہلے بتادی جاتی۔ وہ ریزہ، ریزہ ہو
کے ایسے بکھرتا تو نہیں..... وہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا،
بکھر رہا تھا۔ کوئی سیٹھنے والا تک نہیں تھا۔ اسے خود کو خود
ہی جوڑنا تھا۔

کاش وہ گھر نہ آتا یا اپنے آنے کی اطلاع دے

دیتا۔ کاش وہ شیریں خالہ کے منہ سے اتنے کڑوے اور
زہریلے انداز میں اس سچ کو نہ سنتا..... کاش ابوا سے خود
بتاتے یا پھر امی اسے پاس بٹھا کر آرام سے بتا دیتیں کہ
میں تمہاری اصلی ماں نہیں ہوں۔ پھر شاید اسے اتنا دکھ
نہیں ہوتا..... اسے اس کرب سے نہ گزرنا پڑتا۔ کاش،
کاش یہ سب نہ ہوتا۔ کاش اسے پتا نہ چلتا۔

☆☆☆

سورج کی کرنیں کمرے میں جھانک رہی تھیں۔
مائرہ کی آنکھ کھل گئی اور سب سے پہلے اس نے اپنی
دائیں سائڈ پر دیکھا۔ باسط کی جگہ خالی تھی۔ اس کے
جوتے، رسٹ واچ اور موبائل فون بھی سامنے ٹیبل پر
موجود نہیں تھا۔ وہ واش روم میں بھی نہیں تھا۔ مائرہ باہر
آئی کہ شاید وہ بیٹا خالہ کے پاس ہو، وہ وہاں بھی
نہیں تھا۔ وہ الٹا اس سے پوچھنے لگیں کہ باسط ابھی تک
سورہا ہے۔ مائرہ اسے ڈھونڈنے باہر آئی تھی اور وہ اسی
سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ پورے گھر میں
نہیں تھا۔ چوکیدار سے معلوم ہوا کہ چھوٹے صاحب
رات تین بجے گھر سے نکلے تھے۔ بغیر گاڑی کے۔

نوید نے اورنگزیب کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا تھا کہ عمر کو چیک اپ کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے۔

خلاف توقع وہ مان گئے تھے۔ نوید کو اپنے دماغ سے ایک بوجھ اترتا محسوس ہوا۔ وہ عمر کو دیکھ کر احساس جرم کا شکار ہو جاتا۔ ان تینوں بھائیوں میں سے کسی نے سنجیدگی سے اس کے علاج پر توجہ نہیں دی تھی۔

شاہ زیب کی حادثاتی موت نے عمر زیب کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ اورنگزیب کا کہنا تھا کہ عمر اس طرح رہے تو ٹھیک ہے۔ جب وہ تندرست ہوگا تو شاہ زیب کا صدمہ اسے مار ڈالے گا۔ اورنگزیب نے نوید اور ہارون کو بھی قائل کر لیا تھا۔ اس کے بعد عمر کی ذہنی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ہر کسی کی اپنی دنیا تھی کسی کو احساس نہیں تھا۔ اورنگزیب ماحول کی تبدیلی کے بہانے عمر کو گاؤں لے آئے تھے۔ تب سے وہ اور ڈر بیکتا ادھر ہی تھے۔ ڈر بیکتا بیٹی ہونے کے ناتے باپ کے لیے کڑھتی، پریشان ہوتی عمر اب جارحیت پر اتر آئے تھے جس کو دیکھتے مارنے کے لیے دوڑتے.... نوید کے دل میں قدرت کی طرف سے ہی یہ خیال آیا تھا کہ اسے عمر کا بھائی ہونے کے ناتے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

اسجد بھی گاؤں آیا ہوا تھا۔ نوید اسی کے ساتھ عمر کو لے کر شہر آئے۔ ڈاکٹر سے انہوں نے پہلے ہی ٹائم لے لیا تھا۔ اس لیے انتظار کی زحمت سے بچ گئے۔

یہ ذہنی اور نفسیاتی امراض کا مشہور اسپتال تھا۔ نوید کو پوری امید تھی کہ عمر یہاں سے ٹھیک ہو جائیں گے۔ عمر کے مختلف قسم کے ٹیسٹ ہوئے۔ ڈاکٹر کی ٹیم نے آپس میں مشورے کے بعد عمر کو ایڈمٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ انہیں عمر کا کیس کافی دلچسپ اور قابل توجہ نظر آیا تھا۔ نوید نے اسپتال میں ہی ڈر بیکتا کو کال کر کے بتایا۔ وہ بھی پاپا کے مکمل علاج کروانے کے حق میں تھی۔ جب نوید آج عمر کو ساتھ لے کر آ رہے تھے تو ڈر بیکتا نے

”وہ کہہ رہے تھے کہ میں اتر پورٹ تک ٹیکسی لے لوں گا۔“ چوکیدار بتا رہا تھا۔

مینا کو ڈر لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں خود ہی یہ بات آئی تھی کہ باسط کو پتا چل گیا ہے وہ اس کی ماں نہیں ہے۔ اس نے سن لیا ہے۔ تب ہی یہاں سے بغیر بتائے اس طرح گیا ہے۔ باسط نے وہاں جا کے کال کی تو اس کی جان میں جان آئی۔

”امی ایک ضروری کام تھا اس لیے جلدی میں آنا پڑا مجھے... سب سو رہے تھے۔ میں نے سوچا کیا جاؤں اس لیے اکیلا ہی آیا اتر پورٹ تک۔“ وہ نارمل طریقے سے بول رہا تھا۔ مینا نے رکی، رکی سی سانس خارج کی، اب دل کو کہیں سکون ملا تھا اور ایک بوجھ اتر ا تھا۔ پر مائرہ، باسط سے ناراض تھی۔

☆☆☆

باسط کبھی زندگی بھر نہیں رو یا تھا پر اتر پورٹ سے اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچے ہی وہ اپنے بستر پر ایسے گرا جیسے میلوں دور سے پیدل چل کے آیا ہو۔ جن آنکھوں میں مائرہ کے نام سے دیے جلتے تھے وہ آنکھیں اب بھیگ رہی تھیں۔ دعویٰ آ کے کالے دھندے سے وابستہ ہونے کے بعد اس کا دل سخت ہو گیا تھا پر آج احساس ہوا کہ ایک گوشت پوست کا بنا دل سینے میں ہے اور قطرہ، قطرہ پکھل رہا ہے، موم کی طرح..... اسے بے پناہ محسن کا احساس ہو رہا تھا کوئی چیز نس، نس کو کاٹ رہی تھی، چھید رہی تھی۔ باسط نے شرٹ اور اس کے نیچے پہنی ہوئی بنیان بھی اتار کر پھینک دی پھر شاور کھول کر کھڑا ہو گیا۔ پر اندر آگ ہی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو دھیرے سے چھوا۔ وہ بھیگ رہی تھیں۔ اس نے سر کے بال دونوں مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

”نہیں، نہیں۔“ وہ زور، زور سے چیخنے لگا اور اپنا سر پوری قوت سے بیڈ کی پٹی سے ٹکرایا۔ شاید اس جنون کو سکون مل جائے۔ سکون ہوتا تو نلتا وہ تو نہ ملا پر اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ وہ پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔

ہسپتال ایڈمٹ کروا آیا تھا۔ دوسری بار ہارون ان کے ساتھ ہسپتال گیا اور عمر کے جگری دوست طاہر لغاری کو بھی بتا دیا۔ عمر کا علاج ست رفتاری سے ہو رہا تھا مگر ہو رہا تھا۔ ڈاکٹرز، عمر زیب کی حالت اور رویے کو تسلی بخش قرار دے رہے تھے۔ نوید نے ڈریکٹا سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار جب میں عمر کا ہتا کرنے جاؤں گا تو تمہیں بھی ساتھ لے کے جاؤں گا۔ یہاں سے وہ خود بھی تین چار دن بعد ہسپتال کا چکر لگا لیتے اس کے علاوہ انہوں نے عمر کی دیکھ بھال کے لیے اپنے ایک ملازم کو ہسپتال میں چھوڑا ہوا تھا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ عمر کی بہترین دیکھ بھال ہو رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری، عمر کے پاس بیٹھے تھے۔ عمر آنکھیں موندے لیٹے تھے۔ اشعر بھی باپ کے ساتھ تھا۔ طاہر نے سب سے پہلے ڈاکٹرز سے مل کر عمر کے علاج کے بارے میں پوچھا تو انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ انہیں ایک بات کا دکھ پھر بھی تھا کہ عمر کے بھائی انہیں بہت دیر کے بعد ہسپتال لائے پھر بھی عمر کے علاج کی کامیابی کی پوری امید تھی۔

”میرے دوست میں گاؤں جا رہا ہوں، تمہارے بھائی اور نگزیب سے ڈریکٹا کی رخصتی کی تاریخ لینے، کاش تم خود ٹھیک ہوتے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو رخصت کرتے۔“ طاہر، عمر کے پاس بیٹھے اسے یوں بتا رہے تھے جیسے وہ سن رہے ہوں اور سمجھ رہے ہوں۔ وہ تو سابقہ پوزیشن میں لیٹے ہوئے تھے۔ طاہر کا بتانا نہ بتانا ایک برابر تھا۔

☆☆☆

طاہر، اور نگزیب سے شادی کی تاریخ لینے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کوئی چون و چرا کیے بغیر دس دن بعد کی تاریخ دے دی۔

دل میں پریشان بھی تھے کہ ڈریکٹا کی شادی اپنے رتبے، خاندان اور عزت کے شایان شان کیسے ہوگی۔ طاہر لغاری نے تو کہا تھا کہ مجھے کسی چیز کی بھی ضرورت

انہیں بھیگی، بھیگی تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ان نگاہوں میں چمکتی نمی نے نوید کے ملال کو کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔

انہوں نے عمر زیب کو ہسپتال، ایڈمٹ کروا دیا تھا۔ ان کا علاج، طویل، محنت طلب اور صبر آزما تھا۔ انہیں لمبا عرصہ اسی ہسپتال میں گزارنا تھا۔

بہر حال ایک امید کی کرن نظر آئی تھی جسے نوید نے اپنی منگی میں جکڑ لیا تھا۔ عمر ایڈمٹ ہو چکے تھے اور ڈاکٹرز نے علاج شروع کر دیا تھا۔ ڈریکٹا کو امید تھی کہ پٹا ٹھیک ہو جائیں گے۔ نوید نے اور نگزیب بھائی کو عمر کے علاج کی بابت بتایا وہ غائب دماغی سے سر ہلا رہے تھے۔ انہوں نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

وہ اپنی پریشانیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اشعر والے مسئلے نے انہیں زچ کر کے رکھا ہوا تھا۔ انہیں کسی وقت بھی ڈریکٹا کی رخصتی کے لیے تیاری مکمل رکھنی تھی۔ یعنی انہوں نے سارے نوادے سے ہاتھ دھولیا تھا۔ ڈریکٹا کی جائداد پہ قبضے اور اختیار کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ جو کچھ شاہ زیب نے ماڑہ اور اپنے پیدا ہونے والے بچے کے لیے چھوڑا تھا اس میں سے کچھ نہیں بچا تھا۔ ماڑہ اسی گمان میں تھی کہ وہ شاہ زیب کے کاروبار کی مالک ہے۔ بے شک سب کچھ خسارے میں تھا پر مالک ہونے کا بھی تو اپنا نشہ ہوتا ہے، اگر وہ ان سے کاروبار کے بارے میں پوچھ لیتی تو وہ کیا جواب دیتے۔ عاشر نے اور انہوں نے جو فائدہ اٹھانا تھا اٹھالیا تھا باقی کچھ بھی نہیں تھا۔ ڈریکٹا کے اکاؤنٹ میں سے بھی انہوں نے تقریباً سب پیسے نکلوا لیے تھے۔ اس نے تو شاہ زیب کے نام اور ان کے بزنس کی خاطر ان پر اندھا اعتبار کیا تھا۔ وہ سب پیسہ ان کی جیب میں گیا تھا۔ تھوڑا، تھوڑا ہارون اور نوید کو دیا تھا لیکن زیادہ ان کے پاس تھا۔ عمر زیب کے کاروبار کا انہوں نے بیڑا غرق کر کے رکھ دیا تھا۔ حالات تباہی کی طرف اشارہ کر رہے تھے اب ہارون بھی ان سے الگ ہو گیا تھا۔ اسے آنے والی مشکلات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ نوید عمر کے

میں ہے۔“ وہ اسے بولنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

”ڈریکٹا کو ان کی نرمی نے کچھ حوصلہ دیا۔

”انکل، طیب کسی کے پاس بھی نہیں رہتا۔ ماثرہ بھابی کا تو آپ کو پتا ہی ہے، وہ اپنی سسرال میں ہیں۔ طیب کو ساتھ لے کر نہیں گئیں۔ باقی وہ کسی کے پاس نہیں رہتا۔ میرے ساتھ وہ بہت مانوس ہے، کیسے رہ پائے گا۔ کون دیکھ بھال کرے گا اس کی۔ ہر ایک کی اپنی زندگی ہے، کوئی بھی طیب کی ذمے داری نہیں لے گا۔“ آخر میں وہ تھوڑا تلخ سی ہو گئی تو طاہر اس سادہ اور بے غرض سی لڑکی کو دیکھنے لگے جسے اپنی زیادہ فکر نہیں تھی بلکہ اس چھوٹے سے بچے کی فکر تھی جو ابھی ایک سال کا بھی نہیں تھا۔ وہ اس کی باتوں سے مطلب کی بات تک پہنچ گئے تھے۔

”تم طیب کو یہاں چھوڑنا نہیں چاہتیں؟ میرا مطلب ہے کوئی یہاں اسے رکھنے والا نہیں ہے؟“

”نہیں طاہر انکل، زمین ہے تو..... پر وہ تنخواہ دار نوکرانی ہے، میں اعتبار نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر تم شادی کے بعد طیب کو ساتھ لے جاؤ۔“ انہوں نے اس کے دل کی بات کہہ دی۔ ڈریکٹا کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ اس پر خوشیوں کے ہزاروں رنگ بھر گئے تھے اور ہر رنگ اپنی جگہ مکمل اور خوب صورت تھا۔

”انکل کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ بے یقینی سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔

”بالکل سچ..... کیونکہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میرے گھر میں بہت جگہ ہے۔ طیب، عمر کا پوتا ہے۔ آخری نشانی ہے شاہ زیب کی۔ عمر سے وابستہ ہر چیز اور ہر رشتہ مجھے عزیز ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولتے ہوئے ڈریکٹا کے چہرے پر چھائے بے یقینی کے بادلوں کو ہٹا دیکھنے لگے۔

”کسی اور کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا جب میں طیب کو ساتھ لاؤں گی؟“ وہ دانستہ طور پہ اشعر کا نام

نہیں ہے۔ اشعر نے بھی سختی سے منع کیا تھا..... پر وہ ڈریکٹا کو ایسے ہی تو رخصت نہیں کر سکتے تھے۔ خاندان کی عزت اور آن بان کا بھی خیال تھا۔ ان کے کس بل نکل گئے تھے اس لیے کہ اب ڈریکٹا کی موجودگی کا انہیں کوئی فائدہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ بھتیجے کو سنبھال رہی تھی۔

ڈریکٹا تو یہی چاہتی تھی کہ شادی انتہائی سادگی سے ہو، بے شک کسی کو بھی نہ بلایا جائے، اسے سب کے سوالوں سے الجھن ہوتی اور وہ ڈرتی بھی تھی۔ پتا ہسپتال میں تھے، وہ کسی قسم کی دھوم دھام کے حق میں بھی نہیں تھی۔

شیریں نے بھی اور نگزیب کو یہی صلاح دی تھی کہ شادی سادگی سے ہو۔ چار دن وہ اشعر کے ساتھ گزار آئی تھی۔ اب کسی جھستی اور کہاں کی دھوم دھام۔ وہ ڈریکٹا کے بارے میں بڑے تنفر اور غلط انداز سے سوچ رہی تھیں۔

وہ تو رخصت ہو کے چلی جاتی طیب کو کون سنبھالتا۔ ماثرہ اپنے گھر تھی۔ باقی کوئی بھی طیب کی ذمے داری لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

طاہر، اور نگزیب کے پاس سے اٹھ کر ڈریکٹا کے پاس آئے۔ وہ اداس اور متفکر سی بیٹھی تھی۔ اس نے سلام کیا تو طاہر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں۔ وہ اپنے گزشتہ روتے پر شرمندہ تھی۔ ان سے نگاہ ہی نہیں ملا پارہی تھی۔ نہ اتنی ہمت ہو رہی تھی کہ طاہر انکل سے وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی پر ہچکچا رہی تھی۔ وہ بھانپ گئے تھے کہ ڈریکٹا ان سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے پر ڈر رہی ہے۔ انہوں نے اسے حوصلہ دیا۔

”بیٹی تم مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو، میں محسوس کر رہا ہوں پر تم بول نہیں پارہی ہو۔ ایسی کون سی الجھن ہے، کیا مجھے نہیں بتاؤ گی، میں عمر کی جگہ ہوں۔“ وہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔

”بولو بیٹا جو بات ہے..... جو تمہارے دل

میں آگاہ کر دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد ڈریکٹا کے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔ اشعر کچھ نہیں بولا تھا۔ پر لائبرہ اس کی سب سے بڑی بہن نے چھیڑ، چھیڑ کر ناک میں دم کر دیا تھا۔

”اشعر تمہیں تو جہیز میں ایک چھوٹا سا رقیب بھی مل رہا ہے۔“ وہ اسے شرارتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔
”تو پھر کیا ہے..... میں چھوٹے بڑے سب رقیبوں سے نمٹ لوں گا۔“ اشعر نے بات مذاق میں اڑادی تھی۔

ثمرہ، اشعر سے بڑی اور لائبرہ سے چھوٹی تھی۔ وہ سنجیدہ مزاج تھی پر اشعر کو تنگ کرنے سے باز وہ بھی نہیں آ رہی تھی۔ طاہر بہت خوش تھے۔ بہن، بھائی کے ہنسی مذاق نوک جھوک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ برسوں بعد اس گھر میں خوشیوں کی بارات اتری تھی۔ ان میں جوانوں کی سی پھرتی اور تیزی آگئی تھی۔ بڑھ چڑھ کر سب کاموں میں حصہ لے رہے تھے۔ مشورے دے رہے تھے۔ آخر ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔

☆☆☆

ڈریکٹا پہلی بار اسپتال آئی تھی پاپا کو دیکھنے..... برسوں اس کی رخصتی تھی۔ فوزیہ چچی نے خود کہا تھا کہ شادی سے پہلے جا کے پاپا کو دیکھ لو۔ ڈریکٹا خود بھی یہی چاہ رہی تھی۔ اس کے ساتھ فرح اور فوزیہ چچی دونوں آئی تھیں۔

عمر زیب الگ روم میں تھے۔ نرس نے انہیں ابھی ان کے سامنے دوائی کھلائی اور انجکشن لگایا تھا۔
”پاپا آپ ٹھیک ہیں؟“ ڈریکٹا سامنے کھڑی تھی، انہوں نے ایک ٹاپے کے لیے نگاہیں اٹھا کے اسے دیکھا اور پھر خود میں گم ہو گئے تھے۔ جیسے ان کے سامنے کوئی بھی نہیں ہو۔ آج ان کے رویے میں کوئی جارحیت نہیں تھی۔ یہ ایک اچھا اشارہ تھا۔

جانے کیوں ڈریکٹا کا دل چاہا ان کے سینے سے لپٹ جائے پہلے کی طرح..... پر دل موس کے رہ گئی۔

نہیں لینا چاہ رہی تھی۔
”ارے میرے گھر میں نوکروں کے علاوہ میں اور اشعر ہوتے ہیں۔ جب مجھے اعتراض نہیں ہے تو پھر اشعر کو بھی نہیں ہوگا۔ وہ غصے کا تیز ہے، انا پسند ہے پر انسانیت اور انسانیت سے وابستہ رشتوں کو جانتا ہے، باشعور ہے۔ اس کی فکر مت کرو میں اسے سمجھا دوں گا۔“ طاہر بھی اس کی ہچکچاہٹ بھانپ گئے تھے اس لیے آرام اور تسلی سے بات کی۔

”انکل میری ایک بہت بڑی فکر ختم ہو گئی ہے۔ میں طیب کی وجہ سے بہت پریشان تھی کہ اس کا کیا ہوگا۔“ وہ انہیں یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کیا، کیا سوچتی رہی تھی۔ وہ پچھتاتی تھی کہ اس اشامپ پیپر پہ اپنے دستخط کیوں کیے۔ اسی وجہ سے تو پورا گھر پریشان اور باپوسی کا شکار تھا۔ اس نے یقیناً بہت بڑی غلطی کر دی تھی تبھی تو اورنگزیب تاپا خاموش رہنے لگے تھے ورنہ اس سے پہلے اس نے انہیں اس طرح اداس، خاموش اور پریشان نہیں دیکھا تھا۔ ڈریکٹا نے اشامپ پیپر پر سائن کر کے اور وہ تحریر اشعر کے حوالے کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی اپنے پاؤں پر کلبھاڑی ماری تھی۔ ورنہ وہ کبھی اس طرح رخصتی پر مجبور نہ ہوتی۔ ڈریکٹا کی سوچ طاہر انکل سے بات کرنے کے باوجود بھی ایسی ہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری نے شادی کے کارڈ چھپنے کے لیے دے دیے تھے۔ ان کی دونوں بیٹیاں، داماد اور بچے پاکستان آ گئے تھے۔ اشعر کی بہنیں دونوں بڑی تھیں۔ نکاح پر نہیں آ پائی تھیں۔ یہاں آ کے روبرو پہلی بار اپنی بھائی کو دیکھا تھا۔ بہت خوش تھیں دونوں بہنیں..... ان کا اکلوتا بھائی تھا۔ بہت ارمان تھے ان کے دل میں اپنے اپنے انداز سے خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ مہمانوں کی لسٹ بن رہی تھی۔ وقت کم تھا لائبرہ اور ثمرہ شادی کی شاپنگ کر رہی تھیں۔ ساتھ، ساتھ اشعر سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ طاہر لغاری نے لائبرہ، ثمرہ اور اشعر تینوں کو ڈریکٹا کے بھتیجے طیب کے بارے

ڈاکٹر نے کسی بھی قسم کے جذباتی رویے کے مظاہرے سے روکا تھا۔

جاتے، جاتے وہ ان کے سامنے رکی انہیں جی بھر کر دیکھا تو ٹوٹ کر رونا آیا۔ پر آنسوؤں کو آنکھوں میں مقید کرنا پڑا۔ کیسا عجیب رشتہ تھا باپ، بیٹی کا..... وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ کوئی اپنا نہیں تھا، راز دار نہیں تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی جدائی پہ روتا، نہ ماں نہ بہن نہ بھائی۔ عمر خود اسپتال میں تھی۔ کون اس کے لیے دعا کرتا کہ تمہارے نصیب اچھے ہوں۔ کون سینے سے لگاتا۔ دُور یکتا کو اپنا اکیلا پن بہت زیادہ کھل رہا تھا۔

یہاں اس کی شادی کی کوئی خاص خوشی نہیں تھی۔ ہاں فوزیہ اور فرح چچی اور اس کی کزنز کچھ سرگرمی دکھا رہی تھیں ورنہ شیریں یا سائرہ خاموش ہی تھیں۔ مائرہ رخصتی سے ایک دن پہلے آئی اس کے ساتھ صرف بیٹا تھی۔ مائرہ مارے باندھے آئی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ جب سے باسط اس طرح گیا تھا اس کو کسی کام میں بھی خوشی یا سکون نہیں مل رہا تھا۔ بیٹا زبردستی ساتھ لے کر آئی تھی کہ چلو دل بہل جائے گا مگر یہاں آنکے بھی اس کی اداسی ختم نہیں ہوئی۔

☆☆☆

دُور یکتا پہ کل کی فکر سوار تھی کہ آیا طیب کل اس کے ساتھ جائے گا کہ نہیں یا دو چار دن بعد اسے یہاں سے لے جانا پڑے گا۔ یہ بات اسے طاہر انکل سے پوچھتے ہوئے شرم آرہی تھی۔ اشعر کی دونوں بہنیں یہاں گاؤں آ کے اس سے ملی تھیں مگر ان سے بھی وہ یہ بات نہیں کر سکتی تھی۔

لے دے کے صرف ایک اشعر ہی بچتا تھا کیونکہ شادی اسی کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اسٹامپ پیپر پہ سائن دُور یکتا نے اسی کے کہنے پر کیے تھے۔ اس کو یہ بات اشعر سے ہی کرنی چاہیے۔ آخر اس نے بھی تو (اپنے تئیں سائن کر کے) اس کا ساتھ دیا تھا۔ دُور یکتا کے سر سے بوجھ اترا۔ اشعر سے وہ کیسے بات کرتی اس کے

پاس نمبر نہیں تھا اشعر کا..... اور نہ کبھی اسے عام حالات میں بات کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اشعر کا نمبر پتا چل سکتا تھا یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ اور نگزیب کے پاس اشعر کا نمبر تھا لیکن تا یا سے نمبر معلوم کرتے ہوئے اسے شرم آرہی تھی۔ اس کے ذہن میں طاہر انکل کا نام آیا۔ جب وہ شادی کی ڈیٹ لینے آئے تھے تو انہوں نے تب دُور یکتا سے اس کا سیل نمبر لیا تھا اور اپنا بھی اسے دیا تھا کہ کبھی، کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے تو انسان بات تو کر سکتا ہے۔

وہ طاہر انکل سے اشعر کا نمبر پوچھ سکتی تھی۔ اسے شرم تو آرہی تھی پر ساری شرم بالائے طاق رکھتے ہوئے خود کو اس دلیل سے مطمئن کرتے ہوئے آخر میرا نکاح ہوا ہے اشعر لغاری کے ساتھ میں بات کر سکتی ہوں۔ اس میں حرج نہیں ہے۔ اس نے طاہر انکل کو کال کر دی۔

دور یکتا نے انہیں خود سے کبھی کال نہیں کی تھی۔ اب کل اشعر کی بارات جانی تھی۔ اس تناظر میں دُور یکتا کی کال انہیں پریشانی سے دور چار کر گئی کہ جانے کیا بات ہے، کہیں اس نے رخصتی سے انکار کرنے کے لیے تو فون نہیں کیا..... ان کے ذہن میں پہلی بات ہی یہی آئی تبھی دُور یکتا سے بات کرتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”بیٹا خیریت تو ہے ناں سب ٹھیک ہے ناں.....؟“ انہوں نے لہجے کی لرزش چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ دُور یکتا اپنی پریشانی میں تھی اس نے محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

”جی انکل سب ٹھیک ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ طاہر بے تابی سے اس کے مزید بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔

”مجھے اشعر کا نمبر چاہیے یا میری ان سے بات کروادیں۔“ اس نے خود میں جرات پیدا کرتے ہوئے کہہ ہی دیا۔ ایک ٹائیپ کے لیے وہ خاموش سے ہو گئے اور پھر فوراً اس کا نمبر نوٹ کروادیا۔

READING
Section

88 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

آدابِ مسجد

مسجد شعائر اسلام میں سے ہے اس لیے ہر مومن پر اس کا ادب و احترام لازمی ہے۔ اس سلسلے میں چند آداب تحریر کیے جاتے ہیں۔ جس کا خیال ہر مومن کو رکھنا چاہیے۔

1۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے سیدھا پاؤں اندر رکھے پھر بسم اللہ والصلوة والسلام علی رسول اللہ ﷺ اور اللہمہ افتح لی ابواب رحمتک پڑھے۔

2۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت اگر کچھ لوگوں کو بیٹھا دیکھے تو ان کو سلام کرے..... لیکن یہ اس صورت میں ہے یعنی سلام کرنا جبکہ حاضرین نماز یا تسبیح و تلاوت وغیرہ میں مشغول نہ ہوں۔

3۔ پھر تحبیبہ المسجد پڑھے جو دو رکعت نفل ہے یہ بڑا اجر و ثواب کا کام ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے تم میں سے جب کوئی مسجد میں جائے جب تک وہ دو رکعت نماز نہ پڑھے نہ بیٹھے لیکن اس میں اوقات مکروہا کا خیال رکھے۔ (بخاری و مسلم)

4۔ مسجد میں دنیا کی باتیں نہ کرے۔
5۔ مسجد میں بیٹھنے کی جگہ پر کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرے۔

6۔ مسجد میں بے جا آواز بلند نہ کرے۔
7۔ مسجد کے عظمت و احترام کا تقاضا یہ ہے

کہ آدمی ڈرتا لرزتا اس میں داخل ہو اور نہایت سکون اور عاجزی سے جہاں جگہ ملے وہاں بیٹھ جائے یہ بات بالکل خلاف ادب ہے کہ دوسروں کو ہٹاتا اور پھلانگتا ہوا آگے بڑھ جائے یا زبردستی گھس کر دوسروں کے درمیان بیٹھ جائے۔
مرسلہ: عرشہ جنید، کراچی

”بیٹھا کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے؟“ وہ ابھی تک الجھن کا شکار تھے۔

”نہیں انکل بس مجھے ایک کام ہے۔“ ڈرّیکتا نے کام کی نوعیت انہیں نہیں بتائی۔

رات کو سونے کے لیے لیٹنے سے پہلے ڈرّیکتا نے اشعر کو فون کرنا ضروری سمجھا۔

”السلام علیکم.....“ اشعر بولا تو ڈرّیکتا پہ خاموشی طاری ہو گئی۔

”وعلیکم اسلام.....“ بہ مشکل منہ سے نکلا۔
”معاف کیجیے گا میں نے پہچانا نہیں۔“ رات کے اس پہر اس اجنبی لڑکی کو وہ واقعی نہیں پہچان پایا تھا۔
”میں ڈرّیکتا بات کر رہی ہوں۔“

”اوہو.....“ اشعر ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔
”آج ہی کا دن ہے، کیا آپ کل تک انتظار نہیں کر سکتیں؟“ اشعر کو بے اختیار شرارت سو جھی تو دوسری طرف موجود ڈرّیکتا اس لطیف سی جرأت پر تھوڑا سا نروس سی ہو گئی۔

”میں، میں دراصل طیب کو کل اپنے ساتھ لانا چاہتی ہوں مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ کیسے ہوگا۔ ہو سکتا ہے آپ کی فیملی کو اعتراض ہو، طیب کو بار بار والے دن ساتھ لانے پر..... اگر آپ میرا ساتھ دیں تو ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کل خود کہہ دیں کہ طیب ہمارے ساتھ جائے گا تو.....“ وہ امید و بیم کی کیفیت بھی اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ شروع میں بات کرتے ہوئے وہ نروس تھی پر اب اضطراب کا شکار تھی۔

اشعر اس کی بات سمجھ گیا تھا۔
”ٹھیک ہے کل طیب ساتھ ہی ہوگا آپ کے..... باقی میں سنبھال لوں گا۔“ ڈرّیکتا بے طرح خوش ہو گئی۔

”آپ کا بہت، بہت شکریہ میں اس بات کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ آپ نے میری مشکل آسان کر دی ہے۔“ اشعر تو اس سے مختلف ثابت ہو رہا تھا جیسا اس نے اور نگزیب تایا اور شیریں تائی سے سنا تھا۔

شمرہ نے زمین کے لیے کمر خالی کروا کے سیٹ
 کروا دیا تھا۔ طیب اسی کے پاس تھا۔ طیب کو سولانے
 سے پہلے وہ اسے ڈر یکتا کے پاس لے گئی۔ نیند سے اس
 کی آنکھیں بوجھل تھیں بروہ سو نہیں رہا تھا۔ بے چین سا
 تھا اتنے بہت سارے لوگوں کو دیکھ کر..... اور آج اس
 نے تنگ بھی بہت زیادہ کیا تھا۔

ڈر یکتا نے طیب کو اس سے لے لیا۔ زمین کے
 ہاتھ سے اسے لینے کی دیر تھی اس نے رونا شروع کر دیا۔
 ڈر یکتا کا بھاری لہنگا اور اس پر کیا گیا کام طیب کے
 نازک جسم کو گراں گزرا تھا۔ اس نے رو کر ناپسندیدگی کا
 اظہار کیا۔ زمین نے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اب وہ
 مہر سکون تھا۔ اتنے میں شمرہ بھی ادھر آ گئی۔

”ہاں جی سونے سے پہلے طیب سے مل لو، اشعر
 آرہا ہے۔“ اس کے لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی۔
 وہ سمٹ سی گئی۔ شمرہ کے بعد لائے اور ان کی کچھ اور کزنز
 بھی ڈر یکتا کے پاس بیٹھ گئیں۔ زمین بھی وہیں تھی۔
 طیب کے منہ میں فیڈر دبی ہوئی تھی اور نیند کی وادیوں
 میں آہستہ، آہستہ اتر رہا تھا۔ زمین دلچسپی سے ان سب
 کی باتیں سن رہی تھی اور لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اشعر دوستوں سے فارغ ہو کر آیا تو لائے کو ڈر یکتا پر
 رحم آ گیا۔ بھاری جوڑے اور زیورات کی وجہ سے وہ بہت
 بے آرام سی تھی۔ لائے نے سب کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ڈر یکتا، میں نے تمہارے کپڑے نکال کر
 رکھ دیے ہیں بدل لینا..... اور پریشان مت ہونا
 طیب سو گیا ہے۔ یہ دیکھو زمین کی گود میں ہے۔“ وہ
 جاتے، جاتے پھر شرارت سے بولی تھی۔ کمر خالی
 ہو چکا تھا۔ اب صرف اشعر ہی تھا جو صوفے پر بیٹھا
 اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ کافی تھک گئی ہیں، ذہنی اور
 جسمانی طور پر..... آپ ان کپڑوں سے جان چھڑائیں
 اور ریٹ کریں۔“ اشعر شوز اتارنے لگا۔ ڈر یکتا نے
 حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ روم میں جا چکا
 تھا۔ پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ چند منٹ بعد وہ

اس کے گھر پر فائرنگ کروانے والا شخص اس قدر ہمدرد
 بھی ثابت ہو سکتا ہے اسے یقین نہیں آرہا تھا۔
 ”کل ملاقات ہوگی آپ سے فیس ٹوفیس.....
 پھر شکر یہ بھی ادا کر دیجیے گا۔“ اشعر کے یہ کہنے کی دیر تھی
 اس نے فون بند کر دیا۔

ڈر یکتا بہت خوش اور مطمئن تھی۔ کل طیب اس
 کے ساتھ ہوگا۔ اسے حویلی میں کسی کے بھی رحم و کرم پر
 نہیں چھوڑنا پڑے گا۔
 اسے مارے خوشی کے نیند ہی نہیں آرہی تھی۔

☆☆☆

پہا اور شاہ زیب بھائی کے بغیر اسے اپنی رخصتی کا
 تصور... کل تک بہت کربناک لگتا تھا مگر وہ ان کے بغیر
 ہی رخصت ہو کر اشعر لغاری کے گھر آ گئی تھی۔ طیب اور
 زمین اس کے ساتھ تھے۔ اشعر نے نہ جانے
 اور نگزیب اور شیریں سے کیا کہا تھا کس طرح بات کی
 تھی جو زمین، طیب کے کپڑے اور دیگر ضروری سامان
 پیک کر کے واپسی پر بارات کے ساتھ ہی آئی تھی۔

اشعر نے شمرہ، لائے اور پہا کو خود ہی قائل کیا تھا۔
 کسی کو اگر تھوڑا بہت اعتراض بھی تھا تو اس نے ختم
 کر دیا تھا۔

اس کے باوجود ڈر یکتا یہاں آ کر بھی رو، رو کر
 بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ شمرہ، لائے دونوں نے مشکل
 سے اسے چپ کروایا۔ اتنا تو انہیں بھی پتا کہ در یکتا کے
 جوان بھائی کی ڈیٹھ ہو گئی ہے اور عمر انکل ذہنی امراض
 کے اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ انہیں ڈر یکتا کے نازک
 احساسات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ لڑکی جو ابھی
 اپنے گھر سے باپ اور بھائی کے بغیر وداع ہو کے آئی
 ہے اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ رو، رو کے ڈر یکتا
 کا سر درد کر رہا تھا۔

اشعر دوستوں کی طرف تھا۔ جب سے بارات
 لوٹی تھی وہ تب سے دوبارہ خواتین کے گھیرے میں نہیں
 آیا تھا جو عجیب، عجیب سی رسمیں کر رہی تھیں۔

☆☆☆

ناشتے کے بعد پارلر جانا تھا۔ جانے کتنی دیر تھوڑے مشق بننا تھا اور پھر ایک ہی پوز میں مسلسل بیٹھنا تھا۔ بہت مشکل تھا۔
اشعر دیر تک سویا رہا تھا۔

ڈرّی لیتا سب کے ساتھ ناشتا کر چکی تھی اور اب گاؤں سے آئے ہوئے رشتے داروں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اشعر بھی بیدار ہونے کے بعد اُدھر ہی آ گیا۔ سائرہ نے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ اشعر نے سب کو سلام کیا۔ ڈرّی لیتا کی دونوں بچیاں، تائی، کزنز وغیرہ سب ہی تھے۔ صرف اورنگزیب اور ہارون نہیں تھے۔ انہوں نے شام کو آنا تھا۔ اورنگزیب یہاں آنے میں بے عزتی محسوس کر رہے تھے پر شیریں کے سمجھانے بچھانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ نوید چچا تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے تھے۔

☆☆☆

اشعر کا ناشتالا سب ڈرائنگ روم میں ہی لے آئی جہاں ڈرّی لیتا کے رشتے دار بیٹھے تھے۔ اشعر ہنس، ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اس وقت وہ کہیں سے بھی ایک سخت گیر پولیس آفیسر نہیں لگ رہا تھا جس طرح سائرہ نے اس کے بارے میں سنا تھا۔ اشعر نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور آخر میں چائے پی۔ ہلکے رنگ کی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس سائرہ کو وہ بہت زوردار لگا۔ ٹی شرٹ میں سے جھانکتے بازوؤں کے مضبوط مسلز اور کلانی پر بندھی قیمتی رسٹ واچ سے لے کر اسے ہیرا سائل تک سب کچھ ہی قابل توجہ تھا۔

سائرہ کو اچانک ڈرّی لیتا سے وہی پرانا حسد محسوس ہونے لگا۔ یہ شاندار مرد اس کا شوہر تھا، اس کے تمام تر اختیارات اور جملہ حقوق کا مالک..... اشعر لغاری اسے تروتازہ زندگی سے بھرپور لگ رہا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں ڈرّی لیتا بھٹی، بھٹی اور تھکی، تھکی سی نظر آ رہی تھی۔ اس کی تھکن کی وجہ نظر انداز کرنے والی نہیں تھی۔ سائرہ سلگ اٹھی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی اشعر نے آخر کار ڈرّی لیتا کو جیت ہی لیا تھا۔ ابو نے کتنا زور لگایا تھا وہ ڈرّی لیتا کو چھوڑ دے..... پر وہ ضدی تھا۔

ٹائٹ ڈریس میں ملبوس باہر نکلا۔
”جائیں آپ بھی چھینچ کر لیں۔“ وہ نرمی سے بولا تو ڈرّی لیتا بھی بھاری لہنگا سمیٹی آرام سے اٹھی اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ دوپٹا اتار کے اس نے ہنگ کیا، زیورات سنبھال کر رکھے اور ہاتھ روم میں چلی گئی۔ شاور لے کر ٹائٹ ڈریس پہن کر جب وہ کمرے میں آئی تو دل دھک، دھک کر رہا تھا دل اور دماغ میں کش مکش ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اشعر سے ڈرّی لیتا لگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو سمجھا کر وہ باہر آئی تھی۔

بیڈ روم کی تمام لائٹس بند تھیں۔ صرف زیرو پاؤر کی ایک لائٹ جل رہی تھی۔ اس کے قدم من، من بھر کے ہو گئے تھے۔ اشعر کی نگاہ اسی کی طرف تھی۔ وہ شاید اس کی اندرونی کش مکش سے واقف تھا۔ اس لیے لائٹس دوبارہ آن کر دیں۔ وہ پراسرار اور معنی خیز ماحول یکسر بدل گیا۔

”آئیں، سو جائیں، مجھے خود بہت شدید نیند آرہی ہے.....“ اس نے سگریٹ لائٹروں چیریں تپائی سے اٹھالیں۔ وہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آگئی۔ اشعر اٹھ گیا تھا۔ ڈرّی لیتا کا دل دھک، دھک کرنے لگا وہ اسی کی طرف آ رہا تھا۔ وہ سائڈ پر ہو گئی جیسے بچنا چاہ رہی ہو۔ اشعر نے اس کی طرف نہیں دیکھا وہ ٹیرس کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔
ڈرّی لیتا بیڈ پر آ کر لیٹ گئی اسے بہت دیر بعد نیند آئی۔

اشعر جانے کس وقت دوبارہ آیا اور کب سویا اسے کچھ خبر نہیں..... صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ جہازی سائز بیڈ کے دوسرے سرے پر سر کے نیچے دو تکیے رکھے محو خواب تھا۔

اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کب آ کے سویا..... یہ تو طے تھا کہ وہ اس کے سونے کے بعد ہی آیا ہوگا۔ کچھ عجیب سا رویہ تھا اس کا..... جیسے ڈرّی لیتا کا کوئی وجود ہی نہیں ہو..... وہ سوچنا چاہ رہی تھی پر ٹائم نہیں تھا۔ اسے

غیرت کا پکا..... تب ہی تو کل اسے رخصت کروا کے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اور آج وہ حقیقت بنی اس کے گھر میں بیٹھی تھی۔ کتنا مکمل منظر تھا۔ اس نے رشک سے دیکھا۔

نوکرانی ناشتے کے برتن اٹھا کے لے گئی تو زمین طیب کو لیے چلی آئی۔ دُورِ یکتا نے بے تابی سے اسے گود میں لے لیا..... اور اس کے گال چومے..... شیریں نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا۔ طیب کی ذمے داری کا بوجھ مکمل طور پر ان کے سر سے اتر گیا تھا۔ دُورِ یکتا اسے ساتھ لے آئی تھی اسے اپنے دلہنا پے کی بھی پروا نہیں تھی کہ اس طرح شادی کے اولین دنوں میں طیب پہ اتنی توجہ دینے سے کہیں اشعر ناراض نہ ہو جائے پر وہ تو مسکرا رہا تھا، اسے طیب کے ساتھ لاڈ کرتے دیکھ کر جیسے اس کی اپنی اولاد ہو۔ یہ سوچتے ہی شیریں شرمندہ سی ہو گئیں ایک ماہرہ تھی اس کی ماں اور دوسری شیریں تھیں طیب کی مانی، ساہرہ بھی طیب کی خالہ وہ بھی تو دُورِ یکتا کی ہم عمر ہی تھی۔ کسی کو بھی طیب کی پروا نہیں تھی۔ ان اجنبی لوگوں نے جو طیب کے سکے نہیں تھے اسے قبول کر لیا تھا۔ شیریں نے اشعر کی فیملی کے ہر چہرے کو غور سے دیکھا کہ کہیں انہیں کوئی خفگی نظر آئے۔ پر نہیں..... دُورِ یکتا پہلے دن ہی طیب کو ساتھ لے آئی تھی۔ شیریں نے زمین سے کرید، کرید کر سب کے رویے کے بارے میں پوچھا..... پر انہیں جواب سن کے مایوسی ہوئی۔ ثمرہ، لائبہ نے تو طیب کو گود میں لٹا کے لاڈ بھی کیا تھا۔ ثمرہ کی دو بیٹیاں ہی تھیں انہیں ایک کھلونا مل گیا تھا وہ طیب کو اٹھا کے گھوم رہی تھیں۔ وہ بھی ہنس رہا تھا، ہلکھلکا رہا تھا جیسے اپنی خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔

وہ یہاں آ کے خوش تھا۔ اس گھر کے مکینوں میں اپنائیت کی خوشبو تھی بچے شاید اس چیز کو پہچانتے ہیں اس لیے طیب، ثمرہ کی گود میں آ کے رو نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

ویسے کی تقریب رات گئے اختتام پزیر ہوئی تو

سب تھکن سے چور تھے۔ دُورِ یکتا کو تو سخت قسم کی نیند آرہی تھی۔ کل رات بھی وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں پائی تھی۔ اجنبی جگہ تھی، اجنبی بستر تھا، اجنبی کمر تھا کچھ پریشانیاں بھی اپنی جگہ موجود تھیں جنہوں نے اسے سکون کی نیند سونے نہیں دیا تھا۔ صبح آنکھ بھی جلدی کھل گئی تھی۔

زمین کل کی طرح آج بھی طیب کو سلانے لے گئی۔ دُورِ یکتا نے ویسے کے بھاری کامدار جوڑے سے جان چھڑائی تو سکون ملا۔ کپڑے بدل کے باہر آئی تو اشعر موجود تھا۔ حالانکہ جب وہ کمرے میں آئی تو وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی بیڈ کے قریب آئی اشعر نے سب لائٹس آف کر دیں۔ سوائے زیرو پاؤر لائٹ کے..... وہ خود صوفے پر بیٹھا تھا۔ شاید اسی کے انتظار میں تھا۔ دُورِ یکتا کا دل دھڑکنے لگا۔ کل تو وہ سو گیا تھا، اسے بھی ریٹ کرنے کا کہا تھا پر آج جانے کیا ہوگا۔ وہ گرنے کے انداز میں بیٹھی تھی۔ اشعر کو ہنسی تو بہت آئی پر ہونٹوں میں دہالی۔

اشعر نے دو ٹیکے اٹھائے سر کے نیچے رکھے۔
”پلیز زیرو پاؤر کی لائٹ بھی آف کر دیں یہ تیسرا بٹن ہے۔“ کروٹ بدل کر اس نے یہ جملہ سونی صد دُورِ یکتا سے کہا تھا۔ اس نے لائٹ آف کر دی۔

☆☆☆

پندرہ، بیس دن پر لگا کراڑ گئے۔ ثمرہ، لائبہ واپس جا رہی تھیں۔ انہوں نے دُورِ یکتا کو بہت محبت اور اپنائیت دی تھی۔ بہت جلد ہی وہ اس گھر کے ماحول سے مانوس ہو گئی تھی۔ اس میں سارا کمال۔ اشعر کی دونوں بہنوں کے محبت بھرے رویے کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دُورِ یکتا ان کے واپس جانے پر بہت ادا اس تھی۔ دو دن بولائی بولائی پھرتی رہی۔ زمین، طاہر انکل اور طیب نہ ہوتے تو وہ تنہائی کے احساس سے پاگل ہی ہو جاتی۔ اشعر کی شکل گھر میں کم ہی نظر آتی۔ وہ بہت مصروف ہو گیا تھا یا جان کے خود کو مصروف ظاہر کر رہا تھا۔

(جاری ہے)

READING
Section

92 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

ٹوٹ جائے۔ یہ تو بس ڈرائنگ روم کی بڑی سی کینٹ
میں سجے رہتے تھے اور جب بھی میرے ہاں کوئی خاص
مہمان آتے، میں انہیں ان برتنوں کا دیدار ضرور کراتی اور
ان کے ”واہ، وا کیا خوب صورت برتن ہیں..... کس قدر
نازک شیشہ ہے.....“ قسم کے جملوں سے دلی تسکین
حاصل کرتی..... کبھی میاں کے خاص دوست آتے تو وہ
مجھ سے درخواست کرتے کہ یہ سیٹ نکال دو لیکن میں نے
کبھی ان کی یہ خواہش پوری نہیں کی..... ہوں، ہاں کر

وہ میرے جہیز کا ڈزنیٹ تھا جو میرے والد نے
میری شادی کے موقع پر دیا تھا۔ اس سیٹ کو کم و بیش
پچاس سال تو ہو چکے تھے۔ اس قسم کے برتن آج کل ناپید
تھے۔ ماسین چائنا کے برتن جرمن کے شہر ڈرسٹوبن کے
قریب بنتے تھے اور پوری دنیا میں مشہور تھے۔ عام طور
سے ایسے برتن امیر لوگ رکھتے تھے سو میں ان برتنوں کی
حفاظت جی جان سے کرتی تھی اور اہم سے اہم موقع پر
بھی ان برتنوں کو نہیں نکالتی تھی کہ مبادا اس میں سے کچھ

اگر چیاں دل کی

شیم فضل حنا لق



کے انہیں ٹال دیتی بعد میں وہ بھی بھول بھال جاتے۔
 بیلا میری بہت پیاری اور لاڈلی بیٹی تھی۔ تین
 بیٹوں کے بعد خدا نے اسے ہمارے آنگن میں اتارا تھا وہ
 بھی ہزاروں منتوں، مرادوں اور بے انتہا دعاؤں کے
 بعد..... بیلا میرے اور میرے میاں کے دل کا ٹکڑا تھی،
 ہم نے کبھی اس کی کسی خواہش کو رد نہیں کیا تھا..... وہ تھی
 بھی بہت پیاری..... لیکن فرمائشیں وہ ضرور کرتی تھی اور
 ہم تو تھے ہی پورا کرنے کے لیے..... جب وہ ایف اے
 میں اچھے نمبر لے کر کامیاب ہوئی تو اس نے اپنے
 دوستوں کو پارٹی دینے کا پروگرام بنایا۔ میں نے اور اس
 کے پاپا نے اس کے اس آئیڈیے کی بہت تعریف کی.....
 اس کے پاپا نے تو شہر کے بڑے، بڑے ہوٹلوں کے نام
 لیے کہ ہم یہ پارٹی وہاں دیں گے لیکن بیلا نے ہوٹل میں
 پارٹی دینے کو رد کر دیا اور کہا کہ وہ یہ پارٹی اپنے گھر
 میں دے گی اور اس میں زیادہ تر ڈشز اس کی ممانعت
 میں بناؤں گی۔ کوکنگ کا شوق تو مجھے بہت تھا اور اکثر کوئی
 نہ کوئی نئی ڈش ٹرائی کرتی رہتی تھی..... ظاہر ہے بیلا کی
 خواہش تو ہمارے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی سو میں فوراً راضی
 ہو گئی اور تب ہم تینوں یعنی میں، بیلا اور اس کے پاپا مل کر
 دعوت کا مینو ڈسکس کرنے لگے۔

دعوت والے دن میں خالہ زرینہ کے ساتھ مل کر
 الماری سے برتن نکالنے لگی..... صبح سے کچن میں کام کر،
 کر کے میں تھک چکی تھی..... یہ بھی اچھا تھا کہ خالہ زرینہ
 آج منہ اندھیرے میری مدد کے لیے آئی تھی..... خالہ
 زرینہ میری جزوقتی ملازمہ تھی جسے آج میں نے پورے
 دن کے لیے بلایا تھا..... میں برتن نکال، نکال کر خالہ
 زرینہ کو دے رہی تھی کہ بیلا اپنے کمرے سے باہر آگئی اور
 ناک سے سون سون کرتی ہوئی ہنس کر بولی۔

”مما..... آج تو آپ نے اتنی خوشبو میں پھیلائی
 ہیں کہ مجھے اپنے کمرے میں بھی چھین نہیں آ رہا۔“
 ”یہ تو تمہاری دوستوں سے ہی پتا چلے گا کہ کون سی
 ڈش اچھی بنی ہے۔“ میں مصروف انداز میں اسے دیکھتے
 ہوئے بولی۔

”مما..... میری دوستوں کے لیے آج آپ اپنے

جہیز کا سیٹ نکال دیں تو دعوت کا لطف دو بالا ہو جائے گا۔“
 بیلا میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اچانک اس نے
 بڑی عجیب بات کرتے ہوئے کہا۔ میری تو اوپر کی سانس
 اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی..... گھر میں بہت ساری دعوتیں
 ہوئی تھیں..... بچوں کی سالگرہیں بھی ہم مناتے رہتے
 تھے لیکن کسی بچے نے ایسی فرمائش نہیں کی تھی..... خود بیلا
 وقت بے وقت اپنی بے تکلف دوستوں کی دعوتیں کرتی
 تھی لیکن کھانا کن برتنوں میں سرو ہوتا ہے اس سے اسے
 کوئی سروکار نہیں تھا..... وہ میرے قریب کھڑی آس
 بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کھٹکھا کر
 اپنا گلا صاف کیا اور بہ مشکل بولی۔

”بیلا جانی..... ہمارے گھر میں سارے برتن اعلیٰ
 ہی کوالٹی کے ہیں..... تمہیں تو معلوم ہے کہ تمہارے پاپا
 اور نہ ہی میں لو کوالٹی کے برتن پسند کرتے ہیں، میں نے
 دعوت کے لیے وہ سیٹ نکالا ہے جو ابھی چند ماہ قبل
 تمہارے پاپا پشاور سے لائے تھے..... ابھی اسے کسی اور
 نے یوز نہیں کیا..... پہلی بار.....“

”پلیز ممما..... میں چاہتی ہوں کہ میری دوستیں ان
 یونیک برتنوں کا دیدار کر لیں..... اور اگر ان کو معلوم ہو گیا
 کہ یہ برتن آپ کے جہیز کے ہیں تو وہ کتنا امپریس
 ہوں گی..... کہ اس زمانے میں نانا مرحوم نے آپ کو اتنے
 قیمتی برتن جہیز میں دیے تھے۔“ بیلا میری بات کاٹتے
 ہوئے بولی۔

”دل..... لیکن میری جان.....“ میں کچھ بے بسی
 سے اسے دیکھ کر رہ گئی، مجھ سے کوئی بات نہیں بن رہی تھی۔
 ”لیکن ویکن کچھ نہیں.....“ وہ حتمی لہجے میں بولی۔
 ”بس فیصلہ ہو گیا..... آج کی دعوت کے لیے آپ کے
 جہیز کے برتن ہی استعمال ہوں گے.....“ وہ ہمیشہ کی
 طرح یک طرفی فیصلہ دے کر خالہ زرینہ سے کہنے لگی۔

”خالہ..... وہ والے برتن لا کر واپس رکھ دیجیے۔
 اور ممما کے جہیز والے برتن لے جا کر دھو لیجیے..... لیکن
 خیال رکھیے بہت احتیاط سے دھونے ہوں گے۔ ممما کی
 ان برتنوں میں جان ہے۔“ وہ حکم دے کر ہنستی ہوئی اپنے
 کمرے کی طرف مڑ گئی جبکہ میری توجہ سچ جان پر بن



باتیں بہار و خزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

اس گردشِ لیل و نہار میں ہمارے شب و روز سیلِ رواں کی طرح گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ انہی گزرتے چلنے میں بے شمار کہانیاں، ذہنیوں قصے اور ان گنت واقعات جنم لیتے چلے جا رہے ہیں اور ہم ان کے کردار بنے تماشائے اہل کرم کبھی دیکھتے اور کبھی دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ آپ سب لوگ جو مصنفین اور بالخصوص قارئین کی حیثیت سے ہمارے ساتھ برسوں سے وابستہ ہیں اور کسی نہ کسی انداز میں پاکیزہ صفحات کو رونق بخشتے چلے آئے ہیں اور یہی پاکیزہ کی کامیابی کا راز بھی ہے کہ مخلص اور محنتی مصنفات اپنی پُر تنوع تخلیقات کے ذریعے اور تبصرہ نگار بہنیں اپنے دقیق تبصروں اور قیمتی آرا سمیت ہمارے ساتھ رہی ہیں اور انشاء اللہ رہیں گی۔

ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضر خدمت ہے تاکہ آپ کی اپنی شخصیت کے بچی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ اچھوتا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔
سوالات حاضر خدمت ہیں۔

- 1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُر اثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے.....
- 2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔
- 3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟

4۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں..... کوئی دل کی بات؟

5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔

آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

لڑکیوں کے ہنسنے بولنے کی آوازیں کچن تک آرہی تھیں وہ خوب انجوائے کر رہی تھیں..... پھر وہیں سے بیلا نے مجھے آواز دی۔

”مما..... کھانا لگوا دیجئے.....! میری دوستوں کو اب بھوک برداشت کرنا مشکل ہو گیا ہے۔“

”خوشبو میں جو زبردست آرہی ہیں تو بھوک بھلا کیسے برداشت ہوگی۔“ اس کی کسی سہیلی نے ہنس کر کہا..... اور میرے کام کرتے ہاتھوں میں تیزی آگئی..... حالہ زرینہ کے پیروں کو بھی پپے لگ گئے۔ تھوڑی دیر میں لمبی چوڑی میز یہاں سے وہاں تک کھانوں سے سج گئی..... پھر چمچوں کا شور، ہنسی، مذاق اور میوزک کا دھیمہ پن..... سب کچھ بہت دل لہھا دینے والا تھا۔ میں بچیوں سے معذرت کر کے کچن میں دوبارہ آگئی جہاں میرے دونوں بیٹے مظلومیت کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

”مما..... کھانا دیں ناں..... کتنی دیر ہوگئی ہے۔“ چھوٹا رضوان اپنے پیٹ کو تھام کر کہہ رہا تھا..... وہ بھوک کا بہت کچا تھا اور آج تو دیر بھی ہوگئی تھی کہ میرا بہر حال اصول یہ ہے کہ مہمانوں سے پہلے میزبانوں کو کھانا نہیں کھانا چاہیے۔

”ہاں..... ہاں..... ابھی دیتی ہوں کھانا..... بس تم دونوں بھائی اندرا اپنے کمرے میں جاؤ..... میں لاتی ہوں وہیں پر آپ دونوں کا کھانا.....“ میں نے انہیں پچکارے ہوئے کہا..... وہ دونوں کچن سے چلے گئے تو میں لڑکوں کے لیے کھانا نکالنے لگی۔ حالہ زرینہ تو بے پروا گرم چپاتیاں بنانے میں لگی تھی..... اور ایک، ایک کر کے چپاتی میز پر پہنچا رہی تھی..... یہ بھی بیلا کا حکم تھا کہ روٹی ہرگز بازار سے نہیں آئے گی۔ گھر میں پکے گی اور گرم گرم چپاتی میز پر سرور ہوگی..... ابھی میں بچیوں کے لیے کھانا نکالنے لگی تھی کہ اچانک ہی کچن کے دروازے پر بیلا نمودار ہوئی..... مجھے حیرت ہوئی وہ کس ضرورت کے لیے کچن میں اس وقت آگئی ہے میں ابھی اس سے کچھ پوچھنے بھی نہیں پائی تھی کہ اچانک میری نظر اس کے ہاتھ پر پڑ گئی جس سے بھل،

گئی..... اگر بیلا کی بات نہ مانتی تو بیلا کا موڈ آف ہو جاتا اور ساری پارٹی کا مزہ کر کر ہوجاتا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ پارٹی کے لیے بہت پرجوش ہو رہی تھی اور کب سے تیاریوں میں لگی تھی..... اور اگر اس کی بات مانتی تو..... برتنوں کے ٹوٹنے کا خدشہ تھا کہ برتنوں کا شیشہ انتہائی نازک تھا..... کروں تو کیا کروں..... سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن آخر کار بیٹی کی محبت جیت گئی..... میں نے سارے برتن خود اپنے ہاتھ سے نکالے..... اور ان برتنوں کے دھونے اور خشک کرنے کا سارا کام میں نے اپنے ہاتھوں سے کیا..... اس سلسلے میں، میں حالہ زرینہ پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی..... حالانکہ میری کمر میں درد شروع ہو گیا تھا کہ میں فجر کی نماز کے بعد سے کچن میں کھڑی تھی..... پکانے کا کام ہی بہت زیادہ تھا کچا کہ میں نے برتنوں کی صفائی کا کام بھی اپنے ذمے لے لیا تھا..... لیکن سارا وقت مجھے یہی تشویش ستاتی رہی کہ کہیں برتنوں میں سے کوئی برتن ٹوٹ نہ جائے..... مجھے شک تھا کہ اگر ان برتنوں میں سے کوئی برتن ٹوٹ گیا تو یقیناً میرا دل اسی وقت بند ہو جائے گا۔ اتنی ہی جذباتی تھی میں ان برتنوں کے لیے..... خیر..... میں نے سوچ لیا کہ میں ان برتنوں کو اپنے ہاتھ سے دھو کر الماری میں واپس رکھوں گی اور حالہ زرینہ کو ہاتھ تک لگانے نہیں دوں گی۔

مقررہ وقت پر بیلا کی دوستیں آنی شروع ہو گئیں..... لان کا ایک کونہ میں نے ان کے لیے سیٹ کیا ہوا تھا..... دوسری طرف ڈنر کے لیے میزیں سجا رکھی تھیں..... بونے سٹم تھا، ڈیک پر بیلا نے اپنی پسند کا میوزک لگایا تھا۔ گھر کے سب افراد کے لیے بیلا کی وارننگ تھی کہ ہم ان کے دوستوں سے مل کر نہیں ویل کم تو کہیں گے لیکن ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کی گپ شپ میں نخل نہیں ہوں گے۔ سو بیلا کے پاپا اور دونوں بھائی بیلا کی دوستوں سے مل کر ادھر ادھر ہو گئے..... بیلا کے پاپا تو اپنے دوستوں میں چلے گئے اور دونوں بھائی اپنے کمرے تک محدود ہو گئے..... میں کچن میں مصروف ہو گئی..... لیکن سارا وقت برتنوں کے ٹوٹنے کا خدشہ مجھے ستاتا رہا۔

تعریف کی تھی اور میرا بہت، بہت شکر یہ ادا کیا تھا..... ان کے جانے کے بعد بھی وہ سرشار رہی اور پارٹی کی باتیں کرتی رہی..... وہ بار، بار میرے گال پر پیار کر کے میرا شکر یہ ادا کرتی رہی کہ اس کے کہنے کے مطابق ہر ڈش ہی لذیذ تھی۔ میں اور اس کے پاپا اس کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

☆☆☆

سحر خیزی میری عادت تھی..... میں صبح منہ اندھیرے اٹھی اور لان کے اس حصے کی طرف گئی جہاں رات کی دعوت گزری تھی..... وہاں تو صورت حال اس مصرعے کی تفسیر تھی کہ ...

تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا فسانہ
لان کا وہ حصہ ٹشو پیپر ز اور باقی بیکار چیزوں سے
بھرا پڑا تھا۔ حتیٰ کہ چکن کی ہڈیاں بھی بکھری پڑی
تھیں..... یہ کارستانی تو خالہ زرینہ کی تھی..... برتن
خالی کر کے سارا گند اس نے نیچے گرا دیا تھا کہ صبح سو بچہ
صاف کرے گا..... مجھے جی بھر کر اس پر غصہ آیا.....
میں وہاں سے واپس پلٹ گئی لیکن اچانک میری نظر
اپنے جہیز کی ٹوٹی پلٹ پر پڑی۔ میں گھٹنوں کے بل
بیٹھ کر کالج کے ٹوٹے ٹکڑے اکٹھے کرنے
لگی..... تھوڑی دیر میں، میں نے سارے ٹکڑے اکٹھے
کر لیے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے دل میں
یہ کرچیاں چھ رہی ہوں۔ جانے کیا ہوا لیکن میں خود
پر قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔ میں
ان کرچیوں کو دوسرے ہاتھ سے ایسے سہلانے لگی جیسے
میں کل بیلا کا خون آلود ہاتھ سہلا رہی تھی۔ میرے
محسوسات بالکل کل کی طرح ہو رہے تھے۔ بیلا تو
میری اولاد تھی..... لیکن بعض اوقات کچھ چیزیں بھی
اولاد کی طرح عزیز ہوتی ہیں۔ خاص کر جہیز کی چیزیں
جنہیں مرحوم والدین نے اپنی بیٹی کے لیے بہت پیار
سے جمع کیا ہوتا ہے..... آنسو میرے گالوں پر بڑی
شدت سے بہنے لگے تھے۔

بھل کر تا خون بہہ رہا تھا..... میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں حواس باختہ ہو گئی..... بیلا کا گلابی رنگ پیلا پڑ گیا تھا..... مارے پریشانی کے خون میری رگوں میں جمنے لگا۔

”یہ..... یہ کیا ہوا؟“ میں نے ہٹکا کر اس سے پوچھا۔
”مما..... وہ.....“ وہ اپنا ہاتھ نلکے کے آگے کرتے ہوئے کچھ پچکچاتے ہوئے بولی..... پانی خون کے ساتھ مل کر سرخ ہو رہا تھا۔

”بتاتی کیوں نہیں..... کیسے ہوا یہ سب.....؟“
میں اس کا ہاتھ پکڑ کر..... گھبرا کر تیز آواز میں بولی۔
”ماہ رخ سے..... آپ کا وہ سیٹ..... میرا مطلب ہے..... اس کی پلیٹ ٹوٹ گئی..... میں اس کی کرچیاں اکٹھی کرنے لگی تو..... شیشے کا ٹکڑا ہاتھ میں چبھ گیا۔“

”ارے خالہ..... اندر سے وہ فرسٹ ایڈ باکس تو لے آنا..... جلدی کرو..... دیکھو تو..... خون بند نہیں ہو رہا.....“ گھبراہٹ اور پریشانی سے میرا برا حال تھا۔
”مما..... آپ کو اپنے سیٹ کی پلیٹ ٹوٹنے کا دکھ ہوا ہے نا.....؟“ بیلا اپنے بہتے ہوئے خون سے بے پروا میرے چہرے کو کھوج رہی تھی۔

”ارے بھاڑ میں جائے وہ سیٹ اور اس کی پلیٹ..... بس کسی طرح تمہارا خون بند ہو جائے.....“
میں اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں تھامے فکر سے ادھ موٹی ہوئی جا رہی تھی۔ بیٹی کی محبت ساری محبتوں پر حاوی ہو گئی تھی۔ یہ اولاد ہوتی ہی ایسی ہے کہ اس کے آگے اور کچھ نظر نہیں آتا..... مجھے بھی آج اپنی بیٹی کا زخمی ہاتھ نظر آ رہا تھا..... اور کچھ نہیں.....

☆☆☆

رات کچھ سوتے جاگتے گزری معلوم نہیں لیکن اتنی شدید تھکن کے باوجود مجھے بہت کم نیند آئی..... بیلا تو اسی وقت ٹھیک ہو گئی تھی اور دوستوں کے ساتھ مگن ہو گئی تھی..... رات گئے تک ان کا ہنگامہ جاری رہا..... جانے سے قبل بیلا کی دوستوں نے کھانے کی لذت کی بہت

اعشوق تیرے ہیں کھیلانِ عجب

ڈراما بلال

وہ کمالِ ہنر یوں بھی کرتا گیا
زخم دیتا گیا زخم بھرتا گیا
دور اُس کی نگاہوں سے منزل ہوئی
جادۂ عشق میں جو بھی ڈرتا گیا
رات پھولوں پہ شبنم برستی رہی
رنگ پھولوں کے رخ کا نکھرتا گیا

عشق، محبت، چاہت، پیار ایک جذبے کے کتنے اظہار... یہ جذبہ ہر کسی کے دل میں پنپ سکتا ہے بشرطیکہ دل کا ظرف وسیع اور خلوص کے موتیوں سے مرصع ہو، زیر نظر کہانی اسی جذبے کے اتار چڑھاؤ کو بے حد متاثر کن انداز میں قاری کو ایک نئی سوچ سے روشناس کراتے ہوئے بڑھتی ہے۔

عشق کے آفاقی جذبے کو ایک نئے انداز میں بیان کرتی دلکش تحریر

قطعہ 2



READING
Section



READING
Section

”سارہ ویسے آپ بہت ضدی ہیں۔ دو مہینے سے آپ کے پیچھے خوار ہو رہا ہوں، آخر کس طرح میں آپ کو اپنی محبت کا یقین دلاؤں؟“ اس کے لہجے میں بیچارگی تھی۔ وہ تقریباً اس کے ساتھ، ساتھ ہی چل رہا تھا۔

”مجھے آپ کی محبت پر یقین کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور میں بھی آپ کو کوئی بار کہہ چکی ہوں کہ آپ کسی اور لڑکی پر لائن ماریں۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ بلاوجہ مجھ پر ٹائم ویسٹ کر رہے ہیں آپ۔“ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سارہ کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

”یقین کیجئے سارہ، میں بھی کوئی سڑک چھاپ عاشق نہیں ہوں۔ بخدا جب سے آپ کو دیکھا ہے کسی کام میں دل نہیں لگتا میرا.....“

”تو میں نے آپ کے دل کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ سنبھال کر رکھیں اپنے دل کو۔“ سارہ کو غصہ آنے لگا۔

اسجد بہت کم رفتار سے بایک چلاتا ہوا اس کے بالکل پیچھے، پیچھے ہی آرہا تھا۔ سارہ کی بات پر وہ مسکرا پڑا۔

”سارہ جی میں تو کوئی بار اپنے دل کو سمجھا چکا ہوں مگر یہ کم بخت اب میری سنتا ہی کب ہے..... میرے دل پر تو اب صرف آپ کی حکمرانی ہے، مجھ سے تو اب میرا دل مکمل طور پر بغاوت کر چکا ہے۔“

سارہ اب چلتے، چلتے رک گئی تھی۔ وہ پچھلے دو مہینے سے اس شخص کی ایسی باتیں سن رہی تھی اور وہ اس کو ایسے ہی جواب دے رہی تھی مگر آج وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔

”خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ میرا باپ ایک شریف انسان ہے اگر کسی نے آپ کو میرے پیچھے آتے ہوئے دیکھ لیا تو میرے ساتھ، ساتھ وہ بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔“ سارہ کے لہجے میں التجا تھی۔ وہ سڑک پر جس جگہ تھی وہاں سے اس کا گھر محض ایک گلی کے فاصلے پر تھا۔ وہ گھر جو بالکل خستہ حال تھا جس میں ایک غریب اور بیمار باپ کے پاس اپنی ایمانداری، نیک نامی اور اس کی بیٹیوں کی شرافت کے علاوہ کوئی قیمتی چیز نہ تھی۔

”میں جانتا ہوں سارہ! مجھے بھی آپ کی عزت، اپنی محبت سے بڑھ کر عزیز ہے صرف ایک بار کہیں بیٹھ کر میری بات سن لیں، میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں آپ سے سچی محبت کرتا ہوں اور آپ سے شادی کا خواہش مند ہوں۔“

”جو لڑکی جہیز میں سوائے شرافت کے اور کوئی چیز نہ لاسکے کیا آپ کے گھر والے ایسی لڑکی کو قبول کر لیں گے؟“

”سارہ مجھے اور میرے گھر والوں کو ان چیزوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے، میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ان کے لیے وہ لڑکی سب سے خاص ہوگی جس سے میں محبت کرتا ہوں۔“

اسجد کے لہجے کی سچائی اس کی باتوں میں بولتی محبت..... سارہ کو اندر ہی اندر سرشار کرنے لگی..... مگر اس کے لب خاموش تھے۔ ذہن کچھ سوچنے لگا تھا۔ اسجد بایک سے اتر کر اب اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بھی ٹھنک کر رک گئی تھی۔

”سارہ کچھ تو بولیں۔“

سارہ بغیر اس کی طرف دیکھے ہی اس کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگا رہی تھی۔ اسے اسجد کی باتیں جھوٹ نہیں لگیں۔ اسجد کی وارنٹی نے اسے اپنا رخ موڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”اچھا یہی بتادیں کہ میں اپنی امی کو آپ کے گھر کب بھیجوں؟“

”ابھی اس کی ضرورت نہیں۔“ سارہ نے فقط اس کے گھر کی جانب قدم بڑھائے۔

اے عشق تیرے ہیں کھیل عجب

مہینے کے آخری دن چل رہے تھے۔ گھر میں مہینے کے آخری دنوں میں نوبت فاقوں تک آ جاتی تھی۔ وہ اسجد کو کیا بتائی... کیسے بتائی؟

”آپ کو نہیں مگر مجھے تو ہے ضرورت..... آپ کے بغیر میرا ایک، ایک پل عذاب میں گزرتا ہے۔“ اس کی اس بات پر سارہ کو بے اختیار ہنسی آگئی مگر وہ ضبط کر گئی۔

”پلیز ابھی آپ جا میں یہاں سے..... مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ویسے بھی آتے جاتے کوئی دیکھ لے گا تو کیا سوچے گا۔“ سارہ اسے ٹالتے ہوئے آگے بڑھ گئی تھی اور اسجد دیر تک کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا تھا۔

سارہ جب گھر میں داخل ہوئی تو خلاف توقع..... زویا کو گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی۔

”السلام علیکم! ارے زویا آپ آج آپ اسکول نہیں گئیں؟“ سارہ کمرے میں آ کر اپنی چادر اتارتے ہوئے بیڈ پر لیٹی زویا سے پوچھنے لگی۔

”وعلیکم السلام..... گئی تھی یار..... بس ہاف لیولے کرواپس آگئی، سر میں اتنا شدید درد ہوا کہ کیا بتاؤں..... ساتھ میں بخار بھی لگ رہا تھا۔“

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ سارہ نے بیگ اور فائل اپنے پلنگ سے اٹھا کر الماری میں رکھے۔

”اب کچھ بہتر ہوں..... گھر آ کر پین کھلی تھی پھر اماں نے چائے بنا دی۔ اب بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“

”ابا کہاں ہیں نظر نہیں آرہے۔“ سارہ بہن کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔ ”اور اماں بھی نظر نہیں آ رہیں۔“

”ابا صفدر صاحب کی دکان تک گئے ہیں۔ گھر بیٹھ، بیٹھ کر بور ہو رہے تھے اور اماں نہ رہی ہیں۔“

”گلو گھر آیا کہ نہیں؟“ سارہ کے سوال پر زویا نے سر دآہ بھری۔

”اس کے لیے یہ گھر..... گھر تھوڑی ہے وہ تو یہاں صرف سونے آتا ہے یا اماں سے پیسے مانگنے..... اسے بگاڑنے میں سارا قصور سراسر اماں کا ہے۔“ زویا نے اپنی رائے دی۔

”ہاں..... مگر اب تو اماں بھی اس کی ناجائز فرمائش پر اسے ڈانٹتی ہیں، رات کو جب وہ دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے مری جانے کے لیے اماں سے پیسے مانگ رہا تھا تو اماں اسے ڈانٹ رہی تھیں۔“

”سارہ، جب اسے سمجھانے اور ڈانٹنے کا وقت تھا تو اس وقت اماں گلو کو میرا اکلوتا بیٹا کہہ، کہہ کر اسے بدتمیز اور خود سر بناتی رہیں۔ اب بھلا یہ ڈانٹ گلو کے لیے کیا معنی رکھتی ہے؟ اب تو وہ ڈھیٹ ہو چکا ہے۔“ زویا کے لہجے میں تکلیف تھی دکھ تھا۔

”کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں آپنی! یہ گھر کیسے چل رہا ہے؟ ابا کی معمولی پنشن اور پورا مہینہ، آپ اور میں کتنی محنت سے ایک، ایک پائی جوڑتے ہیں..... اور پھر مہینے کے آخر میں ہمارے ہاتھ کیسے خالی رہ جاتے ہیں..... اس گھر کا کرایہ..... دودھ کا بل، بجلی کا بل، گھر کا راشن، ابا کی شوگر اور بلڈ پریشر کی دوائیاں..... کیسے اور کہاں سے آتی ہیں..... گلو کو ان چیزوں سے کبھی سروکار نہیں رہا..... بھائی تو اپنی بہنوں کو گھر کی چار دیواری کا تحفظ دے کر خود محنت مزدوری کرتے ہیں..... ان کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں..... قرض اٹھا کر بہنوں کی شادیاں تک کرتے ہیں..... اور ایک ہمارا بھائی ہے دنیا کا انوکھا اور نرالا بھائی..... جو ہمارا بوجھ اٹھانے کے بجائے الٹا ہم پر بوجھ بنا ہوا ہے.....“ وہ شدید دل گرفتہ تھی۔

”ابا کی نظر کے چشمے کا نمبر بدلنے والا ہے..... ہر وقت ان کے سر میں درد رہتا ہے، اس مہینے ہم انہیں ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں لے جاسکے ان کی نئی عینک..... ان نے آدمی گرمیاں پچھلے سال کے دولان کے

سستے جوڑوں میں گزار دیں..... ہم انہیں نئے سوٹ نہیں دلا سکے..... کیا کریں مہنگائی نے ہم جیسوں کو دال روٹی کے چکر میں ڈال رکھا ہے..... مہینے میں ایک بار ہمارے گھر فروٹ آتا ہے وہ بھی جس دن ابا کو پنشن ملتی ہے..... ہفتے بعد کہیں گوشت کی شکل دیکھنا نصیب ہوتی ہے ہمیں..... ہمارے دکھ سکھ بانٹنے والا کوئی نہیں ہے زویا آپنی.....“

سارہ حد سے زیادہ جذباتی ہو گئی تھی..... اس کا لہجہ بھگ گیا تھا۔

پلنگ پر لیٹی زویا کی آنکھوں سے دو آنسو ٹوٹ کر گرے تھے اور تکیے میں جذب ہو گئے تھے۔

☆☆☆

مناب نے ایک بڑے برتن میں آٹھ کپ پانی میں چکن بریسٹ کے تین، چار قدرے بڑے پین ڈال کر انہیں ابلنے کے لیے چولھے پر چڑھایا اور کچن کے کینٹ کھول کر دیکھنے لگی..... ان میں کچن سے متعلق ہر چیز رکھی ہوئی دیکھ کر مناب مسکرا پڑی۔

”لگتا ہے چھوٹو بڑا سکھڑ ہو گیا ہے.....“ اس نے کارن فلاور کا ڈبا نکال کر شیلف پر رکھا اور فریج سے دو انڈے اور سویٹ کارن کا ڈبا نکال کر شیلف پر رکھنے کے بعد خود cooking gloves چڑھا کر پانی میں ابلتے چکن کو کانٹے کی مدد سے چیک کرنے لگی..... گوشت ابھی ٹھیک سے نہیں گلا تھا..... مناب نے برتن کے اوپر دوبارہ ڈھکن رکھ دیا اور گلوں اتارنے کے بعد وہ پیالی میں انڈے توڑ کر پھینٹنے لگی۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ چکن کارن سوپ تیار کر چکی تھی اس دوران اس نے سنک میں رکھے برتن بھی دھو ڈالے تھے..... اب وہ ڈش کی مدد سے کچن کی شیلف صاف کر رہی تھی جب اسے اقصم کے روم سے بلکے سے کھٹکے کی آواز سنائی دی تھی۔

مناب نے جلدی سے ڈش مقررہ جگہ پر رکھا اور ہاتھ دھو کر اقصم کے روم میں آ گئی۔

اقصم کروش بدل کر سائڈ ٹیبل پر پڑی پانی کی بوتل اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کے پکڑنے کی کوشش میں نیچے کارپٹ پر گر گئی تھی۔ مناب تقریباً دوڑ کر اقصم کے قریب آئی تھی۔

”چھوٹو پانی چاہیے تمہیں.....؟“

مناب کو اپنے سامنے اور اتنے قریب کھڑے فکر مند ہوتا دیکھ کر اقصم کئی لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔

”کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟“ وہ مناب کو دیکھتے ہوئے جیسے خود سے بڑبڑاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”یہ خواب نہیں ہے چھوٹو..... میں تمہارے پاس ہوں۔“ مناب اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ اس نے اقصم کا ماتھا چیک کیا..... ”تھینکس گاڈ تمہارا بخار پہلے سے کم ہو گیا ہے۔“ مناب نے اسے تسلی دی۔

”آپ آگئی ہیں باب میں یقیناً ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ اقصم نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

”جب میں آئی تھی تو تمہیں بہت تیز بخار تھا۔“

”آپ کو کس نے بتایا کہ میں بیمار ہوں؟“

”مجھے ممانی نے بتایا تھا، وہ بہت پریشان ہو رہی تھیں تمہارے لیے۔“ اقصم کا جی چاہا کہ وہ اس سے پوچھے۔

”کیا آپ میرے لیے پریشان ہوئی تھیں؟“ مگر وہ صرف سوچ کر رہ گیا تھا..... پوچھ نہیں پایا تھا۔

مناب اس سے عمر میں چار سال بڑی تھی۔ وہ تیس سال کا ایک نوجوان لڑکا تھا جبکہ وہ ستائیس سال کی ایک میچور لڑکی تھی۔ لڑکیاں تو ویسے بھی اٹھارہ بیس سال میں ہی میچور ہو جاتی ہیں۔ مناب نے اسے ہمیشہ ایک چھوٹے بھائی کی طرح ہی ڈیل کیا تھا..... اور وہ بھی اسے ول کی ہر بات صرف مناب سے ہی شیئر کیا کرتا تھا

READING
Section

102 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

اگر اسے گھر میں کسی شرارت پر ڈانٹ پڑ جایا کرتی تو وہ ناراض ہو کر ساجدہ پھوپھو کے گھر ڈیرے جمالیتا.....
وجہ وہاں جانے کی صرف مناب ہی ہوا کرتی تھی..... ایشال کی اس سے لڑائی ہوتی تو وہ شکایتوں کے انبار
لے کر مناب کے پاس ہی آیا کرتا تھا وہ اپنے دل کی تمام باتیں حتیٰ کہ اپنے اسکول، کالج کے دور میں گرل
فرینڈز کی باتیں تک مناب سے شیئر کیا کرتا تھا..... بس ایک بات ایسی تھی جو وہ مناب سے کہنا چاہتا تھا مگر
کہہ نہیں پاتا تھا۔

”بھوک لگی ہے چھوٹو.....؟“ مناب کے سوال پر وہ صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا..... مناب اٹھ کر کچن
میں آگئی تھی..... اس نے ایک باؤل میں سوپ نکالا..... سوپ کا چمچ، نیپکن..... پانی کا گلاس..... اور سوس وغیرہ
سب چیزیں اس نے ٹرے میں رکھیں اور اقصم کے روم میں چلی آئی۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور خود اقصم کے
پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”چھوٹو چلو شاپاش..... اچھے بچوں کی طرح ہمت کرو اور تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاؤ۔“ مناب نے اسے
کندھوں سے پکڑ کر اٹھنے میں مدد دی۔ تین دن کے اس شدید بخار نے اقصم کو شدید نقاہت میں مبتلا کر دیا تھا۔
مناب نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیچھے تکیے سیٹ کیے..... اقصم کو اس کے کپڑوں سے اٹھنے والی
burberry weekend perfume کی دلفریب مہک نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھنے
پر مجبور کر دیا۔

اس کے سیاہ سلکی بال دونوں کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے..... بڑی، بڑی سیاہ آنکھوں پر لمبی اور خمیدہ
پلکوں نے اس کی آنکھوں کو مزید خوب صورتی بخش رکھی تھی۔ گلابی مائل سفیدی نے چہرے کو تازگی بخشی ہوئی تھی۔
گلابی ہونٹ اور نچلے ہونٹ کی دائیں جانب تھوڑی کے اوپر ایک چھوٹا سا سیاہ تل اس کے مسکراتے ہونٹوں کے
ساتھ اسے مزید خوب صورت بنا دیتا تھا۔ وہ اسے دیکھتے، دیکھتے مہبوت ہو جاتا..... ولی کو اگر اس سے پہلی نظر میں
محبت ہوئی تھی تو اسے ہونی بھی چاہیے تھی۔ اس میں کشش ہی کچھ ایسی تھی..... اور پھر وہ فطرتاً ہی اچھی تھی کہ ہر کسی
کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔

اقصم بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا..... مناب بھی ٹرے اٹھا کر اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی اس نے
نیپکن اقصم کے آگے پھیلایا۔

”میرا حلق خشک ہو رہا ہے پہلے تھوڑا سا پانی پلا دیں۔“

مناب نے پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگایا، چند گھونٹ پینے کے بعد اس نے گلاس ہٹا دیا..... اب
مناب سوپ کا باؤل لے کر اس کے سامنے بیٹھی..... کسی بچے کی طرح اسے سوپ پلانے لگی۔

”میرا فورٹ سوپ اور وہ بھی اتنے مزے کا صرف آپ ہی بنا سکتی ہیں۔“ اقصم تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”تمہاری پسندیدہ چیزوں کی لسٹ ہمیشہ مجھے یاد رہتی ہے چھوٹو، میں نے تمہارے لیے ویسے بھی اتنی محنت

اور پیار سے بنایا ہے مزے کا کیوں نہ بنتا۔“

”پلیز..... آپ مجھے چھوٹو نہ کہا کریں..... مجھے بہت عجیب سا لگتا ہے کیونکہ اب آپ کا چھوٹو، چھٹ ڈوانچ

لسا ہو چکا ہے۔“ اس کی آواز دھیمی تھی اور وہ دھیرے سے دل کی بات کہہ گیا تھا۔

مناب اس کی بات پر مسکرائی۔

”جس دن تم مجھے آپنی کہنا شروع کرو گے، میں تمہیں چھوٹو کہنا چھوڑ دوں گی۔“ مناب مسکرائی۔

”آپ کہیں سے میری آپنی نہیں دیکھتیں تو میں آپ کو بھلا کیسے آپنی کہوں؟“ وہ قدرے جھنجھلا یا۔

”بس بات تو پھر وہیں آگئی ناں..... دیکھنے میں چاہے تمہاری آپی نہ بھی لگوں... رہوں گی تو تمہاری آپی ہی ناں.....؟ قد میں تم چاہے جتنے بھی لمبے ہو جاؤ..... مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... میرے لیے تو تم چھوٹے بھائیوں جیسے ہو اور ہمیشہ میرے لیے چھوٹو ہی رہو گے۔“ اب اس کی بات پر اقصم کچھ نہیں بولا تھا..... بولنے کے لیے کچھ تھا بھی نہیں۔ اس کی بھوک یک دم ختم ہو گئی تھی..... دل جیسے بجھ گیا تھا۔

مناب نے سوپ سے بھرا چمچ اس کے لبوں سے لگایا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
”بس اور نہیں.....“

”ارے، تھوڑا سا تو پیو ناں..... تمہارا فیورٹ سوپ ہے یہ..... اور ویسے بھی تمہیں ضرورت ہے اس کی۔“
مناب نے اصرار کیا۔

”میری فیورٹ تو آپ بھی ہیں، میری ضرورت تو آپ بھی ہیں.....“ اقصم نے دل ہی دل میں سوچا۔
کبھی کبھی وقت انسان کی پسند اور ضرورت کو یک دم بدل کے رکھ دیتا ہے..... وہ پچھلے کئی مہینوں سے بہت سی باتوں کو دل ہی دل میں سوچتا رہتا تھا مگر ان کو اظہار کا پیرا، ہن نہ دے پاتا۔ بس دل کی باتیں صرف دل ہی میں کر لیا کرتا تھا۔

”پلیز اور نہیں اس وقت بس اتنا ہی۔“ اقصم کے انکار کرنے پر مناب باؤل ٹرے میں رکھ کر کچن میں آگئی۔ ہوپ فریج میں رکھنے کے بعد وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو وہ لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔
”کیا سوچ رہے ہو چھوٹو.....؟“
”آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“
”میرے بارے میں.....؟“ مناب کو حیرت ہوئی۔

”یہی کہ آپ بہت اچھی ہیں..... میری بیماری کا سن کر فوراً میرے پاس چلی آئیں۔“
”ہاں، اچھی تو میں واقعی ہوں اور تمہیں پتا ہے تمہارے پاس یہاں آنے کے لیے میں نے اپنے خوب صورت ویک اینڈ کی قربانی دی ہے۔“
”کیسی قربانی.....؟“ اقصم حیران ہوا۔

”کل ولی امریکا سے اپنی زری آپا کے ساتھ دو چار دن کے لیے انگلینڈ آ رہا تھا۔ وہ بہن، بھائی یہ ویک اینڈ میرے ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔“

ولی کے ذکر پر اقصم کے دل میں ایک عجیب سا درد جاگ اٹھا تھا۔
”جب مجھے ممائی نے تمہاری طبیعت کا بتایا..... اور مجھے تمہارے پاس یہاں آنے کو کہا تو میں نے ولی کو یہاں آنے سے روک دیا..... اس سے ایکسکیوز کر لیا۔“ مناب کے لہجے میں افسوس تھا۔
”ولی بھائی کو غصہ تو آیا ہو گا اس بات پر؟“

”ہاں..... ایک دم سے اس کا موڈ آف ہو گیا تھا لیکن پھر میں نے اسے پیار سے سمجھایا اور وہ سمجھ گیا.....“
مناب سائڈ ٹیبل سے میڈیسن اٹھا کر نکالنے لگی۔ ”he is a wonderful man“ مناب نے اس کی تعریف کی۔

”کاش..... کاش میں بھی سمجھ جاؤں کہ آپ میرے لیے نہیں بنی ہیں۔“ اقصم نے دکھ اور تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

”اٹھو اقصم..... شاباش یہ میڈیسن کھا لو.....“ مناب نے اپنی ہتھیلی پر رکھی میڈیسن اس کی جانب بڑھائی

..... وہ اقصم کا نام بہت کم لیا کرتی تھی..... مگر جب بھی لیتی تھی اقصم کو بہت خوشی ہوتی..... اقصم نے لحظہ بھرا سے دیکھا۔

وہ اتنی دہلی پتلی سی تھی، اس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی، اس کے مزاج میں اتنی سادگی تھی..... کہ وہ اقصم کی اتنی فیلو ہی لگتی تھی..... مگر ان سب چیزوں کے علاوہ وہ ایک منگنی شدہ لڑکی تھی اور اپنے منگیتر ولی سے بہت محبت کرتی تھی..... عنقریب ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی..... اقصم نے آہستہ سے اٹھ کر دوائی اس کے ہاتھ سے لے لی..... میڈیسن کھانے کے بعد وہ دوبارہ لیٹ گیا تھا۔

”میں اب بہتر فیمل کر رہا ہوں..... پلیز اب آپ بھی سو جائیں۔“

”چھوٹو تم میری فکر مت کرو..... میں سو جاؤں گی۔“ مناب نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر تھکی دی۔

”ایکسٹرا کمبل الماری کے نچلے کیبنٹ میں پڑا ہے، آپ اپنے لیے نکال لیں۔“ اقصم نے اطلاع دی۔

”اوکے، ڈونٹ وری میں لے لیتی ہوں.....“ مناب نے اس کی الماری کے نچلے کیبنٹ سے کمبل نکال لیا۔

”اوکے چھوٹو..... میں باہر لاؤنچ میں سو رہی ہوں، تمہیں رات میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو میرے سیل

فون پر کال کر لیتا۔“ مناب کمبل اٹھا کر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

”ویسے مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ کا ویک اینڈ خراب ہوا۔“

”اچھا اب حکومت..... بچپن سے لے کر آج تک اپنی ہر بات تم مجھ سے دھونس جما کر منواتے رہے ہو، اب

ان فار میلٹیز میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔“ مناب نے مصنوعی غصے سے اسے ڈپٹا۔

”آپ سچ کہہ رہی ہیں بچپن میں، میں آپ سے اپنی ہر بات منوالیا کرتا تھا بس ایک بات نہیں منواسکا.....

آپ کو خود سے محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکا.....“ اقصم نے دل میں سوچا۔

”شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اپنی وے..... آپ جا کر آرام کریں کافی ٹائم ہو گیا ہے..... اوکے گڈ

نائٹ.....!“ مناب نے اسے مسکرا کر دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد اقصم کو ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے کمرے کی تمام چیزیں کلرڈ سے بلیک اینڈ وائٹ

ہو گئی ہوں۔

اقصم کی زندگی میں روز بروز لفظ ”کاش“ کے اضافے ہو رہے تھے وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ محبت کی گاڑی ہمیشہ

ایک غلط راستے پر کیوں گامزن ہو جاتی ہے۔ یہ ہمیشہ غلط راستے کا ہی انتخاب کیوں کرتی ہے؟ جہاں بعض اوقات

جگہ، جگہ اس کو سگنل توڑنا پڑتے ہیں..... جہاں کبھی اس گاڑی کے چالان ہوتے ہیں..... کبھی اس کی رفتار زیادہ

ہوتی ہے کبھی کم اور کبھی اس کی بریکس فیل ہو جاتی ہیں اور پھر بالآخر یہ گاڑی علاقہ ممنوعہ میں جا گھستی ہے اور کتنی

تباہی مچاتی ہے۔ کتنے رولز توڑتی ہے یہ آنے والا وقت بتاتا ہے..... اقصم کی محبت کی گاڑی بھی شاید اسی ایریے

میں داخل ہونے والی تھی۔

اقصم نے کروٹ بدلی، ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں اس نے گلاس خالی کر دیا۔

☆☆☆

صبح دس بجے کا وقت تھا جب نور منزل کے تمام افراد ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کرنے میں مصروف تھے بلکہ اور پیٹو

سب کو ناشتا سرو کر رہے تھے۔

”پیٹو جا کر دیکھو زارون ابھی تک ڈائننگ روم میں کیوں نہیں آیا؟ ناشتا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ سمیرا بیگم نے

براؤن بریڈ پہ ڈائٹ جام لگاتے ہوئے پیٹو کو مخاطب کیا۔ جنوری بیگم کو ایک باؤل میں کارن فلیکس ڈال کر دے

رہی تھی۔
”چھوٹی بیگم جی..... چھوٹے صاحب تو جی کافی دیر سے اس بھاگنے والی مشین پہ چڑھ کر تیز، تیز بھاگ رہے ہیں۔“

پتو کی اطلاع پہ ڈائنگ ٹیبل پر موجود تمام افراد مسکرائے۔
”پتو وہ بھاگنے والی مشین نہیں اسے ٹریڈ مل..... کہتے ہیں۔“ عنایہ نے اسے سمجھایا۔
”ہاں جی وہی.....“ پتو نے گرم دودھ نور بیگم کے سامنے رکھا۔
”ہیلو ایوری باڈی.....“ اسی دوران ٹریک سوٹ میں ملبوس زارون ڈائنگ روم میں داخل ہوا۔
اسے دیکھ کر عنایہ کی آنکھیں چمک اٹھیں اور لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی..... زارون، عنایہ کے ساتھ خالی چیئر دیکھ کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

”زارون بھائی، میرے برابر بھی ایک چیئر خالی تھی ادھر آ جاتے۔“ ایشال کا انداز چھیڑنے والا تھا۔
”کیوں بھئی، میں کیوں ادھر بیٹھوں؟ اپنے ساتھ تم اپنے اُن کو بٹھانا..... میں ادھر اپنی اُن کے ساتھ ہی ٹھیک ہوں.....“ زارون کی بات پر ایشال کے ساتھ، ساتھ سب ہی مسکرا دیے۔
”اللہ میرے ان دونوں بچوں کی جوڑی سلامت رکھے۔“ نور بیگم نے زارون اور عنایہ کو خوش دیکھ کر دعا دی۔
”آمین..... اماں آپ کی دعاؤں نے ہی نور منزل کو ایک مکمل گھر بنا رکھا ہے۔“ سمیرا بیگم نے احتراماً نور بیگم کو دیکھتے ہوئے اعتراف کیا۔

”جی اماں..... سمیرا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، آج کل کے دور میں ایسا سکون، ایسی راحت گھروں میں کہاں دیکھنے کو ملتی ہے..... جو ہمارے گھر کو نصیب ہے۔“ برابر والی چیئر پر بیٹھے داؤد چوہدری نے عقیدت سے اپنی اماں کو دیکھا۔

”جیتے رہو میرے بچو..... میں اپنے پروردگار کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے جس نے مجھے اتنی نیک، فرمانبردار اولاد..... اور پیار، عزت اور احترام کرنے والے پوتے، پوتیاں..... نواسے، نواسی عطا کیے۔“ تشکر سے نور بیگم کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

”کم آن دادو..... آپ پلیز روئیں تو نہیں.....“ زارون نے انرجی ڈرنک کی بوتل اٹھا کر لبوں سے لگائی۔
”میرے بچے، یہ تو خوشی کے آنسو ہیں.....“ نور بیگم مسکرا دیں۔
”اسلم میرے لیے کافی بناؤ.....“ داؤد چوہدری نے مؤدبانہ انداز میں قریب کھڑے بٹلر کو مخاطب کیا۔
”جی صاحب.....!“ وہ حکم کی تعمیل کرنے لگا۔

”ایشواب بس بھی کرو..... تم نان اسٹاپ کھا رہی ہو۔“ عنایہ نے اسے تیسرا سلاٹس اٹھاتے ہوئے دیکھ کر ڈپٹا۔
”کیا ہے یار.....؟ خود تو سارا سال تم ڈائٹ پر رہتی ہو..... کم از کم میرے کھانے پینے پر نظر تو نہ رکھا کرو.....“ ایشال نے برا منایا۔

”بھئی کوئی میری ایشو کو کھانے پینے سے نہ روکے.....“ داؤد چوہدری مسکرائے۔
”بڑے پاپا دیکھیں تو..... کتنی موٹی ہو رہی ہے یہ.....“ عنایہ نے دہائی دی۔
”کہاں موٹی ہو رہی ہوں..... میرا ویٹ جسٹ فنٹی تھری کے جی ہی تو ہے۔“

”تو فنٹی تھری کون سا کم ہے تمہارا ویٹ جسٹ فنٹی ہونا چاہیے۔“ عنایہ نے اسے گھورا..... کیونکہ وہ خود ایک weight conscious لڑکی تھی۔ چیز آلیٹ ایشال کا فیورٹ آلیٹ تھا۔ وہ جب بھی

بناتا..... ایشال بڑی رغبت سے کھایا کرتی تھی..... ایشال ویسے بھی کھانے پینے کی شوقین تھی اسے بھوک بھی بہت لگتی تھی۔

”جس نے مجھے پسند کرنا ہوگا وہ مجھے ایسے ہی کر لے گا، اس لیے میں کیوں کسی مریض کی طرح اُبلتی ہوئی سبزیاں کھاؤں۔“ ایشال نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔

”ویسے ایشو تمہارے بارے میں عمر بھائی بالکل ٹھیک ہی کہتے ہیں..... تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ تم ایم بی بی ایس ہو..... بالکل اسٹو پڈ لگتی ہو شکل سے بھی عقل سے بھی۔“

”ایم بی بی ایس تو میں نے صرف ماما اور بابا کی خواہش پوری کرنے کے لیے کیا ہے اگر میرے پاس چوائس ہوتی تو میں مر کر بھی کم از کم ڈاکٹر کبھی نہ بنتی۔“ ایشال کا موڈ ہنوز خراب تھا..... دونوں بہنوں کی نوک جھوک سے سب ہی محظوظ ہو رہے تھے۔

”ارے ہاں عمر کے ذکر سے یاد آیا..... ایشو بیٹا تمہارا ہاؤس جا ب مکمل ہو گیا ہے۔ میں نے عمر سے تمہارے لیے بات کی تھی..... تم کچھ عرصہ عمر کے اسپتال میں اس کے ساتھ پریکٹس کر لو اور ویسے بھی تمہیں مستقبل میں

child specialist ہی تو بننا ہے..... اس حساب سے تمہیں عمر سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔“ داؤد چوہدری کی بات پر ایشال کی بھوک ختم ہو گئی تھی اور منہ پر بارہ بج گئے تھے۔

ایشال کے انداز پر زارون اور عنایہ نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔
داؤد چوہدری نے تو جیسے ایشال کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”بڑے بابا، آپ کے پاس مجھے اس سے بڑی سزا سنانے کے لیے نہیں تھی کہ میں عمر بھائی کے ساتھ رہ کر ان کے ساتھ پریکٹس کروں؟“ ایشال کا لہجہ روہانسا ہوا۔

زارون، اپنے ساتھ بیٹھی عنایہ کو آنکھ مار کر داؤد چوہدری سے مخاطب ہوا۔
”چچ، چچ، چچ..... پاپا آپ نے ویسے ایشو کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے..... چلو اسی بہانے عمر بھائی کے ساتھ رہ کر ان کی ڈانٹ سن، سن کر تمہارا وزن بھی کم ہو جائے گا۔“

”تم سلم بھی ہو جاؤ گی.....“ زارون کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے عنایہ نے بھی اسے زچ کیا۔
”بھئی میں نے ایسا کون سا ظلم کر دیا ہے میں نے تو ایشال کے برائٹ فیوچر کو مد نظر رکھتے ہوئے عمر سے

بات کی تھی۔“ داؤد چوہدری کافی پیتے ہوئے مسکرائے۔
”بڑے پاپا عمر بھائی کے علاوہ بھی اس شہر میں بہت سے چائلڈ اسپیشلسٹ ڈاکٹرز موجود ہیں۔“ ایشال نے

ہنوز افسردگی سے کہا۔
”مگر ایشو میری جان..... عمر کا اس وقت شہر کے قابل ترین اور فینس (مشہور) consultant

paediatrician میں شمار ہوتا ہے..... تم اس کے ساتھ ایزاے جو نیر کام کرو گی تو اس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا تمہیں۔“ سمیرا بیگم نے بھی اسے پیار سے سمجھایا۔

”ایشال میری بچی..... داؤد اور سمیرا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ عمر تمہارا پھوپزا د بھائی ہے آخر کسی نہ کسی اسپتال میں کسی نہ کسی ڈاکٹر کے ساتھ تم نے کام تو کرنا ہی ہے ناں..... عمر تو پھر گھر کا بچہ ہے۔ بہت نیک اور فرمانبردار

بھی۔“ نور بیگم نے بھی اسے پیار سے سمجھایا۔ ”اور اس میں فائدہ بھی صرف تمہارا ہی ہے۔“
”دادو عمر بھائی نیک ہوں..... فرمانبردار ہوں..... قابل ہوں یا فینس..... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا.....

میرے لیے تو ہمیشہ وہ ہٹلر اور ہلا کو خان ثابت رہے۔“ ایشال کے لہجے اور انداز پر ڈانٹنگ ٹیبل پر موجود تمام



کمرے میں بیڈ کے دونوں اطراف رکھے لیپ روشن تھے۔ وہ رات کا کوئی پچھلا پہر تھا جب ایک دم سے اسے اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اقصم نے نیم وا آنکھوں سے وال کلاک کو دیکھا..... صبح کے چارج رہے تھے..... اقصم نے خود پر لیا ہوا کبل اتار کر ایک سائڈ پر پھینکا..... اسے پیاس کے ساتھ گرمی بھی لگ رہی تھی..... ایسا یقیناً اسے بخارا ترنے کی وجہ سے محسوس ہوا تھا۔ اس نے سائڈ ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھا کر مناب کو کال کرنی چاہی مگر پھر پُرسوج انداز میں اس نے موبائل واپس تکیے کے نیچے رکھ دیا اور بیڈ پر چت لیٹا چھت کو گھورنے لگا..... پانچ، چھ گھنٹے پہلے مناب کے ساتھ گزرے لمحات، اس کی نظروں کے سامنے ری وائسٹڈ ہو رہے تھے..... جب پیاس کی شدت زیادہ بڑھی تو وہ ہمت کر کے بیڈ سے اٹھ گیا..... پہلے اقصم نے روم کی ہیٹنگ کم کی اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا..... اب وہ خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہا تھا..... مناب لاؤنج کے صوفے پر گردن تک کبل تانے گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ بے آواز چلتا ہوا کچن میں گیا..... صاف اور چمکتا ہوا کچن دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر وہ دوبارہ لاؤنج میں آ گیا..... اور احتیاط سے مناب کے قریب رکھے صوفے پر بیٹھ کر پانی پینے لگا۔ اس کی نظریں سوئی ہوئی مناب پر مرکوز تھیں..... بے اختیار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے سیاہ بکھرے سلگی بالوں میں دھیرے، دھیرے انگلیاں پھیرے، ہیٹر کی حدت سے اس کے پنک ہوتے رخسار کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے چھوئے..... اس کی ٹھوڑی کے دائیں جانب بنے سیاہ تل کو..... اس کے پاس اس کے بے حد قریب بیٹھ کر فرصت سے دیکھتا رہے۔ اس کا ایک ہاتھ کبل سے باہر نکلا ہوا تھا..... اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لے..... ایسی چھوٹی، چھوٹی بہت سی خواہشیں تھیں جو اس کے پاگل دل میں سراٹھانے لگی تھیں۔

اچانک اس کی نظر اس کے ہاتھ کی اس انگلی پر پڑی جس میں ولی کے نام کی ڈائمنڈ رنگ جگمگ رہی تھی..... انگوشی دیکھ کر اس کا دل بچھ گیا..... اب مناب کے سامنے بیٹھنا اس کے لیے دشوار ہو گیا تھا۔ وہ شکست خوردہ سا اٹھ کر اپنے روم میں آ گیا..... اس کا دل درد سے بھر گیا۔

راہِ محبت میں عجب سا ہوا ہے حال اپنا
نہ زخمِ نظر آتا ہے نہ درد سہا جاتا ہے

دل اتنا بے چین اور بے بس ہو گیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے..... محبت ایک آسیب کی طرح اسے چمٹ گئی تھی..... وہ تھک گیا تھا محبت کے عذاب کو دل پر سہتے، سہتے..... اسے لگتا جیسے وہ کسی جنگل میں جا گھسا تھا..... جہاں اسے واپسی کا راستہ نہیں مل رہا تھا..... وہ بھٹک رہا تھا۔

وہ میرا سب کچھ ہے میرا مقدر نہیں
کاش وہ میرا کچھ نہ ہوتا میرا مقدر ہوتا

پتا نہیں یہ اقصم کے اندر کی بے بسی تھی، دکھ تھا یا غصہ..... اس نے پانی کی بوتل نیچے دے ماری..... کارپٹ پر بوتل گرنے سے شور ضرور اٹھا تھا لاؤنج میں سوئی مناب، اقصم کے روم سے آنے والی آواز سن کر اٹھ گئی تھی اس نے بے اختیار اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھا اقصم کی کوئی بھی مسڈ کال نہیں تھی۔ مناب کبل ہٹا کر اٹھ گئی۔ کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹا..... وہ جینز پر ریڈ شرٹ پہنے ہوئی تھی اس نے قریب رکھی اپنی گرم شال اپنے گرد لپیٹی اور اقصم کے روم میں چلی آئی۔

”چھوٹو آریو اوکے.....؟“ وہ فکر مندی سے آگے بڑھی۔ وہ اقصم کے پاس آکر بیڈ پر بیٹھ گئی۔
 ”چھوٹو..... تم ٹھیک تو ہو؟“ مناب نے فکر مندی سے اس کی سرخ ہوتی آنکھوں اور پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں..... آپ پلیز جائیں یہاں سے۔“ اقصم نے نظریں چرائیں۔
 ”نہیں، تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے ہو..... کیا بات ہے چھوٹو.....؟“
 ”کچھ بھی نہیں، آپ ایسے ہی پریشان ہو رہی ہیں۔“ مناب نے اس کا بخار چیک کیا۔
 ”شکر ہے تمہارا بخار اب اتر گیا ہے۔“

اقصم خاموش رہا۔
 ”کچھ چاہیے تمہیں.....؟“ مناب کے سوال پر وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔
 ”اقصم بولوناں..... میں تم سے پوچھ رہی ہوں..... کچھ کھانا ہے تو بتاؤ میں لادیتی ہوں۔“
 ”نہیں، مجھے کچھ نہیں کھانا میں اب سوؤں گا۔“

DOWNLOADED FROM

PAKSOCIETY.COM

”شیور؟“
 ”یس.....“
 ”اوکے ایز یوش.....“ مناب کمرے سے باہر نکل گئی۔
 اور اقصم نے اپنا بوجھل سر تکیے پر گرالیا تھا۔

☆☆☆

آج اتوار کا دن تھا جب سارہ سوکرائھی تو اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا..... سارہ بال سمیٹ کر چپل پہنے کمرے سے نکلی تو زویا نے صحن میں واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔
 سیما بیگم کچن میں ناشتا بنا رہی تھیں..... ان کے قریب ہی چوکی پر بیٹھے شاہر حسین ناشتا کرنے میں مصروف تھے..... اسی اثنا میں ہاتھ روم کا دروازہ کھلا تھا اور اٹھارہ انیس سال کا گلوبالوں میں تولیا رگڑتے ہوئے باہر نکلا۔
 ”اماں ناشتا بن گیا میرا.....؟“ تولیا چارپائی پر پھینک کر وہ کچن کی جانب آیا۔
 ”بن گیا ہے آکر کھالے.....“ سیما بیگم کی کچن سے آواز آئی۔
 ”آپی آپ رہنے دیتیں، میں خود مشین لگا لیتی۔“ سارہ اس کے قریب آئی۔
 ”ارے کوئی بات نہیں، آج صبح میری جلدی آنکھ کھل گئی تھی۔ میں نے مشین لگالی۔ دیکھو بس تھوڑے سے کپڑے رہ گئے ہیں۔“ زویا نے تار پر پھیلے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔
 ”آپی میں نہا کر ابھی آئی پھر مل کر ناشتا کرتے ہیں.....“
 ”ٹھیک ہے.....“ کپڑے نتھارتی زویا نے بہن کو مسکرا کر دیکھا۔
 سارہ ہاتھ روم میں کھس گئی تھی۔

آج پھر روٹی کے ساتھ اچار ہے؟ رات کا سالن نہیں بچا.....؟ یا انڈا ہی بنا دو.....“ گلو نے روٹی والی چنگیری اور اچار غصے میں پرے کھسکا دیا۔
 ”روٹی کھانی ہے تو اسی سے کھالے..... نہ سالن ہے نہ انڈا.....“ سیما بیگم نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے اطلاع دی۔

”اس گھر میں آج تک ڈھنگ کی روٹی کھانا نصیب نہیں ہوئی..... مجھے نہیں کرنا ایسا بے سوادا ناشتا.....“

”تو لے آ حلوا پوریاں..... کیوں کھیلا ہے سارا دن تاش..... کیوں کرتا ہے آوارہ گردی..... کمانا کیوں نہیں؟“ سیما بیگم کو غصہ آ گیا۔

”کمالوں گا اماں..... مجھے کمائی کے طعنے نہ دیا کر..... جس دن میں نے کمائی شروع کی ناں..... تیرا یہ رویہ نہیں رہے گا میرے ساتھ..... تو خود مجھ سے پوچھے گی..... بتا گلو میں آج تیرے لیے کیا بناؤں؟“

”ارے وہ دن تو آئے جس دن تو کمائی کر کے ہمیں کھلائے گا۔“ سیما بیگم کا غصہ ہنوز برقرار تھا۔

”ابا مجھے ایک ہزار چاہئیں..... ادھار ہی دے، دے واپس کر دوں گا تجھے۔“

”تمہیں پتا ہے گلو یہ مہینے کی آخری تاریخیں چل رہی ہیں..... ان دنوں گھر کی دال روٹی چلانا مشکل ہو جاتا ہے، میں تمہیں کہاں سے دوں ایک ہزار روپیہ.....؟“ شا کر صاحب کے لہجے میں بے بسی تھی، مجبوریاں پنہاں تھیں۔

”بس ابا تجھ سے تو کچھ مانگنا ہی فضول ہے، بارہ مہینے تو کنگال ہی رہتا ہے۔“ گلو ناشتا چھوڑ کر اب زبان درازی پر اتر آیا تھا۔

زو یا اس کا انداز بد تمیزی دیکھ کر پانی کا ٹل بند کر کے کچن کی طرف آ گئی۔

”گلو شرم کرو، یہ کس لہجے میں تم اماں اور ابا سے بات کر رہے ہو؟“

”تو اور کس لہجے میں بات کروں.....؟ جب دیکھو پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی تم لوگوں کے پاس.....“ گلو کے لہجے میں نفرت تھی بے پناہ غصہ تھا۔

”تو تمہارے جوئے کھیلنے کے لیے ہم کہاں سے لائیں اتنی بڑی، بڑی رقمیں.....؟ کوئی ٹنکیاں نہیں لگا رکھی ہم نے پیسوں کی..... ابا کی پنشن اور ہم دونوں بہنوں کی کمائی سے جس طرح ہم خواہشوں کو مار، مار کر زندگی گزار رہے ہیں یہ صرف ہم ہی جانتے ہیں..... تم اتنے غیرت مند ہوتے تو اماں ابا کو کما کر دیتے۔ ہم سب کی زندگی اتنی مشکل نہیں ہوتی جتنی آج ہم گزار رہے ہیں۔“ زو یا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”تو میں کہاں سے نوٹ کما کر لاؤں؟ یہاں ایم بی اے اور ماسٹرز کرنے والے نوکریوں کے لیے دھکے کھا رہے ہیں، مجھے میٹرک پاس کو کون نوکری دے گا۔“

”جن بیٹوں نے اپنے والدین کے لیے اور جن بھائیوں نے اپنی بہنوں کے لیے کمانا ہوتا ہے ناں تو وہ تمہاری طرح کام چور..... بہانے باز اور جوئے باز نہیں ہوتے..... تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے..... جوان جہان ہٹا کٹا ہو کر ماں، باپ کو پیسے کما کر دینے کے بجائے ان سے ہتھیانے کی کوشش کرتا ہے۔ نالائق کہیں کا۔“ زو یا نے گلو کو بری طرح سے ڈپٹا۔

”بس، بس آپی..... اپنی عزت اپنے ہاتھ میں..... تو اسکول میں بچوں کی استانی ہے انہی کو یہ سبق پڑھایا کر میری استانی بننے کی ضرورت نہیں ہے تجھے.....“

”گلو میں کہہ رہا ہوں زبان سنبھال کر بات کر، یہ نہ ہو میرا ہاتھ اٹھ جائے تجھ پر.....“ شا کر صاحب جو اتنی دیر سے اس کی بکواس سن کر برداشت کر رہے تھے پھٹ پڑے۔

”آج تیری بہن سارہ کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں..... تیری جگہ کوئی اور بھائی ہوتا تو نہ جانے وہ مہمانوں کی خاطر خدمت کے لیے کیا، کیا لے کر آتا۔ ایک تو ہے جو ہمیں کما کر دینے کے بجائے ہم سے چوبیس گھنٹے چھینا جھٹی میں مصروف رہتا ہے۔“ سیما بیگم نے روٹی توڑے سے اتار کر چنگیری میں رکھی اور چولہا بند کرتے ہوئے گلو سے مخاطب ہوئیں۔

”اماں سیدھی طرح سے مجھے کہہ دے کہ میں اس گھر سے نکل جاؤں..... میری تو ویسے بھی اس گھر میں

دو ٹکے کی عزت ہے..... اور عزت ہو بھی کیسے؟ آج کل عزت صرف پیسوں والوں کی ہے آج اگر میں کماؤ ہوتا..... نوٹ کما، کما کر تم لوگوں کو دیتا تو تمہی لوگوں نے میرے آگے پیچھے پھرنا تھا۔“

”ارے چل جادو ہو جا..... تجھے کمانے کا اتنا شوق ہوتا تو آج تو کہیں مزدوری کر رہا ہوتا..... کہیں چوکیداری کر لیتا..... کسی ہوٹل میں ویٹر لگ جاتا..... کسی فیکٹری میں کام کر رہا ہوتا..... کہیں رکشا چلا لیتا مگر تجھے تو اپنے اس نکٹھو بہنوئی خالد کی طرح کام کرنے اور کمانے کی عادت ہی نہیں ہے۔“ سیمائیگم کو آج گلو پہ کچھ زیادہ ہی غصہ آ رہا تھا۔

”اماں رہنے دیں یہ بے حس انسان ہے، اس سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا.....“ زویا کا غصہ بھی اسی طرح برقرار تھا۔

”بس بہت ہو گئی میری بے عزتی..... بہت دے لیے تم سب نے مجھے طعنے..... جا رہا ہوں میں اس گھر سے اور اب اس وقت تک گھر نہیں آؤں گا جب تک میری جیب بھی نوٹوں سے بھر نہیں جاتی۔“ گلو غصے میں بکتا جھکتا دھڑ سے دروازہ کھینچ کر باہر نکل گیا تھا..... کچن میں موجود تینوں نفوس خاموش ہو چکے تھے ان کے پاس کہنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ کبھی، کبھی اندر کی خاموشی لبوں کو الے ہی سی دیتی ہے..... اور پھر وہ خاموشی ایک نہ نظر آنے والے دکھ کا روپ دھار کر اندر ہی اندر انسان کو کاٹنے لگتی ہے، مارنے لگتی ہے، دیمک کی طرح کھانے لگتی ہے..... سارہ ہاتھ روم سے نکلتے ہوئے سوچ رہی تھی..... جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا..... ایسا کوئی دن نہیں گزرتا تھا جس دن ان کے گھر میں لڑائی نہ ہوتی ہو..... پہلے ہمیشہ گھر میں لڑائی سیمائیگم کی وجہ سے ہوا کرتی تھی اب سیمائیگم کے ساتھ گلو بھی شامل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اقصم کی صبح جب آنکھ کھلی تو دس بج رہے تھے، شدید بھوک کے احساس نے جلد ہی اسے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا..... شاور لینے کے بعد وہ ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس باہر نکلا تو خود کو فریش محسوس کیا۔

مناب رات والے حلے میں بغیر کسی شال یا منظر کے vacuum cleaner سے لاؤنج صاف کر رہی تھی..... اس نے اپنے بالوں کو اونچی سی پونی میں جکڑ رکھا تھا..... اپنی شرٹ کے بازو اس نے فولڈ کر کے کہیوں تک چڑھا رکھے تھے اور وہ پورے انہماک سے گھر کی صفائی میں مصروف تھی۔

اقصم اسے ماسیوں والے حلے میں دیکھ کر بے اختیار مسکرایا تھا۔ وہ لابی سے لاؤنج میں آیا۔

”گڈ مارننگ.....!“

”ویری گڈ مارننگ.....“ مناب نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

”چھوٹو اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”پہلے سے بہتر فیل کر رہا ہوں.....“ اقصم صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”شکر خدا کا اب تم بہتر ہو..... صبح ممانی کی کال آئی تھی وہ تمہارا بہت پوچھ رہی تھیں..... میں نے انہیں بتایا ہے کہ اب چھوٹو کے لیے انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں اس کے پاس ہوں۔“ مناب نے ویکيوم کلینر رکھنے کے بعد صوفے سے اپنی شال اٹھا کر کندھے پر ڈالی۔

”مما تو بس خواہ مخواہ چھوٹی، چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی ہیں۔“

”ماں کی محبت ہوتی ہی بڑی عجیب ہے چھوٹو..... نہ سمجھ میں آنے والی..... اپنی دے میں نے تمہارے لیے پاستا بنایا ہے اور رات والا سوپ بھی رکھا ہے..... یہ بتاؤ نا کتنے میں کیا لوگے؟“

”پاستا میں لٹچ میں لوں گا..... ابھی مجھے گرم دودھ میں کارن فلیکس لادیں۔“
 ”اوکے، میں ابھی لائی.....“ مناب کچن کی طرف بڑھ گئی۔
 اقصم نے ریوٹ اٹھا کر ایل ای ڈی آن کی۔ تھوڑی دیر کے بعد مناب اسے سرو کر رہی تھی۔
 ”تھینکس.....“ اقصم نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے شکر یہ ادا کیا۔
 ”مجھے تمہارے تھینکس کی ضرورت نہیں ہے، اپنا تھینکس اپنے پاس رکھو.....“ مناب خوشگوار موڈ میں قریب ہی سنگل صوفے پر آ بیٹھی تھی۔

”کیا میں اکیلے ناشتا کروں گا؟“

”ایکچو نیلی میں ناشتا کر چکی ہوں..... اب ایسا ہے کہ تم ناشتا کرو، میں شاور لے لوں..... بعد میں مل کر کافی پیئیں گے۔“ مناب اپنے بیگ سے سوٹ اور ٹاول نکالنے لگی۔
 اقصم کارن فلیکس کھاتے ہوئے چینل سرچنگ کر رہا تھا۔
 مناب، اقصم کے روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔...

کارن فلیکس کھانے کے بعد اقصم نے برتن کچن کی شیلف پر رکھے اور کچن کی صفائی دیکھ کر مسکرا دیا..... ہر چیز اپنے ٹھکانے پر بڑے طریقے سے رکھی ہوئی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل بھی صاف کی گئی تھی اور یقیناً کچن کا فرش بھی صاف کیا گیا تھا۔

وہ بھی بھی بہت صفائی پسند..... اقصم کی دونوں کزنز ایشال اور عنایہ نے کبھی کچن میں جھانکنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور مناب اپنی ماں ساجدہ بیگم کی طرح ویل ایجوکیٹڈ ہونے کے باوجود گھر گھر ہستی میں بہت دلچسپی رکھتی تھی۔
 مناب نے ایک ہی دن میں اس کے اپارٹمنٹ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ ایک دم اسے ولی سے حسد محسوس ہونے لگا تھا۔ بلاشبہ وہ دنیا کا خوش نصیب مرد تھا جسے مناب جیسی لڑکی کا ساتھ ملنے والا تھا..... انہی سوچوں میں گم وہ دوبارہ لاؤنج میں بیٹھا عتاب دماغی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا..... اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے میڈیسن نہیں کھائی تھی۔
 اقصم اٹھ کر اپنے روم کی طرف آ گیا اور بند دروازے کو تاک کرنے لگا۔

”یس کم آن.....“ مناب کی آواز سن کر وہ اندر آ گیا تھا۔

مناب آئینے کے سامنے کھڑی اپنے گیلے بالوں کو ہیر ڈرائیر سے خشک کر رہی تھی اس نے بلیک ٹائٹس اور گرین لائنگ کشمیری شرٹ پہن رکھی تھی..... اس کے اوپر مناب نے بلیک کلر کالائنگ اپر پہن رکھا تھا۔
 ”وہ میں..... میڈیسن لینے آیا تھا.....“ اقصم نظریں چرا کر سائنڈ ٹیبل کی جانب بڑھ گیا اور میڈیسن اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

مناب بھی روم سے نکل کر کچن میں آ گئی تھی..... اس کے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایشال اور عنایہ نے بالوں کو ڈائی کروانے کے ساتھ، ساتھ hair rebonding بھی کروا رکھی تھی..... وہ دونوں باقاعدگی سے پارلر جایا کرتی تھیں..... مگر وہ ان تمام خرافات سے ہمیشہ دور ہی رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی ملاحظت تھی..... شاید یہ اس کے اندر کی خوب صورتی تھی جو اس کی ظاہری شخصیت میں بھی نظر آتی تھی۔
 مناب کافی بتا رہی تھی اور وہ ہاتھ میں پانی کی بوتل پکڑے کھڑا تھا۔

”تم نے میڈیسن کھالی؟“

”ہوں.....“

”تم ریٹ کرو..... زیادہ چلو پھرو نہیں..... میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔“ اقصم خاموشی سے لاؤنج میں

تھوڑی دیر کے بعد مناب کافی کے مگ اور ڈرائی فروٹ کی پلیٹ لیے لاؤنج میں آگئی۔ مناب نے کافی کا مگ اس کی طرف بڑھایا اور اس کے قریب ہی سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

”چھوٹو تم نے ڈرنک کب سے شروع کر دی؟“ مناب نے اس کے کمرے میں اس ممنوعہ مشروب کی بوتل دیکھ لی تھی اب وہ نہایت سنجیدگی سے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ گوکہ ان کی ہائی کلاس اور یہاں کے ماحول میں یہ سب ایک عام سی بات تھی مگر وہ جانتی تھی اقصم نے کبھی اس چیز کو نہیں چھوا، ہاتھ نہیں لگایا تھا مگر اب بوتل دیکھ کر از حد حیرت ہوئی تھی۔

اقصم اس غیر متوقع سوال پر گڑبڑا گیا تھا۔ اور اب نظریں چرا نے لگا تھا۔

”چھوٹو میں کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے..... کب سے پی رہے ہو؟“

”جب سے آپ سے محبت ہوئی ہے۔“ وہ باوجود کوشش کے کہہ نہ پایا۔

”تقریباً ڈیڑھ دو سال سے.. مگر میں ریگولر نہیں پیتا، بس کبھی کبھار.....“ اس نے شرمندہ لہجے میں جواب دیا۔

”تمہیں نفرت تھی ان چیزوں سے..... پھر ایسی کیا وجہ ہوئی کہ تم پینے پر مجبور ہو گئے۔“ وہ کافی کے سپ لے

رہی تھی مگر اس کا انداز اسی طرح سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

”زیادہ نہیں پیتا..... بس ایسے ہی کبھی کبھار پی لیتا ہوں۔“ اقصم نے نظریں نیچی کرتے ہوئے اعتراف کیا۔

”ویسے چھوٹو میں جب سے انگلینڈ آئی ہوں، تم سے مسلسل رابطے میں رہنے کی وجہ سے میں نے محسوس کیا

ہے..... تم اب پہلے والے اقصم نہیں رہے..... کچھ بدل سے گئے ہو.....“ اس کا انداز اب بھی تفتیشی افسر جیسا تھا۔

”وقت کے ساتھ انسان بدل جاتا ہے ساری زندگی بندہ ایک جیسا تھوڑی رہتا ہے۔“

”ہاں وقت انسان کو بدل دیتا ہے مگر تمہاری عمر کے لڑکوں کو اتنی جلدی نہیں بدلتا..... بیس، چوبیس سال کے

لڑکوں کی بہت سی گرل فرینڈز ہوتی ہیں، بہت سی نیٹ فرینڈز ہوتی ہیں..... تمہیں یاد ہے چھوٹو..... پاکستان میں

تمہاری کتنی گرل فرینڈز ہوا کرتی تھیں..... جنہیں پٹانے کے طریقے تم مجھ سے پوچھنے آیا کرتے تھے۔“

”اور آپ ہمیشہ مجھے ایسی باتوں پر ڈانٹا کرتی تھیں۔“ اقصم مسکرایا۔

”اور ان دنوں میری ڈانٹ کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔“ مناب نے ہنستے ہوئے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھا۔

”ہوں..... مگر ان سب کو میں پاکستان چھوڑ آیا تھا..... یہاں میری فرینڈز ضرور ہیں مگر گرل فرینڈ کوئی نہیں ہے۔“

”امپا سبل..... لڑکیاں تم پر مرا کرتی تھیں اور یقیناً اب بھی فدا ہوتی ہوں گی۔“

”بلیومی..... میں سچ کہہ رہا ہوں، میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔“ اقصم مسکرایا۔

”جھوٹ..... جھوٹ اور بالکل جھوٹ..... اپنے ملک میں اتنی رنگین لائف گزارنے والا انگلینڈ جیسے ملک میں

اتنی بورنگ لائف کیسے گزار سکتا ہے؟ اب تو ہمارا ملک بھی بہت ایڈوانس ہو چکا ہے..... تمہیں یاد ہے پی سی میں

saturday night special تم نے کبھی مس نہیں کی تھی۔“

”ہاں یاد ہے مجھے.....“ اس نے کافی کا مگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے مسکرا کر اعتراف کیا۔

”اگر پرانی باتیں یاد ہیں تو نئی باتیں کیوں بھول رہے ہو؟“

”کیا مطلب.....؟“

”تم اچھی طرح سے جانتے ہو..... میں نے تم سے ایک سوال کیا تھا تم نے ابھی تک مجھے اس کا جواب نہیں دیا؟“

”کچھ باتوں کے جواب نہیں مانگا کرتے۔“

”مگر کچھ باتوں کا جواب لینا ضروری ہوتا ہے۔“
 ”زندگی میں بہت ساری چیزیں غیر ضروری بھی تو ہوتی ہیں۔ مگر وہ زندگی میں شامل ہوتی ہیں۔ آپ بھی میری
 زندگی میں اسے ایک غیر ضروری چیز ہی سمجھ لیں۔ بس یہ شامل ہوگئی ہے میری زندگی میں۔“
 ”غیر ضروری چیزوں کو ضروری سمجھ لینا بھی تو اچھی بات نہیں ناں.....“

اب کے اقصم اس کی بات کے جواب میں خاموش رہا تھا۔

”چھوڑ نہیں سکتے تم اس حرام چیز کو.....؟“

”کس کے لیے چھوڑوں.....؟“

”جس کے لیے پینی شروع کی ہے۔“

مناب کی بات پر وہ کتنے ہی لمحے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا تھا اس کا دل چیخ، چیخ کر وہائی دینے لگا تھا۔

تجھے عشق ہو خدا کرے

کوئی تجھ کو اس سے جدا کرے

تیرے ہونٹ ہنسا بھول جائیں

تیری آنکھ پر نم رہا کرے

تجھے ہجر کی ایسی جھڑی لگے

تو ملن کی ہر پل دعا کرے

تجھے عشق ہو پھر یقین ہو

اسے تسبیحوں پہ پڑھا کرے

میں کہوں کہ عشق ڈھونگ ہے

تو نہیں نہیں کہا کرے

تجھے عشق ہو خدا کرے

اسی اثنا میں مناب کے موبائل کی بیپ بجی..... مناب نے ٹیبل سے اپنا موبائل اٹھایا..... اور اسکرین پر جگمگانے
 والا نمبر دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک دل فریب سی مسکراہٹ جاگ اٹھی تھی۔

”ایکسکو زمی..... ولی کی کال ہے.....“ مناب معذرت کرتی وہاں سے اٹھ گئی تھی..... لاؤنج میں بیٹھے

اقصم کو یوں لگا تھا جیسے وہ بھرے مجمع میں بالکل تنہا ہو گیا ہو..... اس عشق نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ روز

اسے بے بس کر کے ذلیل و خوار کرتا تھا..... کبھی اس کی حالت پر روتا کبھی اس کی مجبوریوں پر ہنستا..... کبھی اسے

دلا سے دیتا اور کبھی اس کی حالت پر افسوس کرتا..... کبھی اس کا دشمن بن کر اسے ذلیل و خوار کرتا اور کبھی ایک

دوست بن کر اس سے ہمدردی کرتا..... وہ اس پنڈولم میں پھنس کر رہ گیا تھا..... کہیں کوئی راہ فرار نظر نہ آتی۔ وہ

مناب پر مرتا تھا..... اس کے لیے دل میں جو عشق کی آگ بھڑک رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اقصم کو وہ جلانے لگی تھی۔

☆☆☆

عنا یہ جب سوکراٹھی تو شام اپنے پنکھ پھیلائے سورج کی کرنوں کو اپنی گود میں چھپا رہی تھی۔ ایشال اپنی بچپن کی

فرینڈ علیہ کی طرف گئی ہوئی تھی۔ سمیرا بیگم کا بھی سوشل سرکل خاصا وسیع تھا لہذا وہ بھی مصروف ہی رہا کرتی تھیں.....

شام کو پینو، نور بیگم کو لان میں لے آیا کرتی تھی..... تازہ ہوا میں بیٹھنا، سبزہ دیکھنا نور بیگم کو بہت اچھا لگتا۔

عنا یہ کے آج کل اینول ایگز امر ہو رہے تھے جس کی وجہ سے وہ زارون کو آج کل کم ٹائم دے رہی تھی.....

READING
Section

114 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

جس پر زارون اس سے سخت تالاں نظر آتا۔
 اب بھی وہ شاور لے کر نکلی تھی جب اس کے سیل فون پر Tiffany Alvord کے سوگن I baby
 love you کی ایک مخصوص رنگ ٹون بجنے لگی تھی..... اس نے یہ رنگ ٹون زارون کے نمبر پر لگا رکھی تھی.....
 وہ کال پک نہیں کر سکی تھی..... فون ایک بار پھر بجنے لگا تھا..... عنایہ نے ٹاول بیڈ پر اچھالا اور سیل فون اٹھالیا۔
 ”بے صبر اکہیں کا.....“ وہ مسکراتے ہوئے بڑبڑائی اور کال پک کر لی۔
 ”زارون! تم سے ایک منٹ بھی انتظار نہیں ہوتا.....“
 ”تمہارے معاملے میں، میں ایسا ہی ہوں..... پتا تو ہے تمہیں..... اور بانی داوے کہاں غائب ہو
 تم..... میں کب سے کال کر رہا ہوں..... لنچ ٹائم میں بھی تمہیں فون کرتا رہا تھا مگر محترمہ نے کوئی لفٹ ہی
 نہیں کرائی۔“ زارون بے چینی سے سوال پر سوال کر رہا تھا۔
 ”زارون میں بہت تھک گئی تھی..... پیپر دے کر آئی اور میں سو گئی..... ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اٹھی ہوں.....“
 ”اچھا یہ بتاؤ پیپر کیسا ہوا؟“
 ”بہت اچھا.....“ عنایہ سیل فون کال سے لگائے نیل پالش اٹھا کر صوفے پر آگئی تھی۔
 ”مجھے لگتا ہے تمہارے اینول پیپر ز کے ساتھ، ساتھ میرے بھی پیپر ز ہو رہے ہیں۔“ زارون کے لہجے میں
 شکوہ تھا۔
 ”کیا مطلب؟“ عنایہ اپنے پیروں پر ریڈ نیل پالش لگانے لگی۔
 ”تم آج کل بہت بڑی جو ہو..... مجھے ٹائم نہیں دے رہی ہو..... مجھے نظر نہیں آتی ہو..... تو یہ میرا امتحان
 ہوتا.....“ عنایہ ہنس دی۔

سیرے نسوانی حسن کاراز

ہارٹسم بریسٹ ڈولپنگ ایڈڈ ٹائیٹنگ کریم (ہرٹل)

چھوٹی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
 بریسٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بریسٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔

Rs.250/=

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔ قیمت =/150

حقیقی جڑی بوٹیوں کے اجزاء اور عرقیات سے تیار
 کردہ۔ بدشامہ داغ دھبوں، مہاسوں کو بھی ساف
 کر کے رنگ کورا کرتی ہے۔

گلیسی
 یونانی کریم

یو پی ہسپتال سٹور ہری کیشن روڈ کوئٹہ

آپ آ کر اپنا مانع کرنا چاہتے ہیں تو انٹرنیٹ پر SKYPE آن لائن آ کر اپنا مسئلہ بتا کر وہ اسٹوڈنٹس۔
 اپنا منت کے بارے میں مفت کناپ کنسلٹیشن۔ 0345-7000088
 کریم گھر منگوانے کیلئے رقم ایزی لوڈ کروا کر اپنا ایڈریس SMS کریں۔

خوابا سٹور ایمریس مارکیٹ صدر کراچی
 صدر ہینکل سٹور ایمریس مارکیٹ صدر کراچی
 مسلم جنرل اسٹور ایمریس مارکیٹ ٹیکس کراچی
 ابراہیم بن ایامت مارکیٹ ٹیکس کراچی
 وقاص ہینکل سٹور آصف سکور این 22 کراچی
 قمری اسٹار جنرل اسٹور ہینکل مارکیٹ ہزارہ آباد
 نودلی روڈ خانہ ٹور پیو ڈاکٹر
 ملت روڈ خانہ ٹیکس کراچی

خالدو خانہ صرافہ بازار اہل آباد
 قدیمی چھوٹی روڈ خانہ کچھری بازار سرگودھا
 شامی ٹی روڈ خانہ حضرت بازار فیصل آباد
 سلیم ہسٹری گوبڑو روڈ خانہ حافظ آباد
 ثانی روڈ خانہ محمد انارکیت شاہی بازار بہاولپور
 محمد علی روڈ خانہ اسلام آباد 2278463
 ایس ایس ٹیکرز 22 خانہ سابقہ روڈ لاہور
 حنی انجم جنرل اسٹور ہینکل مارکیٹ

بادشاہ دی ہٹی بوٹر بازار راوی پنڈی 051-5502903-5533528

عقیم الدین ہزارہ کی کلی نمبر 1، ڈیو ہال کراچی۔ فون 2433682۔ ریاض محمد 69، نودو صاحب مارکیٹ شاہ عالم لاہور۔ فون 042-7666264
 پورسٹ پاکستان میں گھر منگوانے کے لیے اور بریسٹ میں کمی یا اضافہ کے بارے میں مفت مشورے کے لیے حکیم صاحب سے تمام امراض کے مشورے کی سہولت بریسٹ
 ڈولپنگ کے بارے میں معلومات اس نمبر پر حاصل کریں۔

”بس کچھ ہی دن کی بات ہے۔“
 ”تمہیں پتا ہے یہ ”کچھ دن“ میں کس طرح گزار رہا ہوں۔ ان کچھ دنوں کے لیے تم میرے لیے بھی کوئی مصروفیت کیوں نہیں ڈھونڈ دیتیں؟“

”تم بس آفس میں دل لگا کر کام کیا کرو.....“ عنایہ مسکرائی۔
 ”میرا دل تمہارے پاس ہے..... آج کل آفس میں نہیں لگتا.....“
 ”تو سمجھاؤ ناں اپنے دل کو.....“ عنایہ کے لب مسکرا رہے تھے۔
 ”دل آج کل میری سنتا نہیں.....“ زارون کے گنگٹانے پر عنایہ ہنسی۔
 ”شرم کرو، آفس میں بیٹھ کر مجھ سے عشق لڑا رہے ہو۔“
 ”تم جو گوشہ نشین ہو بیٹھی ہو..... فون پر ہی تو عشق لڑاؤں گا ناں میں..... اچھا آج تمہارے ساتھ لہج کرنے کا موڈ تھا..... میں نے تمہیں کال کی مگر تم نے پک ہی نہیں کی۔“
 ”ہاں، میرا سیل فون ساکنٹ پر تھا۔“
 ”اٹس اوکے..... یہ بتاؤ اس وقت کیا کر رہی ہو؟“
 ”میں سیلون جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔“

”تم آل ریڈی اتنی خوب صورت ہو تمہیں ان چیزوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“
 ”کیوں ضرورت نہیں ہے، دو مہینے کے بعد ہماری شادی ہے اور میں شادی والے دن دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی لگنا چاہتی ہوں۔“
 ”پتا نہیں یہ دو مہینے کب اور کیسے گزریں گے؟“ زارون نے سرد آہ بھری۔
 ”زارون تم بہت بے صبرے ہو.....“ عنایہ مسکرائی۔

”صرف اور صرف تمہارے معاملے میں ہوں۔“ زارون کے لہجے میں بے پناہ محبت تھی..... عنایہ کا چہرہ بلس ہوا۔

”تمہیں پتا ہے تمہاری اہمیت میری زندگی میں کیا ہے؟ just close your eyes“ زارون کے کہنے پر عنایہ نے آنکھیں بند کر لیں۔
 ”اوکے..... اب تم نے کیا دیکھا.....؟“ زارون نے سوال کیا۔
 ”تھنک..... کچھ بھی نہیں۔“ عنایہ نے آنکھیں بند کیے، کیے نفی میں سر ہلایا۔

”that,s my life without you“ زارون نے محبتوں سے چور لہجے میں اسے اس کی حیثیت اس کی اہمیت اپنی زندگی میں بتادی..... عنایہ کو اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ ”عنایہ جس مرد کو اس کی پسند، اس کی محبت مل جاتی ہے وہ گناہوں سے بچ جاتا ہے..... میرے بہت سے دوستوں کی مختلف لڑکیوں سے فرینڈ شپ ہے مگر مجھے تمہارے علاوہ دنیا کی کوئی لڑکی کبھی متاثر نہیں کر سکی۔ آفس میں ہوتا ہوں تو کئی بار تمہیں کال کرتا ہوں، تمہاری آواز بار، بار سنتا ہوں..... گھر آتا ہوں تو نظریں بار، بار تمہیں ڈھونڈتی ہیں، تمہیں ہر وقت اپنے آس پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔“ زارون جذبات کی رو میں بہتا ہوا اسے اپنے دل کا حال سنا رہا تھا۔

”same here zaron“ وہ پرفسوں لہجے میں بولی..... ”بس تم..... تم ہمیشہ مجھ سے ایسی ہی محبت کرنا.....“ عنایہ کی آنکھیں خوشی سے اس کی محبتوں پر جھللا جایا کرتی تھیں۔

”میری جان..... میری محبتیں صرف تمہارے لیے ہیں اور ہمیشہ تمہارے لیے ہی رہیں گی۔“ زارون اسے یقین دلارہا تھا اس سے وعدے کر رہا تھا اور وہ خود پرنا کر رہی تھی۔ وہ دونوں ایسے ہی تھے ایک دوسرے کو ٹوٹ

☆☆☆

سارہ کالج سے باہر نکلی تو سامنے اسے اسجد بانیگ لیے کھڑا نظر آیا..... وہ سر جھکا کر لڑکیوں کے گروپ کے ساتھ آگے بڑھ گئی..... وہ کم رفتار سے بانیگ چلاتا ہوا لڑکیوں کے گروپ سے قدرے فاصلے پر ان کے پیچھے، پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اس گروپ میں شامل ہر لڑکی کو یہ خوش فہمی تھی کہ اسجد اس کے پیچھے آتا ہے..... کئی لڑکیاں گردن موڑ کر پیچھے دیکھتیں..... کئی اسے مسکرا کر دیکھتیں..... اگر پلٹ کر نہیں دیکھتی تھی تو صرف سارہ شا کر حسین..... وہ اسے نہیں دیکھتی تھی۔ آہستہ، آہستہ سب لڑکیاں اپنے گھروں کو روانہ ہو گئی تھیں اب صرف سارہ ہی رہ گئی..... آج صبح سے ہی اس کا دل اداس تھا وہ بہت چپ، چپ سی تھی۔ اس کی فرینڈ حنانے اس کی اداسی اور خاموشی کو نوٹ کرتے ہوئے وجہ بھی پوچھی تھی مگر وہ طبیعت خرابی کا بہانہ بنا کر اسے ٹال گئی تھی..... جبکہ وجہ یہ تھی کہ ایک دن پہلے سارہ کے رشتے کے سلسلے میں کچھ لوگ آئے تھے مگر ان کے گھر کی غربت دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہوئے رشتے سے انکار کر گئے تھے۔ شاید یہ احساسِ ذلت تھا۔ اسجد بانیگ کی اسپید بڑھا کر سارہ کے قریب آ گیا۔

”کیسی ہو سارہ؟“

وہ خاموش رہی..... آج اس کا دل بہت اداس تھا اس کے چہرے پر افسردگی تھی۔

”قسم سے آپ بہت ظالم ہیں، میں اتنی گرمی اور دھوپ میں آپ کے دیدار کے لیے بے چین رہتا ہوں اور آپ ہیں کہ ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتیں.....“ اسجد کے شکوے پر سارہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا..... اور چند لمحے غیر ارادی طور پر اسے دیکھتی رہی..... ایک خوب صورت سے احساس نے اسے اپنی پلیٹ میں لے لیا کہ کوئی اس کے لیے اتنا دیوانہ بھی ہو سکتا ہے..... کوئی اسے اتنا بھی چاہ سکتا ہے یک دم اسے اپنا آپ بہت معتبر سا لگنے لگا۔

”دو مہینے میں پہلی بار آج آپ نے نظر اٹھا کر مجھے اس طرح دیکھا ہے..... بہت ہینڈسم نہ سہی گزارے لائق تو ضرور ہوں میں۔“ اسجد نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ جھینپ گئی۔

”سارہ پتا ہے کہ کل چاند کی چودہ تاریخ تھی..... رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بے اختیار رات کے تاریک آنچل پر چودھویں کے چاند نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی..... وہ مجھے بالکل تم جیسا لگا..... خوب صورت..... مغرور..... اپنے سحر میں جکڑ لینے والا..... مگر میری پہنچ سے بہت دور۔“ اسجد کا آنچ دیتا لہجہ اسے اندر تک سرشار کر گیا۔

وہ اب لاشعوری طور پر بہت آہستہ، آہستہ چل رہی تھی..... اسے آج اسجد کی باتیں سننا اچھا لگ رہا تھا۔

”لگتا ہے میرے پیچھے آنے سے پہلے احمد فراز کا سارا دیوان پڑھ کر آتے ہیں آپ! سارہ کے انداز اور اس کی بات پر اسجد بے اختیار مسکرایا۔

”یہ عشق بڑی ظالم چیز ہے..... اچھے بھلے انسان کی مت مار کر دیوانہ بنا دیتا ہے یہ عشق۔“

اسجد کی بیچارگی پر سارہ مسکرا پڑی۔

اسجد بانیگ سے اتر گیا تھا اور اب بانیگ لیے اس کے ساتھ، ساتھ چلنے لگا تھا۔

”سارہ تمہاری مسکراہٹ بھی تمہاری طرح جان لیوا ہے۔“

اب کے سارہ خاموش رہی..... وہ ایک سادہ سی گھریلو لڑکی تھی اسجد کی ایسی باتوں کے جواب میں وہ ایسے

ہی خاموش ہو جایا کرتی تھی۔

”سارہ تم میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتی ہو؟“ اس نے شکوہ کیا۔

”میں کیا جواب دوں؟“ وہ انجان بنی۔

تب وہ دھیرے سے بولا۔

”کوئی منتظر ہے اس کا کتنی شدت سے فراز

وہ جانتا ہے مگر انجان بنا رہتا ہے“

سارہ کے لب مسکرانے لگے۔

”سارہ میرا بہت دل چاہتا ہے میں تمہیں اپنے روبرو بٹھا کر فرصت سے دیکھوں، ان چند لمحوں کی ملاقات سے

دل نہیں بھرتا..... بلکہ دل اور بے چین ہو جاتا ہے..... تم پلیز..... کل میرے ساتھ چلو ناں.....“ وہ التجا کر رہا تھا۔

”اسجد پلیز..... آپ ان چیزوں کی مجھ سے توقع مت رکھیں..... میں اس ٹائپ کی لڑکی نہیں ہوں..... اگر آپ

مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں تو اپنی والدہ کو میرے گھر رشتے کے لیے بھیج دیں..... مگر میں یہ سب نہیں کر سکتی جو آپ

چاہتے ہیں.....“ سارہ نے دو ٹوک انداز میں انکار کیا۔ کل کے ریجنکیشن نے اسے اتنی بات کا حوصلہ دے دیا تھا۔

”میری والدہ کا دراصل چند دن پہلے ہی بائی پاس ہوا ہے، وہ فوری طور پر ابھی نہیں آ سکتی ہیں..... سارہ تم

میری مجبوری کو سمجھو..... میں امی کو فوری طور پر تمہارے گھر نہیں بھیج سکتا..... میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں..... مگر

مجھے بہت دکھ ہوا ہے کہ تمہیں ابھی تک میری محبت پہ یقین نہیں آیا..... تم سمجھتی ہو کہ میں تم سے عشق کا ڈھونگ رچا رہا

ہوں؟ دو مہینے سے تمہارے عشق میں ان سڑکوں پر خوار ہو رہا ہوں میں اور کس طرح یقین دلاؤں تمہیں.....؟“ وہ

بیچارگی سے کہہ رہا تھا۔

”سچ تو یہ ہے کہ تم بہت ظالم ہو..... تمہیں میری اور میری محبت کی ذرا بھی پروا نہیں..... پتھر ہو تم..... جس

سے پچھلے دو مہینے سے میں سر پھوڑ رہا ہوں“ اسجد خفا ہو گیا تھا..... اس کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا..... مایوسی

تھی..... وہ ڈھیلے سے انداز میں بایک پر بیٹھ کر چند لمحوں میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا..... سارہ کا دل

کسی نے جیسے مٹھی میں جکڑ لیا..... دکھ سے آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ چند لمحے کھڑی اس سنسان سڑک کو

دیکھتی رہی..... جس طرف اسجد غصے میں بایک دوڑا کر گیا تھا..... سارہ کا دل بوجھل ہو گیا..... گھر تک آتے

ہوئے اس کے دل نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ اسے اسجد کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اس کے ساتھ جانے پر

انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایک اچھے گھرانے کا لڑکا اس کی محبت میں یوں خوار ہو رہا تھا..... وہ لڑکا اس سے شادی کا

خواہش مند تھا..... اسے سارہ کے گھریلو حالات سے کوئی سروکار نہیں تھا..... اس سے بڑھ کر اور اسے کیا چاہیے؟

سارہ دل ہی دل میں خود سے باتیں کر رہی تھی اور اعتراف کر رہی تھی۔

”پاگل لڑکی اللہ، اللہ کر کے تجھے ایک چاہنے والا ساتھی مل رہا ہے جو تیرا عاشق ہے، دیوانہ ہے تیرا..... اس

کی قدر کر..... ورنہ ہر ایرے غیرے لوگوں کے سامنے چائے کی ٹرے سجا کر پیش کرتے، کرتے اور پھر لڑکے

والوں کی طرف سے جہیز کی لمبی چوڑی لٹیں وصول کرتے، کرتے اور ان لٹوں کو پورا نہ کرنے پر مسترد ہوتے،

ہوتے تو ویسے ہی تیری عمر نکل جائے گی..... پھر کون بیاہنے آئے گا تجھے؟“

باقی کے تمام راستے دل اس کو جھنجھوڑتا رہا..... اس سے سوال پر سوال کرتا رہا..... سچ کا آئینہ دکھاتا رہا.....

اور وہ گھر کی جانب بڑھتے ہوئے دل کی تمام باتوں کو سچ مان چکی تھی۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ دل

میں ٹھان چکی تھی کہ کل اسے اسجد کے ساتھ کالج سے کس طرح نکلنا تھا۔

(جاری ہے)

تھی۔ بعد میں اسے اپنے قریبی رشتے داروں اور دوست احباب کے ساتھ یہاں آنا اور قیام کرنا بہت اچھا لگا کرتا تھا۔ بے گلے میں خوش رہنے والی عنایہ سب کے لیے بہترین میزبان ثابت ہوا کرتی تھی اور

عنایہ نتھیاگلی کے دلنشین نظاروں کو دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے اداس ہو گئی۔ آج کی عید ہمیشہ کی طرح ماضی کی تمام عیدوں سے مختلف تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون منانے آئی

ایک حقیقت؟ ایک فسانہ؟

رفاقت جاوید



READING
SECTION

سبھی بھاگ بھاگ کر یہاں آیا کرتے تھے۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر وہ قربانی سے فارغ ہو کر اپنے بچے اور شوہر کے ساتھ وہاں پہنچ جاتی تھی۔ دوسرے دن مہمانوں کا تانتا بندھ جایا کرتا تھا۔

لیکن آج..... وہی جگہ تھی..... وہی حسین مناظر تھے..... لیکن سب کچھ سونا، سونا تھا۔ بارش کی رم جھم بین کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا دل چاہا وہ واپس چلی جائے لیکن اگلے ہی لمحے اسے اسلام آباد کے گھر کی یاد آنے والی خاموشی نے کاٹنے کی دھمکی دی تو اس نے کھڑکی کے آگے پردہ کھینچ دیا اور ڈرائنگ روم کے صوفے پر نیم دراز ہو گئی..... خانساماں کب چائے لا کر رکھ کر بھی چلا گیا لیکن اسے خبر نہ ہوئی۔ وہ ماضی کے حسین دنوں میں شوہر کو تلاشتی ہوئی اس کے سینے سے جا لگی۔

”دیکھو مجھ سی سچی اور کھری محبت تمہیں چراغ لے کر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ تم میری باتوں پر صرف ایک بار بھروسا تو کر کے دیکھو.....“ شہباز نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تو وہ جھولے سے اتر کر بھاگنے لگی۔ شہباز نے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”کچھ تو جواب دو..... میں تمہیں پسند کرتا ہوں بہت ساری ڈھیر ساری خوبیوں اور صرف ایک خامی کے باوجود.....“ وہ ذرا سا مسکرا کر بولا تو عنایہ پھر گئی۔

”بولو کون سی خامی ہے مجھ میں..... مت کرو مجھ پر احسان عظیم..... جاؤ اپنا رستہ ناپو..... اور اس منزل کو پالو جہاں علیحدہ تمہارے لیے پھولوں کے ہار لیے کھڑی ہے۔“ عنایہ نے اس کی طرف غصے سے دیکھا۔ ”خدا کے لیے اب میری جان بخشی کر دو۔ میں دس بار تمہیں سمجھا چکی ہوں کہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”آخر کوئی توجہ ہوگی اس انکالی... بتا دو مجھے

میں بھی تو بیسیوں بار یہ سوال ڈھرا چکا ہوں مگر ایک بات میں بھی تمہیں بتا دوں، تمہارا پیچھا میں پھر بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تم میری خالہ کی بیٹی ہونے کے ناتے میری فطرت کو جانتی ہو کہ میں ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ مستقل مزاج برلے درجے کا اور ثابت قدم تم سے بھی کہیں زیادہ سمجھیں.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”یعنی ضدی، کم عقل اور خود پسند ہو تم..... بس چلے جاؤ یہاں سے..... ورنہ خالہ سے تمہاری شکایت لگا دوں گی۔“ وہ تنک کر بولی۔

”محبت وہ آئینہ ہے جس میں عاشق اور معشوق دونوں کے چہرے صاف نظر آتے ہیں۔ تمہاری نگاہوں میں، میں بستا ہوں ذرا اپنے دل سے تو پوچھو وہ انکاری کیوں ہے؟ آج اس سوال کا جواب میں لے کر ہی جاؤں گا۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”بہت عجیب انسان ہو تم.....“ وہ ہاتھ چھڑا کر سامنے ہی بیٹھ گئی۔

”یہ بتاؤ کہ مجھے تعلیم ختم نہیں کرنے دو گے؟“ وہ نرمابٹ سے بولی۔

”یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ہاں کر رہی ہو..... میری محبت کا اقرار کرنے کا شکر یہ۔“ وہ چہک کر بولا۔ ”تعلیم شادی میں رکاوٹ بن رہی ہے؟ تو تم شادی کے بعد جاری رکھنا..... اپنی تعلیم.....“

”خوش فہمیوں میں رہنا تمہاری فطرت کا حصہ ہے، میری نہیں۔ خدا کے لیے حقیقت کی دنیا میں واپس آ جاؤ..... مجھے تم سے نہ تو محبت ہے نہ ہی شادی وادی کا کوئی پروگرام ہے وہ بھی تم سے..... نہ جانے تمہیں خود پر اتنا غرور کس بات کا ہے۔ اس ملک میں تمہارے جیسے قدم، قدم پر ملتے ہیں۔“ وہ تمسخرانہ لہجے میں بولی۔

”لیکن یاد رکھو کہ میرے جیسا محبت پنچا اور

نے اتنا ہی کہا ہی تھا کہ آنکھیں نیر بہانے لگیں۔
شہباز اچنبھے سے اسے دیکھنے لگا۔

”میں سمجھا نہیں..... کہ ان خوب صورت آنکھوں

میں ساون کسے اتر آیا؟ جلدی بولو کہ مسئلہ کیا ہے؟ ورنہ
مجھے تمہاری آنکھوں کے آنسو مار ڈالیں گے۔“

”تو سنو پھر مرنے کی باتیں مت کرو۔“ وہ آنسو
صاف کر کے اپنی آشفقتہ محبت کو یکجا کر کے بولی۔

”آئی لو یوسوچ..... تم نہیں سمجھ سکتے..... کیونکہ تم

وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے جو میں کہنا چاہتی ہوں آخر کو ایک
فوجی جو ٹھہرے..... آہ شہباز کیسے بتاؤں۔“

اسے اس کا اشارہ سمجھ تو آ گیا تھا مگر وہ انجان

بن کر اس کے خیالات کی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ

اسے دیر تک ستاتی رہی اور وہ اس کی باتوں سے
مغضوظ ہوتا رہا۔

”پگلی سمجھاؤ گی تو سمجھ پاؤں گا ناں.....“ وہ
کرسی اس کے قریب کرتے بولا۔

”میں اپنی خاموش محبت پر آج تو بند باندھ

سکتی ہوں پر کل اس میں ناکام ہو جاؤں گی۔ اس

سے پہلے کہ میں دنیا والوں کے لیے اک عبرت ناک

مثال بن جاؤں تم میری جان چھوڑ دو۔“

”تم عبرت ناک مثال، خاموش محبت..... کل

کی ناکامی، میں کچھ سمجھا نہیں۔“ وہ متذبذب لہجے

میں بولا۔

”سمجھو ناں..... کہ کل تم اگر شہید ہو گئے تو میں

تو چپتے جی مر جاؤں گی۔ بس مجھے تم سے شادی نہیں

کرنی۔“ وہ اپنی کرسی اس سے دور گھسیٹ کر بولی۔

”اب وجہ سمجھ گئے ہونا..... مجھے شہید کی بیوہ

کہلانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھے ایسا شوہر چاہیے

جس کا عمر بھر کا ساتھ ہو، ہم بڑھاپا بھی مل جل کر

گزاریں۔ تم دادا بنو میں دادی کہلاؤں۔ بیچ منجھدار

میں چھوڑنے والے بے وفا ساتھی کی اس دل
س کوئی جگہ نہیں۔“

کرنے والا ہرگز نہیں ملے گا۔ میں نے کہہ دیا ناں کہ
آج انکار کی وجہ پوچھ کر ہی جاؤں گا۔“ وہ پھر مستحکم
لہجے میں بولا۔

”سن سکتے ہو..... جو میں کہنے جا رہی ہوں؟

اس کے بعد میرا پیچھا چھوڑ دینا..... کیونکہ اس کا

تمہارے پاس جواب نہیں ہوگا۔“ وہ پڑ مردہ لہجے میں

بولی اور آسمان کی طرف دیکھ کر گویا ہوئی۔ ”مجھے تم سے

شادی نہیں کرنی..... کیونکہ تم مجھے بہت جلد چھوڑ جاؤ

گے..... روتا پیٹتا..... میری ایک نہیں سنو گے..... میں

سب جانتی ہوں کہ تم ایسا ہی کرو گے۔“

”یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی۔ تم پر بھی بکو اس ختم ہے۔

میں تڑپ رہا ہوں ماہی بے آب کی طرح اور محترمہ

فرما رہی ہے کہ چھوڑ دوں گا۔ خدا کی قسم تم طلاق کا

مطالبہ بھی کرو گی ناں تو پھر بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں

رلا دوں گا۔ مرتے دم تک تمہیں اپنی قید میں رکھوں

گا۔“ وہ غصے میں لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ ”کوئی

ٹھوس دلائل پیش کرو تا کہ میں اس کے بارے میں

سوچ سکوں..... بہت گھٹیا سوچ ہے۔ تمہاری.....

مجھے تو تمہاری نیت میں فتور لگ رہا ہے۔“

”بدھو چھوڑنے کا مطلب تم نہیں سمجھ سکتے.....

محبت کیسے نبھاؤ گے شادی کرنے چلے ہو عتایہ سے۔

جاؤ جی کہیں اور محبت آزما لو۔ کھلم کھلا اجازت ہے۔“

وہ قہقہہ لگا کر بولی۔ ”یہ جو فوجی ہوتے ہیں ناں.....

انہیں صرف بندوق چلانی آتی ہے۔“

”مطلب تم ہی سمجھا دو یار..... میں سیدھا سادہ

بندہ ہوں ناک کی سیدھ میں چلنے والا..... لکیر کا

فقیر..... مجھے گھما پھرا کر نہ تو بات کرنی آتی ہے، نہ

ہی تمہاری جلیبی جیسی باتیں سمجھ سکتا ہوں۔ ویسے

آپس کی بات ہے تم کافی خفیہ لڑکی ہو، خدا خیر ہی

کرے۔“ وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”تم ناک سے

چنے اب بھی چہواری ہو۔ کل بھی ایسا ہی کرو گی۔“

”تو سنو سیدھے سادے الفاظ میں۔“ اس

کی طرح سب کے بچے جوان ہو چکے ہیں۔ وہ ان میں مصروف ہیں، بیچارے مجھے وقت کیسے دے سکتے ہیں، میں ان کی مجبوریاں جانتی ہوں۔“ عنایہ منمنائی۔

”بیگم صاب..... جب بچے چھوٹے تھے وہ پھر بھی بچوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ صاب کے جانے کے بعد ہی اتنی بڑی تبدیلی کیوں آگئی تھی۔ آپ اپنے دو ننھے منے بچوں کے ساتھ اپنی یادیں تازہ کرنے یہاں اکیلی ہی آتی رہیں۔ صاب کے جانے کے فوراً بعد محفلیں ہی اجڑ گئیں۔ وہ گونجتے ہوئے قہقہے اور ہنسی مذاق، چھیڑ خانیاں آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ اور آپ کی خدمت و خاطر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے قلم کی طرح گھوم جاتی ہے۔ بیگم صاب آپ بہت عظیم عورت ہیں۔ کبھی شکایت نہیں کی..... کوئی گلہ نہیں کیا..... بلکہ ان کے اس رویے اور سلوک کی پردہ داری ہی رکھی ہے۔“ وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔

”میں عمر رسیدہ اور زندگی کے تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ اپنے بیٹوں کے پاس چلی جائیں۔ ابھی آپ جوان ہیں، نوکری بھی کر رہی ہیں اور ہمت و حوصلہ بھی بلند ہے۔ کل جسم میں کمزوری آگئی..... بڑھاپا طاری ہو گیا تو آپ کو مجبوراً اپنے بیٹوں کے پاس جانا ہی پڑے گا۔ اس وقت آپ کی بہویں بھی پس و پیش ضرور کریں گی کیونکہ آپ نے ان کو اپنی عادت جو نہیں ڈالی ہوئی۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن چاچا میں اس سرزمین کو کیسے چھوڑ سکتی ہوں جس پر تمہارا صاب قربان ہو گیا تھا۔ مجھے اس کی مٹی سے ان کے خون کی مہک آتی ہے۔ میں نے اسی یاد کے سہارے جوانی گزاری اور بڑھاپا بھی اسی خوشبو کے سنگ بیت جائے گا۔ میرے دونوں بیٹے آباد رہیں۔ خوشحال اور کامیاب

شہباز نے تمسخرانہ انداز میں قہقہہ لگایا تو عنایہ اپنی سوچ کی گہری وادی سے باہر نکل آئی۔ خالی الذہنی سے گرد و پیش کا جائزہ لے کر اپنے دماغ کو حاضر کیا کہ وہ اس وقت کہاں پر ہے؟

اس نے چائے کی پیالی کو ہاتھ لگایا جو برف کے مانند ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

”چاچا!“ اس نے وہیں سے خانساں کو آواز دی تو وہ فوراً جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

”بیگم صاب حکم فرمائیں.....“ ملازم سر جھکائے نہایت مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

”چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے، گرم گرم چائے لے آؤ اور کھڑکی کے پردے ہٹا دو، اگر تم گھر جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔ تمہاری بیوی، بچے تمہارے منتظر ہوں گے۔ ان کی عید میری وجہ سے خراب نہیں ہونی چاہیے۔“ عنایہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

”نہیں بیگم صاب..... میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا..... میں نے آپ کا وہ وقت دیکھا ہے

جب آپ شادی کے بعد یہاں ایک ہفتے کے لیے رہنے آئی تھیں۔ اور پھر ہر عید پر اپنے تمام رشتے داروں کے ہمراہ آنا بھی مجھے یاد ہے۔ آج آپ

اکیلی ہیں، دنیا نام ہی اسی کا ہے۔ لوگ ہنستے مسکراتے ماحول میں کھلکھلاتے لوگوں کی صحبت

میں رہنا چاہتے ہیں۔ جب انسان پر رب کی طرف سے مہربانیاں برستی ہیں تو دنیا والے ان رحمتوں کے

حصے دار بن جاتے ہیں اور جب آزمائش آتی ہے تو.....“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تو وہی

رشتے دار وہی پیارے پھر حصے دار نہیں رہتے..... بڑی آسانی سے اپنا دامن چھڑا کر

ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ میں آپ کے حالات سے واقف ہوں، میں نے یہ بال دھوپ میں سفید

نہیں کیے۔“ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

”چاچا..... ایسی بات نہیں، میرے بچوں

سرگزشت

ماہنامہ

شمارہ اکتوبر 2015ء
کی جھلکیاں

حاجی محسن الباک

اس محسن قوم کا تذکرہ جس نے مسلمانوں
میں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا

حاجی کراچی کراچی

پرانے کراچی کی یادیں جسے ہر کوئی
دلچسپی سے پڑھے گا

حاجی مہینہ کی شخصیات

اس ماہ سے جڑی شخصیات کا مختصر مختصر مگر جامع تبصرہ

حاجی ایک اہم شخصیت کا تعارف جس نے

پاکستان کی فلمی صنعت میں انقلاب برپا کیا

حاجی ایک ایسی سچ بیانی جس کی چھین تادیر محسوس ہوگی

رسول کے علاوہ

لہو رنگ طویل کہانی ”سراب“۔ دنیا کے
انوکھے گھروں میں سے ایک ”انوکھا گھر“ کا
تذکرہ۔ کراچی میں قائم ”کالا چھپرا“ کا ذکر
خاص۔ شکاریات پسند کرنے والوں کے لیے
ایک چالاک چیتے کی روداد اور بہت سے سچے
قصے، انوکھے واقعات، دلچسپ سچ بیانیاں۔

ہوں۔ میں ان کے لیے آزمائش نہیں بننا چاہتی.....
وہ اپنی زندگی میں خوش و خرم رہیں..... یہی میری
آخری خواہش ہے اور دعا ہے۔“ عنایہ نے اپنے
آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے کہا تو چاچا نے اسے
سیلوٹ کیا اور پھر پچن کی طرف چلا گیا۔ وہ کھڑکی
سے باہر دیکھنے لگی۔ دیودار کے اونچے اونچے لائے درختوں
پر بندروں کا کھیل تماشا جاری و ساری تھا۔ اسے وہ
دن یاد آ گیا جب شہباز نے بھی اس کے ساتھ ایسا ہی
کھیل کھیلا تھا اور اسے شادی کے لیے رضامند کر لیا
تھا۔ وہ دائیں طرف مڑتی تو آگے سے رستہ روک
لیتا..... سامنے سے نکلنے کی کوشش کرتی تو سینہ تان کر
کھڑا ہو جاتا۔ پیچھے سے بھاگنے کے لیے نکلتی تو کسی
اور ترکیبوں سے اسے رکنے پر مجبور کر دیتا۔ اور آخر وہ
اسے شادی کے لیے رضامند کرنے میں کامیاب
ہو ہی گیا تھا۔

وہ ابھی میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ شادی
کے بعد اس کا شہباز کے ساتھ رہنا مشکل ہو گیا تھا۔
جب اسے کالج سے ایک مہینے کی چھٹی ملتی تو شہباز بھی
اینول لیولے کر سسرال پہنچ جاتا اور اگلے ہی دن
اسے لے کر ننھیال گلی آرمی گیٹ ہاؤس میں آ جاتا۔
ایک مہینہ پلک جھپکتے گزر جاتا کیونکہ ان کا ہر دن عید
اور ہر رات شبِ برات بن جایا کرتی تھی۔ خوشیوں
کی گھڑیاں گزرنے کا احساس ہی کب ہوتا ہے؟ ان
لحوظ کو تو گویا پر ہی لگ جاتے ہیں، جھٹ سے گزر
جاتی ہیں یہ گھڑیاں..... ہر عید کی چند چھٹیاں بھی اسی
گیٹ ہاؤس کی نذر ہو جایا کرتی تھیں۔ چاچا اس
وقت جوان تھا، چھ بچوں کا باپ تھا۔ ہر وقت ان کی
فکر میں گھائل ہوتا رہتا۔ عنایہ اسے سمجھاتی کہ تم بہت
نادان ہو جو پیسے کی فکر میں رہتے ہو، اپنے گھر
میں بیوی بچوں کے ساتھ خوش رہا کرو۔ یہی اصل
زندگی ہے، باقی سب بیکار ہے۔

”بیگم صاب..... چائے پیجیے... ورنہ پھر

ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ چاچا کی آواز پر وہ چونکی..... اور ٹرے سے چائے کی پیالی اٹھا کر پینے لگی۔

میڈیکل کے آخری سال میں گل فراز پیدا ہوا تو کم تنخواہ کے باوجود شہباز نے اپنی یونٹ میں فراخ دلی سے مٹھائی تقسیم کی۔

عناہ ہاؤس جاب کرنے کے بعد نوکری کی کوشش کرنے لگی۔ میجر شہباز کو سیالکوٹ بارڈر پر تعینات کیا گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی ایک کمرے میں رہنے لگی۔ اسے میس کا کمرہ اور کھانا کسی محل سے کم نہ لگتا تھا۔ وہ بہت خوش تھی لیکن دوسرے بچے کی خوشخبری سنتے ہی شہباز نے اسے اسلام آباد روانہ کر دیا تاکہ اسے مکمل طور پر آرام اور بہترین کھانا دیا جائے..... ابھی پرینینسی کے تین مہینے ہی گزرے تھے کہ لائن آف کنٹرول پر بھارت کی اچانک اندھا دھند فائرنگ نے تین افسران کو شہید کر دیا۔ شہباز بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس دکھ نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ اس کی میت پر روئی نہیں تھی کیونکہ اس کا ذہن خوشیوں کے مرغزاروں میں بھی اسے خطرے کی گھنٹیوں سے بیدار رکھتا تھا۔ وہ اپنے ان منفی خیالات کو خوب کوسی اور دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگتی لیکن یہ ڈر و خوف اور اندیشے اور خدشے کبھی کسی کو بتانہ سکی حتیٰ کہ شہباز کو بھی نہیں.....

شاید یہی وجہ تھی کہ وہ شہباز کے ساتھ گزرنے والی ہر گھڑی سے خوب محظوظ ہوتی۔ وہ میس کے تنگ و غلیظ کمرے میں بھی خوش رہتی تھی۔ میس کے کھانے اسے بہت خوش ذائقہ لگا کرتے تھے۔ وہ میس کے کمرے سے باہر لان میں گل فراز کے ساتھ گھنٹوں کھیلتی رہتی تھی۔ اس نے نیا نیا چلنا سیکھا تھا۔ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اسے الجھن یا بیزاری نہیں ہوتی تھی۔ شہباز نے بھی اسے آج تک کسی غلطی پر ڈانٹا تھا نہ ہی خفگی کا اظہار کیا تھا۔ ایک آئیڈیل زندگی گزارتے، گزارتے انہیں حاسدوں کی نظروں نے ہڑپ کر لیا

تھا۔ وہ تصور میں اس سرگوشی کے انداز میں بولی۔
”میرے مالک، میری جان مجھے اسی بات کا خدشہ رہتا تھا۔ شہباز تم نے مجھے وہی دکھ دیا جس سے میں بھاگنا چاہتی تھی۔“ وہ تڑپ کر خود کلامی کرنے لگی۔ اس کے وجود میں کرب و اذیت نے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ وہ شال کندھوں پر ڈال کر باہر نکل آئی۔ اور برآمدے میں بیٹھ کر اپنے پیاروں کو یاد کرنے لگی جو اسے اب بھی بے حد عزیز اور مقدم تھے لیکن افسوس کہ وہ ان کے لیے عزیز رہی تھی نہ ہی اہم۔

عناہ کو سول اسپتال میں گورنمنٹ کی جاب یہ آسانی مل گئی تھی لیکن اس نے اس نوکری کو ریجیکٹ کر دیا اور آرمی جوائن کر لی۔ اسی دوران دوسرا بیٹا جو ہو بہو باپ کی کاپی تھا سی ایم ایچ میں پیدا ہوا۔ اور اس کی پوسٹنگ بھی یہاں ہی ہو گئی۔ بچوں کو اس نے آرمی کی مدد سے پروان چڑھایا۔ اپنوں میں سے کسی نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ تمام خونی رشتے کہاں کھو گئے تھے جو اس کی خوشیوں کے توجھے دار بنے رہتے تھے مگر اب وہ تمام سہیلیاں اور شہباز کے چہیتے دوست کہاں رخصت ہو گئے..... جو اپنی محبت و لگاؤ کے دعوے کیا کرتے تھے۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے، موٹے آنسو نکلے اور رخساروں پر پھیل گئے۔

”شہباز تمہارے بن میری ہر عید ماضی کو یاد کرتے ہی گزرتی رہی۔ آج کی عید بھی میں نے صرف اور صرف تمہارے نام کر دی ہے۔“ مغرب کی اذان پر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ عید ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہو رہی تھی لیکن شہباز کی یادیں وہیں بسیرا کیے ہوئے تھیں۔ ”کاش شہباز تم جاتے، جاتے اپنی محبت کے صدقے مجھ پر ایک احسان یہی کر جاتے۔ اپنی محبت کو میرے دل سے مٹا جاتے اور مجھے خوش رہنے کا سلیقہ ہی سکھا جاتے۔“

READING
Section

124 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء



وقعت

صدف آصف

ساتوں آسمان سر پر گرنے کا محاورہ اسے آج سمجھ
میں آیا تھا۔ جس کی آنکھوں میں بچپن سے ایک سہنا پلا
ہوا چائیک اسے نوچ لیے جانے کے کرب پر وہ تڑپ اٹھا۔
”اسوہ پلیز..... کچھ تو سوچو یہ بڑا ظلم ہے۔“ افق کا

زرد چہرہ دیکھ کر اس کا دل دھڑکا۔

”افق.....!“ اس کے منہ سے ایک دم نکلا۔

”اسوہ۔“ وہ زخمی نگاہوں سے تکتے ہوئے بلبلا اٹھا۔

”اب میری مصیبتوں کو اور نہ بڑھاؤ۔ میں مئی کے

فیصلے کے خلاف نہیں جاسکتی۔“ وہ اس بار بے بس ہو کر رو

دی۔ افق محمود تڑپ کر رہ گیا۔

”اسوہ! بھلا کوئی اپنی زندگی کے بغیر بھی رہ سکتا

ہے۔ میں یہ جدائی سہہ نہیں پاؤں گا۔“ وہ اب درخواست

کرنے لگا۔

”اس خیال کو دل سے نکال دو۔ مئی نے وقاص احمد

READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ساس مرحومہ نے مرتے وقت یہ بڑا سا گھر جس میں اسد اللہ اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پزیر تھے بیٹے کے نام کر دیا اور ترکے میں اپنا سارا زیور بیٹی کو دے دیا موٹے، موٹے خالص سونے کے بنے بھاری سیٹ پران کی بہو کی شروع سے نگاہ تھی مگر فضیلت کے فیصلے سے تاجور کو یوں لگا جیسے ”دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے۔“

فریدہ کو بھابی کی مطلب پرستی سے بہت دکھ پہنچا، تاجور نے اس بات پر تو کوئی اعتراض نہیں اٹھایا کہ گھر میں فری کو حصہ کیوں نہیں دیا گیا مگر اس بات پر مہینوں سوگ منایا کہ اتنے بھاری، بھاری تین سیٹ صرف بیٹی کو کیوں دیے گئے پوتیوں کا بھی اس میں حق بننا تھا۔ فضیلت بیگم نے یہ فیصلہ کر کے دورانہ لشی کا ثبوت دیا تھا کہ اگر مکان بیچ کر اس میں سے بیٹی کا حصہ دیا جاتا تو مہنگائی کے اس دور میں اسد اللہ میں اتنی سکت کہاں تھی کہ اتنا عا لیشان گھر دوبارہ بنا پاتے، اسی لیے انہوں نے بیٹی کو حصے کے طور پر زیور دے دیے، جو فریدہ کا شرعی حق بننا تھا۔

”اماں کو رکھا ہم نے... آخری وقت میں ساری خدمت یہاں سے لی اور سارا زیور لپیٹ کر فری کو دے دیا۔ اگر ایک سیٹ بہو کو بھی دے جاتیں تو کیا تھا۔ مگر بھیا بیٹی تو بیٹی ہی ہوتی ہے ناں!“ وہ خاندان بھر میں اس قسم کی باتوں کا ڈھنڈورا پیٹتی رہیں، باتیں ضرب، تقسیم ہو کر فریدہ کے کانوں تک بھی جا پہنچتیں۔ اگر، اپنی صفائی دیتی تو سامنے والا آگ لگانے والے انداز میں بات تاجور کے سامنے بیان کرتا۔ اس وجہ سے دلوں کے بیچ فاصلے دھیرے، دھیرے بڑھتے چلے گئے۔ فریدہ دل کی بہت اچھی تھی مگر تاجور کے رویے سے کافی محتاط رہنے لگیں۔ بھائی کے گھر بھی خاص، خاص موقع پر ہی جاتی، حالانکہ اسد اللہ نے ہمیشہ چھوٹی بہن کو اولاد سے بڑھ کر چاہا مگر تاجور نے بہن بھائی کے بیچ، اجنبیت کی ایسی دیوار کھڑی کر دی، جس کا گرانا مشکل ہو گیا۔

خاندانی چپقلش سے پیچھا چھڑانے کے لیے اسد اللہ نے فرار کی بہترین راہ ڈھونڈ نکالی۔ وہ نہ بیوی کے معاملے میں بولتے نہ ہی بہن کو کچھ کہتے، بس اپنے کام دھندے

کے ساتھ میری بات طے کر دی ہے۔ اب ہمارا ساتھ ممکن نہیں..... اس حقیقت کو مان لینے میں ہی ہم دونوں کی بھلائی ہے۔“ اسوہ نے بھیگی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

”یہ مامی کی بے جا ضد ہے۔ وہ اپنی ذاتی چپقلش پر ہم دونوں کی زندگی خراب کرنا چاہتی ہیں۔“ اس کی آنکھوں سے بہتا درد اسوہ کے آس پاس پھیلنے لگا۔

”گزری باتوں کو چھوڑ دو۔ تم نے ان لوگوں کو شادی کی تاریخ بھی دے دی ہے۔“ اسوہ نے کہا اور منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکی لی۔

”تم ایک بار ہمت تو دکھاؤ۔ میں اسد ماموں کو منا کر دم لوں گا۔ آخر یہ ہم دونوں کی زندگی کا معاملہ ہے، اس کا فیصلہ وہ اکیلے کیسے کر سکتی ہیں۔ یہ تو سراسر زیادتی ہوگی۔“ اب وہ غصہ ہونے لگا۔ اسوہ سے اس کا دیوانہ پن جھیلنا نہیں گیا۔

”افق..... ہوش میں آؤ۔ وہ کوئی اور نہیں میری ماں ہیں۔ تم پر نہیں مگر وہ مجھ پر اپنا مکمل حق رکھتی ہیں۔ بس اب مجھے کوئی دوسری بات نہیں سننی۔“ وہ اپنا پرس اٹھا کر تیز قدموں سے باہر کی جانب چل دی۔

”اسوہ سنو!“ افق پیچھے سے پکارتا رہ گیا مگر اس کی صدارانگاں گئی۔ وہ چلی گئی۔ اس نے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنی قسمت کو تلاش، دل کا درد انتہاؤں تک جا پہنچا، اسوہ نے جدا ہونے کا فیصلہ کر کے، اسے خود کی نظروں میں بھی بے وقعت کر کے رکھ دیا۔



کارڈ چھپنے چلے گئے شادی کی تاریخ سر پر آگئی، اسوہ کا دل بچھنے لگا مگر وہ مجبور تھی، افق کو بے انتہا چاہنے کے باوجود وہ اپنی ماں کا مان نہیں توڑ سکتی تھی۔ اس کی می تاجور بانو کو شروع سے اپنی نند فریدہ سے پتا نہیں کیا مسئلہ تھا، ان کی اچھی بات پر بھی وہ برا مان جاتیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی بھی سسرالی رشتے سے بلاوجہ کاہر باندھ کر تا عمر بڑی ڈھٹائی سے اپنی سوچ پر قائم رہتے ہیں۔ تاجور کا بھی یہی حال رہا، دراصل ان کی

والوں کو ہاں کر دی گئی۔ اسوہ ماں کی جلد بازی پر رونی رہ گئی مگر تاجور نے اس معاملے میں اس کی ایک نہ سنی۔

اُدھر فری، اسوہ کا رشتہ مانگنے کا پلان ہی بناتی رہ گئیں اور ان کے بھائی، بیوی کے ساتھ منگنی کی مٹھائی لے کر ان کے یہاں بھی پہنچ گئے۔ وہ بھائی کے یوں غیریت برتنے پر منہ دیکھتی رہ گئیں، افق البتہ اپنی اس بے وقعتی پر غصے میں بائیک اٹھا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

”افق مجھے کچھ کہنا ہے.....!“ اسوہ نے مدھر آواز میں پکارا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا۔

”تم یہاں۔“ اسوہ کو اپنے کمرے میں پا کر اس کے دل کی حالت عجب ہونے لگی۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اسوہ کالج کے سفید یونیفارم میں سرسوں کا زرد پھول بنی ہوئی تھی۔ افق کو ایسا لگا جیسے وہ ایک خواب کی کیفیت میں ہو..... اس کا سگوار چہرہ، زرد پڑتی رنگت، متورم آنکھیں جن کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ افق نے دکھ سے اپنی زندگی کو دیکھا، جو چند روز قبل تک کھلا گلاب لگتی تھی۔

”ہاں بولو..... کیا اب بھی کچھ رہ گیا ہے؟“ اس نے اتہزاز سے انداز میں پوچھا۔

”پلیز..... افق!“ اس کا چہرہ مزید اتر گیا۔

”کیا میرے برباد ہونے کا تماشا دیکھنے آئی ہو؟“ تاک کر ایک اور وار کیا۔

”ایسے لہجے میں مجھ سے بات نہ کرو۔ میری مجبوری کو سمجھو!“ اس کی آنکھوں سے شفاف موتیوں کی لڑی گرنے لگی۔

”سب کی مجبوریوں کو میں ہی دیکھوں، کوئی میری حالت پر بھی تو ترس کھائے۔“ وہ جھلبلا اٹھا۔

”تم کتنے بے درد ہو گئے ہو۔ میرے ساتھ ایسا نہ کرو۔“ وہ اذیت سے چیخ پڑی، افق کو کیا خبر کہ وہ اضطراب کی کن کڑی منزلوں کو طے کر کے آخری بار اس سے ملنے آئی تھی، چند سنہری پل اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا چاہتی تھی۔

”مجھے معاف کر دو، میں اپنے والدین کا دل توڑ کر

میں مصروف رہتے یا شام کو فراغت کے لمحات میں مرزا صاحب کی سنگت میں شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھ جاتے۔

☆☆☆

افق، اسوہ کو بہت شدت سے چاہتا تھا، وہ اس سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ ماں پر زور بھی دیا کہ وہ ماموں کے پاس اسوہ کا ہاتھ مانگنے جائیں، فری کو بیٹے کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اسوہ اپنی دادی فضیلت بیگم کی کاپی تھی، گوری رنگت، خوب صورت آنکھیں، کھڑے نقوش، لمبے گھنے کالے بال اور پرکشش سراپا..... فریدہ کو شروع سے اپنی اس بیٹی سے خاص انسیت تھی مگر تاجور کی فطرت کو پہچانتے ہوئے وہ صحیح وقت کی تلاش میں تھیں، جانتی تھیں کہ بھادج کو تو انکار کا بہانہ چاہیے۔ فریدہ نے افق کو جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے کہا تا کہ وہ بھائی سے اسوہ کا ہاتھ مانگ سکیں، فری اس جانب سے اٹھنے والے سارے اعتراضات کا منہ توڑ جواب تیار رکھنے میں لگی رہیں اور بات ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔

تاجور، ان کی سوچ سے بھی آگے کی دنیا دیکھ رہی تھیں، دور رس نگاہوں نے بیٹی کے چہرے پر افق کو دیکھتے ہی..... اترنے والے محبت کے رنگوں کو پہچان لیا، یہ ان کے لیے ناقابل برداشت بات تھی۔

خواب دیکھنے کی کچی عمر ان پر بھی آئی تھی۔ اسوہ کا اپنی پھپھو کے گھر جانے کے لیے بے چین رہنا..... بہانے، بہانے سے افق سے فون پر لمبی باتیں کرنا۔ باپ کے سامنے ہر وقت پھپھو کی تعریفیں کرنا۔ وہ چوکنا ہو گئیں۔ تاجور کی روک ٹوک کے باوجود وہ اکثر کالج سے سیدھے پھپھو کے گھر چلی جاتی اور ماں کو وہاں سے فون کر کے بتاتی تو وہ تن فین کرتی رہ جاتیں۔

تاجور کو بیٹی کے رنگ ڈھنگ نے ہولا دیا، انہوں نے اسی لیے اسوہ کے لیے آنے والے رشتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ وقاص کا رشتہ مرزا صاحب کے جاننے والوں کے توسط سے آیا، وہ وقاص کے شاندار فیملی بیک گراؤنڈ سے بری طرح سے متاثر ہو گئیں۔ لڑکان کے معیار پر پورا اترتا تھا، یوں جھٹ پٹ وقاص کے گھر

محفل میں موجود رشتے دار خواتین تاجور کی دور اندیشی پر واہ، واہ کرنے لگیں، جنہوں نے ایسے دل والے لوگوں میں رشتہ جوڑا۔ ساری کزنز بھی اسوہ کی خوش قسمتی کو دل ہی دل میں سراہتے ہوئے، اپنے لیے بھی ایسے ہی بر کی دعا مانگ رہی تھیں۔

اسوہ کی نگاہیں اچانک فری پھپھو کے چہرے پر جا نکلیں، جہاں اپنی سب سے قیمتی چیز کھونے کا ملال طاری تھا۔ افق کی یاد نے جیسے یک دم اسے جکڑ لیا۔ وہ ایک دم بے چینی محسوس کرنے لگی۔ اس ماحول میں دم گھٹنے لگا، وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ فری پھپھو تو دو دن قبل یہاں آ کر رک گئی تھیں مگر افق ایک دو گھنٹے کے لیے مہمانوں کی طرح آتا اور تقریب میں شرکت کر کے چلا جاتا۔

اسوہ سارے شور ہنگاموں سے بیزار ہو کر دھیرے سے اٹھی اور اپنے کمرے میں جا لیٹی۔ آنسو پلکوں کی باڑ سے رستہ بناتے بہہ نکلے۔ اس کا دل بری طرح سے گھبرانے لگا تو اس نے اٹھ کر وضو کیا اور دو رکعت نفل پڑھنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر۔ اللہ سے گڑگڑا کر اپنے دل کے سکون کی دعائیں مانگیں۔ دل کی کیفیت تبدیل ہونے لگی، رفتہ رفتہ قرار آنے لگا، اسوہ نے آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

اسوہ خلاف توقع صبح کافی دیر تک سوتی رہی، حیرت کی بات یہ ہوئی کہ اسے کسی نے اٹھایا بھی نہیں، خود ہی منہ ہاتھ دھو کر وہ بالوں کو سمیٹتی باہر نکل آئی، ہر سو خاموشی سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ حیران، پریشان ماں کے کمرے کی جانب بڑھی۔

”اول ہوں، آپنی اندر نہیں جائیے گا۔ مئی کو دوادے کر لٹایا ہے، ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ حسنہ نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے اندر جانے سے روکا۔

”اچھا مگر رات تو مئی ٹھیک تھیں، اچانک کیا ہوا۔ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“ اسوہ نے حیرانی سے چھوٹی بہن کی روئی، روئی سی صورت دیکھ کر سوال کیا۔

”نہیں، کوئی بات نہیں۔ وہ بس تھک گئی ہیں۔“ حسنہ نے ڈرتے، ڈرتے کہا اور نگاہیں چرائیں۔

”ایک منٹ..... تم ذرا میرے کمرے میں چلو۔“ اسوہ کا

خوشیاں حاصل کرنے کا جرم نہیں کر سکتی۔“ وہ ایک دم اس کا ہاتھ تھام کر رو دی۔ جان سے عزیز ہستی کی آنکھوں میں آنسو دیکھنا، محبت کرنے والے کے بس کی بات نہیں ہوتی اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”اف، میں کس موڑ پر آ گیا ہوں۔ جہاں آگے بڑھنا ممکن نہیں اور پیچھے ہٹنے پر دل آمادہ نہیں۔“ افق نے بال نوج لیے۔ زبان ایک دم بند ہو گئی، اس کی سرخ آنکھوں سے ضبط کے باوجود ایک قطرہ زمین پر گر اور کھو گیا۔

وہ اسوہ کی مجبوری سمجھتا تھا..... مگر جسم سے جاں نکلنے کی اذیت اس سے سہی نہیں جا رہی تھی۔ اتنی تکلیف میں ہونے کے باوجود اسوہ کو یوں بچوں کی طرح سوں، سوں کر کے روتا دیکھ ٹشو سے اس کی چھوٹی سی ناک پونچھنے لگا۔ اسوہ کے ہونٹوں پر ایک درد بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ بھی زبردستی مسکرا دیا۔

☆☆☆

گلابی، شیفون پر باٹل گرین بناری بیچ ورک اور نفیس کام والا ایک نامور ڈیزائنر کے یہاں سے تیار کردہ عروسی لباس نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ تاجور نے فخر سے ساری بری بڑے ہال میں سجادی، سسرال سے آیا ہوا قیمتی سامان اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا پھر بھی دل میں کوئی امنگ یا خوشی کا کوئی احساس نہ جاگا۔

”واؤ اسوہ! ساری چیزیں بہت زبردست ہیں۔“ ساری کزنز نے سسرال سے آئی ہوئی بری دیکھنے کے بعد اسے مبارک باد دینا شروع کر دی۔

”اف سینڈل تو دیکھو کتنی آفت ہے۔“ سنہری نگوں سے جڑی خوب صورت ہائی ہیل ہاتھ میں لے کر سونیا چیخی۔

”مجھے تو لگتا ہے، ساری شاپنگ وقاص بھائی نے بہت دل لگا کر خود کی ہے، ایک، ایک چیز اپنی قیمت بتا رہی ہے۔“ بڑی خالہ کی عینی نے ایشن کی زردی میں لپٹی اسوہ کو ٹھوکا مار کر چھیڑا۔ اس سے مسکرایا بھی نہیں گیا۔

”پتا ہے آپنی کی ساس نے اتنا خوب صورت سونے کا بڑا بھاری سیٹ چڑھایا ہے۔“ اس کی چھوٹی بہن حسنہ کے لہجے میں اتراہٹ سمٹ آئی۔

READING
Section

128 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

وقعت

”پھر کیا ہونا تھا، انہوں نے دولہا کے جوڑے، جوتوں کے لیے دو لاکھ کی ڈیمانڈ کی ہے۔“ حسنہ کی دکھی آواز نے اسوہ کا دل چیر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بابا اور بھائی نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر جہیز دیا ہے مگر لالچ کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وقاص کی فیملی کے پاس تو پیسوں کی کوئی کمی نہیں، اس لیے ان سے مقابلے بازی بیکار تھی۔ اب جبکہ ساری جمع پونجی شادی کے اخراجات پر لگ چکی تھی، اس طرح کی فرمائش..... ان لوگوں پر یقیناً جبر ہوگی۔ وہ کافی دیر تک ٹہل، ٹہل کر کچھ سوچتی رہی پھر ایک عزم کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔

☆☆☆

بڑا ہال جو کل تک شادی بیاہ کے گیتوں سے گونج رہا تھا، لڑکیوں کی ہنسی کی کھنک اور عورتوں کے ہنسی مذاق نے یہاں ایک سماں باندھا ہوا تھا، آج اس کا منظر ہی بدل گیا۔ ہر شے پر ان دکھی اداسی کا قبضہ تھا۔ اسوہ آگے بڑھی تو اس کے پیروں تلے آ کر گلاب اور گیندے کی پتیاں پس گئیں۔

وہ اندر داخل ہوئی۔ اسد اللہ اور صمد سب کے بیچ میں سر جھکائے بیٹھے تھے ان کے ارد گرد قریبی رشتے دار بیٹھے اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ خاندان کے دو چار بڑوں پر مشتمل ٹیم وقاص کے گھر جانے کو تیار کھڑی تھی تاکہ بگڑتی بات بنائی جاسکے، کوئی مالی مدد کی پیش کش کر رہا تھا تاکہ خاندان کی لڑکی عزت سے اپنے گھر کی ہو سکے۔ وہ سب اتنے مصروف تھے کہ کسی نے بھی اسوہ کی آمد کا نوٹس نہیں لیا۔

”ایک منٹ چچا انور اور معین خالو، آپ کی مدد کا شکریہ مگر میں بابا اور بھائی کو مزید ایسی کسی پریشانی میں نہیں ڈالوں گی۔“ اسوہ کے مضبوط لہجے پر سب ہی چونک اٹھے، وہاں ایک دم خاموشی چھا گئی۔

”اسوہ! یہاں بڑے بات کر رہے ہیں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔۔۔“ تاجور نے صوفے پر لیٹے لیٹے، بیٹی کو ڈانٹ پلائی، سب سے بری حالت انہی کی ہو رہی تھی۔

”مئی، یہاں میری قسمت کا فیصلہ کیا جا رہا ہے، مجھے جانتے بوجھتے ان لالچی لوگوں میں بیانے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ میں کیسے چپ رہوں، آپ لوگ

ماتھا ٹھنکا، وہ اسے اپنے کمرے میں کھینچتی ہوئی لے آئی، کمرالاک کر کے مڑی تو حسنہ کی سسکیاں کانوں میں پڑیں۔

”ک... کیا ہوا؟“ اسوہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”وہ آبی دراصل وقاص بھائی کی امی نے رشتہ توڑنے کی دھمکی دی ہے۔“ حسنہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ اسوہ ہکا بکا بہن کا منہ تکنے لگی۔

”رشتہ توڑنا چاہ رہی ہیں، وہ کیوں؟“ اسوہ کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، شادی سے چار دن پہلے ان کی یہ دھمکی بلا جواز تھی۔ وہ بہن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر دلا سا دینے لگی تاکہ وہ مزید کچھ بتانے کے قابل ہو سکے۔

”محترمہ فرماتی ہیں کہ ہم لوگ تو ان کے معیار کے نہیں نکلے۔ وہ صرف بڑے گھر کو دیکھ کر دھوکا کھا گئیں۔“ حسنہ نے دانت کچکچا کر بتایا۔

”انہوں نے یہ کیسی بات کر دی۔“ اسوہ کو بھی غصہ آنے لگا۔

”اصل میں جب یہاں سے آپ کے جہیز کا سامان گیا تو وہ ان کو پسند نہیں آیا، انہوں نے اس میں سو، سو کیڑے نکالے، اس کے بعد وقاص بھائی کے کپڑے جوتے، شیونگ کٹ وغیرہ جو بھی سامان یہاں سے گیا، اس پر انہوں نے صمد بھائی کو خوب سنائیں، بقول ان کے وقاص تو ڈیزائنرز کے سوٹ اور برانڈڈ چیزیں استعمال کرتا ہے۔ ہم نے تو آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا مگر آپ نے اس کا صرف ناپ لیا اور باقی اپنی مرضی کے عام سے سوٹ بنوا دیے جو ہمارے معیار کے ہرگز نہیں ہیں۔

اس سے تو ہماری خاندان میں ناک کٹ جائے گی انہوں نے اپنی بری میں بھیجی جانے والی ایک، ایک قیمتی چیز کا حوالہ دے کر شو بازی کی..... صمد بھائی تو افسردہ سے سر جھکائے وہاں سے لوٹ آئے۔“ حسنہ نے روتے ہوئے بتایا تو اسوہ کپکپا اٹھی۔ اپنے بڑے بھائی کا کسی کے سامنے بھی جھکا ہوا سر دیکھنا، اس کی برداشت سے باہر تھا۔

”اوہ، اچھا پھر کیا ہوا؟“ ان دونوں کے درمیان، خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔ پھر اسوہ نے پوچھا۔

ایک بات سوچیں، شادی سے پہلے ان کا یہ حال ہے تو نکاح کے بعد جب وہ مضبوط ہو جائیں گے پھر ہمارے ساتھ وہ کیا سلوک کریں گے؟“ اسوہ نے اپنا مقدمہ لڑنا شروع کیا، سب خاموشی سے اسے سننے لگے۔

”اے لڑکی، تم کیا چاہتی ہو۔ ہم سب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں۔ وہ لوگ رشتہ ختم کر کے ہمارے خاندان کا تماشا بنا دیں؟“ بڑی خالہ نے ناک کھجاتے ہوئے تیز لہجے میں سوال کیا۔

”نہیں میں تو چاہتی ہوں۔ آپ لوگ خود فون کر کے یہ رشتہ ختم کر دیں۔ یوں ان کا طمانچہ ان کے منہ پر جا پڑے گا۔“ اسوہ نے سر سے سر کتا دوپٹا کس کر واپس نکایا اور اپنا فیصلہ سنایا۔ اس کی ہمت پر سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ فری پھوپھو نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے داد پیش کی۔ انہیں بھی وقاص کے گھر والوں کا چلن ٹھیک نہیں لگ رہا تھا مگر تاجور ان میاں، بیوی کی ہمدردی کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتیں۔ اس لیے زبان بند کیے بیٹھی رہیں۔

”اس لڑکی کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ایک داغ لگ جائے گا۔ ہر طرف ہنسی اڑائی جائے گی۔ مرد پر تو کوئی الزام نہیں دھرنا، سارا قصور عورت کا نظر آتا ہے سب کہیں گے آخر شادی ہوتے ہوتے کیوں رک گئی۔“ تاجور نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ان کا بی بی اوپر کی جانب بڑھنے لگا۔

”اچھا میری آخری بات بھی سن لیں۔ پھر آپ لوگوں کا جو فیصلہ ہوگا، میں اس پر سر جھکا دوں گی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”بیٹی کہو کیا کہتا ہے۔“ اسد اللہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اجازت دی۔ وہ دل سے اس سے متفق ہونے لگے تھے۔

اس نے نگاہ اٹھا کر بھائی کو دیکھا، صدمہ نے بھی سر ہلا کر اجازت دی۔

”ابھی تو میں اپنے گھر پر ہوں۔ کسی کا مجھ پر بس نہیں اس پر ان لوگوں کا یہ حال ہے۔ شادی کے بعد تو وہ ہر موقع پر اپنے اسٹیٹس کو ہمارے رشتے کے بیچ لائیں گے۔“

آپ لوگوں سے ہر چیز میں مقابلہ کیا جائے گا۔ بالفرض ابھی قرضہ لے کر ان کی فرمائش پوری کر بھی دی گئی تو بعد میں کیا ہوگا؟ وہ تو ایسی ہی توقعات باندھ بیٹھیں گے۔ کیا آپ لوگوں میں ساری عمر بے جا فرمائشیں پوری کرنے کا حوصلہ ہے؟“ اسوہ کے چہرے پر سچائی کی چھاپ، اس کا انداز تاجور کے دل میں اترتا چلا گیا۔

”یہ بھی تو سوچو رشتہ ختم ہونے کے بعد دنیا کتنی ہنسی اڑائے گی، چھوٹی بہن پر کیا اثر پڑے گا۔“ تاجور نیم رضا مند ہونے لگیں تو ایک اور اندیشے نے سر ابھارا۔

”مئی! آج کے انکار سے میرے دامن پر گندگی کے چند چھینٹے ضرور پڑیں گے مگر ان لوگوں نے جس قسم کی ذہنیت اور سوچ کا مظاہرہ کیا ہے کچھ بعید نہیں یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کل کسی اور بات پر اختلاف رائے ہو جائے اور وہ پروانہ آزادی میرے ہاتھوں میں تھما کر مجھے وہاں سے چلتا کر دیں۔ اس کے بعد ساری عمر کے لیے ماتھے پر وہ داغ لگ جائے گا۔ جو کبھی مٹائے نہیں مٹے گا۔“ ایسی بات کہتے ہوئے اسوہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ وہ رکی نہیں باہر کی طرف بھاگی۔ فری دوپٹے سے آنکھیں مسلتی ہوئی اس کے پیچھے چل دیں۔ تاجور سمیت سب لوگوں نے ان باتوں سے اتفاق کیا۔ اسد اللہ نے مشورے کے بعد فون ملایا اور بڑی ہمت سے لڑکے والوں کو انکار کر دیا۔

☆☆☆

”کھانے کا آرڈر دیا جا چکا ہے، عزیزوں میں دعوت نامے بٹ گئے ہیں، بنکوائٹ ہال بک ہو گیا۔ ایسے میں انکار کر کے میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟“ اسد اللہ نے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”بھائی پریشان نہ ہوں۔ آپ نے کچھ غلط نہیں کیا۔“ فریدہ نے انہیں تسلی دی۔ باقی لوگ جا چکے تھے مگر وہ آج رک گئی تھیں۔

”اب کیا ہوگا، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔“ اسد اللہ نے کافی عرصے بعد بہن سے دل کی بات کی۔

”بھائی! اوپر والے پر بھروسہ رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ فریدہ نے بھائی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

READING
Section

130 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

لگا لیا۔ وہ دنیا کی حقیقت جان چکی تھیں، ایک بار پھر خالص رشتوں سے منہ موڑنے کی غلطی کیسے کرتیں۔
”افق بھائی کہاں ہیں انہیں تو بلا لیتیں؟“ حسہ نے محبت سے پوچھا۔

”وہ ابھی یہاں پہنچنے والا ہوگا۔ میرے بچے کی شادی اتنی اچانک ہو رہی ہے تو کیا ہوا؟ اس کے بھی تو ارمان ہیں۔ ہم لوگ اسوہ کے لیے خریداری کرنے ابھی جا رہے ہیں۔ تم بھی ساتھ چلو۔“ فری نے پیش کش کی تو حسہ نے سر ہلا کر حامی بھر لی۔

”سب کچھ اتنی جلدی ہو رہا ہے۔ تم تیاری کر لو گی؟“ تاجور نے حیرت سے پوچھا۔

”شکر ہے۔ زیور تو تیار رکھے ہیں۔ بس فی الحال عروسی لباس اور دوسرے لوازمات خریدنا ہیں۔ باقی شاپنگ اسوہ شادی کے بعد خود کر لے گی۔“ فری نے بتایا تو تاجور نے بھی دلچسپی لینا شروع کر دی۔

”اچھا کیا جو افق کی دلہن کے لیے زیور پہلے ہی بنا کر رکھ دیے۔“ تاجور نے ریلکسیس ہو کر پاؤں پھیلائے۔ اسد اللہ، مطمئن ہونے کے بعد دوسرے کام نمٹانے چل دیے۔

”نہیں بھابی، امی کے دیکے ہوئے زیورات میں نے اپنی اکلوتی بہو کے لیے ہی تو رکھ چھوڑے تھے۔ اب وہ ہی کام آئیں گے۔“ فری نے مسکرا کر بتایا۔

تاجور کے چہرے کا رنگ لمحے بھر کو بھکا پڑا، اس کے بعد وہ مسکرا دیں۔ دل میں بڑی میٹھی سی لہرا تھی۔

”پھپھو! میں دو منٹ میں آئی۔“ حسہ، پیٹ پکڑ کر بڑی بہن کے کمرے کی جانب دوڑی، اتنی بڑی خوش خبری اس سے اکیلے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

”آخر ہماری محبت کی جیت ہو گئی ناں۔“ ناموں کے گھر کے آگے گاڑی کھڑی کرنے کے بعد افق نے ایک طویل انگڑائی لے کر سو جا۔ قسمت نے اس کی ”وقت“ سب پر ظاہر کر دی تھی۔ وہ مکمل ہو گیا تھا۔ محبت پالینے کی خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

”آہ..... ہاں۔“ تاجور نے آہ بھری اور بھگی ہوئی نظروں سے اسوہ کے کمرے کی طرف دیکھا، جہاں سر شام سے اندھیرا اچھایا ہوا تھا۔

”اب میں اور سب لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ ابھی تو رشتہ ختم ہونے کی بات صرف قریبی لوگوں کو پتا ہے۔“ وہ فکر مندی سے بولے۔

”بھائی، آپ ساری فکروں کو ایک طرف رکھیں اور میری بات سنیں۔ میں آج اپنا دامن پھیلا کر اسوہ کا رشتہ اپنے افق کے لیے مانگنے آئی ہوں۔ شادی اسی تاریخ پر اسی جگہ ہوگی۔ آپ میرے لیے باپ کی جگہ ہیں۔ مجھے ہمیشہ نوازا ہے۔ اس بار بھی ہاں بول کر اسوہ کو میری بہو بنا دیں۔“ فری نے بھائی بھاوج کی جانب دیکھ کر عاجزی سے کہا، اسد اللہ تو جیسے جی اٹھے، ان کا دماغ بھانجے کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔

”ایک بار افق سے بھی پوچھ لو۔ ابھی اسوہ کا رشتہ ختم ہوا ہے۔ وہ جوان لڑکا ہے اسے کوئی اعتراض نہ ہو۔“ اسد اللہ نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔

”بھائی! اللہ کا شکر ادا کریں، جس نے آپ کو اتنی باہمت بیٹی سے نوازا ہے افق کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ سے بات کرنے سے پہلے ہی میری اس سے فون پر طویل بات ہو چکی ہے۔“ فریدہ نے خوشگوار انداز میں بتایا۔ اسد اللہ نے سکون کی سانس لی پھر بیوی کی جانب دیکھا جو خاموشی سے بھائی، بہن کی باتیں سن رہی تھیں۔

”بھابی، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں نعلی پتھر کی لالچ میں اصلی ہیرے کو گوانے کی غلطی سمجھی نہیں کروں گی۔ یہ بھی نہیں سمجھے گا کہ کوئی ترس کھا کر دامن پھیلا رہی ہوں۔ میری شروع سے ہی یہ خواہش رہی کہ اسوہ، افق کی دلہن بنے۔ اب تو آپ لوگوں کی ہاں کا انتظار ہے۔“ فری نے بھائی بھاوج کے گرد بازو پھیلا کر نرمی سے کہا۔ حسہ جو تھوڑی دیر قبل جائے لے کر آئی تھی، اس کے پیر خوشی کے مارے وہیں جم گئے۔

”چلو ٹھیک ہے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ تاجور نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے آگے بڑھ کر نند کو گلے

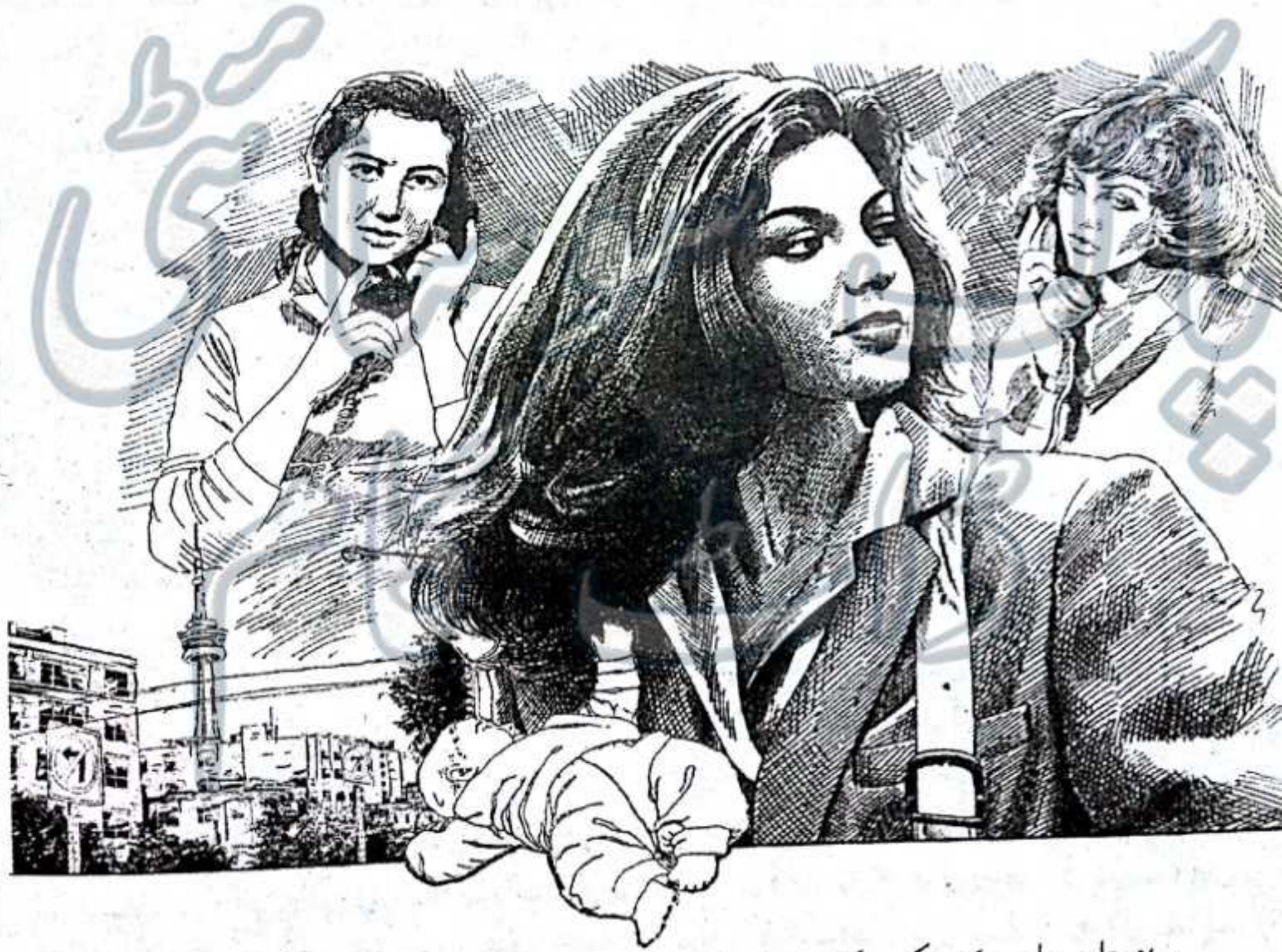




زندگی خاک تھی

شیریں حیدر

چوتھا حصہ



دیا..... میں نے مصطفیٰ کا سراپے سینے سے لگایا اور کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگی۔۔۔ سیٹ بیلٹ باندھنے کے سگنل آن ہو گئے اور سب نے سیٹ بیلٹ باندھنا شروع کر دیں۔ کوئی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہا

جہاز چلتے، چلتے اچانک ہچکولے کھانے لگا۔ پھر یوں لگا کہ بالکل بے وزن ہو گیا اور جانے کتنے ہزار فٹ نیچے چلا گیا..... چیخوں کی آوازیں آئیں اور ہر مسافر نے اپنی، اپنی زبان میں اللہ کو یاد کرنا شروع کر

READING
Section

132 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء



READING
Section

تھا کہ دل کی بے چینی اور بلند فشارِ خون کے باعث فقط اسنے ہی دل کی دھڑکن کانوں کو سنائی دے رہی تھی اور دھڑکنوں میں ہلچل مچی تھی، جانے کون سی گھڑی تھی جو یوں اچانک پروگرام بن گیا تھا۔ کاش میں نے انکار کر دیا ہوتا آنے سے..... موت کا خوف میرے اوپر طاری ہونے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بہنے لگی۔ کیا گھڑی تھی جو میں نے عابد کے بغیر کہیں جانے کا سوچا تھا۔ میرے بغیر عابد کا کیا ہوگا۔ مجھے عابد کی تنہائی کا خیال تڑپانے لگا۔ ماما اور پاپا کی کیا حالت ہوگی اگر میرے اور مصطفیٰ کے ساتھ کچھ ہو گیا تو؟ میں سوچتی جا رہی تھی اور آنسو میری آنکھوں سے تو اتر سے بہ رہے تھے۔

جہاز کا عملہ بھاگ، بھاگ کر مسافروں کو تسلی و تشفی دے رہا تھا۔ شاید کسی مسافر کی طبیعت خراب تھی کیونکہ اعلان کر کے پوچھا گیا تھا کہ اگر جہاز پر کوئی ڈاکٹر ہو تو..... فرسٹ کلاس سے ایک ڈاکٹر ہماری سیٹ کے پاس سے گزر کر پیچھے گیا، مسلسل اعلانات کیے جا رہے تھے کہ انجن میں خرابی کے باعث جہاز کو ایمر جنسی میں لینڈ کرنا پڑے گا۔ ایک قریبی ائر پورٹ کے لیے اجازت طلب کی جا رہی تھی مگر اس ملک سے تعلقات دوستانہ نہ ہونے کے باعث اس کے امکانات کم تھے۔ سفارتی کوششیں یقیناً جاری ہوں گی، جہاز میں مسلسل جھکے لگ رہے تھے، ڈاکٹر میری سیٹ کے پاس سے گزر کر واپس گیا تھا۔ پچھلی سیٹوں سے سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں، ایک دو خواتین کی چیخوں کی بھی..... یقیناً وہ مسافر جانبر نہ ہو سکا تھا۔ آنے والا وقت جانے ہمارے لیے کیا، کیا خبریں لانے والا تھا۔

آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، اس وقت تک جب تک کہ اعلان نہ ہوا کہ قریبی ائر پورٹ پر ہنگامی لینڈنگ کی اجازت مل گئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا..... مصطفیٰ کی طرف دیکھا۔ میں نے اسے منٹوں میں اپنے بیٹے کے لیے جانے کیا، کیا سوچ لیا تھا۔ اس

نے تو ابھی دنیا میں دیکھا ہی کچھ نہ تھا، اس کی محدود سی دنیا تھی جس میں وہ پابندیوں بھری زندگی گزار رہا تھا۔ سکون دل تک اتر گیا تھا۔ جتنی آیات قرآنی یاد تھیں میں زیر لب پڑھنے لگی..... خدا خدا کر کے جہاز انتہائی جھٹکوں بھری لینڈنگ کر کے گرنے کے سے انداز میں اس انجان ائر پورٹ پر اتر گیا، ہمارے جہاز کو ائر پورٹ کی عمارت سے انتہائی دور کھڑا کیا گیا تھا اور ہمیں جہاز سے نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ یقیناً یہ سب کچھ خبروں میں دکھایا جا رہا ہوگا اور عابد دیکھ رہے ہوں گے..... مگر وہاں تو رات کے نصف سے زائد کا وقت ہوگا میں نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر سوچا۔ ماما لوگوں کو تو علم ہی نہ تھا اس لیے۔ اگر وہ خبریں سن بھی رہے ہوں گے تو انہیں کیا علم کہ اس مشکل میں پھنسے جہاز میں ان کی بیٹی اور نواسہ بھی تھے۔

جانے کتنے ہی گھنٹے گزر گئے تھے، جہاز کے لیے کچھ ایندھن دیا گیا تھا غالباً..... جہاز اڑ تو نہیں سکتا تھا مگر جہاز کے اندر درجہ حرارت کو مناسب رکھنے کے لیے اس کا انجن چلتے رہنے کی ضرورت تھی۔ چھوٹے بچے تنگ پڑ گئے تھے اور چیخ چلا رہے تھے، مصطفیٰ بہت خاموش طبع اور صابر بچہ کسی مگر وہ بھی بے چین ہو رہا تھا، میں اسے اپنے فون میں سے تصاویر دکھا کر بہلا رہی تھی۔ اللہ نے ہماری سن لی اور اعلان کیا گیا کہ بوڑھی خواتین اور کم عمر بچوں کے ساتھ ان کی مائیں حوائج ضروریہ کے لیے ائر پورٹ کی عمارت تک جا سکتی تھیں..... میں بھی اپنا بیگ اٹھا کر چل دی، اس کے علاوہ ہمیں کچھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ائر پورٹ کے کسی غسل خانے میں مصطفیٰ کو نہلا لیتی تاکہ ذرا اس کی تھکاوٹ اتر جاتی مگر ناچار اسی طرح چل دی۔

جہاز کے باہر سیرمی لگا دی گئی تھی اور اس کے اختتام پر ایک بس کھڑی تھی، ہم لگ بھگ تیس چالیس عورتیں تھیں جو جہاز سے اتری تھیں، چند ایک نے نہ اترنے کو ترجیح دی تھی، غالباً ان کے بچے ان سے

اور باہر جانے پر پابندی..... اس سارے عمل میں چوبیس گھنٹے بھی لگ سکتے تھے اس لیے لوگوں کو صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کو کہا جا رہا تھا اور بتایا گیا کہ کوششیں جاری تھیں کہ جہاز کی مرمت کے دوران سب مسافروں کو ائر پورٹ پر اترنے کی اجازت دی جائے تاکہ لوگ چل پھر سکیں، ہاتھ روم استعمال کر سکیں اور ممکن ہو تو کچھ کھانی لیں..... انتہائی تشویش ناک حالات تھے مگر کم از کم ہم سب زندہ بچ گئے تھے..... میں نے تصویر کاروشن پہلو دیکھا، کاش سب لوگ اس طرح سوچیں تو ان کی بے چینی دور ہو جائے۔ یہ کیا اللہ کا کم احسان تھا ہم سب پر کہ اس نے ہم سے زندگی جیسی نعمت نہ چھینی تھی۔ جس طرح جہاز فضاؤں میں بے وزن ڈول رہا تھا اس سے تو اس کے بچ جانے کے امکانات کم، کم تھے..... اللہ تیرا لاکھ، لاکھ شکر ہے۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔

مما کیا کر رہی ہوں گی..... میں نے سوچا۔ صدف بھی پہنچ گئی ہوگی..... باہر رات کی تاریکی پھیل رہی تھی۔

☆☆☆

اس نے میری طرف دیکھ کر سیٹی کے انداز میں منہ سیڑھا تو میں نے ایک ادائے بے نیازی سے شانہ اچکایا۔ اس نے جراثیم کے میرے ہاتھ کی پشت کو اپنی انگلی کی پور سے ہولے سے یوں چھوا جیسے ایسا حادثاتی طور پر ہوا ہو، اس پر بجائے اسے ڈانٹ دینے کے..... میں مسکرا دی تھی، ابرو اچکا کر میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا، اس کی مسکراہٹ نے میرے حسن کی تعریف کی..... سر کو جھٹک کر میں نے اسے جتلا دیا تھا کہ میں اپنے حسن کی طاقت سے آشنا تھی، وہ کرن کا منگیتر تھا، کرن نے اپنی منگنی کی ٹریٹ دی تھی، آکس کریم پارلر میں بیٹھے، بیٹھے ہی اس نے کال کر کے اپنے منگیتر کو بھی بلا لیا تھا..... ان دونوں کا دھماکے دار عشق ہم سب سے کہاں چھپا تھا، کرن کے والدین نے انکار کیا تو اس نے دھمکی دی کہ وہ خودکشی کر لے گی

اکیسے سنبھالے نہ جاتے تھے اور اجازت ہر بچے کے ساتھ صرف اس کی ماں کو ملی تھی، کسی مرد کو جہاز سے اترنے کی اجازت نہیں تھی..... پرواز بھی پاکستانیوں سے بھری ہوئی ہو اور ”نیک نامی“ تو ہماری ہے ہی دنیا بھر میں اسی لیے تو..... یہ بھی شکر تھا کہ یہ ایک غیر ملکی ائر لائن کی پرواز تھی تو کسی اور ملک میں اترنے کی اجازت مل گئی تھی ورنہ ہماری قومی ائر لائن ہوتی تو جہاز فضاؤں میں ہی پھٹ جاتا مگر اسے زمین پر نہ اترنے دیا جاتا۔

کوئی غلیظ سا غلیظ ائر پورٹ تھا۔ مجھے تو اپنے ملک کے ائر پورٹ بھی اس کے مقابلے میں بہت اچھے لگنے لگے۔ لاؤنج میں ایک علاقہ محدود کر کے اس کے گرد جنگلوں کی حفاظتی دیوار بنائی گئی تھی۔ درمیان میں بیچ تھے اور دیوار کے ساتھ ساتھ ائر پورٹ سیکورٹی کے اسلحہ بردار درجنوں افراد..... ہم بھلا کیا کر لیتے۔ مگر ان کا اپنا نظام اور اپنے طریقے تھے۔ شکر کیا کہ کم از کم جہاز کی ان تنگ نشستوں سے کم از کم کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر نجات ملی تھی۔ ہم نے باری، باری غسل خانے استعمال کیے۔ بچوں کے بعد خواتین بھی ہاتھ روم استعمال کر چکیں تو ہمیں اسی طرح حفاظتی حصار میں اور قطار بنوا کر واپس جہاز کی طرف لایا گیا۔ گھنٹوں کے انتظار کے بعد کمک کے طور پر چپس اور جوس کے چھوٹے پیکٹ جہاز میں بھجوائے گئے جو کہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھے مگر اسے قبول کرنے کے سوا چارہ کوئی نہ تھا۔

اعلان کیا گیا کہ کسی قریبی ملک سے کوئی پرواز ہمارے جہاز کے انجن کے لیے مطلوبہ پرزہ لے کر روانہ ہو چکی تھی، اس کے آنے کے بعد جہاز کا پرزہ تبدیل کیا جائے گا اور اس کے بعد جہاز اڑنے کے قابل ہو سکے گا.....

”کیا؟“ لوگوں کی اس اعلان پر چینیں نکل گئیں۔ ”کیا ہم اس وقت تک اس جہاز میں اسی طرح محبوس رہیں گے۔ تنگ تنگ سیٹیں، گھٹی سی فضا

مگر کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔
اس کے والدین اسے اپنے خاندان میں بیاہنا چاہتے تھے، انہیں تو علم ہی نہ ہوا کہ ان کی ذہن اور خوب صورت بٹی، گھر سے حصولِ تعلیم کے لیے جانے والی..... کب عشق و محبت کے کھیل میں شریک ہو گئی، کب اپنے دل کے ہاتھوں اس حد تک بے قابو ہو گئی..... وہ بھی اس لڑکے کے ساتھ جس کی شہرت کچھ انہیں اچھی نہ ملی تھی مگر کرن کے سر پر سوار بھوت نہ اتر سکا اور یوں اس کے مجبور کرنے پر کرن کے ماں پاپا نے ان دونوں کی منگنی کر دی ہمارے امتحانات چل رہے تھے پھر چھٹیاں ہو گئیں اور یوں چھ ماہ کے بعد وہ دن آیا تھا کہ ہمیں کرن ٹریٹ دے رہی تھی۔ ان چھ ماہ میں ہر روز کرن کال کر کے مجھے اس کی دیوانگی کے قصے سناتی، اس کی فرزانگی کی کہانیاں مجھے گھنٹوں سننا پڑتیں، کوئی لڑکا آج کے دور میں اس طرح دیوانہ بھی ہو سکتا ہے؟ میں سوچا کرتی..... کیا یہ وہی تھا جو اس لمحے سے قبل کرن پر مرتا تھا..... میں آئس کریم پارلر میں پاگلوں کی طرح اس کا چہرہ دیکھ کر کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے اپنی محویت میں اندازہ بھی نہ ہوا کہ کوئی اور مجھے یوں دیکھ کر کیا سوچے گا۔ اس وقت چونکی جب میرے ہاتھ کی پشت کو اس کی انگلی نے چھوا۔ اشاروں ہی اشاروں میں گفتگو ہوئی۔

”تم پہلے نظر آ جاتیں تو کرن تو مجھے نظر بھی نہ آتی.....“ اس نے کہا تھا۔ ”تمہارا حسن تو جادوئی ہے!“
”اچھا.....“ میں ہنسی تھی۔ ”باتوں کے تم بادشاہ ہو!“
”تم نے ہی کوئی سحر پھونکا ہے جو میں ایسی باتیں کرنے لگا ہوں۔“
”ایسی باتیں تم نے کرن سے بھی بہت کی ہیں پچھلے ایک برس میں۔“
”کہاناں تمہیں کہ تم پہلے مل جاتیں تو وہ نظر بھی نہ آتی مجھے.....“

”پر وہ تمہیں ملی کہاں؟“ یہ وہ سوال تھا جو مجھے کرن سے پوچھنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ مجھے اس کے منگیتر سے اتنی دلچسپی کیوں ہو رہی تھی۔ کرن خوب صورت اور ذہین تھی، اچھے خاندان سے تھی اور اس کے خاندان میں سے ہی کئی لوگ اس کے رشتے کے لیے خواہاں تھے..... یہ سب کرن نے مجھے خود بتایا تھا۔ مگر اس کی اور دانیال کی ملاقات کہاں ہوئی۔ یہ اس نے نہیں بتایا تھا۔

”ہم ایک حادثے کے نتیجے میں ملے تھے.....“
دانیال نے مسکرا کر بتایا۔ ”میرے ایک دوست کی بائیک کو کرن کی گاڑی نے ٹکر مار دی تھی، میرے دوست نے مجھے اپنی مدد کے لیے بلایا کیونکہ وہ زخمی ہوا تھا، گیا میں اس کی مدد کو تھا کہ وہ زخمی تھا..... مگر میں تو قتل ہی ہو گیا۔“ وہ ہنسا..... میں اس کی کیفیت کو سمجھ سکتی تھی۔ کرن کے حسن کے ساتھ سادگی کا تڑکا تھا، اپنے حسن سے بے خبری تھی، اسے اپنے حسن کی طاقت کو استعمال کرنا نہیں آتا تھا اس لیے اس میں دھیما پن تھا..... اس کے برعکس مجھے علم تھا کہ حسن کی طاقت کیا ہے اور اس سے جلا کر بھسم کیسے کیا جاتا ہے، میرا حسن تخریب کاری کی طاقت رکھتا تھا کیونکہ میں ایسی ہی تھی، بے باک اور خطرناک کھیل کھیلتے ہوئے خوفزدہ نہ ہونے والی۔

اسی لیے دانیال سے پہلی ملاقات میں مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کرن کے لیے نہیں، میرے لیے بنا

”آپ کی آئس کریم ٹھنڈی ہو رہی ہے.....“
”مس؟“ اس نے مجھے خواب سے جگا دیا۔
”حنا.....“ میں نے اسی گم خیالی میں کہا۔
”خوش رنگ حنا.....“ اس نے ہولے سے مسکرا کر کہا تھا۔ میں آئس کریم کی طرف متوجہ ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔
”کرن میں ایسا کیا ہے جو اسے بھایا ہے..... کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟ ہاں، کرن ہے تو خوب صورت..... حسین کہیں مجھ سے زیادہ مگر..... دانیال جیسا اسماٹ اور چاہنے والا اسے ہی کیوں ملا، مجھے کیوں نہیں.....؟“ میں سوچ رہی تھی۔

”آپ کی آئس کریم ٹھنڈی ہو رہی ہے.....“
”مس؟“ اس نے مجھے خواب سے جگا دیا۔
”حنا.....“ میں نے اسی گم خیالی میں کہا۔
”خوش رنگ حنا.....“ اس نے ہولے سے مسکرا کر کہا تھا۔ میں آئس کریم کی طرف متوجہ ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

”کرن میں ایسا کیا ہے جو اسے بھایا ہے..... کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟ ہاں، کرن ہے تو خوب صورت..... حسین کہیں مجھ سے زیادہ مگر..... دانیال جیسا اسماٹ اور چاہنے والا اسے ہی کیوں ملا، مجھے کیوں نہیں.....؟“ میں سوچ رہی تھی۔

کہہ رہا ہے..... اسے کوئی اور حسین مل گئی تو وہ اس سے بھی ایسی باتیں کرے گا، تم اسے واپس مجھے مت لوٹاؤ حنا..... مگر اپنی راہ بدل لو۔ مجھے دوستی پر اعتبار رہنے دو..... وہ ہم دونوں کے بیچ آ گیا ہے تو اسے نکال دو۔ ہماری پندرہ سال کی دوستی اس کی چند مہینوں کی رفاقت سے ٹوٹ رہی ہے..... وہ کسی ایک کا ہو کر رہنے والا نہیں ہے حنا..... میری مان لو!

”کرن..... اگر میں کہوں کہ تم میرے اور دانیال کے بیچ میں آ رہی ہو تو؟“ میں نے غصے سے ابرو اچکائے تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ”جس کے حسن میں طاقت ہے وہی جیتتا ہے، دانیال کا میری طرف متوجہ ہو جانا اور مجھے تم سے زیادہ چاہنا..... یہ سب میں نے تو نہیں کیا۔“

”یہ لو.....“ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی سے انگلی اتاری اور میری طرف بڑھائی۔

”مجھے کیوں دے رہی ہو یہ انگلی.....“ میں نے رخ پھیرا۔ ”کیا میں تمہاری اتاری ہوئی انگلی پہنوں گی؟“ میں اس وقت خود غرضی کی انتہا پر تھی۔

”تمہیں وقت بتائے گا حنا..... جو کسی سے چھین کر کھاتا ہے اسے عمر بھر سکون نصیب نہیں ہوتا۔“

”بند کرو یہ سب فضولیات کرن! کیا چھین کر کھایا ہے میں نے تم سے جو تم مجھے بددعا میں دے رہی ہو؟“

”میں نے تمہیں کوئی بددعا نہیں دی ہے حنا ابھی تک.....“ اس نے کمال تحمل سے کہا، اس کی آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ ”بس یہ دعا ہے کہ دانیال کی یہ عادت برقرار رہے..... وہ جو حسین چہرہ دیکھے، اس کی طرف لپکے تب تمہیں احساس ہوگا کہ حسن کی طاقت کتنی عارضی ہے.....“

”جسٹ شٹ اپ.....“ میں نے دانت پیس کر کہا تھا، وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس وقت مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ میں ایک اچھی دوست کو کھورہی تھی، اس سراب کے پیچھے بھاگتے ہوئے جس کے ساتھ زندگی

تھا، اسی لیے میں نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی..... اس نے ایک انگلی کا اشارہ کیا تھا، میں نے اس کا پہنچا تھا م لیا اور اس کے ساتھ آنکھیں بند کیے اس راہ پر بگٹ بھاگ رہی تھی جس کے دوسرے سرے پر کرن اسی طرح بے خبر دانیال کو چاہے جا رہی تھی، پھر وہ دن آ گیا۔ جب وہ میرے گھٹنے پکڑے رو رہی تھی اور میری منتیں کر رہی تھی اس وقت بھی میں کسی اور گمان میں تھی.....

”ایک بار حنا جانی..... فقط ایک بار کہہ دو کہ دانیال کا خیال غلط ہے..... وہ جھوٹ کہتا ہے کہ تم بھی اسے چاہتی ہو..... وہ کہتا ہے کہ تم نے آگے بڑھنے میں اس کی حوصلہ افزائی کی ہے..... ایک بار کہہ دو کہ وہ سب کچھ جھوٹ کہتا ہے۔“ میں نے جن خاموش نظروں سے اسے دیکھا تھا وہ اس کے قتل کے مترادف تھیں۔

”میں نہیں مان سکتی حنا کہ تم ایسی کٹھور ہو سکتی ہو۔ میری سال بھر کی منگنی ٹوٹ رہی ہے..... ساری دنیا جانتی ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور میں نے سب سے ٹکر لے کر اسے حاصل کیا تھا..... میرے پیچھے تین اور جوان بہنیں ہیں۔ یوں بے وجہ میری منگنی ٹوٹنے سے نہ صرف میری زندگی پر اثر پڑے گا بلکہ میری بہنوں کے لیے آنے والے رشتے..... پہلے میری منگنی ٹوٹنے کا سبب پوچھیں گے، خدا را حنا..... نہ کرو یہ سب.....“ وہ میری منتیں یوں کر رہی تھی جیسے مجھے اپنے یا دانیال کے دل پر اختیار تھا کچھ۔

”مجھے کیا کہہ رہی ہو کرن..... دانیال سے بات کرو۔“ میں نے بے پروائی سے کہا تھا۔

”اس سے بات کی تھی حنا..... وہ کہتا ہے کہ تم سے بات کروں..... مجھ پر ایسا ظلم تم دونوں مل کر مت کرو۔“

”دل پر کس کو اختیار ہوتا ہے کرن جان.....“

”جب وہ میرے ساتھ ایسی باتیں کرتا تھا تو میں ہواؤں میں اڑتی تھی، اب وہ بھی باتیں تم سے

ان کی ایک جھلک دیکھنے پر مجھے نظر آئی تھی اور یوں بھی حالہ کے بارے میں ماما کبھی منفی سوچ ہی نہیں سکتی تھیں تو میں جو بھی بتاتی خواہ وہ حقیقت ہوتی یا افسانہ..... انہیں یقین ہی کہاں آتا تھا۔ یوں بھی ان کے جس عیب کو اللہ تعالیٰ نے عمر بھر ڈھکے رکھا تھا، پاپا کے جس راز کو ماما پر آشکار نہ کیا تھا، اسے آشکار کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ پہلے ہی ماما جانے کس بات کے نتیجے میں پاپا سے خلع لینے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ ابھی تک تو یہ بھی راز تھا، ماما کو پاپا کے بارے میں کئی ایسی باتوں کو علم رہا ہوگا جن کی بنیاد پر وہ کسی بھی وقت یہ فیصلہ کر سکتی تھیں مگر اب یقیناً کچھ ایسا ہوا تھا جو ان کی برداشت کی حدود کو توڑ گیا تھا۔

”تمہیں اس نے خاص طور پر ملنے کے لیے بلوایا تھا فاطش.....؟“ ماما کے لہجے میں آنسو تھے۔
 ”وہ اکیلا محسوس کر رہی تھیں ماما.....“ میں نے بات بنائی۔ ”میرے ساتھ تو ان کا بچپن سے پیار ہے۔ آپ کو معلوم ہے ان کے اپنے بچے نہیں ہوئے تو ان کی ساری ممتا میرے لیے تھی.....“ میرے آنسو بھل بھل بہنے لگے، مجھے ایک دم سے محسوس ہوا کہ میں جو کچھ کہہ رہی تھی اس میں کچھ جھوٹ نہ تھا۔ وہ واقعی مجھے اتنا ہی چاہتی تھیں..... میں نے تو انہیں بچپن سے اپنے پاپا کے ساتھ یوں دیکھ لیا کہ عمر بھر اس واقعے کی یاد کو بھلا نہ سکی مگر مجھے اس واقعے کے پس منظر کا علم نہ تھا..... سات سال کی بچی کیا ہوتی ہے..... میں ان کی بے بسی، ان کی تکلیف اور اس چھوٹی سی عمر میں ان کی ذہنی اذیت کو سوچ کر ہچکیوں سے رونے لگی..... ماما نے میرا سر اپنے ساتھ لگا لیا۔

”چلو گی میرے ساتھ ملتان تم؟“ ماما نے پوچھا۔
 ”یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے ماما.....“ میں نے آنسو اپنے ہاتھ کی پشت سے پونچھے۔

”میں نے سوچا..... شام کو ہی تو واپس پہنچی ہو۔“
 ”کون، کون جا رہا ہے؟“ میں نے اٹھ کر اسود کو اٹھالیا جو نیند سے جاگ کر اپنی ماں کو روتے ہوئے

گزارنے میں جانے لیا، کیا عذاب سہنا تھے مجھے۔
 دانیال دیوانگی کی حدوں کو پھوڑ رہا تھا، یا گل ہو رہا تھا مجھے پانے کے لیے..... میرے ماں باپ کو اس کی دیوانگی سے خوف آتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ عارضی نشہ ہے اور جلد اتر جائے گا مگر مجھے یقین تھا اس پر تو کسی اور کی کیا چلتی۔ ماں باپ کو ہم پر بے پناہ اعتماد تھا اور ہماری زندگیوں کا کوئی فیصلہ وہ ہم سے پوچھے بغیر نہیں کرتے تھے۔ دانیال کے بارے میں انہوں نے مجھے اپنے خدشات سے آگاہ کیا اور میں نے ان کے ہر خدشے کو جھٹلا دیا۔ ان کے ساتھ دلائل میں، میں تلخ بھی ہو گئی مگر اس وقت مجھے ان سب باتوں کی کوئی پروا نہ تھی۔ میں نے لڑ جھگڑ کر، کتنے ہی لوگوں کو ناراض کر کے دانیال کو جیت لیا تھا اور اس جیت کے نشے میں سرشار دن رات گزر رہے تھے۔ وہ صرف پُرکشش اور اسماٹ مرد ہی نہیں..... ایک کامیاب کاروباری بھی تھا اور میں زندگی میں ہر اس خوشی کی مستحق ٹھہری جس کے کوئی عورت خواب دیکھ سکتی ہے مگر کب تک؟ مجھے یہ خوشیاں کسی اور کی خوشیوں کے مزار پر بیٹھ کر ملی تھیں۔ شاید میں کسی کی بد دعاؤں کے حصار میں تھی مگر پھر بھی ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

میں اس وقت جن ہواؤں میں تھی..... ان ہواؤں میں مجھ جیسی کم عقل لڑکیاں یونہی اڑتی ہیں، میں اس وقت کسی اور زعم میں تھی، کسی اور نشے میں تھی، جانتی تھی کہ میرا حسن کائنات کو سر کرنے کی طاقت رکھتا ہے..... دھیمی، دھیمی آنچ سلگانے والا نہیں، آگ لگانے والا حسن ہے مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ حسن کی طاقت بہت عارضی ہے یہ نہیں سمجھتی تھی کہ جس حسن پر وہ مرنا ہے وہ حسن کسی اور کے پاس ہوگا تو اس کا لالچی من پھر لپچا جائے گا۔ اس وقت میں انتہا کی خود غرض جو بن گئی تھی۔

☆☆☆

”مجھے کچھ علم نہیں ماما کہ حالہ نے ایسا کیوں کیا؟“
 میں نے پاپا کے چہرے پر لکھی وہ التجا پڑھ لی تھی جو

READING
Section

138 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015

نظر نہ آ رہا تھا، پاپا کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا، جانے وہ اس گلی میں کتنی بار آئے ہوں گے..... آج وہ اس چہرے کو کس منہ سے دیکھ سکیں گے جس چہرے کی معصومیت انہوں نے سات برس کی عمر میں چھین لی تھی..... اس وجود کو کندھا دے پائیں گے جسے وہ عمر بھر پامال کرتے رہے تھے؟ میں ان کے بے تاثر چہرے کو دیکھ رہی تھی، دانت پر دانت جمائے تمام راستہ وہ تقریباً خاموش ہی رہے تھے۔ وہ جسے دوسروں کے سامنے بیٹی کہتے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹی کے رشتے کو کس طرح پامال کیا..... خالہ نے مجھے کہا تھا کہ انہوں نے انتقام میں ایسا کیا..... کس سے انتقام لیا آپ نے خالہ؟ خود کو ہی تباہ کیا ناں آپ نے..... آپ کی بے وفائی نے آپ کے شوہر کی جان لے لی اور آپ کے ضمیر کے بوجھ نے آپ کو جینے نہ دیا..... جانے کیسے میں گاڑی کے رکے ہی بھاگ کر باہر نکلی، مردوں کے بیچ میں سے راستہ بناتے ہوئے اندر پہنچی۔ برآمدے سے مجھے عین صحن کے وسط میں چار پائی نظر آئی۔

”خالہ.....“ میں وہیں سے چیخ، چیخ کر رونے لگی۔

☆☆☆

”چند دن قبل تم نے مجھ سے کچھ مانگا تھا ناں نیل.....“ عمر پوچھ رہے تھے اور مجھے کچھ یاد نہ آ رہا تھا کہ میں نے ایسا کیا مانگا تھا۔ ”مجھے تمہارے بیچ پر بھی شک ہوا تھا اور تمہاری نیت پر بھی.....“

”کوئی بات نہیں عمر..... ہو جاتا ہے ایسا میاں بیوی کے بیچ..... بلکہ ہر رشتے کے بیچ۔“ میں سمجھ گئی تھی کہ ان کا اشارہ بلی اور نیل کے رشتے کی طرف تھا اور میری طرف سے یہ کہنا کہ بلی کی بھی مرضی اس رشتے میں شامل تھی، اس سے ان کے پندار کو ٹھیس پہنچی تھی مگر اب وہ بلی کا مسکراتا اور مطمئن چہرہ دیکھتے تو انہیں یقین آ گیا تھا کہ میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔

”اب میں تم سے شرمندہ ہوں نیلیم..... تم بلی کے لیے ماں بن کر سوچتی ہو اور میں سمجھتا رہا کہ تم.....“

دیکھ کر منہ بسور رہا تھا۔
”سبھی کو جانا ہوگا!“ ممانے کہا۔

”میں سوچ رہی تھی کہ صرف میں اور آپ جاتے..... اسود کو گھر پر چھوڑ دیتے ہیں..... صدف ہے؛ پاپا ہیں۔ میں اور آپ جا کر دو دن میں لوٹ آئیں گے.....“ دل میں خیال آیا کہ خالہ نے خودکشی کی ہے، کہیں وہ کوئی خط و طہ نہ لکھ کر چھوڑ گئی ہوں، اس میں اپنے اور پاپا کے بارے میں کچھ الا بلا لکھ دیا ہو تو پاپا کیا منہ دکھائیں گے لوگوں کو؟ پاپا سے بھی بڑھ کر مجھے فکر تھی کہ ماما کو جب یہ صدمہ پہنچے گا تو کیا وہ سہار پائیں گی؟ کوئی پاپا کا گریبان تھام لے تو.....؟ میں نے بھی اشعر کی بے وفائی سہی تھی اور جانتی تھی کہ ماما کے لیے پاپا کی ساری بے وفائیاں ایک طرف اور خالہ کے ساتھ جو کچھ ہوا..... وہ سب پر بھاری ہو گا شاید تابوت کی آخری کیل ثابت ہو..... ماما مرتے دم تک خود کو اپنی بہن کا مجرم سمجھتی رہیں گی۔

”کیا بات کر رہی ہو بیٹا..... دانیال کس طرح رکیں گے..... جانتی نہیں ہو کہ تانیہ ان کی پانچویں بیٹی جیسی تھی.....“ ماما سکیں تو میرے دل سے خون کے آنسو بہنے لگے..... کیا کوئی باپ ایسا کر سکتا ہے اپنی بیٹی کے ساتھ؟

”مگر ماما!“ میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کسی طرح پاپا نہ جائیں، کیا معلوم وہ نادیہ، خالو کی بیٹی، جو سب کچھ جانتی تھی۔ وہ سب کے بیچ کوئی ایسی بات کہہ دے..... پھر تو ماما کو بھی نہیں جانا چاہیے۔ مگر.....

..... ایسا کیسے ممکن تھا کہ میرے کہنے سے وہ خود رکتیں یا پاپا کو رکنے دیتیں۔ اسود، صدف کے پاس ہرگز نہ رکتا کہ وہ اس سے مانوس نہ تھا سوا سے بھی ساتھ لے جانا پڑا۔ تمام راستے ماما کی آنکھوں سے آنسو بار بار بند توڑ کر بہنے لگتے اور میں ممکنات کے خوف میں جتلا رہی۔

گاڑی خالہ کے گھر کی طرف مڑی، پاپا گاڑی چلا رہے تھے..... پوری گلی میں سوائے مردوں کے کچھ

کچھ اور بھی پوچھ رہے تھے..... کچھ کہہ رہے تھے مگر میری حسیں سوچلی تھیں۔ میرے فون پر پیغام کی کھنٹی بجی تھی مگر مجھ میں فون اٹھا کر دیکھنے کی سکت بھی نہ تھی۔

”نیل..... جانِ عمر!“ میں نے عمر کی آواز کسی کنویں میں سے آتے ہوئے محسوس کی۔

”ہوں.....“ میں نے نیند کے عالم میں کہا تھا۔

”تمہارے لیے تمہاری ماما کا پیغام آیا ہے.....“

عمر نے کہا تھا اور میں غالباً خراٹے لے رہی تھی۔

☆☆☆

”تم میرے ساتھ کس بات پر ناخوش ہو

صدف؟“ احمد مجھ سے پوچھ رہا تھا اور میں ابھی،

ابھی سی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”میں نے کب کہا کہ میں ناخوش ہوں احمد؟“

”تم روز رات کو سوتے میں بڑبڑاتی ہو کہ تم مجھ

سے خوش نہیں ہو..... غالباً خلع کا فیصلہ کر لیا ہے تم نے۔“

”اوہو.....“ میں نے تاسف سے کہا۔ ”مجھے

تو علم نہیں کہ میں رات کو سوتے میں کیا بڑبڑاتی ہوں

اور کیوں؟“

”کوئی ابجھن ہے تمہارے ذہن میں صدف تو

تم مجھ سے شیز کیوں نہیں کرتیں؟“ احمد میرا ہاتھ

تھامے نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

”ابجھن کیا ہوگی بھلا.....؟“ میں نے کھوئے،

کھوئے لہجے میں کہا۔

”کچھ تو ہے ورنہ تمہاری عمر ایسی تو نہیں کہ یوں

اچانک تمہارا زروس بریک ڈاؤن ہو جاتا.....“

”میرے اختیار میں تو نہیں احمد کہ خود کو زروس

بریک ڈاؤن ہونے سے بچا سکوں یا سوتے میں نہ

بولوں..... یہ سب تو بے اختیاری کے کام ہیں

ڈیر.....“ میں نے اپنے ان اعمال کا دفاع کیا جو

انجانے میں سرزد ہو رہے تھے مگر حقیقت تو یہ تھی کہ ان

کی بنیادی وجہ سے میں آگاہ تھی، یہ اور بات کہ اپنا مان

توڑنا نہیں چاہتی تھی..... اپنے ماں باپ کی عزت پر

حرف نہ آنے دینا چاہتی تھی۔

”ارے کیا ہو گیا، کس بات پر شرمندہ ہیں

آپ؟“ میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔

”میں نے اسی خدشے کے تحت تمہیں عمر بھر

محروم رکھا نیل.....“ ان کی آنکھوں میں کوئی ستارہ

چمکا تھا۔ ”مجھے ناہید آپنی نے بتا دیا ہے جو باتیں ان

کے اور اماں کے مابین ہوئیں اور انہیں غالب گمان

ہے کہ تم نے وہ باتیں سن لیں.....“ میرے اندر سے

درد اٹھا۔

”کوئی بات نہیں عمر.....“ میں نے جی کڑا کر

کے کہا۔ ”انسان کو زندگی میں ہر حقیقت کا کبھی نہ کبھی

سامنا کرنا ہی پڑتا ہے.....“

”میں خود کو کس قدر بے وقوف سمجھ رہا ہوں۔ تم

سوچ بھی نہیں سکتیں نیل.....“ عمر کی آواز بھرا گئی۔

”کئی بار سوچا کہ میرے اور تمہارے بچے ہوں مگر اماں

سے کیا گیا عہد..... کیوں کیا میں نے ایسا غیر فطری

وعدہ ان سے اور کیا نبھانا اتنا ضروری تھا، تمہارا اپنے

بچوں سے عمتا بھرا برتاؤ دیکھ کر بھی سوچا نہیں کہ تمہارا

دل کتنا بڑا ہے.....“

”ان باتوں کو ہم کسی اور وقت کے لیے اٹھا

رکھتے ہیں، مجھے نیند آرہی ہے اس وقت۔“ میں دوا

کے زیر اثر تھی اور سونا چاہ رہی تھی۔

”ابھی بات کرنا بہت ضروری ہے نیل..... پہلے

ہی بہت اہم وقت ضائع ہو چکا ہے.....“

”پلیز عمر.....“ میں نیم غنودگی میں تھی۔

”کیا تم ماں بننا چاہتی ہو نیل؟“ اس نے

سوال کیا۔

”وہ تو میں ہوں.....“ میں نے نیم خوابیدہ لہجے

میں کہا۔

”اپنے بچوں کی؟“ عمر نے سرگوشی کی۔

”میرے ہی ہیں وہ بچے.....“ میں ہولے سے

بڑبڑائی۔

”میرے اور تمہارے اپنے بچے نیل

جان!“ میں جواب دینے کے بجائے اونگھ رہی تھی، وہ

”پھر بھی کچھ تو ایسا ہوا ہوگا جان..... کوئی وجہ، کوئی واقعہ کوئی حادثہ..... کسی پرانے واقعے کی یاد..... کسی نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو جس کے باعث.....“ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا..... احمد کیا سوچ رہا تھا، مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ سچ کو چھپانے کے لیے..... جس لاعلمی کے پردے میں ڈال رہی تھی وہ میرے شوہر کو کسی اور شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ احمد اب میرا وہ کزن نہیں تھا جس کے ساتھ میں بچپن سے ہی ہر چھوٹی بڑی بات شیر کر لیتی تھی، نہ ہی وہ منگیتر کہ جسے دنیا میں سب سے پہلے میری خوشی کا خیال ہوتا اور وہ میرے لیے ہر کسی سے لڑائی مول لے لیتا تھا۔ میاں بیوی کے رشتے میں بندھ کر میری طرف سے ذرا سا تکلف در آیا تھا، میں اسے احترام دینے کی کوشش کرتی کیونکہ اب وہ میرا شوہر تھا۔ بچپن سے ہی جس تو تراخ کی عادت تھی اس سے چھٹکارا پانا کافی مشکل کام تھا مگر احمد تو ویسا ہی تھا، اسی طرح میرا خیال رکھتا بلکہ اب تو اور بھی چاہتا تھا۔ میری چھوٹی سے چھوٹی خوشی کے لیے، وہ خود کو بڑی بڑی مشکل میں ڈال لیتا..... یوں کسی بھی بیوی کی طرف سے اس طرح کی ذہنی بیماری میں مبتلا ہونا کسی بھی شوہر کو شک میں ڈال سکتا ہے۔

”بتاؤ گی نہیں مجھے، کیا بات تمہیں اتنا پریشان کرتی ہے کہ احمد کا پیار اور توجہ بھی اس کے سامنے بیچ ہو جاتے ہیں؟“ اس نے اپنے بازو میرے گرد لپیٹے۔

”احمد.....“ میں سسک پڑی، اس کی ہمدردی پا کر میں بکھر گئی اور احمد کے شانے پر سر رکھ کر اسے اپنا مسئلہ بتانے لگی۔ ماما کا پیغام..... اس سے منسلک اپنے خدشات۔ ماما سے پاکستان آ کر جو میری ایک دفعہ اس موضوع پر مختصر بات ہوئی تھی، سب کہہ سنایا۔

”ہوں..... تو تم نے اس بات کو اپنے سر پر سوار کر لیا ہے؟“ احمد کے لہجے میں کوئی تاثر نہ تھا۔

”تو کیا یہ ایسی بات نہیں کہ اسے سر پر سوار کیا جائے..... کیا تمہیں یہ سب سن کر حیرت نہیں

”نہیں کوئی زیادہ نہیں!“ اس نے کمال بے نیازی سے کہا۔

”یعنی ماما..... پاپا پر بے وفائی کا الزام لگا رہی ہیں..... ان سے خلع حاصل کرنے کا سوچ رہی ہیں اور اس کے لیے یہ جواز پیش کر رہی ہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں.....؟“

”مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی ڈیر.....“ اس نے مسکرا کر کہا، وہ مسکراہٹ جو مجھے زہر لگ رہی تھی۔

”اس دنیا میں یہ سب اور اس سے زیادہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔“

”لیکن یہ سب کچھ میرے ماما اور پاپا کے بیچ ہونا..... ناممکن ہے۔“ میں نے احتجاج کیا۔

”کیوں؟“ اس نے زور دے کر کہا۔ ”وہ دونوں کیا اس دنیا کی مخلوق نہیں ہیں؟“

”ہیں مگر..... تم سنو تو سہی احمد کہ ماما، پاپا پر کس کس طرح کے شک کرتی ہیں۔“

”میں جانتا ہوں یہ.....“

”کیا.....“ میں چلائی۔ ”تمہیں یہ سب ممانے خود بتایا ہے؟“

”آہستہ بولو.....“ احمد نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ”سب لوگ سو رہے ہیں، کوئی جاگ کر آ کر پوچھے گا تو کیا سب بتاؤ گی؟“

”بتاؤ ناں احمد.....“ میں ضدی بچے کی طرح مچلنے لگی۔ ”ماما نے خود بتایا ہے تمہیں اس بارے میں؟“

”نہیں..... ممانی نے مجھے نہیں بتایا.....“ وہ رکا، میں نے سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ ”ممانی کو میں نے بتایا ہے یہ سب کچھ۔“

”کیا؟“ میں روکتے، روکتے بھی ایک بار پھر چلا دی۔ ”کیا بتایا تم نے ماما کو؟“

”کہ ماموں کیا کرتے پھر رہے ہیں، ان کے ساتھ کس طرح دھوکا کر رہے ہیں۔“

”کیوں تم نے یوں جھوٹے سچے واقعات ماما کو

میں سو رہی تھی اور جانے کس وقت ماما کا پیغام آیا تھا کہ خالہ نے خودکشی کر لی تھی، جانے اب یہ پیغام عمر نے پڑھا تھا کہ نہیں..... کیونکہ مجھے یاد آ رہا تھا کہ عمر نے رات کو آخری بات یہی کی تھی کہ میری ماما کا پیغام تھا۔ میں نے ٹولنے والی نظروں سے عمر کو دیکھا۔

”عمر..... رات کو سونے سے پہلے کچھ کہہ رہے تھے آپ مجھے؟“

”میں نے تو بہت کچھ کہا تھا جان عمر!“ عمر نے مسکرا کر کہا۔

”تم کس بارے میں کہہ رہی ہو؟“

”مجھے واقعی یاد نہیں..... آپ کو علم ہے کہ میری

دواؤں میں نیند کی دوا بھی ہے غالباً!“

”میں نے تو بہت کچھ کہا تھا میری پیاری.....

اب افسوس ہو رہا ہے کہ سب ضائع گیا۔“

”فون کے بارے میں کچھ کہا تھا شاید آپ

نے؟“ میں نے محتاط انداز میں سوال کیا۔

”ہاں وہ..... یہ رہا تمہارا فون.....“ وہ

سرہانے کے نیچے ہاتھ مار رہے تھے۔ ”تمہاری ماما کی

طرف سے افسوس تاک پیغام تھا.....“ فون میرے

ہاتھ میں تھا۔ میں پہلے ہی سرہانے کے نیچے سے نکال

چکی تھی، میں نے فون عمر کو دکھایا، آنسو میری آنکھوں

سے بہہ نکلے..... ”میں نے جان بوجھ کر نہیں پڑھا تھا

پیغام..... اسکرین پر نظر آ رہا تھا جان، خودکشی کا لفظ

پڑھ کر فطری طور پر تجسس کے ہاتھوں پورا پیغام پڑھ

لیا۔“ میں خاموش تھی۔ ”جانا ہو گا ناں ہمیں؟“ عمر

نے سوال کیا، میری خاموشی ہی میرا جواب تھی۔ ”کیا

بات ہے نیل، تم ٹھیک تو ہو؟“

”ہوں“ میں نے گہری سانس لی، خالہ کے

بارے میں سوچا، بیماری اکیلی رہ گئیں تو مستقبل

کے اندیشوں کے باعث اپنی جان ہی لے لی، کاش

ان کی کوئی اولاد ہوتی تو انہیں اپنے بڑھاپے کا سہارا

نظر آتا، میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”جانا تو ہو گا

بتائے..... کیوں انہیں پاپا سے بدظن کیا ہے؟“ میں اس کے ساتھ یوں جھگڑ رہی تھی جیسے بچپن میں جھگڑا کرتی تھی، اس کا گریبان میں نے تھام لیا۔ ساتھ ساتھ آنسو بہے جا رہے تھے۔

”ممائی نے اپنی ساری عمر سچائی اور خلوص کے

ساتھ گزاری ہے صدف.....“ اس نے مجھے سمیٹ

لیا۔ ”مجھے ان کی وفا اور خلوص پر کوئی شبہ نہیں

ہے..... صرف ماموں کے ساتھ ہی نہیں۔ وہ ہم سب

کے ساتھ بھی بہت اچھی ہیں، مجھ سے برداشت نہیں ہوا

کہ وہ لاعلمی میں دھوکے کی زندگی گزاریں..... اس

لیے میں نے انہیں اس خطرے سے آگاہ کر

دیا۔ ماموں یہ سب کچھ ماضی میں کر کے چھوڑ چکے

ہوتے صدف تو میں خاموش رہتا..... مگر حد تو یہ ہے کہ

وہ اس عمر میں بھی اور چار، چار بیٹیوں اور دامادوں

کے ہوتے ہوئے دھڑلے سے سب کچھ جاری رکھے

ہوئے ہیں، میں تو ان کا بھانجا ہوں سو ان کے سامنے

کھڑا نہیں ہوا مگر کوئی اور ہو گا تو وہ ان کا گریبان پکڑ

لے گا.....“ احمد نے اپنا گریبان میرے ہاتھ سے

چھڑوایا، میں سسک دی۔

”کیا ثبوت ہے تمہارے پاس احمد ان

الزامات کا؟“ میں نے ہارتے ہوئے اس سے

پوچھا، جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہو گا اس میں کچھ نہ

کچھ سچائی تو ہوگی۔

”سب کچھ ہے میرے پاس صدف..... مگر میں

تمہیں وہ سب کچھ دکھا کر صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا! پہلے

ہی جس کیفیت سے ممائی گزر رہی ہیں اس کے لیے

میں خود کو مجرم سمجھتا ہوں مگر یہ سب ضروری تھا صدف،

کسی، کسی زخم کو علاج کے لیے نشتر سے چھیڑنا پڑتا

ہے..... بسا اوقات گل جانے والے عضو کو جسم سے

علیحدہ بھی کرنا پڑ جاتا ہے..... ممائی کو خود فیصلہ کرنے

دو، ان کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے ماموں نے میری

جان.....“ احمد مجھے سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اور

بھی بکھر رہی تھی۔

ادبی لطائف

دہلی کے ایک مشاعرے میں جب بشیر بدر کا نام پکارا گیا تو راجندر سنگھ بیدی نے ساتھ بیٹھے مجتبیٰ حسین سے کہا۔ ”یار ہم نے در بدر ملک بدر شہر بدر تو سنا تھا، یہ بشیر بدر کیا ہوا؟“

☆☆☆

سعادت حسن منٹو نے راجندر سنگھ بیدی کو خط لکھا کہ.....

”بیدی تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے وقت بھی سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔“ اس پر بیدی نے جواب میں منٹو کو لکھا۔

”منٹو تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم نہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، نہ لکھتے وقت سوچتے ہو اور نہ لکھنے کے بعد سوچتے ہو۔“

داغ دہلوی

داغ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب ان سے ملنے آئے اور انہیں نماز میں مشغول دیکھ کر لوٹ گئے۔ اسی وقت داغ نے سلام پھیرا..... ملازم نے کہا۔ ”فلاں صاحب آئے تھے اور واپس چلے گئے۔“ فرمانے لگے۔ ”دوڑ کر جا، ابھی راستے میں ہوں گے۔“ وہ بھاگا بھاگا گیا اور ان صاحب کو بلا لایا۔ داغ نے ان سے پوچھا کہ آپ آ کر چلے کیوں گئے؟“ وہ کہنے لگے۔ ”آپ نماز پڑھ رہے تھے۔ اس لیے میں چلا گیا۔“ داغ نے فوراً کہا۔ ”حضرت! میں نماز پڑھ رہا تھا، لاجول تو نہیں پڑھ رہا تھا جو آپ بھاگے۔“

پسند: عرشہ جنید، کراچی

عمر..... میں نے کہا۔ ”مگر کیا ممکن ہے کہ ہم اماں کو یہ نہ بتائیں کہ خالہ نے خودکشی کی ہے؟“ میں نے درخواست کی، ماما کے پیغام کے بعد فاطش کا صبح سویرے آنے والا پیغام بھی تھا کہ کسی کو یہ نہ بتائیں کہ خالہ نے خودکشی کی ہے..... میں نے جواب میں اس سے وجہ پوچھی تو اس نے جواب نہیں دیا۔ غالباً وہ کہیں مصروف ہوگی۔

”کیوں نہیں..... جو تم جا ہو وہ بتاؤ!“ عمر نے کہا۔ ”میں تیاری کرتا ہوں چلنے کی!“

”آپ نہ جائیں بے شک.....“

”ارے نہیں.....“ عمر نے فوراً کہا۔ ”پہلے بھی خالو کی وفات پر مجھے جانا تھا اور کسی مصروفیت کے باعث نہ جاسکا تھا۔ حالانکہ زندگی کی کوئی مصروفیت اس سے اہم نہیں ہوتی.....“ ان کے لہجے میں تاسف تھا۔

”جس طرح آپ مناسب سمجھیں۔“ میں نے اٹھ کر تیاری شروع کی نہیں تو شاید ہم جنازے پر نہ پہنچ پاتے مگر جانا تو تھا کہ ماما، بابا، فاطش اور اسود وہیں تھے..... جانے کسی نے رانی کو بتایا ہے کہ نہیں..... سوچ کر میں نے اسے کال کی مگر اس کا فون بند آ رہا تھا۔ پیغام بھیجا مگر جواب نہ آیا، غالباً وہ سوچکی ہوگی، چلو جاگے گی تو پڑھ لے گی، میں غسل خانے کی طرف بڑھ گئی تاکہ تیار ہو جاؤں اور پھر اماں کو بھی بتانا تھا روانگی سے پہلے۔

☆☆☆

”آپا جی..... اندر آ کر بات سن سکتی ہیں میری؟“ نادیدہ کے ابا تھے، ماما غم سے نڈھال خالہ کی چار پائی کے پاس زمین پر ہی بیٹھی تھیں۔ اسود اندر سو رہا تھا اور کوئی کام والی اس کے پاس تھی، میں مسلسل ماما کے ساتھ تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر اٹھنے لگیں تو میں نے جلدی سے اٹھ کر سہارا دے کر انہیں اٹھایا۔ ہم دونوں اندر پہنچیں تو بابا پہلے سے وہاں موجود تھے۔ میرے ذہن میں تھا کہ شاید خالہ کے مرنے کے کھانے کا کوئی مسئلہ ہوگا۔

نے سوال کیا۔
 ”صرف مجھے اور نادیا کو..... اس نے نادیا کے نام خط لکھا تھا اس سے علم ہوا کہ اس نے خودکشی کی تھی۔“ میرے کان کھڑے ہو گئے۔

”کہاں ہے وہ خط اور اس میں کیا لکھا تھا؟“
 ممانے فوراً پوچھا۔

”خط نادیا کے پاس ہی ہوگا، مجھے اس نے زبانی ہی بتایا ہے کہ بھر جانی نے لکھا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے تنگ آگئی ہے.....“ وہ رکے۔ ”جانے کیوں تنگ آگئی وہ اپنی زندگی سے چند دنوں میں ہی..... اچھی بھلی ہی تو تھی۔“

”ہوا کیا اسے اچانک.....؟“ ممانے سے سوال کر رہی تھیں، اس سوال کا جواب شاید کسی کے پاس بھی نہیں تھا..... یا شاید کسی کے پاس تھا۔

”میں نے تو نادیا سے کہا ہے کہ اپنی اماں کو بھی نہ بتائے..... عورتوں کا پیٹ ہلکا ہوتا ہے، اتنی بھاری بات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی اور کسی نہ کسی سے کہہ ڈالتی۔“ انتہائی عقلمندی کی تھی انہوں نے۔

”ٹھیک ہے.....“ کہہ کر ممانے دوبارہ باہر کوچل دیں، میں ان کے پیچھے چل دی۔ ممانے کی چال میں جو کمزوری تھی وہ صرف مجھے ہی نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ ہر کوئی دیکھ سکتا تھا کہ وہ جس طرح ٹوٹ گئی تھیں۔ بیٹیوں جیسی بہن کی موت نے ان کے جسم کا جیسے خون نچوڑ لیا تھا۔ ان کا پیلا زرد چہرہ اور بے رونق آنکھیں..... میرے دل میں کھد بادی مچ گئی تھی، میں اس ہجوم میں نادیا کو ڈھونڈ رہی تھی اور پھر اس کے بعد مجھے وہ موقع تلاش کرنا تھا کہ میں اس کے پاس موجود حالہ کا خط دیکھ سکتی۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ اسے حالہ اور پاپا کے بیچ تعلقات کی کچھ سن گئی تھی اور یہ بات اس نے حالہ سے کہہ بھی دی تھی اور حالہ نے مجھے بلا کر اپنے ضمیر کا بوجھ بھی ہلکا کیا تھا۔

☆☆☆

جو بیس عذاب ناک گھنٹے گزر چکے تھے..... جہاز

”آپاجی، بھائی صاحب..... آپ سے ایک درخواست کرنی ہے کہ کسی کے سامنے یہ ذکر نہ کریں کہ بھر جانی نے خودکشی کی ہے۔ ہم نے سب کو یہی بتایا ہے کہ کسی برتن میں کسی نے دوا ڈال کر رکھی تھی اور وہ بغیر دیکھے اس میں پانی ڈال کر پی گئیں.....“ میں حیرت سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”کیوں انکل؟“ میرے منہ سے سوال نکل گیا، جاننا چاہتی تھی کہ حالہ کی خودکشی کے اسباب کو وہ کس حد تک جانتے تھے۔

”اصل میں پتر..... خودکشی کا سن کر لوگ سو طرح کی باتیں سوچتے ہیں، کوئی کچھ سوچے گا کوئی کچھ..... کوئی اگر یہ سوچے گا کہ جاوید کے جانے کا غم برداشت نہ کر سکی اور خودکشی کر لی تو دوسرا یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ جانے اس کے ساتھ کیا غلط تھا جو اس نے اپنی جان لے لی..... زمانہ کسی کو کسی حال میں جینے نہیں دیتا، مرنے والی تو ہمیں دکھ دے کر چلی گئی اب اس کی میت پر لوگ انگلیاں اٹھائیں۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا.....“ وہ اپنے آنسو پونچھنے لگے۔ ”میرے مرے ہوئے بھائی کی عزت پر بٹانگے یہ میں نہیں دیکھ سکتا..... اور پھر اس کا تو کوئی جنازہ بھی نہیں پڑھائے گا، اسے کوئی گاؤں کے قبرستان میں دفن کرنے کی اجازت بھی نہیں دے گا..... یہی ہمارے ہاں کا دستور ہے.....“ میرا جسم سن ہو گیا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ باتیں نہ تھیں.....

”ہوں.....“ بہ مشکل ممانے کے منہ سے نکلا۔

”ایک بات نکالو منہ سے یہاں کسی کے سامنے بھر جانی کی خودکشی کی..... پھر دیکھنا تماشا کہ کس طرح یہاں کسمرے اور خبروں والے پہنچیں گے جو کتوں کی طرح چٹخارے دار خبریں سونگھتے پھرتے ہیں..... اس کی میت کی چیر پھاڑ کروا کر ہی دم لیں گے.....“ وہ جاہل سا شخص جو باتیں کر رہا تھا وہ ہمارے گمان میں بھی نہ آئی تھیں۔

”کس، کس کو معلوم ہے حقیقت کی بابت؟“ ممانے

READING
Section

عابد نے پوچھا۔

”السلام علیکم.....“ میں نے تحمل سے کہا۔
”آپ کیسے ہیں؟“

”وعلیکم..... میں ٹھیک ہوں رانی، تم بتاؤ.....“

جانے کہاں، کہاں سے کوشش کر کے تم سے بات کرنے کا وسیلہ بنا ہے۔“ بے تابی عیاں تھی۔

”اللہ کا بڑا کرم ہے عابد جو ہم کسی حادثے سے

بچ گئے..... ذرا سی آزمائش ہے، اس کا کوئی مسئلہ

نہیں، مشکل تو ہے لیکن اللہ بہتر کرے گا، یہ وقت بھی

گزر ہی جائے گا، آپ بس دعا کریں..... اور ہاں

اپنے امی ابو کو نہ بتائیے گا.....“ میں نے اپنے لہجے کو

حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کی ورنہ میں ایسی

بہادر نہیں..... موت کو جتنا قریب سے سوچا اور محسوس

کیا تھا اس کے بعد میرے اندر یہ معمولی سی تبدیلی آئی

تھی ورنہ عام حالات میں تو میں عابد کی آواز سنتے ہی

دھاڑیں مار مار کر رونے لگتی۔

”اچھا تم پریشان نہ ہونا.....“ عابد نے کہا۔

”ابو کو معلوم ہے، انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا اور میں نے

ٹی وی آن کر کے سنا بھی اور میرا تو دماغ بھک سے اڑ

گیا یہ سوچ کر کہ تم کس قدر پریشان ہو گی۔“

”اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے عابد..... اس نے

ہمیں محفوظ رکھا، اس آزمائش میں، میں اور مصطفیٰ تنہا

نہیں..... بہت سے لوگ ہیں، ہم سب اکٹھے ہیں اور

سب کے لیے ایک جیسی آزمائش ہے.....“ میں نے

رسان سے کہا۔

”واؤ..... رانی!“ عابد نے یقیناً سیٹی کے انداز

میں ہونٹ سکڑے ہوں گے۔“ میں تو تم سے بہت

متاثر ہو گیا ہوں۔“

”میں سمجھی کہ آپ بہت سال پہلے مجھ سے متاثر

ہو گئے تھے۔“ میں نے ہنس کر کہا تھا اور فون بند کر کے

لوٹی تو وہ محافظ میرے ساتھ، ساتھ چل رہا تھا، مصطفیٰ

جیسے نیند میں چل رہا تھا، میں نے ایک بیچ پر بیٹھ کر اسے

اپنی گود میں لٹالیا اور اس کے بالوں میں ہولے، ہولے

کا پرزہ بچھ گیا تھا اور ہمیں اس متروک قسم کے ائر پورٹ کی عمارت میں ایک گوشے میں محدود کر کے رکھا گیا تھا، اتنے مسافروں کی دیکھ بھال کی قابلیت سے محروم وہ ائر پورٹ اس دنیا سے باہر کی کوئی جگہ لگ رہا تھا۔ بچے بلبلارہے تھے، بڑے بھی بھوک سے ٹڈھال تھے، اگرچہ انہیں اپنے احساسات کو قابو کرنے کا سلیقہ تھا مگر ان کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا۔ کئی طرح کے مریض تھے، عورتیں تھیں، ضعیف لوگ تھے اور ائر پورٹ کی عمارت، سکیورٹی کے حصار میں بیچوں پر بیٹھے ہوئے بے بسی سے اس مژدے کا انتظار کر رہے تھے کہ جہاز پرواز کے قابل ہو گیا ہے۔

میرے نام کی کوئی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی، جانے کوئی اور زبان تھی یا پھر اسپیکر کا نظام اتنا برا تھا کہ مجھے سوائے رانیہ کے کچھ سمجھ میں نہ آیا، میں مصطفیٰ کو اٹھائے ہوئے سکیورٹی کی ڈیوٹی پر مامور ایک باوردی شخص کے پاس گئی اور اس سے انگریزی میں پوچھا کہ کیا اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی.....

”ائر پورٹ کے کاؤنٹر نمبر نو پر آپ کو رپورٹ کرنے کو کہا جا رہا ہے، اس نے شستہ انگریزی میں کہا۔“
”کیا میں وہاں جا سکتی ہوں؟“ میں نے اس سے اجازت طلب کی۔

”میں چیک کر کے بتاتا ہوں.....“ کہہ کر وہ چند قدم چل کر دوسرے باوردی آدمی کی طرف گیا، غالباً وہ اس کا انچارج تھا۔ تھوڑی دیر رک کر اس سے بات کی، واپس آ کر مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کس ملک کی شہریت تھی، میرے بتانے پر اس نے حفاظتی حصار میں سے راستہ بنایا اور مجھے جانے کو کہا، ساتھ ہی بتایا کہ مجھے کس طرف جانا تھا، میرے ساتھ ایک اور نوجوان لڑکا چلنے لگا جسے اسی آدمی نے میرے ساتھ جانے کو کہا تھا۔ کاؤنٹر پر جا کر میں نے اپنا تعارف کروایا۔ فون کا چونکا مجھے پکڑا دیا گیا، حسب توقع عابد ہی تھے.....

”کیسی ہو رانی؟ مصطفیٰ کیسا ہے؟“ چھوٹے ہی

انگلیاں پھیرنے لگی۔

کی بے تابی بھی ہوگی۔“ اس نے کہا تو میں خاموش ہو گئی، یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ کون سا خط؟

”جب تمہیں سب علم ہی ہے تو مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں..... تم خود ہی بتا دو مجھے۔“

”چاچی نے جو خط لکھا ہے وہ ایسا نہیں کہ میں کسی کو بھی اس کے مندرجات بتاؤں.....“ اس نے ہولے سے کہا، ہم کوشش کر رہے تھے کہ ہماری آواز ماما تک بھی نہ پہنچے مگر.....

”کیا لکھا ہے اس خط میں جو بتانے کے قابل نہیں..... میں جاننا چاہوں گی۔“ ماما نے اچانک کہا تھا گویا وہ ہماری گفتگو سن رہی تھیں۔

”آپ تو نہ ہی پوچھیں آئی.....“ نادیہ نے کہا۔

”کیوں نہ پوچھوں.....؟“ ماما ذرا غصے میں آ گئیں۔ ”کیونکہ کوئی خط اس نے لکھا ہی نہیں ہوگا۔ یا یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس نے سرے سے خودکشی کی ہی نہ ہو۔ اسے کسی نے نہ ہر دے کر مار دیا ہو اور سارا ڈراما خودکشی کا ترتیب دے دیا ہو.....“ ماما غصے میں بول رہی تھیں۔ ”دیکھنا تو یہ ہے کہ اس کی خودکشی سے کس کس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے..... اس کے تو بال نہ بچیں۔ اس کے بعد کون والی وارث ہے.....“

”آئی.....“ نادیہ کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے ہولے سے دبایا کہ وہ خاموش رہے۔ میں اس سے جو بات تنہائی میں کرنا چاہ رہی تھی اس میں ماما کی مداخلت سے بھی بات بگڑ سکتی تھی۔

”اچھا چھوڑیں اس بات کو سو جائیں ماما..... نادیہ سو جاؤ تم بھی۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھامے، تھامے کہا۔ ماما نے کروٹ بدل لی مگر تھوڑی دیر کے بعد انہیں گھبراہٹ ہونے لگی۔ ان سے باہر سویا نہیں جا رہا تھا۔

”میں نیچے جا رہی ہوں سونے کے لیے..... تانیہ کے کمرے میں۔“ ماما نے اٹھ کر اپنی چپل پہنی۔ ”کھلے آسمان تلے سونے کی عادت نہیں

اچھا ہی ہوا کہ میں نے ماما کو سر پر اتر دینے کا سوچا تھا ورنہ اس وقت وہ جس کیفیت اور پریشانی میں ہوتیں وہ ان کی فکروں میں اضافہ ہی کرتا۔ مصطفیٰ کے ننھے، ننھے خراٹے..... میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے تھکے، تھکے وجود سے ہلکی، ہلکی بو آ رہی تھی، اسے ہر روز نہانے کی عادت تھی اور اس وقت دوسرا دن چل رہا تھا کہ اسے نہلا نہ سکی تھی، میں نے اسے پرس میں سے چھوٹی سی پرفیوم کی بوتل نکالی، اپنی ہتھیلی پر اس میں سے تھوڑا سا پرفیوم نکال کر ملا اور اسے مصطفیٰ کے جسم کے مختلف حصوں پر ملنے لگی، ہلکی سی خوشبو پھیل گئی ماما جیسی، یہ پرفیوم مجھے ماما نے پرس میں رکھنے کے لیے دیا تھا، یہ اسی پرفیوم کا miniature تھا جو وہ استعمال کرتی تھیں۔ ”ماما!“ میں نے جیسے بے خیالی میں ان کو پکارا۔ گھڑی دیکھی۔ پاکستان میں کیا وقت ہوگا۔ صبح سویرے کا وقت ہوگا۔ میرا فون بند تھا اور اس وقت اس پر کوئی سروس نہ تھی، سوچا کہ آن کروں اور ماما سے بات کروں، انہیں تشویش تو ہوگی کہ مجھ سے بات نہ ہوئی تھی، کال کی ہوگی تو عابد نے کیا بہانہ گھڑا ہو گا کچھ پوچھ ہی لیتی عابد سے..... میں کبھی کبھی اور کبھی کچھ سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

”میں دن بھر موقع ڈھونڈتی رہی تم سے بات کرنے کا نادیہ.....“ رات کھلی چھت پر چار پائیوں کی قطار میں، میں نے کوشش کر کے نادیہ کے ساتھ والی چار پائی لی تھی، میرے ساتھ ماما کی چار پائی تھی اور وہ چھت کی آخری چار پائی تھی..... پاپا کہیں مردانے میں تھے۔

”میں جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوگا۔“ کیسی تیز تھی وہ جسے میں سادہ سا سمجھ رہی تھی۔

”تم کیسے جانتی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کو اس خط کے پڑھنے

READING
Section

146 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

حق مہر میں ان کے نام لکھا گیا گھر انہوں نے خالو کی بھیجی کو دیا تھا..... اس کا جانے کیا سبب تھا۔ شہر کی جائداد جو کہ مہنگی ترین ہوگی۔ اس کی وارث میں، تنہا میں..... مگر کیوں؟

”نادیہ.....“ میں گہری سوچ میں تھی کہ اس سے یہ بات کہوں یا نہ کہوں۔ ”تم سے ایک درخواست کرنا تھی۔“

”کہیں آپ! اس نے اندھیرے میں ہی میری طرف دیکھا۔

”میں تمہیں بہت زیادہ نہیں جانتی..... مگر جتنا جان پائی ہوں۔ اس سے مجھے لگتا ہے کہ تم بہت سمجھدار ہو۔“

”مکھن لگا رہی ہیں آپ!؟“ وہ ہولے سے ہلکی۔

”نہیں، سچ کہہ رہی ہوں.....“ میں نے کہا۔

”جس طرح تم نے خالہ کے بارے میں چیزوں کو صیغہ راز میں رکھا..... جس طرح انہیں سمجھایا اور جس طریقے سے تم نے ان کے خط کے مندرجات اپنے ابا تک کو بھیجے تھے۔“

”اس میں ایسا ہے کیا آپ! جو میں ڈھول پیٹتی پھروں..... چاچی مجھے بہت چاہتی تھیں، اسی طرح جس طرح وہ آپ کو بیٹی سمجھتی تھیں اور میرے اوپر ان کا ایک ایسا احسان ہے کہ اس کے بدلے مجھے ان کے راز کو راز رکھنا ہے..... اور اب تو وہ خود نہیں رہیں تو ان کے راز کو افشا کر کے مجھے کئی زندگیوں میں زہر کیا گھولنا۔“

”تم اس سے کہیں زیادہ عقلمند ہو پیاری..... جتنا میں تمہیں سمجھ رہی تھی۔“ میں نے دل سے اعتراف کیا۔

”اب تم سے ایک اور درخواست بھی کرنی ہے.....“

”حکم فرمائیں آپ!..... مجھے آپ بہت پیاری ہیں۔ میں تب سے آپ سے متاثر ہوں جب آپ چھوٹی سی تھیں اور چاچا کے ہاں رہنے آتی تھیں، میں آپ کو اپنے گھر کی چھت سے چھپ چھپ کرتا کا

مجھے..... تم بھی آ جاؤ!“

”میں ٹھیک ہوں یہاں ماما..... اور اسود بھی اب سو رہا ہے!“

”اسے کوئی چھمر و چھمر کاٹ گیا تو!“ ماما نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں نے اس پر اپنا دوپٹا لپیٹ رکھا ہے ماما، آپ پریشان نہ ہوں اس کے لیے!“ میں نے کہا تو وہ چل دیں، مجھے نادیہ سے بات کرنے کا اس سے بہترین موقع اور کون سا مل سکتا تھا۔

”انہوں نے خط میں خودکشی کرنے کی وجہ کیا لکھی ہے.....“ وہ رکی۔

”دانیال انکل ہیں!“ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا، میں اندھیرے میں اس کے چہرے کو گھور رہی تھی۔

”اور.....“ کافی دیر کے بعد یہ مشکل میرے منہ سے الفاظ ادا ہوئے۔ ”اور کیا لکھا ہے انہوں نے؟“

”چاچی نے اپنے بعد اپنے حصے کی ساری جائداد..... رفاہی اداروں کو دینے کا کہا ہے..... یہ گھر انہوں نے مجھے دینے کو کہا ہے اور لاہور میں... چاچا نے ان کے لیے دو کنال کا پلاٹ لیا تھا..... اور ان کا زیور.....“ وہ رکی، میں سن رہی تھی..... ”یہ سب کچھ آپ کے لیے ہے!“ میں بے یقینی سے سب سن رہی تھی۔

”مم..... میرے لیے کیوں؟“ میں ہکلائی۔

”چاچی نے لکھا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ آپ کو بیٹی کی طرح چاہا ہے.....“ وہ پھر گویا ہوئی۔ ”کچھ چیزیں تو انہوں نے چاچا کی زندگی میں قانونی طور پر ہی ان لوگوں کے نام لگا دی تھیں جنہیں دینا تھیں..... باقی زمینیں وغیرہ ہیں، ان کا فیصلہ شرعی طریقے سے ہو گا، زمین تو یوں بھی ساری چاچا کی تھی سو اس کے بارے میں مجھے علم نہیں.....“

گویا خالہ کے پاس اپنا جو کچھ تھا، اس میں سے

”تم اسے مرمت کروا کر رکھ لو اگر تم برا محسوس نہ کرو تو مجھے نیا لیپ ٹاپ لینے میں مدد کرو۔“ ماموں نے سخاوت کا مظاہرہ کیا، وہ میرے فقط ماموں ہی نہیں، سر بھی ہونے والے تھے، یوں بھی ان کی طرف سے مجھے گاہے بگاہے تحائف ملتے رہتے تھے کہ ان کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔

میں ان کے دفتر گیا اور انہیں اپنے لیپ ٹاپ پر نئے لیپ ٹاپ کے ماڈل دکھائے..... انہیں ان کے فیچر سمجھائے مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ ماموں کو لیپ ٹاپ کے استعمال... کا کچھ خاص اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لیپ ٹاپ صرف اپنی انی میل اور فیس بک کو چیک کرنے کے لیے لینا چاہتے تھے۔ اگرچہ انہیں اس مقصد کے لیے اتنی رقم استعمال کرنے کی ضرورت نہ تھی تاہم مجھے ان کے انتخاب پر کوئی اعتراض تھا نہ اعتراض کا حق۔ انہوں نے نیا لیپ ٹاپ لے لیا اور پرانے والا میرا ہوا۔

ماموں والا لیپ ٹاپ ملا تو وہ میرے پہلے لیپ ٹاپ سے بہت بہتر تھا، میں نے اپنے لیپ ٹاپ کو بیچنے کا سوچا، اس کے لیے مجھے اپنی ساری معلومات ماموں والے لیپ ٹاپ میں منتقل کرنا تھیں، ان کے لیپ ٹاپ کو خالی کر کے ہی میں اپنے لیپ ٹاپ کی معلومات اور ڈیٹا اس میں منتقل کر سکتا تھا۔ پاس ورڈ ماموں نے مجھے بتا دیا تھا، میں نے اسے کھولا، تھوڑی دیر اپنی ماہرانہ تکنیک سے میں نے اس کی فائلیں کھولیں کہ اگر ان میں کچھ اہم ہو تو وہ یو ایس بی پر منتقل کر کے ماموں کو دے دوں۔ اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں..... میں دیکھتا جا رہا تھا، پڑھتا جا رہا تھا اور حیرت کی وادیوں میں کھوتا جا رہا تھا۔ ”تو یہ سب ہو رہا تھا!“ ماموں کو تو میں بہت شریف سمجھتا تھا، آئیڈیل تھے وہ میرے اور میرے آئیڈیل کی تصویر کا دوسرا رخ کتنا مکروہ تھا۔

(دیکھا) کرتی تھی۔“

”چھپ، چھپ کر کیوں بھئی؟“ میں ہنسی۔

”کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ پھولے، پھولے گالوں والی اور پیارے، پیارے فرائک پہننے والی یہ لڑکی بہت مغرور ہوگی.....“ میرا اس بات پر قہقہہ نکل جاتا جو عام حالات ہوتے، میں نے اپنی مسکراہٹ کو دبایا۔

”بہت افسوس ہے بھئی..... تم نے مجھے بچپن سے ہی ایک اچھی دوست سے محروم کر دیا!“ میں نے اس کے گال کو پیار سے چھوا۔

”آپ کچھ کہنے والی تھیں؟“ اس نے بات بدلی، جو روشنی ہوتی تو میں دیکھتی کہ اس کے گال کیسے لال ہو گئے ہوں گے۔

”مما..... اصل میں اپنی بہن کی اس طرح وفات پر بہت جذباتی ہو رہی ہیں..... تم ان کی کسی بات کا برا نہ ماننا، وہ کچھ کہیں تو میں ان کی طرف سے معافی مانگ لوں گی، ویسے بھی وہ کچھ جانتی بھی تو نہیں..... جو تم اور میں جانتے ہیں.....“

”یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے آپنی، وہ میری بھی ماں جیسی ہیں۔“ اس نے کہا تو اطمینان میرے دل تک اتر گیا۔

سوچتے، سوچتے جانے کس وقت میں نیند کی وادی میں چلی گئی تھی..... صبح کاذب کے وقت آنکھ کھلی تو اسود کو لے کر نیچے چلی گئی، خالہ کے کمرے میں ماما تنہا سو رہی تھیں، میرے جانے سے جاگ اٹھیں۔

☆☆☆

ماموں کا لیپ ٹاپ خراب تھا..... انہوں نے پیغام بھیج کر مجھے بلوایا، میں نے آ کر دیکھا تو اس کی ہارڈ ڈسک میں کوئی مسئلہ تھا، ماموں کو بتایا تو انہوں نے کہہ دیا کہ اسے پھینک کر میں انہیں کوئی اور بہتر لیپ ٹاپ لے دوں..... میں نے انہیں بتایا کہ اچھا خاصا لیپ ٹاپ تھا، تھوڑی سی مرمت کے بعد جیسی تھی قیمت پر ہی سہی مگر اسے بیچا جا سکتا تھا۔ انہیں بہر صورت نیا لیپ ٹاپ ہی چاہیے تھا۔

”ہاں، ہاں..... کیوں نہیں!“ پاپا نے شاید اوپری دل سے ماما کی تائید کی تھی مگر ماما کا تمناک چہرہ بھی اس بات پر کھل اٹھا تھا، ان کے اور پاپا کے بیچ تناؤ کو عام لوگ محسوس نہیں کر سکتے تھے مگر چونکہ ہم جانتے تھے سو میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ ماما کے دل میں پاپا کے لیے تمام نفرت یا ناپسندیدگی کے باوجود بھی احساس تشکر جاگا ہوگا۔

”خط خالہ نے نادیاہ کے نام لکھا ہے ماما..... اسے وہ صرف اس وقت عدالت میں پیش کرے گی جب اس پر اس خط کو دکھانے کے لیے مقدمہ کیا جائے گا..... خط اس نے اپنے باپ کو بھی نہیں دکھایا، آپ دیکھیں خط پاپا!“ میں نے خط کی ایک اور تصویر پاپا کو دکھائی۔

”میں دانیال کے اور اپنے مابین تعلقات کی وجہ سے ہونے والی شرمندگی کے باعث خودکشی کر رہی ہوں۔“ اسکرین پر خالہ کی لکھائی میں خط کا پہلا فقرہ..... صرف پاپا کو نظر آیا تھا اور ان کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔

”خالہ ہی کی لکھائی ہے نا پاپا؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں!“ پاپا جیسے کسی کنویں سے بولے تھے۔
”کیا آپ سمجھتے ہیں پاپا کہ ہمیں ابھی نادیاہ سے پورا خط دیکھنے کے لیے اصرار کرنا چاہیے؟“ میں نے پاپا سے سوال کیا۔

”نہیں!“ پاپا کے لہجے میں ایسی لرزش تھی جو ان لوگوں کے لہجے میں ہوتی ہے جنہیں شاید سزائے موت دی جاتی ہوگی۔

”جب عدالت میں ضرورت ہوگی تو.....“ پاپا کے لہجے میں جان کہاں تھی، میرے دل میں ہوک اٹھی مگر فقط ایک لمحے کے لیے ساتھ ہی مجھے خالہ سے وابستہ تکلیف یاد آئی۔

”آپ ٹھیک ہیں نا پاپا؟“ میں نے ان کے چہرے پر نظر جما کر سوال کیا۔

”اپنے پاپا کو بلو او فاطش باہر سے..... مجھے ان سے کوئی بات کرنی ہے۔“ ماما نے کہا تو میں نے کسی سے کہہ کر پاپا کو پیغام بھجوایا۔ تھوڑی دیر میں پاپا آ گئے۔

”آپ سے ایک بات کرنا تھی دانیال!“
”ہوں؟“ پاپا نے سوالیہ انداز میں ماما کو دیکھا۔

”میں تانیہ کے قتل کی رپورٹ لکھوانا چاہتی ہوں..... مجھے شک ہے کہ اسے جاوید کے بھائیوں نے مار دیا ہے، زمین کے لالچ میں، ان سب جائدادوں کے لالچ میں جو یہاں ملتان اور لاہور میں تانیہ کے نام تھیں۔“

”ٹھیک ہے..... میں دیکھتا ہوں۔“ پاپا کے انداز میں ایسی بے پروائی تھی جو ماما کو کھٹک گئی۔

”آپ کو نہیں لگتا کہ جائداد کے لالچ میں تانیہ کو قتل کروا دیا گیا ہے..... آپ کیس کروائیں، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ جن لوگوں کو اس کی جائداد ملنے والی ہے ان کے نام مشکوک لوگوں میں نامزد کروادیں۔“ ماما نے سوال بھی کیا اور وضاحت بھی کر دی۔

”ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو.....“ پاپا نے کہا۔
”میں کچھ کرتا ہوں۔“

”جب آپ خالہ کی وفات سے مستفید ہونے والوں کے نام لکھوائیں پاپا تو ان میں میرا نام بھی لکھوائیں کہ انہوں نے اپنی جائداد کا ایک حصہ میرے نام بھی لگایا ہے، جس کی مالیت کروڑوں تک ہے!“ ماما مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے اپنے فون میں سے اس خط کے اس حصے کی کھینچی گئی تصویر ماما کو دکھائی جہاں پر انہوں نے اپنے لاہور والے پلاٹ کو میرے نام لکھا تھا۔

”خط کہاں ہے..... میں پورا خط دیکھوں گی!“ ماما کا اصرار تھا۔ ”اور ان پر اپنی بہن کے قتل کا مقدمہ بھی ضرور کروں گی.....“

”ہوں.....“ انہوں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

”سوری سر..... ہم اپنے مہمانوں کے بارے میں تفصیلات دوسروں سے شیئر نہیں کرتے!“

جواب آیا۔

”دیکھیے وہ میرے سگے ماموں ہیں یار، ہم

اکٹھے ہی آ رہے تھے، گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے

راستے میں رک گیا تھا، اب مجھے ان سے ملنا ہے.....

آپ بے شک انہیں کال کر کے چیک کر لیں۔“ میں

نے چال چلی۔

”وہ تو تین دن سے یہاں ہیں اور آپ آج

پہنچے ہیں؟“ اس نے میرا کمرانمبر پوچھا اور چیک کر

کے کہا۔

”بتایا ہے ناں کہ گاڑی خراب ہو گئی تھی اس

لیے... میں رک گیا تھا اور ماموں کرائے کی گاڑی لے

کر آ گئے تھے.....“ میں نے ہوا میں تیر چھوڑا جو کہ

نشانے پر لگ گیا تھا۔

”میں نے کال کیا ہے ان کے کمرے میں

سر..... وہ فون نہیں اٹھا رہے، غالباً ابھی تک وہ کھانا

کھا رہے ہیں یا ممکن ہے کہ باہر سیر کے لیے نکل گئے

ہوں.....“

”اچھا، چلیں میں خود ہی فون کر کے ان سے

رابطہ کر لیتا ہوں۔“

”ان کا کمرانمبر 214 ہے سر..... وہ جب بھی

آتے ہیں وہیں ٹھہرتے ہیں، اصل میں ان کی بیگم کو

اس کمرے سے پہاڑوں کا نظارہ بہت پسند ہے، اس

لیے۔ وہ جب بھی آنے والے ہوں، پہلے سے اطلاع

کر دیتے ہیں تو ان کا کمرابک ہو جاتا ہے.....“ میں

فون بند کرنے ہی لگا تھا کہ اس نے مجھے ضرورت سے

زیادہ ہی معلومات دے دیں..... میرے ارد گرد

دھماکے سے ہونے لگے۔

”نام کیا ہے تمہارا یار، بھول گیا میں؟“ میں

نے پوچھا۔

”نام تو میں نے بتایا ہی نہیں سر..... کلیم نام ہے

میرا ویسے!“

”کسی سے کہہ کرنا شتے کا کوئی بندوبست کرو پایا

کے لیے... فاطش بیٹا، انہوں نے دوا کھانا ہوئی

ہے!“ ممانے فکر بندی سے کہا، میں ان کا سادہ چہرہ

دیکھ رہی تھی۔ کیا نہیں ممانے..... کیا پایا ایسی عورت کی

محبت اور توجہ کے لائق تھے؟ کیا میرا دل اتنا بڑا نہیں ہو

سکتا تھا کہ میں ہر شے کو اسی طرح برداشت کر پاتی، کیا

میں اپنی ماں جتنا حوصلہ کر کے..... اشعر کی بے

وفائیوں کے ساتھ گزارہ کر سکتی تھی؟ کہاں سے ایک

بھولی ہوئی یاد آ گئی تھی..... کیا میں اسود کی خاطر قربانی

دے کر زندگی نہیں گزار سکتی تھی؟ ممانے ایک بار کہا

تھا۔ ”اولاد بہت بڑی مجبوری ہوتی ہے، عورت کے

پیروں میں بندھی زنجیر..... جس کی لمبائی گھر کی چار

دیواری تک ہوتی ہے، اس زنجیر میں بندھی عورت

اپنے جوگی نہیں رہتی.....“ کتنا بڑا سچ تھا اور کیسی تلخ

حقیقت مگر میں اسے سمجھ نہ پائی تھی، ممانے بھی تو آبلہ

پائی کا اتنا طویل سفر کیا تھا، ہماری خاطر ہی ناں اور

اب اگر انہوں نے پایا سے خلع لینے کا سوچا تھا تو اس کا

مطلب تھا کہ وہ برداشت کے آخری درجے تک پہنچ

گئی تھیں۔ اس درجے تک جس پر میں چند ماہ میں ہی

پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

میں اپنے دوستوں کے گروپ کے ساتھ بھوری

.... گیا تھا، گھر میں کسی کو میرے پروگرام کا علم نہ تھا،

وہاں میں نے رات کے کھانے کے وقت ہوٹل میں

ماموں کو دیکھا..... مگر اکیلے نہیں بلکہ کسی اور عورت کے

ساتھ، میں سمجھا کہ وہ کسی کاروباری سلسلے میں اس

عورت سے مل رہے ہوں گے انہوں نے مجھے نہیں

دیکھا اس لیے میں بہانہ کر کے وہاں سے اٹھا اور اپنا

کھانا کمرے میں منگوا لیا، ریسپشن پر کال کر کے

ماموں کا نام بتایا اور پوچھا کہ وہ کس کمرے میں

ٹھہرے ہوئے تھے۔

بچپن

کیوں نہ اس گزرے ہوئے پل کو دیکھ لیں۔ جس میں زندگی چمکتے جھلملاتے ستارے کے مانند مگر پُر فریب سی تھی، خواہشات اور آرزوئیں تو اس وقت بھی بہت تھیں مگر ان کے پورا ہونے اور نہ ہونے کا احساس اتنا زیادہ شدت آمیز نہ تھا۔ دیر پا مسکراہٹیں تو آج بھی مل ہی جاتی ہیں۔ مگر وہ لمحات تو تھے ہی مسکراہٹوں کے جو مسکراہٹ ملتی دل تک اثر کرتی۔ اس وقت دور یوں کا احساس فاصلوں کی بنیاد پر کیا جاتا تھا اور جب نزدیکیاں ملتیں تو بھی دوریاں برقرار رہتیں۔ حرارت اس قدر نہ تھی کہ حالات کی برف سے پکھل کر ڈھکے ہوئے احساسات نمودار ہو کر دل کی آنکھ کے سامنے آسکتے۔

اچھا تھا کہ اس وقت تنہائیوں سے آگاہی نہ تھی کہ تنہا ہو کر خود کو تنہا نہ سمجھتے تھے سوچیں صرف محدود تھیں مگر ان کا انجام غیر محدود کسی سے جدا ہو کر ملن کی خواہش کم کم ہی تھی، آنسو آنکھوں ہی سے ٹپکتے تھے مگر دل تک رسائی کچھ بھی نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو دماغ سے بالاتر ہو کر..... چاہتیں عارضی تھیں اور دکھ پل بھر کے لیے ہی ہوتے، اب کے برعکس روشنیاں زیادہ مسرت آمیز تھیں اور اندھیروں سے خوف محسوس ہوتا۔ زندگی کا ایک ہی روپ تھا جس میں زمانے نے رنگ بھر لیے اور وقت کے ساتھ، ساتھ مختلف رنگوں میں ڈھلتا گیا۔ غرض کے وہ پل بھی گزر گئے اور جو کچھ اب ہے یا آنے والے پل میں وہ بھی نہیں رہے گا کیونکہ یہی زندگی کے ارتقائی مراحل ہیں شاید۔

از: صائمہ جواد، کراچی

”بہت شکریہ کلیم..... میں نے آج تک اتنا مہذب فون آپ پر نہیں دیکھا.....“

”بہت شکریہ سر۔“ وہ یقیناً باچھیں کھول کر مسکرایا ہوگا۔ ”میں ریسیپشن ڈیسک پر ہوتا ہوں، دن کی ڈیوٹی میرے بھائی سلیم کی ہوتی ہے اور رات کی میری.....“

”اچھا..... ماشاء اللہ..... کہاں کے رہنے والے ہو؟“ میں نے اس سے فری ہونے کی کوشش کی، شاید اس سے مجھے کچھ اور معلومات مل سکیں، وہ بھی غالباً اس وقت فارغ تھا۔

”جی میں ہوں تو دیول شریف کا مگر اب ہم دونوں بھائی یہیں قریب ہی رہتے ہیں، کرائے کا کمرہ ہے، زیادہ وقت تو ہمارا یہیں گزرتا ہے۔“

”اچھا..... بہت شکریہ!“

”کوئی کام ہو جناب..... تو ہمیں خدمت کا موقع دیں۔“ اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

”کیا کام کر سکتے ہو تم میرا؟“ میں اس کے لہجے سے چونک گیا تھا۔

”سر آپ کے ماموں تو..... وہ تو بہت مالدار آدمی ہیں، بڑی بڑی آسامیاں لے کر آتے ہیں..... میرا مطلب ہے کہ آپ کو بھی کوئی..... میں بہت کم نرخوں میں بندوبست کر سکتا ہوں۔“ اس کی بات کا متن سمجھ کر میرے کان گرم ہو گئے۔

”اچھا میں بتاؤں گا.....“ مجھے علم ہو گیا کہ وہ مجھے بہت سی معلومات دے سکتا تھا۔

”ویسے سر..... وہ آپ کے ماموں ہی ہیں یا آپ میڈیا کے کوئی آدمی ہو؟“ اس نے سوال کیا، پس منظر میں کسی کی آواز آئی، وہ کمرے کا چیک کر رہے تھے..... ”بہت شکریہ سر!“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا، گاہک کو اسٹینڈ کرنا اس کا پہلا فرض تھا، میرے دل میں کھد بدمچا کروہ فون بند کر گیا تھا۔

”ماموں کہاں ہیں؟“ میں نے صدف کو پیغام بھیجا.....

میں سیٹ کی پشت سے سر نکائے، آنکھیں
موندے بیٹھی تھی، مصطفیٰ میری گود میں سو رہا تھا،
میں نے آہستہ، آہستہ اس کی پشت پر اپنے ہاتھ
پھیرتے ہوئے گزرے ہوئے چوبیس گھنٹوں کی
بابت سوچا، جہاز کو اس قابل بنا دیا گیا تھا کہ وہ کسی
قریبی ائر پورٹ تک پہنچ سکے..... وہاں سے ہمیں
کوئی اور جہاز اپنی منزل مقصود یعنی پاکستان تک
پہنچاتا۔ جہاز کی لینڈنگ کے لیے ہدایات دی جا
رہی تھیں اور بتایا گیا کہ اگلے چند منٹوں میں ہم لینڈ
کرنے والے تھے، دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔
دہلی ہماری عارضی منزل ٹھہرا، یہاں سے تین گھنٹے
میں ہمیں اگلی پرواز سے پاکستان بھیجا جانا تھا، مزید
ساڑھے تین گھنٹے کی پرواز اور میں پاکستان میں
ہوتی، اپنے پیاروں کے پاس!

تمام مسافروں کی تقلید میں میں بھی مصطفیٰ کا
ہاتھ تھامے چل رہی تھی، کوشش کر رہی تھی کہ گروپ
کے ساتھ رہوں، ہم سب سامان وصول کرنے جا
رہے تھے..... چونکہ یہ فلائٹ ایمرجنسی میں یہاں
اتری تھی اس لیے اس کے سامان کی دوبارہ چیکنگ
کی تو اصولاً ضرورت نہ تھی مگر جانے کیوں ہمیں اسی
طرف لے جایا جا رہا تھا..... بعد ازاں معلوم ہوا کہ
کسی قسم کی دہشت گردی کی افواہ پھیلی ہوئی تھی سو
ساری پروازوں کی سخت چیکنگ ہو رہی تھی۔ میں
نے اپنے دو سوٹ کیس وصول کر لیے تھے.....
تیسرے سوٹ کیس کا گلابی ربن غائب ہونے کے
باعث میں اسے پہچان ہی نہ سکی اور وہ کہیں میرے
پاس سے گزر گیا۔ چند گز کے فاصلے پر وہ سوٹ کیس
مجھے زمین پر پڑا نظر آیا، اس کا ہینڈل ٹوٹ چکا
تھا..... گلابی ربن ہینڈل کے ساتھ ہی تو بندھا تھا
اسی لیے وہ غائب تھا۔ پورٹنام کی کوئی مخلوق نظر نہ
آئی تو میں نے خود ہی ٹرالی گھسیٹی اور جا کر وہ سوٹ

”پاپا کراچی گئے ہیں کسی کام کے سلسلے میں.....“
”کب گئے ہیں اور کب لوٹیں گے؟“ میں

نے پوچھا۔

”تین دن ہو گئے ہیں احمد..... خیریت تو ہے؟“
اس کے لہجے میں تشویش در کر آئی تھی۔

”ہاں ہاں..... سب ٹھیک ہے، بس پوچھنا تھا
کہ ان کا نیا لپ ٹاپ ٹھیک ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں کر
رہا؟“ مجھے فوراً بہانہ سوچا۔

”تم کہو تو میں چیک کر لوں ان کی اسٹڈی میں جا
کر.....“ اس نے پوچھا۔

”نہیں، نہیں..... وہ تو ساتھ لے کر گئے ہوں
گے۔ ٹھیک ہے..... میں انہی کو کال کر کے پوچھ لوں
گا۔“ میں نے گھبرا کر فون بند کیا۔

تو گویا ماموں دوہری زندگی گزار رہے تھے.....
ممائی کے ساتھ دھوکا کر رہے تھے۔ مجھے یہ سب سوچ
کر دکھ ہوا اور میرا سر واقعی درد سے پھٹنے لگا۔ کیا میں
ماموں کا سامنا کروں یا..... میں نہیں چاہتا تھا کہ
ماموں نہ صرف ممائی کو دھوکا دیں بلکہ گناہ بھری زندگی
گزاریں۔ ممائی ان کے ساتھ مخلص تھیں، ان کے
پورے خاندان کے ہر فرد کی من پسند تھیں کیونکہ انہوں
نے باہر سے آ کر بھی ہم سب لوگوں کو اس طرح اپنا لیا
تھا کہ وہ ہمیں اپنوں سے بڑھ کر اپنی لگتی تھیں اور میں تو
ان کا خاص الخاص منظور نظر تھا کہ میں ان کی سب سے
لاڈلی بیٹی کا منگیترا تھا۔

یا میں ماموں کے اس گناہ یا جرم سے چشم پوشی
کروں..... اگر اللہ نے ان کا راز کسی پر آشکار نہیں کیا
تھا تو میں بھی خاموش رہوں؟ میرے دل و دماغ میں
جنگ جاری تھی، کیا پیسے والوں کو حق حاصل ہوتا ہے کہ
وہ اپنے پیسے کو منہنی کاموں کے لیے استعمال
کریں؟ ممائی کو کال کر کے بتاؤں کہ کال کر کے
ماموں سے پوچھیں کہ وہ کراچی میں کہاں ٹھہرے
ہوئے تھے؟ ممائی کے اندھے اعتماد کو وہ ٹھیس پہنچا

چھٹی۔ میں آگے بڑھی اور دیکھنے لگی۔ وہ میرا سوٹ کیس ہی تھا، میں اس کی طرف بڑھی۔ ”میرا سوٹ کیس ہے یہ!“ میں نے دعویٰ کیا تو دو پولیس والے آگے بڑھے۔

”ہمارے ساتھ چلیں.....“ ایک نے کرخت آواز میں انگریزی میں کہا۔

”کہاں.....“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”چلیں تو علم ہو جائے گا۔“

”میں اپنا باقی سامان تو لے لوں!“ میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

”اس کی آپ فکر نہ کریں، وہ یہیں پر ہے.....“ میں ان کی تقلید میں چل پڑی، ان کے پاس

ٹرائی میں میرا سوٹ کیس تھا۔ ایک کمرے کے

دروازے کے باہر پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوئے اور

مجھے اس کے ساتھ ایک کمرے میں جا کر جامہ تلاشی

دینے کو کہا گیا۔ ابھی تو جامہ تلاشی ہوئی تھی..... میں

نے دل ہی دل میں سوچا۔

”بچے کو باہر بھیجنا ہوگا.....“ اندر موجود خاتون

نے کہا، میں نے بہ مشکل مصطفیٰ کو باہر بٹھایا اور دوبارہ

اندر گئی..... اس روز مجھے جامہ تلاشی کا صحیح مطلب سمجھ

میں آ گیا۔

”میری اس طرح تلاشی کیوں لے رہے ہیں؟“

میں نے حیرت سے اس سے سوال کیا۔

”تمام مشکوک لوگوں کی اسی طرح تلاشی لی جاتی

ہے میڈیم.....“ اس نے غالباً اس لیے احترام سے

بات کی تھی کہ میرے پاسپورٹ کا رنگ سبز نہ تھا ورنہ تو

شاید اس کا لہجہ ہی کچھ اور ہوتا۔

”مشکوک؟“ میرے دماغ میں اس کا کہا ہوا

لفظ اٹک گیا۔

”مجھے اس سے زیادہ کچھ علم نہیں ہے..... اس

کے بعد آپ دوسرے دروازے سے نکل کر اگلے

کمرے میں چلی جائیں.....“

”مگر میرا بیٹا تو اس وقت اس سے پہلے والے

.....

کیس اٹھا لیا، معمول سے بھاری بھی تھا وہ سوٹ کیس یا شاید اس کا ہینڈل ٹوٹ جانے کے باعث مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔

میں اپنا سامان لے کر ان لوگوں کے پیچھے چل

پڑی جو کہ چیکنگ کی طرف جا رہے تھے..... مصطفیٰ کو بھی

میں نے ٹرائی پر بٹھایا تھا کہ وہ چل، چل کر تھک گیا

تھا۔ قطار کافی طویل تھی اور وہاں بیٹھنے کو کوئی جگہ بھی نہ تھی۔

تھکاوٹ اب نئے انداز سے طاری ہو رہی تھی.....

جماہیاں آرہی تھیں۔ میری باری بالآخر آ گئی۔

وہاں سے باہر نکلی تو ایک طویل قطار اپنے،

اپنے سامان کے انتظار میں کھڑی تھی مگر سامان کو

کلیئر کرنے کا عمل کافی سست تھا، کنویئر بیلٹ رکی

ہوئی تھی، تھوڑی دیر کے بعد چلتی، ایک سوٹ کیس

گزر رہا اور پھر چند منٹ کا وقفہ آ جاتا، ابھی وہاں چند

اور لوگ آئے جو کہ پولیس کی وردی میں تھے، اس

کے تھوڑی دیر کے بعد کچھ اور باوردی افراد آئے،

ان کے ہاتھوں میں لمبی چین تھیں جن کے دوسرے

سروں پر بڑے، بڑے کتے تھے جو جوش سے بھونک

رہے تھے..... انہیں ہمارے اس سامان کے پاس

لے جایا گیا جو کنویئر بیلٹ پر سے اتار کر ایک ڈھیر کی

صورت نیچے رکھا گیا تھا۔ وہ تیزی سے سامان کے

گرد گھوم رہے تھے۔ ان سب نے مل کر ایک ایک

سوٹ کیس کو سونگھنا شروع کر دیا، ہم سب بیزاری

سے کھڑے اس عمل کو دیکھ رہے تھے، پولیس کی

وردیوں میں ملبوس وہ سارے اس منظر سے لطف

اندوز ہو رہے تھے یقیناً.....

کتوں کی چیکنگ کے بعد..... ایک، ایک کر کے

سوٹ کیس واپس کنویئر بیلٹ پر رکھے جا رہے تھے،

کتوں کو واپس لے جایا گیا تھا مگر باقی پولیس والے

وہیں تھے۔

”یہ سوٹ کیس کس کا ہے؟“ ہم سب اچک

اچک کر دیکھ رہے تھے۔ میرے سامنے کتنے ہی لوگ

تھے اس لیے مجھے نظر نہ آ رہا تھا۔ ذرا سی بھیڑ

بہت زیادہ عجیب تھا۔
”سوٹ کیس کھولیں.....“ اس نے کہا۔ میں آگے بڑھی۔ ”آپ نہیں.....“ وہ دھاڑا۔ ”آپ اس سوٹ کیس کو چھو بھی نہیں سکتیں۔“ اس کا لہجہ انتہائی غصیلا تھا۔ کیمروں والے اپنے کام میں مصروف تھے۔

”مگر یہ میرا سوٹ کیس ہے..... میں اسے کیوں نہیں چھو سکتی؟“ میرے لہجے میں حیرت بھی تھی اور غصہ بھی، اسی اثنا میں کسی نے وہ سوٹ کیس کھول دیا تھا..... میں ڈر سے چیخ مار کر پیچھے کو ہٹی..... ”نہیں، نہیں.....“

”کیا ہوا..... کیا نہیں، نہیں؟“ سوال داغا گیا۔

”یہ سوٹ کیس میرا نہیں ہے.....“ میں نے ہکلا کر کہا۔

”سارے مجرم پکڑے جانے پر اسی طرح کہتے ہیں۔“ اس نے میرے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یقین مانیں یہ سوٹ کیس میرا نہیں ہے.....“ میں گڑگڑائی۔ ”یہ..... میرا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”اچھا، کیوں نہیں ہو سکتا آپ کا؟“ وہ ہنسا تھا۔

”میرا کیسے ہو سکتا ہے یہ.....“ میں ہکلا رہی تھی

مسلل..... ”میں تو پاکستان جانے کے لیے اپنا ٹکٹ

بھی کریڈٹ کارڈ پر لائی ہوں، اگر یہ میرا ہوتا تو.....“

میری آواز کانپ رہی تھی اور آنکھیں اس سوٹ

کیس کو دیکھ کر پھٹی جا رہی تھیں..... جس میں چند

پکڑے تھے، جو شاید صرف اوپری تہ میں رکھے گئے

تھے اور ان کے نیچے سیکڑوں کے حساب سے ڈالروں

کے نئے نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔

زندگی کیسے، کیسے رنگ و روپ بدلتی ہے۔ یہ خود وہ بھی نہیں جانتے جوان مرحلوں سے گزر رہے ہوتے ہیں مگر ہماری مصنفہ نے خوب جانا ہے، سب کے دلوں کا حال، اسی احوال کی مزید داستان پڑھیے اگلے ماہ کے شمارے میں.....

کمرے میں ہے..... میں نے احتجاج کیا۔ ”اس کمرے میں!“ اشارہ کر کے میں نے اس سے کہا۔ وہ عربی میں کچھ بڑبڑائی اور باہر جا کر مصطفیٰ کو لے کر آئی۔ میں نے لپک کر اسے اٹھایا اور دوسرے دروازے کی طرف چل دی۔ وہاں کئی لوگ تھے..... دو ایک عورتیں بھی تھیں، وہ سب لوگ پولیس کی وردیوں میں تھے یا غالباً رپورٹ سیکورٹی کی۔

”یہ سوٹ کیس آپ ہی کا ہے ناں میڈم..... رانیہ دانیال!“ اس نے میرے ہاتھ سے پاسپورٹ لے کر کھول کر اس میں سے میرا نام پڑھا۔

”جی!“ میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ وہیں پر موجود لوگوں میں سے دو کے ہاتھ میں کیمرے تھے، وہ غالباً وڈیو بنا رہے تھے، دونوں مخالف سمتوں میں کھڑے تھے۔

”آپ کو پورا یقین ہے کہ یہ آپ کا سوٹ کیس ہی ہے؟“ پھر سوال کیا گیا۔

”جی مجھے پورا یقین ہے.....“ میں نے جواب دہرایا۔

”کیا اسے آپ نے خود ہی پیک کیا تھا..... اس میں سارا سامان خود رکھا تھا؟“ عجیب سا سوال تھا۔

”ہاں..... زیادہ تر، ممکن ہے کہ کچھ سامان میرے شوہر نے رکھا ہو۔“ مجھے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس نوعیت کے سوالات کیوں پوچھ رہے تھے وہ۔

”اس بچے کو ذرا وہاں بٹھا دیں!“ ایک آدمی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا، میں نے مصطفیٰ کو پیار سے سمجھایا کہ وہ بیٹھ کر ٹی وی دیکھے اور خود واپس اسی جگہ پر آگئی۔

”کیا آپ اپنے پورے ہوش و حواس میں ہیں رانیہ دانیال؟“

”میرا خیال ہے.....“ میں نے طنز سے کہا۔

”مجھے اپنا خیال نہ بتائیں..... میرے سوال کا سیدھا سا جواب دیں۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”جی.....“ میں ڈر سی گئی، اس کے لہجے میں کچھ



ڈاٹ کام

جیت

عزالہ عزیز

محبت ایک الہامی کیفیت کا نام ہے۔ اسی لیے یہ محبت پر خود بخود آشکار ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے آسمانی تحفہ بھی کہا جاتا ہے۔ اب چاہے محبت حقیقی محبوب سے ہو یا مجازی، بندے کو کشف عطا کرتی ہے۔

محبت میں الہام نہ ہو تو محبت، محبت نہیں ہوتی۔ محض وقتی جذباتی کشش ہوتی ہے جو وقت گزرنے کے بعد اپنا تاثر کھودیتی ہے۔ اور خرد حسن کو صرف

وہ میٹرک میں تھی اور ماں کے اچانک انتقال کے بعد بڑے بھائی اسد اور نرما بھابی نے ہی اسے اس عظیم صدمے کو برداشت کرنے کا حوصلہ اور ڈھارس دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کی زندگی کا یہ بڑا خلا رفتہ، رفتہ صبر سے پُر ہونے لگا۔ میٹرک کے بعد خرد نے کالج میں ایڈمیشن لینا تھا اور اسد نے اس ذمے داری کو بخوبی نبھایا تھا۔ اس کے کالج آنے جانے کے لیے دین بھی لگوادی۔

جبکہ حشام اس وقت میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر بننا اس کا خواب تھا۔ حالانکہ حسین احمد کی خواہش تھی کہ وہ ان کا بزنس سنبھالے لیکن حشام کے شوق اور رجحان کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اکلوتے بیٹے کے ساتھ زبردستی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کیونکہ خرد سے رشتے طے ہونے پر حشام نے ان کی خواہش اور فیصلے کا مان رکھا تھا۔ حالانکہ وہ اپنی کلاس فیلو مائرہ کو پسند کرتا تھا۔ مائرہ بھی اسے پسند کرتی تھی اور شاید دونوں مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس سے پہلے ہی حسین احمد نے حشام کو اپنی بھانجی کے ساتھ منگنی کے رشتے میں باندھ دیا۔ چونکہ فی الحال وہ اپنا سارا فوکس اپنی اسٹڈیز پر رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے خاموش تھا اور اس خاموشی میں کون سا طوفان پنہاں تھا۔ یہ کون جانتا تھا۔

جبکہ خرد، حشام سے رشتہ جڑنے کے بعد کون سے اپنی اسٹڈیز میں مگن ہو گئی۔ البتہ منگنی کے بعد بھی حشام اور اس کے درمیان تکلف اور گریز کی لکیر حائل تھی۔ اور خرد کو حشام کا منگنی کے بعد بھی یہ گریز اور لیا دیا سا انداز اور سنجیدہ رویہ اکثر بے چینی میں جتلا کر دیتا کہ حشام کی اس رشتے میں خود اپنی مرضی شامل ہے یا نہیں..... مگر وہ اس سلسلے میں نہ کبھی نرما بھابی سے بات کر سکی اور حشام سے بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ حشام

محبت نہیں ہوئی تھی، محبت میں الہام بھی ہونے لگے تھے۔ حشام کہاں ہے، کیا کر رہا ہے..... کب اسپتال کے لیے نکلتا ہے، خرد کو سب پتا چل جاتا تھا۔ حالانکہ وہ اس کے پڑوس میں رہتا تھا نہ ہی محلے میں اور اسے تو حشام کی روٹین کا بھی علم نہیں تھا۔ یقیناً اس کی چھٹی حس بہت اسٹراٹجک تھی یا شاید محبت ہو تو الہامی کیفیت اور حساسیت خود بخود بندے میں بیدار ہو جاتی ہیں۔ خرد حسن کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ تھا۔ محبت میں ہونے والے الہام نے اس کے دامن میں دائمی خوشیاں ڈالنے کے بجائے اس کی ذات کو عمر بھر کا روگ لگا دیا۔

☆☆☆

حشام حسین کا تعلق اپرٹل کلاس سے تھا۔ حشام کے والد حسین احمد کا اپنا گارمنٹس کا بزنس تھا۔ حسین احمد کے دو بچے تھے۔ حشام اور نرما..... نرما، حشام سے بڑی تھی۔ نرما کی اپنے پھوپھی زاد اسد سے شادی ہوئی تھی۔ ان کے دو بچے تھے۔ وہ اسد کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ اسد اس سے بہت محبت کرتا تھا۔

خرد حسن، اسد کی چھوٹی بہن تھی۔ اسد اور نرما کی شادی کے وقت حسین احمد نے بیوہ بہن کی بیٹی خرد کو حشام کے ساتھ منسوب کر دیا تھا۔ اس وقت حشام میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اگرچہ اسے اپنی اسٹڈیز ختم ہونے سے پہلے ایسے کسی سلسلے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر باپ کے اصرار اور خواہش پر اس نے چپ چاپ اس رشتے کو قبول کر لیا..... مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ حشام کے دل میں کیا ہے، وہ خرد حسن کے لیے اپنے دل میں کیا جذبات رکھتا ہے۔ البتہ خرد، ماں اور ماموں کے طے کیے اس رشتے سے خوش تھی کیونکہ جس شخص کو اس نے اپنے لیے خدا سے دعاؤں میں مانگا تھا۔ وہ اسے بنا کسی مشکل کے مل گیا تھا۔

سے بات کرتے ہوئے بہت گھبراتی تھی یا پھر اسے کھودینے کے خوف نے خرد کے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا دی تھی۔ مگر اس کی چھٹی حس کہتی تھی کہ حشام اور اس کے درمیان وہ بیٹھا سا تعلق نہیں ہے جو منگنی جیسے رشتے میں بندھنے کے بعد دونوں فریقین کے درمیان خود بخود بن جاتا ہے۔

شاید اس لیے کہ محبت تو اسے ہوئی تھی حشام سے..... حشام کو تھی یا نہیں اور محبت میں اب الہام بھی ہونے لگے تھے۔ اور اپنی اس کیفیت سے اسے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔

☆☆☆

منگنی کے بعد بہت سے دن بے کیف گزر گئے تھے..... جب ایک دن نرمابھابی نے اس سے وہ سوال کر لیا۔ جس کا جواب اسے ہمیشہ سے مشکل لگتا تھا۔ وہ اپنی اسٹڈیز میں جی جان سے محنت کر رہی تھی تاکہ اچھی پوزیشن لے کر پاس ہو سکے اور میڈیکل کی تعلیم کے لیے کوالیفائی کر سکے۔ وہ حشام کی طرح ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔

وہ اپنے روم میں بیٹھی کیمسٹری کا جنرل لیے تھیوری لکھ رہی تھی۔ جب نرمابھابی اس کے روم میں چلی آئیں۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ ”خرد..... تم اس رشتے سے خوش تو

ہو ناں.....؟“ اور نرمابھابی کے اس اچانک سوال نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا..... وہ مزا جا بہت خاموش طبع اور اپنی ذات میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔ نرمابھابی کے سوال پر خاموشی سے انہیں تکتے لگی۔ جبکہ بھابی مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑا دودھ کا گلاس انہوں نے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور خود خرد کے سامنے بیڈ پر کچھ فاصلے پر بیٹھ گئیں۔

”یہ سوال تو آپ کو اپنے بھائی سے پوچھنا چاہیے تھا..... جس نے ابھی تک اپنے دل کی خبر کسی کو

جیت

لگنے نہیں دی ہے۔ اس کے دل میں کیا ہے..... وہ اس رشتے کے حوالے سے کیا احساسات رکھتا ہے؟“ اس نے نرمابھابی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا تھا مگر کہا نہیں..... اور نرمابھابی اس کی خاموشی کو شرم و جھجک سمجھ رہی تھیں۔

”کیا ہوا..... اس طرح کیا دیکھ رہی ہو..... میں تمہاری بھابی ہی نہیں کزن بھی تو ہوں، تم چاہو تو دوست سمجھ کر اپنے دل کی بات شیئر کر سکتی ہو۔ ابھی سے مجھے نند سمجھنے کی تو ضرورت نہیں ہے۔“ نرمابھابی نے شرارت سے مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا تو وہ جھینپ کر مسکرانے لگی۔

”جی بھابی..... کالج میں کوئی دوست نہیں بنائی ہے میں نے..... آپ جو ہیں..... رہی بات حشام کی تو اگر وہ مجھے پسند نہ ہوتے تو یہ منگنی کی انگلی میری انگلی میں نہ ہوتی۔“ اور یہ بات اس نے نرمابھابی کے سامنے بڑی مشکل سے کہی تھی۔ جسے سنتے ہی نرمابھابی نے اختیار اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

”میں جانتی تھی..... میرے اتنے ہینڈسم اور اسمارٹ سے بھائی کو بھلا کوئی لڑکی ناپسند کر سکتی ہے۔“ نرمابھابی نے پرجوش لہجے میں کہا تو خرد ایک بار پھر جھینپ کر مسکرانے لگی۔ جبکہ نرمابھابی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا..... تم اپنا کام کرو..... لیکن یہ دودھ ٹھنڈا ہونے سے پہلے پی لینا۔ اور ہاں..... رات دیر تک جاگ کر اسٹڈیز مت کرنا..... جلدی سو جانا ورنہ آنکھوں کے گرد ڈارک سرکلو بن جائیں گے اور میں اپنی ہونے والی بھابی کو ہمیشہ خوب صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔“ نرمابھابی نے شرارت پر خرد بلیش کر گئی تھی۔

”کیا مجھے اس بارے میں حشام سے بات کرنی چاہیے۔“ بھابی کے کمرے سے جانے کے بعد وہ اپنے اور حشام کے بارے میں سوچنے لگی۔ خرد نے ایک لمحے کے لیے دل میں سوچا تھا مگر پھر وہی خوف

یقین کو حوصلہ ہی عطا کر دو۔“ حشام..... کی گبھیہر ہوتی
خاموشی پر ماثرہ نے لجاجت سے کہا۔

”مجھے بھی انتظار رہے گا ماثرہ..... تمہاری محبت
میں یہ کمال کب ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھے تمہارے یقین
پر کوئی شک نہیں ہے۔“ حشام کی پرسکون آواز نے
ان کے درمیان قائم خاموشی اور سکوت توڑا تھا۔

”اور محبت.....! تمہیں اپنی محبت پر ایسا یقین
نہیں ہے شام.....؟ کیا تمہاری محبت میں اتنی طاقت
نہیں ہے کہ وہ وقت کے فیصلے کو اپنی خواہش کی شدت
سے بدل دے۔“ ماثرہ نے برجستہ کہا تو حشام اسے
سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔

”آئی ایم سوری ماثرہ..... یہ میرے ماں،
باپ کا فیصلہ ہے، ان کی خواہش ہے جسے میں رد
نہیں کر سکتا..... میں کتنا بھی چاہوں لیکن انہیں مایوس
کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکوں گا مگر میں تقدیر کے فیصلے
بدلنے پر قادر نہیں ہوں۔ اگر میری اور تمہاری قسمت
میں ہجر و فراق لکھا ہے تو میں تو کیا کوئی بھی تقدیر کے
فیصلے کو ٹال نہیں سکتا سوائے ایک ذات کے..... بس
اب میرے اور تمہارے درمیان ہمارا مقدر اور وقت
فاصلوں کی دیوار بن کر حائل ہے۔ اور یہ دیوار کب،
کیسے گرتی ہے۔ اس کا فیصلہ وقت اور قدرت ہی
کرے گی۔ میرا یہ یقین ہے۔“

اور حشام کے جواب نے اسے لاجواب
کر دیا۔ واقعی تقدیر کے فیصلے اوپر آسمان پر ہوتے
ہیں۔ اور آسمانی فیصلے چیلنج کرنے کی اس کی اوقات
نہیں تھی لیکن اسی آسمانوں پر بیٹھے طاقتور ہستی جس
کے ہاتھ میں ہر انسان کی طرح اس کی تقدیر کی ڈور
بھی تھی تھی۔ اسے اپنے اس رب کی رحمتوں پر پورا
بھروسا تھا۔ دعا مانگنا بھی تو اسی کا حکم ہے۔ اگر حشام
اس کے نصیب کا ستارہ نہیں تھا تو اس کے سچے
جذبوں کی شدت تقدیر کے فیصلے کو بدلنے پر مجبور
ہو جائے شاید..... یہ ماثرہ کی سوچ اور خواہش تھی۔

کی کیفیت نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اگر حشام
نے اس کا من چاہا جواب نہیں دیا تو وہ کیا کرے گی۔
کیا حشام کی محبت سے دستبردار ہونے کا حوصلہ ہے
اس میں.....؟ یہ اور ایسی بہت سی پریشان کن سوچوں
نے اس کے ذہن کے گرد اپنا جال بُنا شروع کر دیا
تھا مگر فی الحال وہ اس بارے میں مزید گہرائی میں جا
کر سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے سر جھٹک کر اپنے
کام میں مصروف ہو گئی۔ ابھی بہت وقت پڑا تھا.....
سو سب کچھ وقت اور حالات پر چھوڑ کے زبردستی دل و
دماغ کو اپنی اسٹڈیز پر مرکوز کرنے کی کوششیں
کرنے لگی۔

☆☆☆

”تم سوچ بھی نہیں سکتے شام..... تمہیں پالینے
کی خواہش کی تکمیل میرے لیے کسی معجزے سے کم نہ
ہے..... میں سچائی جانتی ہوں۔ مگر مجھے اپنے
جذبوں کی صداقتوں پر بھی پورا بھروسا ہے..... تم
چاہے کسی سے بھی منسوب ہو جاؤ۔ میری محبت کی
شدت ایک دن اپنا آپ منوالے گی..... میں اپنے
رب کے معجزوں سے مایوس نہیں ہوں اگر اس کی
رحمت میرے ساتھ رہی تو میں کبھی مایوس نہیں ہوں
گی۔ بس اب یہ دیکھنا ہے کہ میرے یقین کو کب
کامیابی میں بدلنا ہے۔ میری محبت میں کب یہ کمال
ہوتا ہے۔“

اور حشام حسین سامنے بیٹھی ماثرہ کے پریقین
لہجے اور پُر اعتماد انداز کو دیکھ رہا تھا۔ وہ حشام کی کلاس
فیلو تھی۔ اپنے ماں، باپ کی اکلوتی، لاڈلی بیٹی اور
حشام کی بہترین دوست تھی..... وہ کبھی کبھی حشام کو
شام کہا کرتی تھی اور حشام اس کے یقین کو دیکھ کر سوچ
میں پڑ گیا تھا کہ جیت کس کی ہوگی۔ ماثرہ کے یقین
اور بھروسے کی یا پھر اس کے ماں، باپ کے فیصلے کی
جو خرد حسن کی صورت میں اس پر مسلط کیا گیا تھا۔
”تم کچھ نہیں کہو گے شام.....! کم از کم میرے

READING
Section

158 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

بجئے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ نرمابھابی کے اصرار پر اچھی طرح تیار ہوئی تھی۔ پنک شیفون کی فراک اور تنگ پاجامے کے ساتھ بڑا سادو پٹالیے، ہونٹوں پر پنک نیچرل لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل کی لکیریں سجائے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ بس یہی اس کی تیاری اور پارٹی میک اپ تھا۔ وہ ہمیشہ سے اتنی ہی سہل رہتی تھی۔ اور آئے دن نئے نئے بدلتے فیشن سے اسے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ وہی لباس پہنتی جو اس کی شخصیت سے میچ کرتا..... لیکن اس سادگی میں بھی وہ دیکھنے والوں کے لیے بے حد کشش اور انفرادیت رکھتی تھی۔

برتھ ڈے کا انتظام لان میں کیا گیا تھا۔ گھڑی کی سوئی کے چھ کے ہندسے پر پہنچتے ہی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خرد، نرمابھابی اور اسد لان میں مہمانوں کی آمد کے منتظر تھے اور جس کا شدت سے انتظار تھا وہ شاہکار بالآخر اپنی تمام تر وجاہت اور پروقار شخصیت کے ساتھ خرد کے سامنے موجود تھا۔ حشام، ماموں، ممانی کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔ حشام نے بلیک شلوار قمیص پہن رکھی تھی وہ دراز قد تھا۔ سلیقے سے جمے ہوئے بال اور نکھری ہوئی رنگت، ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ اسے نمایاں کر رہی تھی۔ تب ہی نرمابھابی نے شرارت کی۔

”آج تو تم دونوں ماشاء اللہ جاند، سورج کی جوڑی لگ رہے ہو، حشام کو تو کالا ٹیکا بھی لگانے کی ضرورت نہیں ہے کہیں کسی حسینہ کی نظر بد نہ لگ جائے میرے ہینڈسم سے بھائی کو۔“

اور ساتھ کھڑی خرد کے ساتھ، ساتھ دوسرے لوگ بھی مسکرانے لگے تھے۔

”چلو..... حشام کی تو خیر ہے..... اس نے پہلے ہی بلیک ڈریس پہن رکھا ہے لیکن میری معصوم سی نند کا کیا ہوگا۔ اسے تو میں کالا ٹیکا لگانا بھول گئی ہوں۔ حشام..... اب تم خرد کے ساتھ، ساتھ

”تم نے ٹھیک کہا شام..... ہم قدرت کے فیصلوں سے نہیں لڑ سکتے..... مگر اپنے جذبوں کی سچائی اور دعا سے ضرور جیت سکتے ہیں۔ اب دعا ہی میرے اور خرد حسن کے حق میں صائب فیصلہ کرے گی۔ جس کی دعاؤں میں زیادہ شدت و طاقت ہوگی۔ جیت اسی کا مقدر بنے گی کیونکہ میں تمہاری محبت سے دستبردار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“ مائرہ نے مسکراتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا تو حشام بھی نرمی سے مسکرانے لگا۔ اسے مائرہ کی محبت اور یقین دونوں پر بھروسا تھا پھر اسے بے سکون اور فکر مند ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

”چلیں..... کافی دیر ہو گئی ہے کلاسز آف ہوئے۔ اب ہمیں گھر چلنا چاہیے۔“ حشام نے کلانی پر بندھی رسٹ واچ پر نگاہ کرتے ہوئے کہا تو مائرہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کیمپس کے سب سے پُرسکون اور سرسبز گوشے..... (لان) میں رکھی بیچ پر بیٹھے تھے۔ وہ دونوں اکثر اپنا فری ٹائم ایک دوسرے کے ساتھ اسی جگہ شیر کرتے تھے اور اب دونوں ایک ساتھ اٹھ کر کیمپس کے پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

بلال کی برتھ ڈے تھی۔ گھر پر تمام قریبی رشتے دار اکٹھا تھے۔ حشام اور اس کی فیملی بھی انوائٹڈ تھی۔ خرد نے نرمابھابی کے ساتھ مل کر خود پورے گھر کو سجایا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی اور نرمابھابی اس کے چہرے پر چھلکتی خوشی دیکھ کر حشام کے حوالے سے اسے وقتاً فوقتاً چھیڑ بھی رہی تھیں اور وہ بس مسکرا کر رہ جاتی۔ اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ چونکہ حشام اس کے بچوں کا اکلوتا ماموں تھا۔ اس لیے نرمابھابی سے بلال کی برتھ ڈے میں شریک ہونے کی خاص تاکید تھی۔ حشام بھی اپنے بھانجے، بھانجی سے خاصا اٹیچڈ تھا۔ اس لیے اس کا آنا ضروری تھا خرد کو شام کے چھ

رہنا..... تاکہ کسی کی بری نظر نہ لگ سکے میری پیاری سے بھابی کو۔“

اور لفظ بھابی پر خرد بری طرح بلش کر گئی..... حسین احمد کے ساتھ عذرا بیگم اور اسد بھی نرمہ کی بات پر مسکرانے لگے جبکہ حشام یوں ہی پروقار سے سنجیدہ انداز میں کھڑا رہا۔ مسکراہٹ ہونٹوں سے غائب تھی۔ اس نے بس ایک نظر نرمہ کے ساتھ کھڑی گلابی ڈریس میں گلاب کی کلی کی طرح کھلتی خرد کی طرف دیکھا تھا پھر لان کی ارتجمنٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”آپی..... بلال اور عینی کہاں ہیں، نظر نہیں آرہے؟“ حشام نے نرمہ سے پوچھا۔

”وہ اپنے روم میں میڈ کے ساتھ ہیں، آپ لوگ ادھر لان میں بیٹھیں، میں اور اسد انہیں لے کر آتے ہیں۔ بس آپ لوگوں کے آنے کا انتظار تھا۔ خرد..... تم امی، ابو اور حشام کو لے کر چلو..... ہم بس ابھی آتے ہیں۔“ نرمہ بھابی نے پاس کھڑی خرد سے کہا..... اور خود اسد کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ گئی تو خرد نے کن آنکھوں سے سامنے کھڑے حشام کی طرف دیکھا مگر وہ کسی اور جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ تجل سی ہو کر ان کی طرف بڑھی۔

”چلیں ممانی..... آپ لوگ وہاں چل کر بیٹھیں۔“ ”ضرور بیٹا..... ویسے آج تم واقعی بہت پیاری لگ رہی ہو، نرمہ ٹھیک کہہ رہی تھی..... کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔“

عذرا بیگم نے پیار سے دیکھتے ہوئے اس کے نرم ہاتھوں کو تھام کر کہا تو وہ واقعی جھینب کر رہ گئی۔ جبکہ حشام پہلے ہی لان میں سیٹ کی گئی کرسیوں کی جانب بڑھ چکا تھا۔

☆☆☆

بلال کی برتھ ڈے کا چھوٹا سا فنکشن اپنی تمام تر رونقوں کے ساتھ بالآخر رات بارہ بجے اختتام کو پہنچا

تھا۔ سب مہمان اپنے گھروں کو جا چکے تھے..... وہ اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی خود کو مرر میں دیکھ رہی تھی۔ ایک کٹنے سے پہلے نرمہ بھی نے اسے موٹیے کے کنگن پہنائے تھے جو عذرا بیگم، نرمہ اور خرد کے لیے لائی تھیں۔ وہ ہاتھوں کی کلائی میں پڑے ان ہی کنگن سے کھیل رہی تھی۔ برتھ ڈے کی تقریب میں تقریباً سب نے ہی ستاشی نگاہوں سے اس کی ذات کو اعتماد بخشا تھا۔ سوائے حشام کے جس نے حق رکھنے کے باوجود اس کے لیے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

حالانکہ وہ تقریب کے آغاز سے حشام کے چند لفظوں کی پزیرائی اور چند لمحوں کی رفاقت کی آرزو مند رہی تھی مگر حشام تو نرمہ بھابی کے دیے گئے موقعوں کے باوجود اس کے قریب پھنکا تک نہیں تھا اور حشام کا یہ گریز خرد کو اپنے اندیشوں اور واہموں کی سچائی پر یقین کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس ایکٹو ہو کر الارم دینے لگی کہ کہیں کچھ غلط ضرور ہے۔

حشام کا اس سے گریز اسے سب کچھ سمجھانے کے لیے کافی تھا۔ ان کے درمیان بندھے اس خوب صورت ترین رشتے میں حشام کی مرضی اور پسند شامل نہیں ہے۔ وہ کب تک اپنے دل کی تسلی کے لیے اپنے ذہن میں آنے والی منفی سوچوں کو لفظوں کی جھوٹی تسلی دے کر جھٹک سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی چھٹی حس اسے کبھی غلط سگنلز نہیں دیتی۔ شاید یہی سوچ کر اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو ستاروں کی طرح چمکنے لگے۔ جنہیں وہ اندر ہی اندر پینے کے جتن کر کے ہلکان ہو رہی تھی کہ مبادا نرمہ بھابی نہ آجائیں اسے روتے دیکھ کر جانے کیا سمجھیں۔

خود کو لاکھ سمجھانے پر اس کا دل دہائی دے رہا تھا کہ آخر اس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ہر پسندیدہ شے اس سے چھن جاتی ہے، پہلے ماں، باپ

READING
Section

160 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

موسم ہو، حشام کا میڈیکل ہو چکا تھا اور وہ آج کل ہاؤس جاب کے آخری مراحل میں تھا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ ملک سے باہر جا کر میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا تھا۔ البتہ گھر والے چاہتے تھے کہ حشام شادی کر کے باہر جائے، خاص طور پر اسد، حشام کے باہر جانے کا سن کر روایتی طور پر بہن کے حوالے سے طرح، طرح کے خدشات میں مبتلا ہو گیا جیسا کہ ملک سے باہر جانے والے نوجوانوں کے حوالے سے ماں، باپ اور ان کے رشتے داروں کو تحفظات ہوتے ہیں لیکن حشام نے یہ کہہ کر شادی سے فی الوقت منع کر دیا کہ ابھی خرد کی میڈیکل کی تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے۔ وہ اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا۔ دوسرے خود اسے بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے یکسوئی درکار ہوگی جبکہ شادی شدہ زندگی ایک فل ٹائم ذمے داری ہوتی ہے اور اس معاملے میں خرد نے بھی حشام کو ہی سپورٹ کیا تھا۔ سو باقی لوگ بھی سمجھ گئے تھے کہ حشام اپنی جگہ درست ہے۔ باہر سے میڈیسن میں ڈگری لینا آسان کام نہیں تھا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ خرد اپنے ذہن و دل میں جاری کشمکش اور خدشوں کا خاتمہ چاہتی تھی جو اسے حشام کے گریز کی وجہ سے مستقل لاحق تھے۔ وہ اگلے مزید چند اور سال حشام کی طرف سے ان خدشوں اور واہموں کی سولی پر لٹکتے رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے بالآخر حشام سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ جاننا چاہتی تھی کہ والدین کے طے کیے ان کے اس رشتے میں حشام کی اپنی کیا مرضی اور پسند کس حد تک شامل ہے۔ وہ اپنی چھٹی حس کی مسلسل تہیہ کرتی سچائی کو چاہ کر بھی جھٹلا نہیں سکتی تھی جو ہمیشہ اسے صحیح وقت پر غلط ہونے کا الارم دیتی تھی۔

ان دنوں حشام یو کے جانے کے لیے اپنے ضروری کاموں میں مصروف تھا اور وہ آج اس سے

اور اب حشام..... وہ کوئی شے نہیں تھے، جیتے جاگتے انسان تھے۔ جو خرد کی متاع جان کی حیثیت رکھتے تھے۔ ماں، باپ کی جدائی تو محضت ایزوی تھی لیکن حشام کو، کون سی نا دیدہ قوت اس سے چھین کر دور لے جا رہی تھی۔

خرد کی سوچیں قیاس کے اس ایک نقطے پر آ کر جم کر رہ گئیں کہ حشام کی زندگی میں کوئی اور ہے..... جس نے اس کے دل و دماغ پر پہلے ہی سے اپنے نام کی مہر ثبت کر دی ہے۔ اب خرد کا حشام کے دل تک رسائی کا داخلہ ممنوع قرار دیا ہے۔ اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی یا شاید اس میں ابھی اس تلخ سچائی کو فیس کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ بے دلی سے ڈرینگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ کر واش روم کی جانب بڑھ گئی..... آنکھوں میں شدید جلن جو ہو رہی تھی۔

☆☆☆

خرد نے بھر پور محنت سے ایف ایس سی کا ایگزام دیا تھا اور شاندار رزلٹ کے ساتھ اس کی محنت رنگ لائی تھی۔ اس کے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن کے چانسز روشن ہو چکے تھے۔ سب نے اس کی اس شاندار کامیابی پر مبارک باد دی تھی۔ جس میں حشام بھی شامل تھا اور اس نے خرد کو پاس ہونے پر گفٹ بھی دیا۔ نازک سی قیمت پر برانڈڈ رسٹ واچ تھی۔ اور یوں حشام کے ذرا سے التفات نے خرد کی پچھلے دنوں کی ساری مایوسی کو ختم کر ڈالا تھا۔ وہ پھر سے خوش فہمی کی خوشنما دنیا میں کھونے لگی۔ حشام کے اپنی ذات سے متعلق روکھے بھکے روتے کو وہ اس کا مزاج جان کر خود کو خود ہی مطمئن کرنے لگی۔ یہ سوچ کر کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان کا رشتہ بھی مضبوط ہو جائے گا۔ اور وقت کا کام تو گزرتا ہی ہوتا ہے۔ لہذا چار سال یوں گزر گئے جیسے زندگی دھوپ چھاؤں کا

”بہت جلدی خیال آگیا تمہیں اس بات کا..... مگر اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔“ خرد جو دم سادھے کھڑی حشام کے جواب کی منتظر تھی اس کے لبوں سے نکلے جملوں کی کاٹ سے اندر ہی اندر ٹوٹنے لگی..... جس بات کا اسے ڈر تھا۔ وہ ہونے جا رہی تھی۔ وہ حشام کی زبان سے وہ سب کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ جو وہ اس کے رویے کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ لیکن اس کے لہجے اور زبان سے نکلے لفظوں سے اس کے بدترین خدشات حقیقت میں بدلتے نظر آنے لگے تو اس نے ہراساں ہو کر اس کی طرف دیکھا..... پھر اپنے ٹوٹے حوصلوں کو مجتمع کر کے بولی۔

”مگر اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے اور ہم دونوں اتنے کمزور بھی نہیں کہ وقت کے فیصلوں کو اپنے تابع نہ کر سکیں، کم از کم میں تو اتنی کمزور نہیں ہوں۔“

خرد کے اندر ہی اندر ٹوٹے حوصلوں نے اس کے سامنے اس حساس معاملے میں دنیا کی کمزور ترین لڑکی کو بہت مضبوط اور بہادر بنا دیا کیونکہ معاملہ اب اس لڑکی کی خودداری اور نسوانی انا کا تھا اور اس معاملے میں وہ کسی قسم کے سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھی۔ کسی کی ذات پر زبردستی مسلط ہونا اسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔ جبکہ حشام چند لمحوں کے لیے چپ رہ گیا تھا۔ خرد نے گیند اس کے کورٹ میں پھینک دی تھی۔

”سچائی چاہے کتنی بھی تلخ ہو..... میں آپ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں حشام..... پلیز..... مجھ سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش مت کیجیے گا۔ میں سچ سننے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔“ اور حشام کے لیے اب مزید خاموش رہنا ممکن نہیں رہا۔

”ٹھیک ہے، میں بھی تمہیں اندھیرے

حتمی بات کرنے آئی تھی۔ حشام اپنی اسٹڈی میں تھا جب وہ ممانی جان کو بتا کر اس کے پاس چلی آئی۔ وہ انگلیوں سے ہلکی دستک دے کر اندر چلی آئی تھی۔ لیپ ٹاپ پر جھکا کام کرتا حشام حیرانی سے سامنے کھڑی خرد کو دیکھ کر چونکا تھا۔

”تم..... اس وقت.....؟“ حشام نے بے ساختہ کہا تھا کیونکہ اس سے پہلے وہ کبھی اس طرح اس کی اسٹڈی میں نہیں آئی تھی۔

”جی..... مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔“ خرد کی سنجیدگی سے کہی بات پر حشام سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے..... آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ حشام نے ایک صوفے کی جانب اشارہ کیا تھا مگر وہ بدستور وہیں کھڑی رہی تھی۔

”نہیں..... میں بس یوں ہی ٹھیک ہوں..... میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔“ خرد نے سنجیدگی سے کہا تو حشام نے بھی جواباً سنجیدگی اختیار کی۔

”ٹھیک ہے..... کہو..... کیا کہنا چاہتی ہو، میں سن رہا ہوں۔“ وہ لیپ ٹاپ آف کر چکا تھا۔ وہ ہاتھوں کو مسلنے لگی۔ وہ ہمت کر کے یہاں آ تو گئی تھی لیکن اب حشام سے سوال، جواب کرنے کا حوصلہ ٹوٹنے لگا تھا جبکہ حشام بدستور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تب خرد کو اپنا حوصلہ خود ہی بڑھانا پڑا۔

”میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں حشام..... کہ کیا میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ طے پایا ہے اس میں آپ کی مرضی اور پسند شامل ہے؟“

بالآخر، خرد نے کہہ ڈالا تھا اور حشام نے چونک کر اسے ایسے دیکھا جیسے اسے خرد سے اس سوال کی توقع نہیں ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی پیشانی پر خود بخود ناگواری کی لکیریں ابھر آئیں۔ اور وہ اپنے رویے

آمنہ ولید لاہور اور

درنگ (نازیہ) کے نام

کچھ لوگوں کے لیے ہاتھ اٹھانے نہیں پڑتے ان کے لیے دعا دل سے نکلتی ہے اور آپ دونوں کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ میری دعاؤں میں آپ دونوں ہمیشہ شامل رہو گی۔

میری سوچیں، میرے لفظوں کا

جب روپ دھار لیتی ہیں تو

تمہاری تصویر بنتی ہے

منجانب: فریحہ شبیر، شاہ نکلڈر

حاصل سبق

ستم کے موتی پرو کے ہم نے
اذیتوں کی بنی ہے مالا
وہ جس کو مانا تھا اپنا محسن
اسی ستم کرنے مار ڈالا
نہ چننا راہیں محبتوں کی
وہاں کی کلیاں بھی کاتوں سی ہیں
بھلا چکے ہیں جو مجھ کو کب سے
بس ان کی یادوں کو ہم نے پالا
نہ ہونا خوشیوں میں خوش کسی کی
نہ بانٹنا غم کسی سے اپنا
بہت ستاتی ہیں ان کی یادیں
لگائیں جب وہ دلوں پہ تالا
وہ جس سے کہتے تھے سب فسانے
وہ جس کو سمجھے تھے خضر اپنا
اسی مسافر نے رہ بدل لی
ہمیں ویرانوں میں جھونک ڈالا

پسند: فریح طاہر لاہور

میں رکھنا نہیں چاہتا۔ نہ ہی اپنے بڑوں کے طے کیے ہوئے اس رشتے کو جھوٹ سے شروع کرنا چاہوں گا، تمہیں سچائی کا علم ہونا چاہیے۔“ اور حشام کے لب کھلتے ہی خرد کو اپنے وجود سے جان اور روح کھینچتی ہوئی محسوس ہوئی جو الہام اسے ہوتے تھے اس کی سچائی بس چند لمحوں میں خرد حسن کے زندہ وجود کو بے جان کرنے کے لیے کافی تھی۔ حشام چند لمحوں بعد بولا تھا۔

”میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا خرد، یہ رشتہ میں نے صرف اور صرف امی، ابو اور آپ کی وجہ سے قبول کیا ہے، اس میں میری مرضی اور پسند کو ہرگز دخل نہیں..... سچ تو یہ ہے کہ میں اپنی کلاس فیلو مائرہ کو پسند کرتا ہوں، ہماری بہت دوستی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں مگر میں امی، ابو اور نرما آپ کی کو بھی مایوس کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنا اور تمہارا یہ رشتہ ضرور نبھائوں گا۔“ اور خرد حسن کے وجود کی مضبوط عمارت ٹوٹ کر دھڑام سے اس کے اندر ہی گری تھی۔ جس کی تباہی حشام کی آنکھوں سے اوجھل تھی۔ خرد حسن کے الہام نے سارے خدشے سچ ثابت کیے تھے۔ جس بات سے وہ خوف زدہ رہتی تھی آج وہ خوف ہمیشہ کے لیے اپنی موت مر گیا تھا۔ اس لیے اس نے حشام کو اپنا فیصلہ سنانے میں دیر نہیں کی۔

”مگر میں سمجھوتے اور مجبوری میں قبول کی جانے والی نئی زندگی اور اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کروں گی۔ مجھ میں سچائی کا سامنا کرنے کا حوصلہ ہے مگر آپ فکر مت کریں، میں زبردستی آپ کی ذات پر مسلط نہیں ہوں گی۔ مجھے آپ کی ہمدردی یا ترس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ میں آج اور ابھی اس بے معنی رشتے کو ختم کرتی ہوں۔ مجھے آپ

سمجھتی تھی اس لیے اس نے کبھی ہاتھ اٹھا کر حشام کو دعاؤں میں نہیں مانگا تھا۔ حالانکہ سچ تو یہ تھا کہ حشام تو کبھی خرد کا تھا ہی نہیں۔ شاید خرد یہی سمجھتی تھی کہ جو اپنا ہو اسے مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور پھر نصیب کے فیصلوں سے کون لڑے۔ کے جیتا ہے اسے کب معلوم تھا کہ ماثرہ کی دعاؤں نے اپنے نصیب سے لڑ کر حشام کو جیت لیا ہے یا پھر حشام کا ساتھ لکھا ہی ماثرہ کے مقدر میں تھا۔ اور یہ سچ ہی تو ہے، دعاؤں سے تقدیریں بدل جایا کرتی ہیں، کاتب تقدیر تو وہی ہے جو مانگنے پر دینے والا ہے۔ بس مانگ اور طلب میں جذبے کی صداقت اور لگن کے ساتھ دینے والے پر پورا یقین اور بھروسا ہونا چاہیے۔ یوں بالآخر ماثرہ کا اعتقاد جیت گیا تھا۔

☆☆☆

حشام میں اگر ہمت ہوتی تو وہ یہ سچائی اپنے اور خرد کا رشتہ طے ہونے سے پہلے ہی سب کو بتا سکتا تھا مگر یہ بہادری خرد نے دکھائی تھی اس نے حشام سے بات کرنے کے بعد ڈائریکٹ حسین احمد سے بات کی۔ اور انہیں پوری سچائی بتا کر اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جبکہ حسین احمد شرمندہ کھڑے تھے۔

”مجھے معاف کر دیں ماموں..... مگر سچائی جاننے کے بعد میں کبھی حشام کے ساتھ منافقت اور سمجھوتے والی زندگی نہیں گزار سکوں گی۔ چاہے آپ لوگ حشام کو زبردستی ایک بار پھر اس رشتے کو نبھانے پر مجبور کر دیں..... لیکن میں اس رشتے کو قبول کرنے پر مجبور نہیں ہوں..... کیونکہ میری خوشی اس میں ہے کہ حشام جس کے ساتھ بھی رہے خوش رہے۔ چاہے وہ لڑکی کوئی بھی ہو، پلیز..... آپ بھی حشام سے اس کی اس خوشی کو مت چھینے گا۔“ خرد نے ہلچلی لہجے میں حسین احمد سے کہا تھا۔ جو سچائی جان کر اپنی جلد بازی میں کی جانے والی غلطی پر نادام اور خرد کی اس غلطی کو

سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ کیونکہ آپ نے سچ بولا ہے اور مجھے منافقت بھری زندگی سے نفرت ہے۔“ خرد نے اپنی بات مکمل کر کے انگلی سے انگلی اتار کے حشام کے سامنے اس کی اسٹڈی ٹیبل پر رکھی اور تیزی سے مڑ کے اسٹڈی روم سے باہر نکل گئی جبکہ حشام گم صم حیرت زدہ.... اس کمزوری لڑکی کی بہادری اور حوصلے کو دیکھ کر غیر یقینی کیفیت میں گھرا کھڑا رہ گیا۔

وہ مرد ہو کر کمزور نکلا تھا..... اس میں اپنے بڑوں کے سامنے سچ بولنے کا حوصلہ نہیں تھا اور وہ جسمانی طور پر کمزور نظر آنے والی عورت ہو کر بھی چٹانوں جیسے حوصلے کا اظہار کر کے گئی تھی۔ جس نے حشام کو اگلے ہی لمحے اس خوف میں مبتلا کر دیا کہ اب وہ سب کو کیا جواب دے گا۔ اور کہیں اس کے اس عمل سے اس کی بہن نرما اور اسد کے رشتے پر ردِ عمل کے طور پر کیا اثر پڑے گا..... اسد چاہے نرما سے کتنی بھی محبت کرتا مگر اپنی بہن کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ حشام کو اب خود پر غصہ آرہا تھا، اپنے سچ بولنے پر..... کیا تھا جو وہ ساری عمر سچائی چھپا کر خرد کے ساتھ منافقت بھری زندگی گزار دیتا..... مگر وہ یہ سوچتے وقت بھول گیا کہ ماثرہ کے یقین اور بھروسے کی جیت ہوئی تھی۔ جو اسے اپنے رب پر تھا۔ وہ رب جو دعاؤں سے تقدیریں بدل دیتا ہے۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ اب سچائی جاننے کے بعد خرد کبھی اس سے شادی نہیں کرے گی اور سچائی جاننے کے بعد اسد نے بھی اپنی بہن کو اس پر مسلط نہیں کرنا تھا۔ ہاں البتہ پرانے رشتوں میں ضرور اس نئے رشتے کے ختم ہونے سے دراڑ آجانی تھی۔

وہ حیران تھا، ماثرہ کے جذبوں کی صداقت نے اس کے نصیب کو بدل دیا تھا۔ ماثرہ جیت گئی اور خرد کے حصے میں ہار آئی تھی۔ وہ حشام حسین کو اپنا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر سے ہٹالیا تھا اور وہ وہاں سے چلی گئی۔ حسین احمد وہیں کھڑے دیکھتے رہے تھے۔

سدھارنے پر اس کی اعلیٰ ظرفی پر کچھ بھی بولنے سے قاصر رہے تھے۔ پھر چند لمحوں بعد اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

”مگر بیٹا..... میں اسد کو کیا جواب دوں گا۔ اور تمہاری خوشی..... مجھے تو تمہارے ساتھ تمہاری خوشی بھی عزیز ہے۔ اور میں جانتا ہوں تم اس رشتے پر دل سے خوش تھیں۔“ حسین احمد نے افسردگی سے کہا تھا اور خرد سے ماموں کی یہ افسردگی دیکھی نہیں گئی تو برجستہ بولی تھی۔

بعد میں خرد نے کس طرح بھائی کو سمجھا کے راضی کیا۔ یہ الگ کہانی ہے بہر حال یو کے اسپیشلائزیشن کے لیے جانے سے پہلے ماثرہ اور... حشام کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اکھٹا یو کے گئے۔ البتہ حشام نے خرد کا شکر یہ ادا کیا تھا۔ اس نے اپنی اعلیٰ ظرفی اور تدبیر سے حشام کو ساری فیملی کی نظروں میں گرنے سے بچالیا تھا۔ سب کو اس طرح سمجھایا تھا کہ حشام کی ذات پر کوئی آنچ بھی نہیں آنے دی اور اس کی محبت کے ساتھ اس کی خوشیاں بھی لوٹا دیں۔

”میں اب بھی خوش ہوں ماموں..... میرا یقین کریں مجھے اس رشتے کے ختم ہونے کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ جو منافقت اور مجبوری کی بنیاد پر قائم کیا جا رہا تھا۔ حشام کو پہلے ہی آپ کو سچائی بتا دینی چاہیے تھی لیکن حشام نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ صرف اپنی پسند کا اظہار کیا ہے..... اس لیے اسے کوئی سزا بھی نہیں ملنی چاہیے۔ مجھے امید ہے، آپ حشام پر کوئی دباؤ ڈالنے کے بجائے اس کی خوشی اور خواہش کا احترام کریں گے۔ کیونکہ مجھے حشام سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“

وہ عمر بھر کے لیے خرد کا مقروض ہو گیا تھا۔ اگرچہ خرد محبت میں اپنے دل کی بازی ہار گئی تھی مگر اس کی اعلیٰ ظرفی اور بڑے پن نے حشام کا دل جیت لیا تھا۔ وہ پہلے حشام کے دل میں نہیں تھی لیکن اب اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے اپنی جگہ بنا لی تھی۔ وہ ہار کے بھی جیت گئی تھی۔

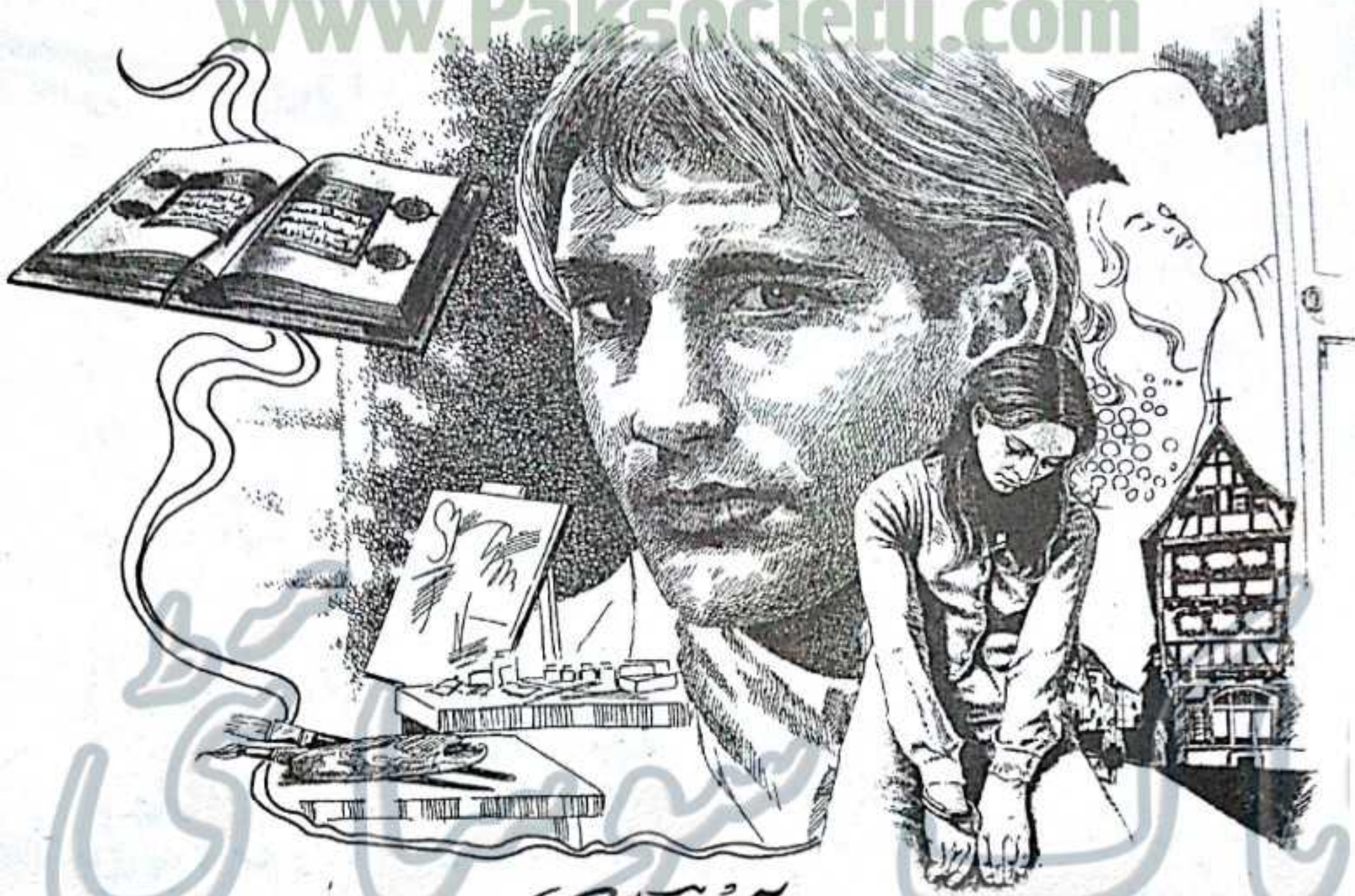
حسین احمد نے محبت سے سامنے کھڑی خرد کو دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے سر پر تھپتھپایا تھا۔ اس نے چھوٹی ہو کر کتنے بڑے پن کا مظاہرہ کیا تھا اس نے حشام اور انہیں شرمندگی سے ہی نہیں بچایا بلکہ تین زندگیوں کو برباد ہونے سے بھی بچالیا تھا مگر حسین احمد کب جانتے تھے کہ اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے دل کو برباد کر لیا ہے جو صرف حشام کے لیے دھڑکتا تھا۔

حشام اور ماثرہ کے جانے کے بعد خرد اپنی اسٹڈیز میں مگن ہو گئی۔ وہ میڈیکل کے فورٹھ ایئر میں تھی۔ اسے حشام کی طرح ڈاکٹر بننا تھا۔ زندگی کے سفر میں بہت سی کامیابیوں کا آغاز کرنا تھا۔ آج اس کی چھٹی حس نے اسے جیت سے ہم کنار کیا تھا۔ وہ اب پرسکون تھی جس کے باعث محبت میں مبتلا ہو کر ہونے والے الہام نے محبت کرنے والے دو انسانوں (حشام اور ماثرہ) کے ایک ساتھ دھڑکنے والے دلوں کو ٹوٹنے سے بچالیا۔ اس سے بڑی اور جیت اس کے لیے کیا ہو سکتی تھی۔ وہ حشام ہی نہیں اپنی ساری فیملی کے دل میں اونچا مقام بنا گئی تھی۔

”جیتی رہو بیٹا..... اللہ تمہارے نصیب روشن کرے..... اور تمہیں ایک ایسے شخص کا ساتھ ملے جو تم کو صرف چاہتا ہی نہیں ہو بلکہ تمہاری قدر بھی کرے، آمین۔“

خرد نے عقیدت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

READING
Section



آخری امید

قطعہ 4

قیصرہ حیات

مکان فانی ، مکین آنی ، ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاودال تو ہے

ایک ایسی لڑکی کی کہانی ... جو حق کی جستجو میں اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اور اس ابدی، لافانی حقیقت کو پالینے کے اس سفر میں اسے جن مسائل، جن شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہماری مصنفہ نے اپنے ماہرانہ قلم سے اسے بہت خوب صورت اور پُر اثر انداز میں اجاگر کیا ہے۔

اس کہانی کی اشاعت نوجوان نسل کی اسلام کے بارے میں معلومات مطالعے اور علم کو مزید وسعت دے گی۔

مایناز مصنفہ کے منفرد اندازِ بیاں کا

ایک اور شاہکار

READING
Section

166 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء



READING
Section

رات کو کیتھی نیٹ پر عبدالرحمن کے ساتھ چیت کرنے میں مصروف تھی اور وہ عبدالرحمن کو اللہ، حضرت محمد اور اسلام کے بارے میں اپنی ریسرچ کے بارے میں بتا رہی تھی اور وہ اس سب کے بارے میں اس کے خیالات جان کر بے انتہا خوش بھی ہو رہا تھا اور حیران بھی۔

”کیتھی..... اس کا مطلب ہے تم بہت جلد مسلمان ہو جاؤ گی۔ یعنی کہ اسلام قبول کر لو گی؟“ عبدالرحمن نے قدرے خوش ہو کر پوچھا۔

”ہاں..... انشاء اللہ.....“ وہ رک، رک کر بولی تو عبدالرحمن مسکرانے لگا۔

”گڈ..... ویری گڈ..... کیتھی تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ تم پر بہت مہربان ہے جو تمہیں ہدایت کے راستے پر لا رہا ہے..... کیتھی اللہ جن لوگوں سے محبت کرتا ہے ان کے دلوں میں اپنی اور اپنے پسندیدہ دین اسلام کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔“ عبدالرحمن نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے اللہ سے..... پیغمبر محمد اور اسلام سے ایک دم بہت محبت ہونے لگی ہے۔“ کیتھی نے مسکرا کر کہا۔

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

”تو..... پھر..... تم کس بات کا انتظار کر رہی ہو؟“ عبدالرحمن نے پوچھا۔

”میں اسلام کے بارے میں اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کر لوں..... پھر۔“ کیتھی نے جواب دیا۔

”تو کیا..... ابھی تک تمہاری اسٹڈی کمپلیٹ نہیں ہوئی؟“ عبدالرحمن نے حیرت سے پوچھا۔

”بہت زیادہ کر لی ہے۔ اسلامک لاز اور اسلامک ہسٹری کے بارے میں ابھی کچھ اسٹڈی رہتی ہے۔ عبدالرحمن میرے لیے یہ بہت بڑا فیصلہ ہو گا۔ اس لیے میں اس کے کسی بھی پہلو کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ مکمل اسٹڈی کرنے کے بعد پھر میں اسلامک سینٹر جاؤں گی۔“ کیتھی نے کہا۔

”او کے..... دیش ویری گڈ۔“ عبدالرحمن نے اس کی سوچ کو سراہا تھا۔ وہ ہمیشہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

”ہاں، مجھے بھی اس دن کا شدت سے انتظار ہے۔“ کیتھی نے مسکرا کر کہا۔

”اور میں اس روز اپنے سب فرینڈز کو مٹھائی کھلاؤں گا۔“ عبدالرحمن نے مسکرا کر کہا۔

”کیوں؟“ کیتھی نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

”جب کسی ایک فرینڈ کو دنیا اور آخرت کی سب سے بڑی خوشی ملے تو دوسرے فرینڈ کو اس کی خوشی کو ضرور سلی بریٹ کرنا چاہیے۔“ عبدالرحمن نے انتہائی خوش ہو کر کہا۔

”تھینک یو ویری مچ، یو آراے ٹرو فرینڈ۔“ کیتھی نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تو عبدالرحمن نے اس کے کمنٹس پر شکر یہ کہا تھا۔

”اچھا تم نے تو یہ بتایا ہی نہیں کہ تمہیں اسلام کی کس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟“ عبدالرحمن نے متحسّس ہو کر پوچھا۔

”Concept of God نے۔“ عبدالرحمن خدا کا ایسا تصور میں نے کسی اور مذہب میں نہیں پڑھا اور پھر یہ کہ حضرت محمد صرف اللہ کے messenger اور پرافٹ (پیغمبر) ہیں Jesus کی طرح گاڈ نہیں۔ جس طرح کسی اسکول کا پرنسپل، ٹیچر کو کلاس میں اسٹوڈنٹس کو پڑھانے کے لیے بھیجتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے حضرت محمد کو ساری دنیا کو تعلیم دینے کے لیے بھیجا ہے جس طرح اسٹوڈنٹس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ٹیچر کا کہنا مانیں اور اس کی عزت کریں۔ اسی طرح اسلام میں حضرت محمد کی باتیں ماننے اور ان کی عزت کرنے کو کہا ہے۔ اصل اتھارٹی تو پرنسپل یعنی اللہ تعالیٰ ہے۔ ٹیچر..... پرنسپل کے آرڈرز کو اسٹوڈنٹس کے لیے convey کر کے انہیں گانڈ کرتا ہے کہ ان

آرڈرز پر کس، کس طرح عمل کرنا ہے۔ حضرت محمد بھی ساری دنیا کو گانڈ کرتے ہیں کہ یہ اسلام کا راستہ ہے اور اس پر چلنے کے لیے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں کہ راستہ آسان ہو جائے۔ انہوں نے تو ہمارے لیے بہت آسانیاں پیدا کی ہیں کہ ہم کسی اور طرف نہ بھٹکیں اور سب سے اچھی بات یہ لگی ہے کہ محمد نے کہیں بھی نہیں کہا کہ میری عبادت کی جائے بلکہ اس بات کو سختی سے منع فرمایا ہے اور میں نے یہ بھی آبز رو کیا ہے کہ آج اتنی صدیاں گزرنے کے باوجود بھی مسلمان ان کی عزت کرتے ہیں اور احترام کرتے ہیں، خدا جان کر عبادت نہیں کرتے بلکہ ان سے محبت کرتے ہیں۔ عقیدت رکھتے ہیں مگر سجدہ وہ صرف 'اللہ' کو کرتے ہیں۔" کیتھی نے قدرے جذباتی ہو کر روانی سے بتایا تو عبدالرحمن انتہائی متوجہ ہو کر دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ دل ہی دل میں وہ حیرت میں بھی مبتلا تھا۔

"ماشاء اللہ کیتھی..... اللہ نے تمہیں کتنا کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم نے واقعی اسلام کے بارے میں ٹھیک پڑھا ہے۔ یہ درست بات ہے جو لوگ Converted مسلمز ہوتے ہیں وہ اسلام کو زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں اور اس پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جزاک اللہ!" عبدالرحمن نے اس کی بھرپور تعریف کرتے ہوئے کہا تو کیتھی بھی خوش ہو کر مسکرانے لگی اور یوں دونوں کافی دیر تک اسلام کے بارے میں خوب ڈسکشن کرتے رہے۔ بلکہ کیتھی ہر روز لائبریری سے جو کچھ اسٹڈی کر کے آتی تو وہ رات کو عبدالرحمن کو ضرور بتاتی اور اگر کوئی پوائنٹ وضاحت طلب ہوتا تو عبدالرحمن اسے گانڈ کرتا اور اس کے ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کے ذہن کی پراگندگی اور تذبذب دور کرنے میں عبدالرحمن کا بڑا کردار تھا۔

☆☆☆

کیتھی نے ان دنوں کالج جانا بالکل چھوڑ دیا تھا جبکہ کالج میں وہ خصوصی طور پر Sculpture making اور پورٹریٹس بنانے کی تعلیم لے رہی تھی مگر جیسے ہی اس نے پڑھا تھا کہ اسلام میں جسے یا مورتیاں بنانا جائز نہیں تو وہ خود بخود رک گئی اور اسے اپنے اس فیصلے پر..... خود بھی حیرانی ہونے لگی کہ اس آرٹ سے اسے بچپن سے لگاؤ تھا۔ وہ اس قدر جذباتی تھی کہ کئی، کئی گھنٹے وہ کوئی ایچ بنانے میں لگا دیتی تھی۔ اسے کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ ہوتا تھا۔ پیسے جمع کر کے وہ آرٹ میٹریل خریدتی تھی۔ اس کا ایک ہی passion تھا آرٹ کی اس فیلڈ میں نام پیدا کرنا اور اب جو اس کی سوچ کا زاویہ بدلا تھا تو خود بخود اس کا انٹرسٹ اس میں کم ہو گیا تھا۔ اب ایک ہی لگن تھی۔ سر پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ اس کی جستجو کا سفر مکمل ہو اور جس ٹریک پر وہ آنا چاہ رہی ہے خدا سے اس راہ میں کامیابی عطا کرے۔

پہلے وہ کالج کے بعد لائبریری جاتی تھی اور اب سارا سارا دن لائبریری میں گزارتی۔ گھر آ کر نیٹ پر ریسرچ کرتی یا پھر عبدالرحمن سے باتیں کرتی۔ عبدالرحمن بھی بہت خوش تھا اور اسے اسلام کی نئی ریسرچ شدہ کتابوں کے بارے میں بتاتا۔ وہ اب جو اپنے کو بالکل بھولنے لگی تھی۔ جب بھی ذہن میں اس کے بارے میں کوئی سوچ آتی تو وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتی کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی تو اس نے اسے چھوڑنا ہی تھا۔ اگر تب وہ اسے چھوڑتی تو شاید جو اپنے لیے یہ شاکنگ ہوتا مگر اب جو اپنے پاس مارینہ تھی اس لیے کیتھی کے چھوڑنے اور جانے کا اسے دکھ نہیں ہوگا۔ اسے جو اپنے کی مارینہ کے ساتھ انچنٹ خدا کی پلاننگ محسوس ہونے لگی اور اس کے بارے میں سوچ کر اس کا دل مکمل طور پر مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

جمعے کی صبح تھی جب کیتھی نے غسل کر کے نیا ڈریس، لوز ٹراؤزر کے ساتھ لانگ شرٹ پہنی، بالوں کو ڈرائے کر کے ان کی پونی بنائی اور اس کا ریف کو سیر پر اچھی طرح لپیٹ کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک خاص چمک پیدا ہونے لگی۔ تبھی عبدالرحمن کا فون آ گیا۔ اس نے اسے مسکرا کر روش کیا۔ کیتھی بیگ کندھے پر

ڈال کر باہر نکلی اور مسزولسن کو پکارنے لگی مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ ادھر ادھر کمروں میں انہیں تلاش کرنے لگی... کہ اچانک ایک کمرے میں مسزولسن پر اس کی نظر پڑی۔ وہ بیڈ پر لیٹے ہڈیوں کا ڈھانچا لگ رہے تھے۔ چہرے کی سیاہ رنگت اور اندر کودھنسی آنکھیں..... بیماری نے ان کا برا حال کر رکھا تھا۔ کیتھی نے ان کی طرف دیکھ کر ایک سرد آہ بھری اور ان کے قریب آ کر حال پوچھنے لگی۔ ولسن نے چونک کر اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور اس کے اسکارف کو بغور دیکھنے لگے۔

”کیا تم مسلم ہو گئی ہو؟“ ولسن نے خفگی سے پوچھا۔

”ہاں، ابھی باقاعدہ ہونے جا رہی ہوں۔“ کیتھی نے مسکرا کر جواب دیا۔

”بد بخت.....“ اور ولسن نے پاس پڑا ایک ڈیکوریٹو پیس غصے سے اس کی طرف پھینکا جو اس کے سر پر لگا مگر اسکارف کی وجہ سے بچت ہو گئی۔ شکر ہے وہ ہلکا ہی تھا۔ کیتھی کو غصہ آ گیا مگر ان کی حالت دیکھ کر وہ خاموش رہی اور جلدی سے باہر نکل آئی۔

اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ مسزولسن واقعی بہت مجبور ہیں۔ وہ بھی اس شخص کی بیماری کی وجہ سے بے بس ہیں اور وہ انتہائی بری حالت میں بیڈ پر ایڑیاں رگڑ رہے ہیں مگر اسلام دشمنی میں کتنے توانا ہیں۔ اس نے اسلامک ہسٹری کا جو مطالعہ کر رکھا تھا اس نے اس کی بھرپور مدد کی اور اس کے حوصلے اور ہمت کو توانا رکھا کہ حضرت محمدؐ کے پیروکاروں کو تو اس سے بھی زیادہ اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا مگر جن کے دلوں میں اسلام بس جائے ان کے لیے ایسی اذیتیں کیا معنی رکھتی ہیں۔ وہ لوگ بھی تو تھے جنہیں جلتے کونلوں پر برہنہ کر کے چت لٹایا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ اسلام سے انکار کر دیں مگر وہ صرف کلمہ طیبہ کا ورد کرتے رہتے۔ کافروں کا غصہ اور غضب مزید بڑھنے لگتا تھا۔ وہ انہیں پہلے سے بھی زیادہ اذیتیں دینے لگتے۔ وہ جتنی زیادہ ان کی اذیتوں میں اضافہ کرتے اتنا ہی ایمان والوں کا ایمان بڑھنے لگتا۔ یہاں تک کہ کئی ایمان والے شہید ہو گئے مگر ان کے جذبہ ایمانی میں کمی نہ آئی۔ یہ سب اس نے ان کتابوں میں پڑھا تھا اسی طرح مسزولسن کی پہنچائی گئی چوٹ پر اس نے مسکرا کر ہاتھ رکھا اور اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ ”اللہ کی راہ پر چلنا آسان نہیں۔ ایسی بہت سی مشکلات اور اذیتیں اسے برداشت کرنی ہوں گی۔“ اس کے دل میں ایمان اور مضبوط ہونے لگا اور اسلامک سینٹر تک کا راستہ اس نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے طے کیا۔

جمعے کی وجہ سے لوگوں کی آمد و رفت کچھ زیادہ تھی۔ اسلامک سینٹر میں جا کر وہ ایک باپردہ خاتون زینب سے ملی اور انہیں بتایا کہ وہ اسلام قبول کرنا چاہتی ہے۔ زینب نے مسکرا کر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اسے دیکھ کر کہا۔ زینب نے اس سے پوچھا کہ وہ اسلام کے بارے میں کیا کچھ جانتی ہے اور جب کیتھی نے انہیں بتایا کہ وہ اسلام کے بارے میں مکمل ریسرچ کر کے آئی ہے تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ پھر ایک ادھیڑ عمر شخص کو بلا کر لائیں۔ انہوں نے پینٹ کوٹ کے ساتھ سر پر سفید ٹوپی پہن رکھی تھی۔ سفید داڑھی کے ساتھ ان کا چہرہ بہت نورانی لگ رہا تھا۔ زینب نے انہیں کیتھی کے بارے میں بتایا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ اس سے کچھ سوال جواب کیے پھر بسم اللہ پڑھا کر اسے کلمہ پاک پڑھایا۔ خوشی سے کیتھی کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ رہے تھے۔ زینب اور تمام دوسری خواتین بھی اس کے پاس اکٹھی ہو گئیں۔

ان صاحب نے پھر اسے کلمہ شہادت پڑھانے سے پہلے کچھ سمجھایا۔

”اب جو کلمہ تم پڑھنے جا رہی ہو اس کی گواہی تم سے زیادہ تمہارے دل نے دینی ہے۔ کیا تمہارا دل یہ گواہی دینے کو تیار ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں!“ کیتھی نے گہری سانس لے کر بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے..... پھر پڑھو..... لیکن اپنے دل اور ذہن کی اس قدر سچائی کے ساتھ پڑھو کہ تمہاری روح پر اس کا اثر ہو۔“ انہوں نے پڑھایا تو کیتھی کے اقرار کے ساتھ، ساتھ سب لوگوں نے بھی بلند آواز سے کلمہ شہادت پڑھا۔ ہر طرف گلے کے الفاظ گونجنے لگے۔ ہر ایک کی آنکھیں فرط جذبات سے نم ہونے لگیں۔ کیتھی کا دل بھی انتہائی جذباتی کیفیت سے لبریز ہونے لگا اور وہ آہستہ، آہستہ سسکنے لگی۔

”مسلمان ہونا مبارک ہو۔“ اس سے پوچھ کر اس کا نام، آمنہ رکھا گیا۔ ان صاحب نے اس کے سر پر اپنائیت سے ہاتھ رکھا اور پھر دونوں ہاتھ بلند کر کے اس کے لیے بہت سی دعائیں کیں۔ اس کے بعد تمام خواتین نے اسے باری، باری گلے لگا کر مبارک باد دی۔ کیتھی بے حد خوش تھی۔ اس کا دل کس قدر خوش ہو رہا تھا اور اس وقت جس خوب صورت کیفیت سے وہ دوچار ہو رہی تھی، ایسی کیفیت اس نے زندگی بھر محسوس نہیں کی تھی۔ کچھ خواتین عمرے سے واپس آئی تھیں اور وہ اپنے ساتھ آب زم زم اور کھجوریں لائی تھیں۔ زینب نے وہ سب تمام لوگوں میں تقسیم کیں اور آمنہ (کیتھی) کو بھی کھلائیں۔ آب زم زم پیتے ہوئے اسے ایک روحانی مسرت سی محسوس ہوئی۔

”اب تم ہر روز میرے پاس آنا تاکہ میں تمہیں اسلامی عبادات اور دوسرے ادب و آداب پر عمل کرنا سکھاؤں۔ اسلام صرف زبان اور دل سے اقرار کرنے کا نام نہیں۔ وہ عمل کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے اور سب سے پہلے میں تمہیں وضو کرنا اور نماز پڑھنا سکھاؤں گی۔ کیونکہ تمام عبادات میں اللہ نے سب سے زیادہ نماز پر زور دیا ہے۔ اس کے ساتھ، ساتھ قرآن پاک بھی پڑھنا سکھاؤں گی اور تمام دوسرے مسائل کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور احکامات بھی بتاؤں گی۔“ زینب نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور وہاں سے جانے لگی تو زینب نے اپنے پاس رکھا ایک ہار محبت سے اس کے گلے میں ڈالا اور ایک حجاب اسے گفٹ کیا۔ اس نے شکر یہ ادا کیا اور خوشی، خوشی گھر کی راہ لی۔

وہ بے حد خوش تھی کہ سب سے پہلے خوشی کی یہ خبر وہ مسز ولسن کو اور پھر عبدالرحمن کو سنائے گی۔ عبدالرحمن کو معلوم تھا کہ وہ اسلامک سینٹر جا رہی ہے مگر مسز ولسن کو کوئی خبر نہ تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ مسز ولسن بھی آج بہت خوش ہوں گی اور حقیقت میں اس راہ پر لانے اور گانڈ کرنے والی مسز ولسن ہی تھیں۔ مگر بیچاری خود کتنی مجبور تھیں۔ وہ خوشی، خوشی گھر پہنچی تو گھر میں ہر طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مسز ولسن اسے کہیں دکھائی نہ دیں۔ وہ پریشان ہونے لگی۔ وہ جلدی سے مسز ولسن کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گئی اور ان سے مسز ولسن کے بارے میں پوچھنے لگی۔ وہ ایک دم سسکیاں بھر کر رونے لگے۔

”کک..... کیا ہوا..... مسز ولسن کہاں ہیں؟“ کیتھی جو اب آمنہ بن چکی تھی نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہسپتال میں۔“ ولسن نے روتے ہوئے جواب دیا۔

”کیوں..... کیا ہوا؟“ آمنہ نے پھر گھبرا کر پوچھا۔

”روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کی ڈیڑھ تھہ ہو گئی ہے۔“ ولسن نے سسکی بھر کر کہا۔

”کیا.....؟“ آمنہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا اور ایک دم اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہونے لگے

اور وہ ہچکیاں بھرنے لگی۔ وہ تو نہ جانے کیا کچھ سوچ کر آئی تھی کہ مسز ولسن اس کے بارے میں جان کر کتنی خوش ہوں گی..... اور وہ خود اس موقع کی منتظر تھیں۔ شاید مسز ولسن کی ڈیڑھ تھہ کا انتظار کر رہی تھیں اور خود ان کی اپنی ڈیڑھ تھہ ہو گئی۔ انہیں کلمہ پڑھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ ان کا دل مسلمان ہو چکا تھا مگر زبان سے اقرار کرنے کی توفیق نہیں ملی تھی۔ اسے اسی بات کا شدید صدمہ ہو رہا تھا۔ مسز اینڈ مسز جانسن بھی آگئے تھے اور جب انہیں کیتھی کے مسلم ہونے کا پتا چلا تو انہوں نے بھی ناگواری کا اظہار کیا اور وہ جو پہلے اس کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتے تھے اب ان کے چہروں پر

اس کے لیے خفگی کے تاثرات تھے۔ آمنہ کو ان کا رویہ بہت ہرٹ کرنے لگا مگر وہ خاموش رہی۔
 مسزولسن کی burial (تدفین) تک الزبتھ بھی پہنچ گئی تھی اور جب مسزولسن کی تدفین کرچکن grave
 yard میں کرچکن رسومات کے مطابق ہونے لگی تو آمنہ نے پریشان ہو کر الزبتھ کی طرف دیکھا اور اس کے کانوں
 میں سرگوشی کرنے لگی۔

”مسزولسن..... مسلم تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دل سے مسلم ہو چکی ہیں۔ الزبتھ ان کو کرچکن کی طرح
 مت دفن کرو۔“ آمنہ نے پریشان ہو کر کہا تو الزبتھ نے آہ بھر کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”مگر می نے اپنا مسلم ہونا اتنا وٹس نہیں کیا تھا۔ ابھی وہ کرچکن کیونٹی کا ہی حصہ ہیں۔ میں انہیں کیسے روک سکتی
 ہوں؟“ الزبتھ نے پریشان ہو کر کہا مگر آمنہ بری طرح پریشان ہو گئی۔

”لیکن میں انہیں روک سکتی ہوں۔“ آمنہ نے جذباتی ہو کر کہا اور جیسے ہی پادری مسزولسن کے لیے دعائیں
 پڑھنے لگا تو آمنہ خفگی سے آگے بڑھی۔ الزبتھ پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”مسزولسن..... مسلمان تھیں آپ انہیں یہاں ایسے دفن نہیں کر سکتے۔“ آمنہ نے آگے بڑھ کر پادری کو کہا تو
 مسزولسن کے علاوہ مسزولسن کے تمام فیملی ممبرز اور فرینڈز غصے میں آ گئے۔

”شٹ اپ..... کیتھی..... تم نے کیوں ایسی فضول بکواس کی۔ مسزولسن کبھی مسلمان نہیں ہوئیں..... تم ان پر
 الزام لگا رہی ہو۔ کیونکہ تم مسلم ہو کر خود جنونی اور پاگل ہو رہی ہو جسٹ گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔“ مسزولسن نے اسے
 غصے سے بازو پکڑ کر دھکے دیتے ہوئے وہاں سے باہر نکال دیا۔ الزبتھ پریشان ہو کر رونے لگی۔ آمنہ بھی روتی ہوئی گھر
 واپس آ گئی۔ اسے شدید دکھ ہو رہا تھا اور اس کے کانوں میں بار بار اس آیت کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ”اور تم مرنا تو
 مسلمان ہی مرنا۔“ مسزولسن مسلم دل رکھنے کے باوجود بھی مسلمان ہو کر نہیں مری تھیں اور اس بات کا اسے شدید رنج
 ہو رہا تھا۔ رات کو جب اس نے عبدالرحمن کو یہ بات بتائی تو بتاتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔ وہ اسے دلاسا دینے لگا۔

”اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جب آپ کسی نیک کام کو کرنے کا ارادہ کریں تو اسے فوراً انجام دے دیں، ہو سکتا
 ہے بعد میں آپ کو اس کی توفیق یا مہلت ملے نہ ملے۔ اب یہ معاملہ تو اللہ کے پاس ہے کہ اگر مسزولسن نے تنہائی میں
 بھی کلمہ پڑھا ہو گا تو اللہ ان کے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا مگر ہم لوگ دنیاوی تعلقوں کا شکار ہو کر اپنی آخرت بھی
 گنوا بیٹھتے ہیں۔“ عبدالرحمن نے آہ بھر کر کہا تو وہ بھی ایک دم پریشان ہو گئی اور جلدی سے الزبتھ کے پاس گئی اور جا کر
 اس سے پوچھنے لگی کہ کیا مسزولسن نے تنہائی میں کلمہ پڑھا تھا۔

”نہیں، وہ غلط نہیں..... کہ.....“ الزبتھ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو زواں ہو گئے۔

”اور..... الزبتھ..... کیا تم نے کلمہ پڑھا کہ اسلام قبول کر لیا ہے؟“ آمنہ نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... میں ان دنوں پلان کر رہی رہی تھی کہ.....“ الزبتھ نے آہ بھر کر کہا۔

”پلیز..... اب تم اپنا نام مت ویسٹ کرو۔ جس طرح مسزولسن کو موقع نہیں ملا ممکن ہے تمہیں بھی نہ ملے تو اس
 لیے تم بس جلدی سے اپنے مسلم ہونے کا اتنا وٹس کر دو۔“ آمنہ نے اسے سرگوشی میں کہا تو مسزولسن کمرے سے
 باہر نکلیں اور آمنہ کو یہ کہتے سن کر وہ ایک دم ہائپر ہو گئیں۔

”کیتھی..... تم ہر ایک کو ٹریپ کرنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ اگر تم راستے سے بھٹک گئی ہو تو دوسروں کو مت
 بھٹکاؤ۔“ مسزولسن نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بھٹکی ہوئی نہیں بلکہ اب صراطِ مستقیم پر چلنا شروع کیا ہے اور میرا نام آمنہ ہے کیتھی نہیں۔“ اس نے گہری
 سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

”ہونہہ..... بھنگی نہیں۔ دیکھنا اب تم کیسے جنونی اور پاگل ہوتی جاؤ گی۔ الزبتھ تم اس کی باتوں میں بالکل نہیں آنا۔
-we are prouod of being christians۔“ مسز جانسن نے قدرے خفگی سے آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو آمنہ آہ بھر کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”مسز جانسن! کیا آپ میرے خلاف اس لیے ہو گئی ہیں کہ میں مسلم ہو گئی ہوں؟“ آمنہ نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... تم نے اپنے ریلیجن کو چھوڑ کر یہ بتانا چاہا ہے کہ کرپچن ریلیجن ٹھیک نہیں ہے اور تم نے ہم کرپچن کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔“ مسز جانسن نے خفگی سے کہا۔

”ہاں..... اور یہ بات بالکل سچ ہے کہ اسلام سے بڑھ کر سچا مذہب کوئی اور نہیں آپ لوگ صرف اسلام سے grudge کی وجہ سے اس کی blessings سے جان بوجھ کر محروم ہو رہی ہیں۔ آپ لوگ نہیں جانتے کہ اسلام دنیا کے لیے کتنی بڑی نعمت ہے۔“ آمنہ نے کہا۔

”بکو اس بند کرو۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط۔ مسلمان اسی طرح دوسروں کے دلوں میں زہر بھرتے ہیں کہ ان کے اپنے بھی ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔“ مسز جانسن نے نہایت غصے سے کہا۔

”مسلمان کسی کے دل میں زہر نہیں بھرتے، اسلام میں اتنی پوینشل ہے کہ جب وہ پوری سچائی کے ساتھ کسی کے دل میں بستا ہے تو وہ اس کے لیے ایسی طاقت بن جاتا ہے کہ وہ انسان ہر مخالفت کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔“ آمنہ نے قدرے جذباتی انداز میں کہا تو مسز جانسن نے چونک کر اسے دیکھا۔

”الزبتھ! تم اس کی باتوں میں نہ آنا..... بلکہ تم میرے ساتھ چلو..... اب تمہیں یہاں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ الزبتھ تم میرے ساتھ چلو۔“ مسز جانسن نے انتہائی غصے سے آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے الزبتھ کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔

”ڈیڈ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں؟“ الزبتھ نے آہ بھر کر کہا۔
ولسن کے بھی آخری لمحات آگئے تھے اور جانسن نے اسے اسپتال میں ایڈمٹ کر دیا تھا۔ آمنہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اسے سب کے بدلے ہوئے رویے دیکھ کر بہت دکھ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز آمنہ بیدار ہوئی تو اسے اپنے کمرے کے باہر عجیب سی ہلچل سنائی دی اور کہیں، کہیں سسکیاں بھی سنائی دینے لگیں وہ ایک دم گھبرا کر اٹھی اور باہر لاؤنج میں آئی تو الزبتھ، مسز جانسن کے گلے لگ کر رو رہی تھی اور مسز جانسن اسے پیار کرتے ہوئے تسلیاں دے رہی تھیں۔

”کک..... کیا ہوا؟“ آمنہ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”ڈیڈ کی ڈتھ ہو گئی ہے۔“ الزبتھ نے روتے ہوئے بتایا تو آمنہ ایک دم پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
”اوہ، آئی ایم سوری۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔ الزبتھ روتی جا رہی تھی۔ آمنہ نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگانا چاہا تو مسز جانسن نے قدرے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا تو آمنہ کو ایک دم شاک لگا۔ اس نے نم آنکھوں سے مسز جانسن کی طرف دیکھا اور ہونٹ کاٹتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے کوٹ پہن کر اسکارف لیا اور اس سے اپنے سر کو اچھی طرح کور کر کے باہر چلی گئی۔

”الزبتھ..... تم آج ہی یہ گھر چھوڑ دو۔ اب ہم تمہیں یہاں نہیں رہنے دیں گے ورنہ یہ لڑکی تمہارا بھی دماغ خراب کر دے گی۔“ مسز جانسن نے قدرے خفگی سے کہا اور الزبتھ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے باہر چلی گئیں۔
آمنہ اسلاک سینٹر پہنچی تو بہت زیادہ اپ سیٹ تھی۔ زنب نے اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات دیکھے تو

اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے وجہ پوچھنے لگیں۔ آمنہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔
 ”مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ لوگوں کو اسلام سے اتنی دشمنی کیوں ہے۔ وہی لوگ جو مجھ سے محبت کرتے تھے جب ان کو پتا چلتا ہے کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور مسلمان ہو چکی ہوں تو ایک دم ان کی محبت، نفرت میں بدل جاتی ہے اور ان کا رویہ میرے ساتھ اتنا تلخ ہو جاتا ہے کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“ آمنہ نے نہایت دکھی لہجے میں بتایا تو زینب مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”صبر اور برداشت یہی تو مومن کی نشانیاں ہیں۔ اگر تم نے اسلامک ہسٹری پڑھی ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ایک کلمے کی خاطر ابتدائی مسلمانوں نے کیا، کیا تکلیفیں برداشت نہیں کیں جبکہ وہ لوگ سچے بھی تھے اور انہوں نے سچ کو ہی قبول کیا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو ایک انسان کے سچ قبول کرنے سے کسی دوسرے کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے، یہ تو ہر انسان کا ذاتی فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ سچ کو مانے یا جھوٹ کو؟ کسی دوسرے انسان کو اس میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہوتا لیکن پھر بھی کافروں نے صرف اور صرف اسلام دشمنی کی وجہ سے ان لوگوں کو تکلیفیں پہنچائیں مگر وہ صبر پر ڈٹے رہے اور پھر وہ وقت آیا کہ کافروں نے ان کے حوصلے، ایمان اور صبر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اسلام کو قبول کر کے انہوں نے اپنی بارمان لی۔ اسی لیے تم بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اللہ انسان کے ایمان کا سب سے بڑا قدر دان ہے اور جو اس کے راستے میں ذرا سی تکلیف اٹھاتا ہے تو اللہ اسے ضرور اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔“ زینب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر محبت اور نرمی سے سمجھایا تو آمنہ نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور اس کے بے قرار دل کو سکون سا ملنے لگا۔

”لیکن لوگ اسلام کے اتنے خلاف کیوں ہیں؟ کیا اتنی اسلام دشمنی کی وجہ ان کا حسد ہے مگر کس قسم کا حسد.....؟“ آمنہ نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، دنیا کے تمام مذاہب کا مطالعہ کرو اور پھر اس مذہب کی تعلیمات کا اثر اس کے پیروکاروں میں دیکھو تو تمہیں صاف پتا چلے گا کہ جو کامیابی اسلام کو نصیب ہوئی ہے اور ابھی تک ہو رہی ہے وہ کسی اور مذہب کو نہیں ہوئی۔ اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب نے اتنی شدت سے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں کو نہیں بدلا اور نہ ہی کسی اور مذہب کے پیروکاروں نے اپنے مذہب کی خاطر جان و مال کی اتنی قربانیاں دی ہیں جتنی کہ مسلمانوں نے دی ہیں۔ جب سے اسلام دنیا میں آیا ہے۔ تب سے اس کے منکرین اس کی طاقت سے خوف زدہ ہیں اور ان کا یہ حسد مختلف انداز سے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے تم اپنے دل کو مضبوط رکھو اور ہرگز گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ اس کا اللہ ہوتا ہے تو اسے دنیا کی کسی جھوٹی طاقت سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔“ زینب نے اس قدر پُر اثر انداز میں اسے سمجھایا کہ اس کے دل میں ایک دم حرارت سی پیدا ہونے لگی اور اس کے مضطرب دل میں ایک دم اطمینان سا پیدا ہونے لگا۔ اس نے مسکرا کر زینب کی طرف دیکھا تو انہوں نے محبت سے اس کے کندھے پر ہتھکی دی۔

”آؤ میں آج تمہیں نماز سکھاتی ہوں اور جب تم کسی بات سے پریشان ہو تو نماز پڑھنا۔ تمہارے دل کو خود بخود سکون مل جائے گا۔ کیونکہ نماز میں ہم اپنے اللہ سے باتیں کرتے ہیں۔ اور دعا پڑھتے ہوئے اپنے سارے دکھ اسے بتا کر اس سے مدد مانگتے ہیں اور وہ ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے۔“ زینب نے مسکرا کر کہا اور اسے نماز کی بابت بتانے لگیں۔ اس سے پہلے زینب نے طہارت اور پاکیزگی کے بارے میں اسے خاصی تفصیل سے بتا دیا تھا۔ اب اس کا زیادہ تر وقت یہیں گزرتا تھا۔

☆☆☆

اس روز آمنہ اسلامک سینٹر جانے کے لیے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلی تو الزبتھ قدرے بھاگتی ہوئی اس کے

پیچھے آئی اور اسے بلند آواز میں پکارنے لگی۔ آمنہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مسکرا کر اس کے پاس پلٹ گئی۔ الزبتھ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

”ہائے..... الزبتھ کیا ہوا؟“ آمنہ نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”تم کہاں جا رہی ہو..... کیا اسلامک سینٹر.....؟“ الزبتھ نے پوچھا۔

”ہاں..... مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ آمنہ نے حیرت سے پوچھا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“ الزبتھ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”وہاٹ..... ریٹلی.....؟“ آمنہ نے قدرے خوشی سے چلا تے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... لیکن پلیز..... اس بات کی خبر مسز جانسن کو نہ ہو۔ وہ میرے بہت خلاف ہو گئی ہیں لیکن آج میں

نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ میں بھی مسلم ہو جاؤں گی۔ مام کو اللہ نے موقع نہ دیا مگر میں آج یہ چانس avail کرنا

چاہتی ہوں۔ میں سوچتی تھی یہاں آ کر مام کے ساتھ جا کر اسلامک سینٹر میں اسلام قبول کروں گی..... مگر.....“ وہ آہ

بھر کر غم آنکھوں سے بولی۔

”لیکن مسز ولسن تو کہتی تھیں کہ تم نے امریکا میں اسلام قبول کر لیا ہے؟“ آمنہ نے حیرت سے پوچھا۔

”میں، مام کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہتی تھی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں ان کے لیے خوف سا تھا۔ خیر

ان باتوں کو چھوڑو..... چلو..... اب چلتے ہیں۔“ الزبتھ نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”کیا تم نے غسل کر کے صاف ڈریس پہنا ہے؟“ آمنہ نے پوچھا۔

”کیا یہ ضروری ہے؟“ الزبتھ نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں..... لیکن اپنے اطمینان کے لیے ہم پاک ہونے جا رہے ہیں۔ پاک ڈریس پہننا چاہیے۔ شاور لے

کر اپنے جسم کو پاک کرنا چاہیے۔“ آمنہ نے مسکرا کر اس سے کہا۔

”اوکے..... پھر میں ابھی شاور لے کر آتی ہوں۔ تم میرا یہیں ویٹ کرنا۔“ الزبتھ نے جلدی سے کہا اور

بھاگتی ہوئی گھر چلی گئی۔

آمنہ روڈ سائڈ پر سنی ایک بیچ پر بیٹھ گئی اور اپنے بیگ سے ایک اسلامک بک نکال کر پڑھنے لگی۔

جوائے، کالج جانے کے لیے گھر سے باہر نکلا تو نہ جانے کیوں اسے کیتھی بہت یاد آنے لگی اور پیرن نے بھی

اسے بہت زور دیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں پتا کرے کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کالج جانے کے بجائے کیتھی (آمنہ)

سے ملنے آ گیا۔ جب وہ کیتھی کے اپارٹمنٹ کے باہر پہنچا تو اس نے کیتھی کو بیچ پر بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک دم اسے دیکھ کر

چونکا اور گاڑی ریورس کر کے اس کے قریب آیا۔ وہ کتاب پڑھنے میں اتنی محو تھی کہ اسے جوائے کی آمد کا احساس ہی

نہیں ہوا۔ جوائے قدرے تیزی سے گاڑی سے نکل کر اس کے قریب آیا اور انتہائی حیرت سے کیتھی کے اسکارف کی

طرف دیکھنے لگا۔

”کیتھی..... تم؟“ جوائے نے قدرے حیرت سے پوچھا تو اس نے ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”جوائے..... تم یہاں.....؟“ اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”یہ..... تم نے سر پر کیا پہن رکھا ہے؟“ جوائے نے قدرے بدتمیزی سے اس کے سر سے اسکارف کو کھینچتے

ہوئے کہا تو آمنہ کے سر سے اسکارف اتر گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم خون اتر آیا۔ غصے اور شرمندگی سے اس کا

چہرہ سرخ ہونے لگا اور اس نے زور سے ایک ٹھٹھڑ جوائے کے چہرے پر لگایا۔

”ایک مسلم عورت کی عزت اس کا یہ حجاب ہے اور وہ کسی کو اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ اس کو ہاتھ بھی

لگائے۔“ آمنہ نے انتہائی غصے سے چلاتے ہوئے کہا تو جو اے ایک دم ہٹا بٹا ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔
”وہاٹ..... مسلم..... ہاؤ ڈیئر یو..... تم جانتی بھی ہو کہ آئی ہیٹ مسلمز۔“ جو اے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”how dare you to hate Muslims?“ آمنہ نے بھی غصے سے کہا تو جو اے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مزید حیران رہ گیا۔ وہ کبھی اس کے ساتھ اس لہجے میں نہیں بولی تھی اور نہ ہی اس کے چہرے پر اتنے غصے کے تاثرات پہلے کبھی اس نے دیکھے تھے۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ جو اے کو ایک دم خوف سا محسوس ہونے لگا اور اس نے ایک دم اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا۔
”کیتھی.....“ جو اے نے کچھ کہنا چاہا۔

”اب میں آمنہ ہوں۔“ اس نے اس کی بات کاٹ کر چلاتے ہوئے کہا تو جو اے ایک دم پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”تم..... تم نے یہ سب کب اور کیوں کیا؟“ جو اے نے قدرے خفگی سے پوچھا۔

”میں نے بہت ریسرچ کرنے کے بعد جو مناسب سمجھا وہی کیا ہے اور مجھے اسلام کا راستہ ہی ٹھیک لگا اس پر میں نے چلنے کا فیصلہ کر لیا۔“ آمنہ نے اس کا رخ کو اپنے سر پر دوبارہ اوڑھتے ہوئے کہا تو اسی لمحے الزبتھ شاور لینے کے بعد نیا ڈریس پہن کر آگئی اور دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر کچھ فاصلے پر ہی رک گئی اور حیرت سے ان کی باتیں سننے لگی۔
”کیا تم نہیں جانتیں کہ ہم دونوں نے شادی کے بارے میں کیا پلان کر رکھا ہے؟“ جو اے نے خفگی سے پوچھا۔
”میں تم سے ہرگز شادی نہیں کروں گی اور ویسے بھی اسلام میں مسلم عورت، غیر مسلم مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ جو اے تمہارے اور میرے راستے جدا، جدا ہیں اور اب تم مجھ سے ملنے کبھی مت آنا کیونکہ میں بھی تم جیسے اینٹی مسلم کو پسند نہیں کرتی۔“ آمنہ نے قدرے خفگی سے کہا تو جو اے اس کی طرف دیکھا رہ گیا۔

”تو کیا تم کالج بھی نہیں آؤ گی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میں نے کالج جانا چھوڑ دیا ہے کیونکہ میں جو آرٹ سیکھ رہی تھی وہ بھی اسلام میں جائز نہیں۔“ آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو جو اے ایک دم irritate ہونے لگا۔
”اسلام..... اسلام..... ٹو ہیمل وڈ یو اینڈ یو اسلام۔“ جو اے غصے سے دانت کچکچا کر بولا تو آمنہ کو اس کی بات سن کر شدید غصہ آ گیا۔

”جسٹ شٹ اپ۔“ آمنہ نے اسے غصے سے کہا اور الزبتھ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ جو اے نے انتہائی غصے سے گاڑی پر کئے مارے اور انتہائی ریش ڈرائیونگ کرنے لگا۔ وہ غصے میں آئے سے باہر ہو رہا تھا اور اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے کیتھی کے ساتھ گزارا ایک، ایک لمحہ یاد آنے لگا تھا۔ وہ دونوں بہت اچھے فرینڈز رہے تھے گو کہ وہ آج کل اپنی نئی گرل فرینڈ مارینہ کے ساتھ بہت زیادہ انوالو ہو گیا تھا مگر اس کے دل میں مارینہ کے لیے کبھی وہ فیئلنگو پیدا نہیں ہوئی تھیں جو کیتھی کے لیے تھیں۔ اس نے کبھی مارینہ کے ساتھ شادی کا نہیں سوچا تھا۔ شادی کے لیے اس کا انتخاب صرف کیتھی تھی اور کیتھی نے اس کی جتنی انسلٹ کی تھی اس نے اسے قدرے پاگل بنا دیا تھا اور اس پر مزید یہ کہ وہ ”مسلم“ ہو گئی تھی۔ یہ سن کر تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اور اب وہ اس آگ کے شعلوں میں بری طرح جھلس رہا تھا۔ اس نے کالج جانے کے بجائے مارینہ کے اپارٹمنٹ کا رخ کیا۔ مگر وہ بھی گھر پر موجود نہیں تھی۔ اس لمحے اسے کسی ایسے دوست یا سہارے کی ضرورت تھی جس کے ساتھ وہ شیئر کر کے شدت سے آنسو سکا سکتا۔ وہ ڈرائیو کرنا ہو اور ان سڑک پر تنہا جا رہا تھا اور

☆☆☆

الزبتھ اسلاک سینٹر سے مسلمان ہو کر آئی تو اس کا نام عائشہ رکھا گیا اور اس نے جیسے ہی مسٹر اینڈ مسز جانسن کو اس کے بارے میں بتایا تو انہوں نے غصے میں اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا اور لا تعلقی کا اظہار کیا۔ وہ انہیں چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ اس کے پاس کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ کیتھی اسے اپنے گھر لے آئی اور اسے تسلیاں دینے لگی۔

”عائشہ! (الزبتھ) تم ہمت نہ ہارو اور بالکل پریشان نہ ہو۔ مسلمان بن کر تمہارے دل کو جو اطمینان اور سکون نصیب ہوگا اس کے سامنے یہ ساری پریشانیاں بہت معمولی ہیں۔ جب کسی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کا اللہ ہے اور وہ اس کے راستے میں تکلیفیں اٹھا رہا ہے تو ان تکلیفوں میں بھی ایک لذت محسوس ہوتی ہے۔ تم میرے پاس یہاں رہ سکتی ہو اور جب تک تمہیں کوئی مناسب جاب نہیں ملتی تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ آمنہ (کیتھی) نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو..... لیکن میں واپس امریکا جانے کا سوچ رہی ہوں..... مجھے وہاں جابز کی بہت اچھی آفرز تھیں.....“ عائشہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ایز یوش..... تم جیسا مناسب سمجھو..... مگر یہاں تم میری فرینڈ ہو..... میری اسلاک سسٹر ہو۔“ آمنہ نے مسکرا کر کہا۔

”شکر یہ تمہاری اس محبت کا.....“ عائشہ نے بھی مسکرا کر کہا اور اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ باتوں، باتوں میں عائشہ نے اس سے جوائے کے بارے میں پوچھا۔

”وہ مجھ سے محبت کرتا تھا..... اور مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا..... لیکن..... وہ اسلام اور مسلمز کے سخت خلاف ہے۔“ آمنہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیوں.....؟“ عائشہ نے حیرت سے پوچھا۔

”معلوم نہیں..... اس نے اسلام دشمنی کی وجہ کبھی نہیں بتائی..... میں نے کئی بار پوچھا بھی..... لیکن وہ خاموش رہا..... مگر اس کے اندر مسلمز کے خلاف اتنا زہر بھرا ہوا ہے کہ اس کا بس چلے تو وہ سب مسلمز کو ختم کر ڈالے اور دنیا میں کسی مسلم کو بھی زندہ نہ چھوڑے۔“ آمنہ نے اسے بتایا۔

”ریٹلی.....؟“ عائشہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

”ہاں..... اسی لیے تو وہ میرے ایک دم خلاف ہو گیا جب اسے پتا چلا کہ میں مسلم ہو گئی ہوں۔ اس نے اپنے سارے تعلقات، فرینڈ شپ..... محبت سب کچھ بھلا دیا..... اور میں اسے ایک دم سخت بری لگنے لگی کیونکہ میں مسلم ہو گئی ہوں.....“ آمنہ نے اک ٹھنڈی آہ بھر کر بتایا۔

”کیا تمہیں اس کے جانے کا افسوس ہو رہا ہے..... آف کورس تم نے اس کے ساتھ لائف کے بارے میں پلاننگ تو کی ہوگی۔“ عائشہ نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

”اگر میں مسلم نہ ہوتی اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا جاتا تو شاید مجھے شدید دکھ محسوس ہوتا مگر اب مجھے کوئی ملال نہیں ہو رہا۔“ آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”کیوں.....؟“ عائشہ نے چونک کر پوچھا۔

”اس لیے کہ جب اللہ کہتا ہے کہ تمہارا جینا، تمہارا مرنا، تمہاری محبت اور نفرت سب کچھ میرے لیے ہونی چاہیے تو پھر دل خود بخود مطمئن ہونے لگتا ہے۔“ آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو عائشہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگی۔

”عائشہ... اب تم ریٹ کرو... میں تمہارے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔“ آمنہ نے کہا اور مسکراتی ہوئی

کمرے سے باہر چلی گئی۔

رات کو جب وہ اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹی تو اسے جو اے کی حرکت پر انتہائی افسوس اور غصہ آنے

لگا جب اس نے... اس کے سر سے حجاب اتارا تھا... اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”معلوم نہیں... تم مسلمز سے کیوں اتنی نفرت کرتے ہو... کاش تم مجھے موقع دو تو میں تمہیں بتاؤں کہ تم کتنی

بڑی نعمت کو ٹھکرارہے ہو... تمہیں احساس ہی نہیں کہ اسلام دنیا کے لیے کتنی بڑی رحمت اور نعمت ہے مگر جن لوگوں

کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ وہ واقعی گونگے، بہرے اور اندھے بن جاتے ہیں... ہدایت ان پر کبھی اثر

نہیں کرتی۔“ وہ کتنی ہی دیر جو اے کے رویے پر افسوس کرتی رہی... وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی جب عبدالرحمن کا

فون آ گیا... اور وہ موڈ بدل کر اس سے باتیں کرنے لگی۔ عبدالرحمن اسے خوشی، خوشی بتانے لگا کہ اس نے اپنی

آرٹ ایگزیشن لگائی تھی جو بہت کامیاب رہی ہے۔ اس نے قرآنی آیات کی بہت خوب صورت انداز میں

abstract painting کے ساتھ کیلیگرافی کی تھی اور اسے میڈیا نے بہت زیادہ کوریج دی... اور اسے

اپنی زیادہ appreciation ملی تھی کہ وہ بے حد خوش تھا... وہ آمنہ کو ایک، ایک بات بتا کر خوش ہو رہا تھا اور

اس نے اپنی پینٹنگز کی پیکرز بھی اسے بھجوائی تھیں اور آمنہ بھی بہت تعریف کر رہی تھی۔

”جب میں جرمنی سے آیا تھا تو بہت زیادہ مایوس تھا لیکن صرف خدا پر یقین تھا کہ وہ میرے لیے کوئی بہتر وسیلہ پیدا

کرے گا اور مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ وہ میرے لیے کیسے، کیسے اسباب پیدا کر رہا ہے... اس نے میرے آرٹ

ٹیچر عبداللہ کی صورت میں میری ایسی مدد کی ہے کہ میں اب پہلے سے بھی زیادہ کونفیڈنٹ ہوتا جا رہا ہوں... عبداللہ کی

وجہ سے میں خود بھی بہت کچھ سیکھ رہا ہوں۔ اور میرا کالج بھی بہت پروگریس کر رہا ہے۔“ عبدالرحمن نے خوش ہو کر بتایا۔

”عبدالرحمن... تمہارے اس یقین کی وجہ سے میرے اندر بھی بہت چیز آئی ہیں... جب تم اپنی اسٹڈیز اور

اپنا کیریئر صرف اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر چلے گئے اور صرف اس وجہ سے کہ جو اے تمہارے مذہب کو برا کہہ کر

tease کرتا تھا اور تم یہ سب برداشت نہیں کر سکتے تھے تو میں بہت چونکی تھی کہ تمہارے لیے اپنے وجود سے

بڑھ کر اپنا مذہب زیادہ عزیز ہے تو اس سوچ نے میرے اندر اسلام کے لیے جستجو اور بڑھادی تھی۔ اور اسلام کا

مطالعہ کرتے ہوئے بھی تم میرے ذہن میں تھے... میں نے تم سے بھی بہت کچھ پریکٹیکل سیکھا ہے۔“ آمنہ نے

اسے صاف گوئی سے بتایا تو عبدالرحمن متحس ہو کر سنتا رہا۔

”ارے ہاں... جو اے کو تمہارے مسلم ہونے کا پتا چلا تو اس کا کیاری ایکشن تھا؟“ عبدالرحمن نے ایک دم

چونک کر پوچھا۔

”کیا... ری ایکشن ہو سکتا ہے؟ تم بتاؤ کیا ایکسپیکٹ کرتے ہو؟“ آمنہ نے متحس ہو کر پوچھا۔

”آف کورس... اس نے بہت مائنڈ کیا ہوگا؟“ عبدالرحمن نے کہا۔

”ہاں...“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔

”کیا ہوا... تم اتنی سیریس کیوں ہو گئیں۔ کیا اس نے بہت شدید ری ایکٹ کیا...؟“ عبدالرحمن نے پوچھا۔

”ہاں... ہمارا جھگڑا ہوا... اور مجھے اسے تھپڑ بھی لگانا پڑا...“ آمنہ نے آہ بھر کر کہا تو عبدالرحمن ایک دم چونکا۔

”ریلی! کیا واقعی تم نے جو اے کو تھپڑ لگایا؟“ عبدالرحمن نے پوچھا۔

”ہاں...“ آمنہ نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے... اس نے کچھ زیادہ ہی برا بھلا کہا ہوگا؟“ عبدالرحمن نے کہا۔

”ہاں..... اور اب میں اس کے ساتھ اپنے ٹرمز ختم کر چکی ہوں۔“ آمنہ نے اسے بتایا۔
 ”کیا تم اس کے ساتھ تعلق توڑنے پر اپ سیٹ ہو رہی ہو؟“ عبدالرحمن نے پھر پوچھا۔
 ”نہیں بالکل مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں۔“ آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
 ”پھر تم اتنی افسردہ کیوں ہو رہی ہو؟“ عبدالرحمن نے حیرت سے پوچھا۔
 ”نہیں..... میں افسردہ نہیں ہوں..... بس یونہی بات کرتے ہوئے سیریس ہو گئی ہوں۔“ آمنہ نے اسے کلیئر کیا۔
 ”آمنہ..... میں بہت دنوں سے تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں مگر سوچتا ہوں تم ماسٹرنہ کرو.....“ عبدالرحمن نے کچھ سوچتے ہوئے رک، رک کر کہا۔

”کیا.....؟“ آمنہ نے ایک دم چونک کر پوچھا۔
 ”آمنہ تم بہت اچھی انسان ہو، بہت genuine اور kind اور آئی ایم شیور کہ تم ایک بہت اچھی مسلم بھی ہوگی۔“ عبدالرحمن اس کی تعریفیں کرتے ہوئے بولا تو آمنہ انتہائی حیرت سے اس کی باتیں سننے لگی۔
 ”آمنہ..... میرے دل میں تمہاری بہت عزت ہے.....“ عبدالرحمن مسکرا کر بولا۔
 ”تھینک یو.....“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

”لیکن..... اب عزت کے ساتھ، ساتھ میرے دل میں تمہارے لیے بہت محبت بھی پیدا ہونے لگی ہے۔“ عبدالرحمن نے کہا تو آمنہ ایک دم چونکی۔
 ”کیا..... محبت.....؟“ وہ حیرت سے بولی۔
 ”ہاں..... کیا تمہیں میری محبت پر یقین نہیں آرہا..... یا پھر میں تمہاری محبت کے قابل نہیں ہوں؟“ عبدالرحمن نے قدرے متفکر ہو کر پوچھا۔

”نہیں ایسی بات نہیں..... مجھے..... مجھے یقین نہیں آرہا..... کہ..... تم اور..... میں.....؟ آئی مین..... تم میرے بارے میں ایسے بھی سوچ سکتے ہو؟“ آمنہ نے قدرے حیرت سے کہا۔

”ہاں، میں خود بھی حیران ہوتا ہوں..... اور میں جب بہت سوچتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے شاید میں جرمنی صرف تم سے ہی ملنے گیا تھا..... مگر میں سوچتا تھا کہ تمہارے اور میرے درمیان مذہب کی مضبوط دیوار حائل ہے اور تمہاری جوائے کے ساتھ اسٹرائنگ فرینڈ شپ کو دیکھ کر میں نے اپنے دل میں جنم لینے والے تمام خیالات کو اپنے ذہن سے کھرچنے کی کوشش کی مگر میرا دل تھا کہ ہر وقت تمہاری سوچوں میں لگا رہتا تھا..... اور پھر جب تم نے اپنے مسلم ہونے کے بارے میں بتایا تو مجھے یوں لگا جیسے میرا اللہ تمہیں..... میرے قریب لا رہا ہے..... اور اب میرا دل کہتا ہے کہ تم میرے بہت قریب آ چکی ہو۔“ آمنہ اس کی باتیں حیرت سے سن رہی تھی..... کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دو مختلف لوگ اس قدر قریب آ جائیں، یہ عبدالرحمن کس محبت کی بات کر رہا ہے۔ وہ ابھی یہ سب سوچ رہی رہی تھی کہ عبدالرحمن نے اسے ہیلو کہہ کر چونکا دیا۔ ”آمنہ میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں۔ اگر تم مجھے اس قابل سمجھتی ہو تو میں تمہیں پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔“ عبدالرحمن نے جب یہ سب کہا تو آمنہ ہکا بکا رہ گئی۔

”پروپوز.....؟“ وہ حیرت سے بڑبڑائی تھی۔
 ”کیوں..... تمہیں یہ اچھا نہیں لگا.....؟“ عبدالرحمن نے گھبرا کر پوچھا۔

”نہیں..... میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ میں اور تم..... کیسے؟ تم پاکستان کے کسی علاقے کے رہنے والے ہو میں یہاں کی اور..... ہمارے کلچر میں بھی بہت فرق ہے۔“ آمنہ نے صاف گوئی سے کہا۔
 ”آمنہ..... مسلمان مرد اور عورت کے درمیان جناب مذہب کا تعلق مضبوط ہو تو کلچر پھر کچھ میٹر نہیں

کرتا..... میرے گھر میں میری بیوہ ماں، دو بھائی، دو بھابھیاں اور صرف تین بھتیجیاں ہیں..... اور وہ سب میری خاطر تم سے بھی بہت محبت کریں گے۔“ عبدالرحمن نے کہا تو وہ اس کی باتیں بغور سنتی رہی اور کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی۔

”آمنہ کیا بات ہے، تم خاموش کیوں ہو گئی ہو؟“ عبدالرحمن نے پوچھا۔

”مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں تمہیں کیا کہوں، تم نے اتنی اچانک مجھے اپنی محبت کا بھی بتایا ہے اور پھر پروپوز کرنے کا بھی..... کہ میرا ذہن الجھنے لگا ہے۔“ آمنہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں، تم اچھی طرح سوچ لو، میرے بارے میں سب کچھ جان لو۔ آمنہ اگر تمہارا دل مجھے قبول کرتا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوگی اور اگر تمہارا دل مجھے قبول نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں کبھی فورس نہیں کروں گا اور نہ ہی میرے دل میں تمہارے لیے کبھی بدگمانی کے احساسات ہوں گے۔ یہ سب تمہاری اپنی مرضی اور پسند پر منحصر ہے۔ مجھے ہمیشہ اپنا ویل و شر (خیر خواہ) سمجھنا۔“ عبدالرحمن نے قدرے ملائمت سے کہا تو آمنہ اس کی بات سن کر زپر لب مسکرانے لگی۔

”چلو اب تم ریٹ کرو..... میں پھر کال کروں گا۔“ عبدالرحمن نے کہہ کر موبائل آف کر دیا اور آمنہ انتہائی حیرت کے عالم میں اس کے جملوں پر غور کرتی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ زندگی کیسے لمحہ، لمحہ بدل رہی تھی..... اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کیسے جوائے اس کی زندگی میں آیا پھر کیسے اس کی زندگی کے ٹریکس بدلے..... صرف چند ماہ کے لیے عبدالرحمن آیا بھی اور چلا بھی گیا..... اور اب عبدالرحمن نے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی بات سنا کر اسے چونکا دیا تھا۔ وہ عبدالرحمن کے بارے میں گہرائی میں جا کر سوچنے لگی۔ نرم اور سادہ مزاج انسان لگا تھا۔ وہ بالکل بھی جھگڑا و طبیعت کا سخت خوانسان نہیں تھا..... بہت ہمدردی سے دوسروں کے بارے میں سوچتا اور بہت محبت اور اپنائیت سے دوسروں کو ٹریٹ کرتا..... عبدالرحمن کے ساتھ گزارا ہوا ایک، ایک پل اس کی نظروں کے سامنے گزرنے لگا..... اسے کوئی بھی ایسا موقع یاد نہیں آیا جس نے اس کے ذہن میں کوئی منفی تاثرات چھوڑے ہوں۔ تب بھی نہیں جب جوائے نے اسے بہت تنگ کیا تھا..... وہ جتنا زیادہ عبدالرحمن کے بارے میں سوچتی..... اتنی ہی زیادہ اس کے بارے میں پازیشننگز پیدا ہونے لگتیں۔

”عبدالرحمن کے ساتھ زندگی کیسے گزرے گی.....؟“ اس سوال کے بارے میں وہ ہر اینگل سے سوچنے لگی تو اسے ہر اینگل پازیشننگز لگنے لگا..... اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

”عبدالرحمن اچھا لائف پارٹنر ہو سکتا ہے۔“ اس نے ہر زاویے سے سوچنے کے بعد تقریباً ایک ہفتے کے غور و فکر اور اسلامک سینٹر میں زینب سے مشورے کے بعد اوکے کہہ دیا۔ عبدالرحمن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور وہ بھی اپنے اس فیصلے پر بہت خوش تھی۔

☆☆☆

عبدالرحمن نے آمنہ کو باقاعدہ پروپوزل دینے سے پہلے ماں سے ذکر کر دیا تھا۔ جس پر ماں نے کافی حیل و حجت کی تھی۔

”کیا وہ تمہارے لیے مسلمان ہوئی ہے؟“ جمیلہ (ماں) نے قدرے حیرت سے عبدالرحمن سے پوچھا تھا۔

”نہیں اماں اسے اسلام سے پہلے ہی بہت لگاؤ تھا۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”پھر اسلام سے لگاؤ تمہاری محبت میں کیسے بدل گیا؟“ جمیلہ نے قدرے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”کیا مطلب.....؟ کیا آپ کو آمنہ کو بہو بنانے پر کوئی اعتراض ہے؟“ عبدالرحمن نے چونک کر پوچھا۔

”بیٹا..... رشتے داریاں اپنے لوگوں، اپنے خاندان اور اپنے مذہب میں ہوں تو بہتر ہوتی ہیں۔ غیر اور اجنبی

READING
Section

182 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

عورتیں کبھی اچھی بہویں ثابت نہیں ہوتیں۔“ جمیلہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔
 ”اماں اسلام میں ان باتوں کی کوئی گنجائش نہیں، جب باقاعدہ کلمہ پڑھ لیا اور ارکان اسلام پر عمل کرنا شروع
 کر دیا تو پھر تو غیر نہ ہوئی ناں..... اور آمنہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اسے مجھ سے نہیں بلکہ مجھے اس سے محبت ہوئی
 ہے..... اور میں نے اس سے شادی کے بارے میں سوچا ہے اس نے تو کبھی کچھ نہیں کہا بلکہ اس نے تو ہمیشہ اسلام
 کے موضوع پر ہی مجھ سے باتیں کی ہیں۔“

”تو کیا تم ہم سب کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس کے پاس چلے جاؤ گے؟“ جمیلہ نے قدرے گھبرا کر پوچھا اور
 ان کے چہرے پر انتہائی پریشانی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

”نہیں ماں..... میں اسے بیاہ کر یہاں لاؤں گا اور آپ دیکھیے گا کہ وہ آپ کی ساری بہوؤں میں سب سے
 اچھی ثابت ہوگی۔“ عبدالرحمن نے مسکرا کر کہا تو جمیلہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

”بیٹا تم ابھی سے اس کی اتنی تعریفیں کر رہے ہو۔“ جمیلہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”اماں وہ بہت اچھی انسان ہے۔ جب میرا اور اس کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا اور میں وہاں صرف پڑھنے کے
 لیے گیا تھا تو اس نے میری بہت مدد کی اور ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔“ عبدالرحمن نے گہری سانس لیتے
 ہوئے کہا تو جمیلہ اس کی باتیں سن کر خاموش ہو گئی تھیں۔

”ٹھیک ہے بیٹا جیسی تمہاری مرضی..... میرے لیے تمہاری خوشی سے بڑھ کر کچھ اہم نہیں اور وہ خوشی میں
 تمہارے چہرے پر دیکھ رہی ہوں۔“ جمیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو عبدالرحمن ان کی بات سن
 کر خوش ہو گیا۔

جمیلہ نے خوشی، خوشی اپنی بہو کے لیے خوب صورت کام دار عروسی جوڑا بنوایا اور اس کے ساتھ زیورات اور
 دوسرے ملبوسات بھی بنوائے۔ اس کی دونوں بھابھیاں اور بھائی دے، دے لفظوں میں اس شادی پر اعتراض
 کر رہے تھے کہ عبدالرحمن بہت بڑی غلطی کرنے جا رہا ہے مگر عبدالرحمن مطمئن تھا کہ یہ سب لوگ آمنہ کو جانتے نہیں
 اس لیے ایسی باتیں بنا رہے ہی۔

عبدالرحمن نے جب سے آمنہ کو بتایا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنے جرنی آرہا ہے تو وہ بہت زیادہ خوش
 تھی۔ اس نے کمپیوٹر پر ماں اور آمنہ کی آپس میں بات بھی کروادی تھی۔ اسلامک سینٹر میں باقاعدہ جانے سے وہاں
 کی مسلم خواتین سے اس کی بہت زیادہ دوستی ہو گئی تھی اور زینب تو اسے اپنی بیٹیوں کی طرح جانتی تھی۔ امام صاحب
 کو بھی اس کے ساتھ بہت اٹیچ منٹ تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو ایک اچھی مسلمان بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہتی،
 ان سے اسلامی احکامات اور سوالات پوچھتی رہتی اور اس وجہ سے وہ اس کی بہت زیادہ عزت کرتے تھے اور جب
 آمنہ نے سب کو اپنی شادی کے بارے میں بتایا تو ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تمام مسلم خواتین نے اس کی شادی کو
 اچھے طریقے سے منعقد کرنے کا پروگرام بنایا..... آمنہ کا اپنا تو کوئی تھا نہیں..... لیکن مسلم کمیونٹی کے سب لوگ یوں...
 بیہو کر رہے تھے جیسے ان کی اپنی عزیزہ کی شادی ہو..... عبدالرحمن جب وہاں پہنچا تو ان لوگوں نے بہت اچھے انداز
 میں اس کا استقبال کیا۔ آمنہ کے گھر کو صاف ستھرا کر کے بہت اچھا ڈیکوریشن کیا گیا..... عبدالرحمن نے اسے پہننے
 کے لیے وہ عروسی جوڑا اور زیورات دیے..... جو اس کی ماں نے خصوصی طور پر اس کے لیے بھیجے تھے۔ آمنہ اتنی محبت
 اور چاہت پر خوشی سے پھولی نہ سار ہی تھی ماں ہی خواتین نے اسے تیار کیا تو وہ بہت زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔
 اسلامک سینٹر میں اس کا نکاح پڑھایا گیا تھا اور بہت اچھے انداز میں اس کی رخصتی کی گئی۔ آمنہ کو دلہن بنے دیکھ کر...
 عبدالرحمن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا..... وہ محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“ آمنہ نے مسکرا کر پوچھا، وہ شرمناک رہی تھی۔
 ”اپنی قسمت پر حیران ہو رہا ہوں اور پھر تمہیں دیکھ کر اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تم واقعی میری بیوی بن چکی ہو..... آمنہ مجھے پھر بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم واقعی دلہن بن کر میرے سامنے بیٹھی ہو..... قدرت نے کیسے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔“ عبدالرحمن نے محبت بھرے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
 ”میں خود بھی سوچتی ہوں تو حیران ہو جاتی ہوں کہ تم سے ملاقات صرف ایک کلاس فیلو کی حیثیت سے ہوئی تھی اور جب تم یہاں سے گئے تو میں بہت ڈپریشن میں تھی کہ تم یہاں کبھی نہیں آؤ گے..... لیکن انسان کو کیا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اس کی قسمت میں کیا لکھا ہوتا ہے اور میری زندگی میں تو خدا نے اتنے زیادہ ٹرننگ پوائنٹس رکھے ہیں کہ تمہارے ساتھ شادی مجھے بالکل انہونی نہیں لگ رہی.....“ آمنہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ان کی شادی کا کھانا خاص طور پر اسلامک سینٹر کی طرف سے ہی دیا گیا تھا۔ شادی کے بعد تمام لوگوں نے ان دونوں کی بہت پُر تکلف دعوتیں کیں۔ آمنہ کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا مگر بہت خوش کن..... سب لوگ اتنی اپنائیت کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ اس کا دل خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا۔ عبدالرحمن بھی ان لوگوں کے حسن سلوک سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ دونوں شادی کے بعد بہت خوش تھے اور ان کے لیے ایک، ایک لمحہ انتہائی مسخو کن تھا۔ وہ دونوں زندگی کے اس فیز کو بہت زیادہ انجوائے کر رہے تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ اس نے دونوں کو ایک دوسرے کا لائف پارٹنر بنا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆
 اس روز آمنہ اور عبدالرحمن ایک شاپنگ مال میں شاپنگ کرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ جوائے نے انہیں دیکھا۔ وہ ان کے قریب جا کر غصے سے چلایا۔

”کیتھی، تم..... تم اس (گالی) کے.....“ ساتھ وہ دانت کچکچا کر عبدالرحمن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”شٹ اپ..... ہی از مائی ہسینڈ ناؤ..... ہم دونوں نے شادی کر لی ہے۔“ آمنہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو جوائے ہکا بکا رہ گیا۔

”وہاٹ..... وہاٹ..... تم نے اس کے ساتھ شادی کر لی ہے؟ آریوان پور سینس۔“ جوائے نے قدرے طنزیہ انداز میں عبدالرحمن کی طرف دیکھا جو جوائے کے مقابلے میں معمولی شکل صورت کا مالک تھا۔ درمیانہ قد، دبلا پتلا جسم، چہرے پر داڑھی..... اور اس کے مقابلے میں جوائے خوب صورت دراز قد، صحت مند جسم کا مالک، خوب صورت نقوش اور صاف رنگت کے ساتھ عبدالرحمن کے مقابلے میں بے انتہا پُر کشش اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔
 ”ہاں..... میں نے عبدالرحمن کے ساتھ شادی کر لی ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش ہیں..... اب تمہیں ہمارے راستے میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں، سمجھے تم.....“ آمنہ نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو جوائے اس کے تیور دیکھ کر چونک گیا۔

”کیتھی..... تم.....؟“ وہ حیرت سے بڑبڑایا۔
 ”میں آمنہ عبدالرحمن ہوں..... کیتھی مرچکی ہے اور اس کیتھی سے وابستہ تمام رشتے، باتیں اور یادیں سب ختم ہو چکی ہیں اور میں تمہیں بھی نہیں جانتی.....“

”چلیں عبدالرحمن.....“ وہ عبدالرحمن کا ہاتھ پکڑ کر خفگی سے جوائے کی طرف دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور جوائے کو اس پر غصہ آنے لگا وہ پاؤں پٹختا ہوا آگے بڑھ گیا۔

گھر آ کر بھی وہ سارا وقت غصے سے تلملانا رہا..... اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے عبدالرحمن اور کیتھی کا افسیر بہت پرانا تھا اور کیتھی نے اس سے اتنا عرصہ چھپائے رکھا۔ اسی لیے عبدالرحمن کے واپس پاکستان جانے کے بعد وہ جوائے کے ساتھ پہلے کی طرح فریج نہیں رہی تھی..... کیتھی کو اس سے چھیننے والا عبدالرحمن یعنی کہ ایک مسلم تھا اور

اس کی ماں کی زندگی کو برباد کرنے والا بھی ایک مسلم ہی تھا۔ اس کی ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔
 ”کسی مسلم پر کبھی اعتبار نہیں کرتا.....“ وہ الفاظ اس کے کانوں میں نشتر چبھو نے لگے اور اس کے اندر غصہ
 ایک لاوے کی صورت میں ابلنے لگا۔ کیتھی اور عبدالرحمن کی شادی کا سن کر اس کے اندر سلگتی آگ ایک دم انتہائی
 شدت سے بھڑک اٹھی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح مسلمز کے خلاف اپنا زہرا گلے..... انہیں کس،
 کس طرح برباد کرنے کی کوشش کرے۔

”کاش..... میرے بس میں کچھ ہوتا..... اور میں ان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا.....“ وہ ساری رات
 کروٹیں بدلتا رہا اور انتہائی غصے میں یہ سب سوچتا رہا۔ اس کا ذہن بہت انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔



آمنہ اور عبدالرحمن ایک دوسرے کو پیا کر بہت خوش اور مطمئن تھے۔ پاکستان میں عبدالرحمن کی فیملی ان کی آمد
 کی شدت سے منتظر تھی۔ آمنہ نے اس کی فیملی کے لیے بہت گفتش خریدے اور یہاں کی مسلم کمیونٹی نے انہیں بہت
 تحائف بھی دیے اور دعاؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔ آمنہ نے جینز کے ساتھ کرنا اور حجاب لے رکھا تھا اور اس کا
 چہرہ ہر قسم کے میک اپ سے عاری تھا مگر پھر بھی وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اتر پورٹ پر عبدالرحمن کے
 دونوں بڑے بھائی عبدالوہاب اور عبدالرب اپنی بیویوں اور بچوں کے ہمراہ انہیں لینے آئے تھے..... ان کے خیال
 میں آمنہ سچی سنوری، چمکیلا لباس اور زیورات پہنے ہوئے ہوگی مگر آمنہ کو جینز، کرتے اور حجاب میں دیکھ کر وہ ایک دم
 چونک گئے۔ عبدالوہاب کی بیوی ہاجرہ اور عبدالرب کی بیوی شبنم نے برقع پہن رکھے تھے۔ دونوں بہت عام اور
 معمولی شکل صورت کی عورتیں تھیں مگر دونوں بہت چمکیلے بھڑکیلے لباس پہنے اور میک اپ کے لیے آئی تھیں۔
 گوکہ آمنہ بالکل سچل تھی پھر بھی بہت خوب صورت دکھائی دے رہی تھی لیکن اسے اتنا سادہ دیکھ کر وہ سب مایوس
 ہو گئے۔ عبدالرحمن جتنا نارمل اور عام لگ رہا تھا آمنہ اتنی ہی زیادہ خوب صورت اور کیوٹ لگ رہی تھی۔ وہ سب
 لوگوں کے ساتھ بہت محبت اور تپاک سے مل رہی تھی۔ عبدالرحمن کے دونوں بھائی اسے دیکھ کر بری طرح چونکے تھے
 اور عبدالرحمن کی قسمت پر رشک کر رہے تھے کہ اسے اتنی خوب صورت بیوی ملی ہے مگر انہوں نے اپنی سوچ اپنے تک
 ہی محدود رکھی۔ گھر پہنچتے، پہنچتے رات کے دو بج گئے تھے، دونوں کو گھر لایا گیا تو جمیلہ نے بہت محبت سے آمنہ کو چوم کر
 اور اسے اپنے گلے لگا کر دونوں کا بھرپور استقبال کیا۔ نوبیا ہتا دو لہا، دلہن کی ساری رسمیں ادا کی گئیں اور ان کی نظر
 بھی اتاری گئی، صدقے نکالے گئے۔ آمنہ ان سب باتوں کو بہت انجوائے کر رہی تھی اور بہت محسوس ہو کر دیکھ رہی
 تھی۔ باتوں اور رسموں میں ہی فجر کی اذانیں ہونے لگیں۔ سب لوگ بہت شور مچا کر ہلا گلا کر رہے تھے۔ ڈھولک
 رکھی گئی تھی۔ سب گا بجا رہے تھے۔ اذان کی آواز سن کر آمنہ ایک دم چونکی اور حیرت سے سب کی طرف دیکھ کر دونوں
 ہاتھ ہلا، ہلا کر سب کو خاموش ہونے کو کہنے لگی تو سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا آپ لوگ نہیں جانتے کہ ہمارے پرافٹ حضرت محمد ﷺ نے کیا فرمایا ہے کہ جو شخص اذان کے وقت
 خاموش نہیں رہتا موت کے وقت اسے کلمہ نصیب نہیں ہوگا۔“ آمنہ نے قدرے بلند آواز میں انگلش میں کہا تو ہاجرہ
 اور شبنم نے قدرے خفگی سے منہ بنا کر اپنے، اپنے شوہروں کی طرف دیکھا۔ سب کو سمجھ آ گیا تھا کہ وہ اذان کے
 بارے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ سب خاموش ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ خود آمنہ خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔
 جمیلہ اس کی بات سن کر بہت خوش ہوئیں اور عبدالرحمن نے بھی مسکرا کر تعریفی انداز میں اس کی طرف دیکھا جبکہ ہاجرہ
 اور شبنم کو بہت انسلٹ محسوس ہوئی۔ دونوں نے اپنے، اپنے بچوں کو اٹھ کر جانے کو کہا کہ جا کر سب آرام کریں.....
 کسی کو شور مچانے اور کسی کا چاؤ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

”ہم تو پاگل ہیں جو ہفتے بھر سے گھر کی صفائیاں، ستھرائیاں کر کے دلہن کے استقبال کی تیاریوں میں ہلکان ہو رہے ہیں۔ دلہن نے تو آتے ہی سب کی بے عزت کر دی۔“ ہاجرہ خفگی سے منہ بنا کر بولی۔ آمنہ کو قطعی احساس نہیں ہوا کہ ہاجرہ نے کیا کہا تھا..... وہ مسکرا کر اسے دیکھتی رہی۔

”بھابی..... اس نے کوئی غلط بات نہیں کہی، آپ کیوں ناراض ہو رہی ہیں؟“ عبدالرحمن آمنہ کے دفاع میں بولا۔
 ”ہاں..... بھیا، تم تو ابھی سے جو رو کے غلام ہو گئے ہو..... اس سے بڑھ کر تو سچی پکی اور نیک مسلمان کوئی ہے ہی نہیں ناں.....“ ہاجرہ نے غصے سے کہا اور شوہر، بچوں کو لے کر پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

”عبدالرحمن مجھے نماز پڑھنی ہے، فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔“ آمنہ نے کہا تو عبدالرحمن نے بڑے بھائی کی بیٹی فریحہ کو کہا کہ وہ آمنہ کو وضو کرا دے۔ اس نے منہ بنا تے ہوئے لوٹے میں پانی ڈالا اور اسے وضو کرانے لگی۔

وہ اسے وضو کرا کے اور نماز بچھا کر دے گئی اور خود اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ عبدالرحمن مسجد کی طرف نماز پڑھنے چلا گیا۔ گھر میں صرف جمیلہ نے نماز ادا کی تھی باقی گھر کے سب افراد اپنے، اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔ آمنہ، نماز پڑھ کر فارغ ہوئی اور اپنے بیگ سے پاکٹ سائز قرآن پاک نکال کر پڑھنے لگی۔ عبدالرحمن مسجد سے واپس آیا تو حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”آمنہ، تم ابھی تک سوئی نہیں..... کیا اتنے سفر کے بعد تمہیں تھکاوٹ نہیں ہوئی؟“ عبدالرحمن نے اس کے چہرے پر انتہائی تھکاوٹ کے آثار دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بس تھوڑا سا قرآن پاک پڑھ لوں..... عبدالرحمن جب سے میں مسلم ہوئی ہوں، فجر کے بعد تھوڑا سا قرآن پاک ضرور پڑھتی ہوں۔ اس سے میرے دل کو سکون ملتا ہے۔“ آمنہ نے مسکرا کر کہا تو عبدالرحمن پُرسٹائش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا..... تھوڑی دیر بعد اس نے قرآن پاک پڑھ کر چوم کر بند کر دیا۔

”تم نے قرآن پاک پڑھنا کہاں سے سیکھا ہے؟“ عبدالرحمن نے مسکرا کر پوچھا۔
 ”اسلامک سینٹر سے..... میم زینب سے۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا اور نماز کا دوپٹا اتار کر بیڈ پر آ گئی۔

چھوٹے سے کمرے کو رنگ برنگے چمکیلے کاغذی پھولوں اور لڑیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ عبدالرحمن کا گھر چھوٹا سا تھا جس میں تینوں بھائیوں کے لیے ایک ایک کمرہ مخصوص تھا۔ ایک چھوٹا سا کمرہ جمیلہ کے پاس تھا۔ صحن، کچن اور ڈرائنگ روم، دو واش رومز آمنہ نے گھر کی طرف تو کوئی خاص توجہ نہ دی مگر گھر والوں پر حیران ہو رہی تھی۔

”عبدالرحمن سب لوگ میرے اذان کی طرف توجہ دلانے پر غصہ کیوں ہو رہے تھے؟“ آمنہ نے قدرے پریشانی سے عبدالرحمن کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ ایک دم شرمندہ ہونے لگا پھر اس نے سب کو سونے کے لیے جاتے دیکھا تھا نماز پڑھنے کے بجائے۔ اب وہ اس کے جواب میں کیا کہتا..... اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ جو کہہ رہی تھی بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن اس کے اس سچ کو سننے کا کسی میں بھی حوصلہ نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اسے یہ کہہ سکتا تھا کہ تم اپنے کام سے کام رکھنا..... ان باتوں کو نہ چھیڑنا..... ان کے معاملات میں دخل نہ دینا..... عبدالرحمن نے ایک گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

”عبدالرحمن آپ میری باتوں کو سن کر خاموش کیوں ہو گئے ہیں؟“ آمنہ نے عبدالرحمن کو قدرے الجھے ہوئے دیکھ کر پوچھا تو وہ اس کی بات سن کر ایک دم ہڑبڑا گیا۔

”نہیں..... تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے..... اب تم سو جاؤ، بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو اور میں بھی سونے لگا ہوں۔“ عبدالرحمن نے لائٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ اس نے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

(جاری ہے)

وہاں کچھ نہیں ہو گئے کہ جاؤں گا

اقبال بانو

دوسرا اور آخری حصہ



”جی اچھا.....“ عاتزہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
”ہاں، ہمیں بہت زوروں کی پیاس لگی ہے، بڑا
جگ بھر کر شربت لانا.....“ وہ مسخرے پن سے
بولی۔ ”ہم تو پورا جگ دودھ پی لیتے ہیں۔“

”یہ مشعل رو کیوں رہی ہیں؟“ اللہ دتہ نے
پریشانی سے پوچھا۔
”جاؤ عاتزہ، اللہ دتہ کے لیے کوئی جوس وغیرہ
لاؤ۔“ ملیجہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولیں۔

187 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

READING
Section

اس اثنا میں مشعل اٹھ کر بیٹھ چکی تھی اور وہ اللہ دتہ کو دیکھے جا رہی تھی جو اس کی جانب بڑی محبت سے دیکھ رہا تھا۔

”تم جاؤ یہاں سے۔“ مشعل بولی۔

”کہاں جائیں ہم۔“ اللہ دتہ گڑ بڑا کر بولا۔
”شکر ہے آپ کو ہوش آ گیا اب ہم شکرانے کے نفل پڑھیں گے۔“

”آپ پلیز یہاں سے جائیں۔“ مشعل نے اللہ دتہ کو کہتے ہوئے دروازہ کی طرف اشارہ کیا۔
”مگر ہم کیوں جائیں، ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟“ وہ آنکھیں پٹ پٹا کر معصومیت سے بولا۔

”میں کہہ رہی ہوں ناں بس جائیں یہاں سے۔“ مشعل چلائی۔ وہ دادو کو دیکھنے لگا۔
”چلو بیٹا ہم باہر چلتے ہیں۔“ عشرت جہاں تمام صورت حال سمجھنے ہوئے بیڈ سے اٹھیں۔

”ہم شربت تو پی لیں.....“ اللہ دتہ ماتحتی لہجے میں بولا۔

”عائزہ وہیں لے آئے گی۔“ عشرت جہاں بولیں اور اللہ دتہ کو لے کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد مشعل ماں سے لپٹ گئی۔

”مئی میں اس شخص کے ساتھ مر جاؤں گی۔“ وہ ماں سے لپٹ کر زور، زور سے رونے لگی۔ ملیجہ بھی دکھی ہو کر اس کا سر چومنے لگیں۔

”تم پریشان نہ ہو بیٹا، میں تمہیں دکھی نہیں ہونے دوں گی۔“

☆☆☆

اللہ دتہ صوفے پر پالتی مارے بیٹھا دادو سے باتوں میں مصروف تھا کہ ملیجہ بھی وہیں چلی آئیں۔
”اب مشعل ٹھیک ہے ناں.....؟“ عشرت جہاں پوچھنے لگیں۔

”ہاں ٹھیک ہے، میں نے کہا کہ سو جاؤ تو اب سوئی ہوئی ہے۔“

”ہاں سناؤ اللہ دتہ! تمہارے ابو، امی تو ٹھیک

ہیں؟“ ملیجہ پوچھنے لگیں۔
”ہاں بالکل ٹھیک ہیں امی آپ کو سلام کہہ رہی تھیں آپا جی.....“

”ارے یہ تیری آپا نہیں ہے، چاچی لگتی ہے..... تمہارے ابا..... عثمان کے کزن ہوئے تو ملیجہ تمہاری ”چچی“ ہوئی ناں.....“

”اچھا مگر مجھے تو یہ آپا ہی لگتی ہیں، بہت اسمارٹ سی ہیں۔“ اب وہ بہت غور سے ملیجہ کو دیکھ رہا تھا۔
”چاچا جی سے تو بہت چھوٹی ہوں گی؟“

”اے ہٹ صرف دو سال کا فرق ہے۔“ عشرت جہاں تڑخ کر بولیں۔

”دادو آپ نے اپنے بیٹے کی عمر میں ضرور ڈنڈی ماری ہے.....“ وہ انگلی نچا کر بولا۔

”چل ہٹ شریہ..... فریدہ اور ملیجہ کلاس فیلو تھیں، ایک عرصہ ساتھ پڑھیں، اپنے پڑوس میں ہی تو فریدہ لوگ رہے تھے..... اچھی لگی تو دونوں کو بہویں بنا لیا، ایک میں نے لی اور دوسری آپا نے اخلاق کے لیے پسند کر لی۔“

”اس کا مطلب ہے میرے ابا اور عثمان چاچا عاشق مزاج تھے، لومیرج ہوئی ہوگی یقیناً.....“

”نہیں بھئی، انتہائی شریف بچے تھے ہمارے۔“ عشرت جہاں ہنسنے لگیں۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے اتنی خوب صورت لڑکیاں دیکھ کر دل نہ دھڑکے.....“ اللہ دتہ عجب بے ڈھنگے سے انداز میں بولا۔

”اللہ دتہ تمہارا دل بھی خوب صورت لڑکیاں دیکھ کر دھڑکتا ہے؟“ عشرت جہاں کو بھی مذاق سوچھا۔

”اونہوں..... میں تو خوب صورت یہ لہی پونچھ (دم) والی گائے بھینس دیکھ لوں تو دل دھڑکتا ہے۔“
”اے لو اس میں دل دھڑکنے والی کون سی بات ہے.....“ عشرت جہاں حیرت زدہ ہو کر بولیں۔

”دادو آپ کو نہیں پتا جس طرح لہی چٹیا اور کالی آنکھیں لڑکی کی خوب صورتی ہوتی، میں اسی طرح

بھی وہیں بیٹھا تھا..... خاموش، چپ سا۔

”کیا بات ہے تم اداس ہو؟“

”ہاں دادو، ہم اپنی امی کے لیے بہت اداس ہیں۔“

”دو ہی دن تو ہوئے ہیں اور ابھی سے ماں کے

لیے اداسی کا دورہ پڑ گیا۔“

”اصل میں امی سے تھوڑا عرصہ بھی دور رہیں

ناں تو ہم اداس ہو جاتے ہیں۔“

”چلو فریدہ کو کہوں گی جلدی آ جائے..... اور

آ کر تمہاری منگنی کر دے۔“

”یہ لوگ مان جائیں گے؟“

”لو بھلا کیوں نہیں مانیں گے۔“ وہ جلدی سے بولیں۔

”مجھ سے تو نہ بلو بھائی نے اچھی طرح سلام دعا

کی نہ ملیجہ آئی نے۔“ وہ دکھ سے بولا۔

”اے چھوڑو، انہیں کون پوچھتا ہے..... کرنا تو سب

عثمان نے ہے۔“ عشرت جہاں وثوق سے بولیں۔

”اور مشعل.....؟“ اللہ دتہ پریشانی سے بولا۔

”وہ بھی مان جائے گی تم فکر نہ کرو بس..... مشعل

کی شادی تمہارے ساتھ ہی ہوگی۔“

”سچ دادو..... آپ اسے بتائیں میں پورا فارم

ہاؤس اور ڈیری فارم بھی اس کے نام کر دوں گا۔ وہ اگر

مجھے نہ ملی تو میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔“ وہ روہانسا ہو

کر بولا۔

”تم دل چھوٹا نہ کرو جو تمہاری منشا ہے وہی

ہوگا۔“ دادو نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

☆☆☆

رات کو کھانے پر سب ہی موجود تھے۔ آج دادو

کے برابر والی کرسی پر اللہ دتہ براجمان تھا۔ مشعل، ملیجہ

کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ نہ جانے میز کھرچتے ہوئے کیا

سوچ رہی تھی۔ اللہ دتہ اسے دیکھ دیکھ کر خود ہی مسکراتا

اور شرما جاتا۔

سب سے پہلے عشرت جہاں نے حسب روایت

اپنی پلیٹ میں سالن ڈالا پھر اللہ دتہ کی پلیٹ میں ڈالا

اب ڈونگے سب کی طرف گردش کر رہے تھے۔

بھینس، گائے کی خوب صورتی لمبی دم ہوتی ہے۔“

”زرے گاؤدی ہی رہے تم.....“ عشرت جہاں

نے ہنس کر اسے چپت لگائی۔ تبھی موجود دونوں ہاتھوں

میں شاپرز لیے اور ٹھجور کے پتوں کی بنی ٹوکری سر پر

رکھے آن وارد ہوا۔

”اتنی دیر کر دی کب سے تو گئے تھے۔“ ملیجہ

ڈپٹ کر بولیں۔

”وہاں یوٹیلیٹی اسٹور پر بہت رش تھا۔“ موجود

ان کے قریب ہی سامان رکھ دیا تھا۔

”ارے آپ لوگ سستے اسٹور سے سامان

لیتے ہیں..... یہ جو بیوٹی لے لی (یوٹیلیٹی) اسٹور ہیں ناں یہ

غریبوں کے لیے ہیں..... آپ تو امیر لوگ ہیں پھر

بھی.....“ اللہ دتہ حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولا۔

”نہیں تو یہ کم بخت خود ہی وہاں گھس گیا ہوگا۔“

ملیجہ موجود کو گھورتے ہوئے بولیں۔

”چل اٹھا سامان اور جا کر کچن میں رکھ۔“

”یہ کون ہیں؟“ موجود نے حیرت سے پوچھا۔

”ہم..... ہم اللہ دتہ ہیں۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ

کر بولا۔

”گھر میں بڑا ذکر تھا آپ کا۔“ باچھیں پھیلا کر

موجود نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”اچھا، اچھا..... اور بھئی موجود غصہ نہ کرنا، ہم

نو کروں سے ہاتھ نہیں ملاتے.....“ اللہ دتہ نے

مغرورانہ انداز میں کہا اور ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”چل اب یہاں سے جا بھی.....“ ملیجہ نے گھور

کر کہا۔

”لگتا ہے آپا جی خفا ہو گئی ہیں، ہے ناں

دادو.....“ اللہ دتہ بولا۔

”ارے نہیں، وہ موجودیر سے آیا ہے ناں اس

لیے بہو کو غصہ آ گیا۔ تم پریشان نہ ہو۔“

اللہ دتہ سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

عشرت جہاں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں اور اللہ دتہ

READING
Section

”واہ بڑے مزے کا قورمہ ہے۔“ اللہ دتہ
سناشی لہجے میں بولا۔
”مشی آپ نے کیا پکایا ہے؟“ وہ بڑے ہی
بے تکلف انداز میں بولا۔

”زہر.....!“ مشی نے چلبلا کر جواب دیا۔
”یہ کوئی نئی ڈش ہے شاید، ہم نے پہلے کبھی نام
نہیں سنا..... کہاں سے؟“ اللہ دتہ نے ہونقوں کی طرح
پوچھا۔ تبھی مشعل کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
”ممی میرا کھانا میرے کمرے میں بھجوادیں۔“
وہ تنناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔
”اے ہے اے کیا ہوا؟“ عشرت جہاں بولیں۔
”بہت کچھ ہوا ہے اے۔“ ملیجہ بڑبڑا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

عشرت جہاں لان میں بیٹھی تھیں اور شہناز ان
کے کندھے پر بارہی تھی کہ مشعل غصے سے ان کے سامنے
آکھڑی ہوئی۔
”واہ دادو مان گئی آپ کو بھی اور آپ کی محبت کو بھی.....“
”اے ہے کیا ہوا تجھے.....؟“ عشرت جہاں
حیرت سے بولیں۔

”یہی محبت ہے آپ کی..... یہ نمونہ میرے لیے
پسند کیا ہے آپ نے.....“
”میں سمجھی نہیں۔“ عشرت جہاں حیرت سے بولیں۔
”سمجھ تو خیر آپ گئی ہیں مگر میں بھی صاف،
صاف کہہ رہی ہوں کہ مر جاؤں گی مگر آپ کے اللہ دتہ
سے شادی ہرگز نہیں کروں گی آئی سمجھ.....“
”کیا برائی ہے اس میں؟“

”پہلے تو مجھے اس کا نام عجیب لگتا تھا اور..... اور
اب اس کی حرکتیں انداز..... عجیب لوفرانہ طریقے سے
مجھے سرخ، سرخ آنکھوں سے گھورتا ہے۔ یہ سب میری
برداشت سے باہر ہے۔“ وہ حد درجہ تنگ کر بولی۔
”تم اس کی منگیتر جو ہو.....“ وہ بڑے اطمینان
سے بولیں۔

”یونہی خواہ مخواہ..... میں کہہ رہی ہوں آپ اس

کو چلتا کریں ورنہ.....“
”ورنہ کیا کرو گی؟“ عشرت جہاں بھی تنگ گئیں۔
”پہلے بھی میں کہہ چکی ہوں، اے گولی مار دوں گی
سن لیں آپ۔“ مشعل تنناتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔
”پتا نہیں اس لڑکی کا کیا ہوگا۔“ عشرت جہاں
اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

”آپ مشعل کی بات مان لیں بڑی بیگم صاحبہ.....“
اس کے جانے کے بعد شہناز آہستہ سے بولی۔
”اے لو ابھی تو وہ بچی ہے، نا سمجھ ہے۔“
”پھر انہیں اللہ دتہ پسند جو نہیں۔“

”پسند کیوں نہیں، کیا کمی ہے، اتنا سوہنا گبرو
جوان ہے، لوگ تو اسے اپنا داماد بنانے کے لیے مرے
جار ہے ہیں۔“

”ہاں ہے تو مگر مشعل بی بی کو جو پسند نہیں پھر.....“
”یہ سب ملیجہ کی شہ پر ہو رہا ہے، وہی اس کا
دماغ خراب کیے ہوئے ہے امریکا، لندن کے رشتے
جب ماں بتائے گی تو میری مشی کو یہاں کے رشتے کب
پسند آئیں گے؟“ بہو پر سارا غصہ ان کی غیر موجودگی
میں اتر رہا تھا اور شہناز تیزی سے دادو کے کندھے
دبارہی تھی۔

☆☆☆

”دیکھ لیا آپ نے اللہ دتہ کو.....؟“ دو تین دن
اللہ دتہ کو برداشت کر کے بلال بالآخر آج باپ کے
سامنے پھٹ پڑا تھا۔
”ہاں بیٹا.....“

”آپ دادو کو زمان انکل کے ہاں جانے دیں،
کہیں تو میں خود چھوڑ آتا ہوں۔“
”دماغ تو صحیح ہے تمہارا..... میں ماں کو گھر سے
نکال دوں ایک ذرا سی بات پر.....“

”یہ ذرا سی بات ہے، میری بہن کا فوجوہ وہ تباہ
کر رہی ہیں اور آپ ذرا سی بات کہہ دے ہیں، خد ہے
پاپا.....“ وہ بہت طیش میں تھا۔

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ اور آپ

چند کارآمد ٹپس

- 1۔ روٹی کو نرم رکھنے کے لیے آٹا گرم پانی سے گوندھیں..... سفید آٹے میں تھوڑا چمکی کا آٹا ملا کر گوندھنے سے روٹی اگلی صبح تک نرم رہے گی۔
- 2۔ روٹی پکا کر کھجور کے پتوں کی چنگیر میں اتاریں پھر بعد میں روٹی کے کپڑے میں لپیٹ کر رکھیں اور نرم شاپر میں یہ کپڑا رکھیں پھر روٹیاں کسی ٹوکری، ڈلیا یا روٹی کے ڈبے میں رکھیں اگلے دن تک صحیح رہیں گی۔
- 3۔ روٹی کے برتن اور کپڑے کو ہر روز دھو کر سکھائیں۔
- 4۔ صاف خاکی کاغذ روٹی کے کپڑے پر رکھ کر اس میں روٹی رکھیں تو گرم روٹی کے دھبے کپڑے پر نہیں پڑیں گے۔
- 5۔ اپنے کام پر روٹی لے جانا ہو یا سفر پر لے جانا ہو اسی ترکیب سے نرم اور گرم رہے گی۔
- 6۔ آج کل لڑکیاں وٹامن ڈی کی کمی کا شکار ہو رہی ہیں۔ اس کے لیے صبح خیزی کی عادت ڈالیں اور صبح نو بجے سے پہلے والی دھوپ میں بیٹھنا مفید ہوتا ہے یا پھر ڈھلتے ہوئے سورج کی دھوپ کو ہڈیوں میں جذب ہونے دیجیے..... فلیٹ سٹم اور آرام طلبی نے یہ دونوں وقت ہماری زندگی سے چھین لیے ہیں۔
- 7۔ بریسٹ گینسر سے بچنے کے لیے وٹامن سی اور فائبر پر مشتمل غذائیں استعمال کریں..... سیاہ رنگ کے انڈرگارمنٹس سے بچیں..... دن بھر کے UGS رات میں استعمال نہ کریں۔ مائیں بچوں کو خود فیڈ کرائیں۔ اپنے جسم کی اسمارٹنس کے خیال سے پہلے بچے کی غذائی ضرورت کا خیال رکھیں جو میڈیکل آپ کی بھی فٹنس کے لیے ضروری ہے۔

مرسلہ: نگہت زیدی، بہارہ کہو

کی والدہ کیا چاہتی ہیں؟“
 ”تم یہ کس لہجے میں بات کر رہے ہو بلال.....؟“
 ”میں صحیح کہہ رہا ہوں..... آپ دادو کی ناراضی مول لے لیں، خدارا میری بہن کو اس پینڈو سے نہ بیاہیں۔“
 ”خاندان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کیا برا ہے، پینڈو سم ہے، دولت مند ہے کیا ہے جو ویل ڈریسڈ نہیں..... اور دیکھو بھولا بھالا ہے باقی اور سنور جائے گا۔“

”سب سے بڑھ کر تعلیم اور ایٹی کیٹس کاؤنٹ کرتے ہیں پاپا۔“

”اپنا تو ہے..... میں کس طرح اماں کی بات لوٹا دوں۔“
 ”پھر مشی کو گولی مار دیں۔“ بلال غصے سے بولا۔
 ”سنو بلال، ہم کچھ عرصہ اللہ دتہ کو یہیں رکھتے ہیں کم از کم اسے شہر کے طور طریقے تو سکھاؤ۔ یقیناً ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

”مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا..... نہ ہی اتنی فرصت ہے۔“
 ”لوگ تو جانوروں کو بھی سدھار لیتے ہیں، اللہ دتہ تو پھر انسان ہے۔“

”جانور نما انسان.....“ بلال بڑبڑایا۔
 ”بیٹا میں اخلاق سے بات کروں گا کہ وہ اللہ دتہ کو سمجھائے..... اگر واقعی یہ مشعل سے شادی کرنا چاہتا ہے تو پھر اسے مشعل کی پسند میں ڈھلنا ہوگا۔“ عثمان احمد بولے۔

”اور اگر وہ پھر بھی نہ مانی تو.....؟“ ملیحہ جلدی سے بولیں۔

”کیوں نہیں مانے گی، اگر تم اسے شہ نہ دو تو وہ فوراً مان جائے گی۔ اللہ دتہ بہت اچھا ہے، ذرا پالش کی ضرورت ہے اسے۔ تم اپنی بہن کے لیے اتنا نہیں کر سکتے۔“

”پاپا میں اللہ دتہ کو بدلوں.....؟“ ذیشان بھی بولا۔
 ”کتنا بھی وہ بدل جائے مشی تو کبھی نہیں مانے گی۔“ ملیحہ نے کہا۔

”تم نے ضرور کچھ الٹا سیدھا بولنا ہے، تم چاہتی

آم کاٹتے ہوئے اللہ دتہ کے ہاتھ سے چھری گر گئی۔
 ”ہائے ہم مر گئے۔“
 ”یہ کہو ہم ڈر گئے.....“ موجو، اللہ دتہ کی بدحواسی
 کے مزے لے کر بولا۔

”بکومت.....“ اللہ دتہ تڑخ کر بولا۔ ”گستاخ، بدتمیز.....“
 ”یہ آپ کیا کر رہے تھے چوری، چوری.....“
 ”چوری کیسی چوری؟ کھانے پینے کی کوئی چوری
 نہیں ہوتی۔“ اللہ دتہ ہاتھ نچا کر بولا۔

”یہ جو آپ ٹھونس رہے ہیں یہی چوری ہے۔“
 ”تمیز سے بات کرو، تم نوکر ہو اور نوکر بن کر
 رہو..... ہم اس گھر کے ہونے والے داماد ہیں بلکہ
 مالک ہی ہوئے۔“ اللہ دتہ ہاتھ اٹھا کر تڑخ کر بولا۔
 ”اچھا..... بلے بھی بلے.....“ موجو دونوں
 ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”کیا اچھا..... ہاں.....؟“ اللہ دتہ نے آنکھیں نکالیں۔
 ”یہی کہ آپ اس گھر کے ہونے والے داماد
 ہیں..... مگر مشعل بی بی تو.....“
 ”کیا ہوا مشعل کو.....؟“ اللہ دتہ گھبرا کر اپنے
 سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔
 ”یہی کہ وہ آپ کو پسند نہیں کرتیں۔“ موجو سچائی
 سے بولا۔

”وہ ذرا شر ماتی ہیں.....“ اللہ دتہ مسکرا کر
 بولا۔ ”دل میں مجھے پسند کرتی ہیں۔“
 ”خوش فہمی میں مر جاؤ گے.....“ موجو بڑ بڑایا
 اور اللہ دتہ بھڑک اٹھا۔

”بکواس مت کرو گستاخ نوکر..... رات کا ایک
 بج رہا ہے، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ اللہ دتہ نے رعب
 جمانے کی ناکام کوشش کی۔
 ”پانی پینے آیا تھا.....“ موجو بولا تو اللہ دتہ نے
 اس کی گردن پکڑ لی۔

”ہم سے جھوٹ..... ارے ہم تو اڑتی چڑیا کے
 پر گن لیتے ہیں۔“
 ”ہم سے تو آپ یہاں کیا کر رہے تھے، چوری،

ہو اماں یہاں سے چلی جائیں تو سن لو ملیجہ بیگم ایسا نہیں
 ہوگا اگر میری ماں ناراض ہو کر چلی گئی تو میں خود کو شوٹ
 کر لوں گا۔ خوش ہو جانا پھر تم سب.....“ عثمان احمد
 کہتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر چلے گئے۔
 ملیجہ، بلال اور ذیشان حق دق زہ گئے۔

☆☆☆

”بلال میرا خیال ہے پاپا بھی اپنی جگہ صحیح ہیں۔“
 عازہ نے بلال کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے کہا۔
 ”کیا مطلب.....؟“

”ظاہر ہے اماں چلی جاتی ہیں تو پاپا کے لیے
 بہت بے عزتی کی بات ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ مشی
 کی شادی ہی نہ کی جائے۔“

”تمہیں پتا ہے شادی سنت نبوی ﷺ ہے۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے کچھ عرصے کے لیے ہم مشی کی
 شادی کا تذکرہ نہیں کرتے..... کہتے ہیں وہ ابھی شادی
 نہیں کرنا چاہتی وہ ایم فل کر رہی ہے۔“

”ہاں، یہ صحیح ہے۔“ بلال جلدی سے بولا۔
 ”ویسے دادو کی منطق بھی عجیب ہے، کہاں مشی
 اور کہاں میٹرک فیل اللہ دتہ۔“ عازہ کا لہجہ افسردہ تھا۔
 ”بس دادو کو اس کے کاروبار نے متاثر کیا ہے
 اور کوئی بات نہیں۔ ویسے شکل صورت کا برا نہیں ہے اگر
 وہ اپنا پہنا وابدل لے۔ چال ڈھال بدل لے تو یقین
 کرو عازہ وہ بہت زبردست پرسنالٹی کا مالک ہو جائے
 گا۔“ بلال کی بات پر عازہ حیرت سے اسے دیکھے گئی۔

☆☆☆

”مزہ آگیا واہ بھئی..... سب کے سامنے تو ذرا
 سا کھاؤ اور شرم کے مارے پیٹ بھر کر دو دن سے کھانا
 ہی نہیں کھایا۔“ اللہ دتہ ڈانگ ٹیبل پر بیٹھا فروٹ کی
 ٹوکری سے پھل نکال کر کھانے میں مصروف تھا
 اور ساتھ، ساتھ بڑ بڑا بھی رہا تھا۔ تبھی موجو اندر چلا آیا
 جہاں اللہ دتہ کھانے میں مصروف تھا وہ نہایت حیرت
 سے اسے دیکھنے لگا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس کے قریب جا کر موجو بولا

READING
Section

”کیوں..... کیوں.....؟“ اللہ دتہ نے پریشان ہو کر کہا..... معلوم نہیں وہ ایسا ہی تھا یا مشعل کے سامنے ایکٹنگ کر رہا تھا۔

”اپنی شکل دیکھی ہے تم نے؟“ مشعل گرجی۔

”ہاں بہت مرتبہ، ششے میں بہت دیر تک ہم اپنی صورت دیکھتے ہیں مگر آج کل ہمیں ششے میں اپنے بجائے آپ کی صورت نظر آتی ہے۔“ وہ چہرے پر بیچارگی لیے کہہ رہا تھا اور مشعل..... وہ غصے سے کھولتے ہوئے اپنی مٹھیاں بھینچ رہی تھی۔

”سنیں، ہمارا نام اے ڈی نہیں..... اللہ دتہ ہے کئی مرتبہ بتایا ہے.....“ وہ اس کے غصے کی پروا کیے بغیر بڑے اطمینان سے بولا۔

”اے ڈی کا مطلب بھی یہی ہے بس تم اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ مشعل چٹکی بجا کر بولی۔ ”میں شام تک تمہیں یہاں نہ دیکھوں سمجھے تم.....“

”مگر ہم کہاں جائیں؟“ وہ روہانسا ہو کر بولا۔

”اپنے گھر جاؤ فیصل آباد.....“

”ہم آپ کے بغیر گھر نہیں جائیں گے۔“ وہ اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے بولا۔

”میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی، سمجھے تم.....“ مشعل پاؤں پیچ کر بولی۔

”لے جائیں گے، لے جائیں گے، دل والے

دلہنیا لے جائیں گے۔“ اللہ دتہ بڑی ادا سے مسکرایا

اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے مشعل کے قریب آ کر

گنگنانے لگا۔

”گوٹو ہیل.....“ مشعل تنناتی ہوئی وہاں سے

چلی گئی۔ اور اللہ دتہ اپنی ہی دھن میں یہی گائے چلا گیا۔

☆☆☆

اللہ دتہ باہر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ڈوبتے

سورج کو دیکھ رہا تھا۔ جیسی پیچھے سے کھٹکے کی آواز آئی۔

وہ کن آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ پیچھے مشعل ہے۔ اس

نے جھٹ سے فون کان سے لگا لیا۔

”ہاں امی، ہم خیریت سے ہیں، سب ٹھیک ہے

چوری فروٹ کھا رہے تھے..... میں بیگم صاحبہ کو بتاؤں گا۔“ موجواپنی گردن چھڑاتے ہوئے بولا۔

”او بے وقوف نوکر..... تجھے پتا نہیں سسرال

والوں کا مال داماد پر حلال ہوتا ہے۔“ اللہ دتہ اس کے

گال پر چپت لگا کر مسکراتا ہوا پکن سے نکل گیا۔ موجو

خاموش کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

اللہ دتہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا پاؤں

میز پر رکھے بڑی بے نیازی سے ٹی وی دیکھ رہا تھا جیسی

اسے مشعل سامنے سے سیڑھیاں اترتی نظر آئی۔ وہ ٹی وی کا

والیم کم کر کے آنکھیں بند کیے اونچی آواز میں گانے لگا۔

”ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے.....

مرنے والا کوئی..... مرنے والا کوئی

زندگی چاہتا ہو..... جیسے“

مشعل وہیں سیڑھیوں پر ہی ٹھنک گئی۔

اللہ دتہ نے یہ مصرعے پھر دہرائے اور ساتھ،

ساتھ میز بھی بجانے لگا۔

جیسی مشعل تیزی سے سیڑھیاں اترتی اس کے

قریب آئی۔

”یہ کیا میرا شیوں کی طرح گار ہے ہو؟“

اللہ دتہ نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

”ارے آپ مشعل..... زہے نصیب ہمارے

قریب.....“ وہ بڑے بھونڈے طریقے سے بولا۔

”بکواس بند کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔“

مشعل ڈپٹ کر بولی۔

”کیوں نہ ہم دونوں مل کر ٹی وی دیکھیں۔“ وہ

معصومیت سے بولا۔

”میں کہہ رہی ہوں کہ تم میرے گھر سے چلے

جاؤ..... گیٹ لاسٹ.....“

”ہم کیوں جائیں..... بس دو تین دن تک امی

آجائیں گی پھر میری آپ سے منگنی ہو جائے گی اور.....“

”دیکھو منسٹر اے ڈی میں تم سے شادی

نہیں کروں گی۔“

وہ ہکا کر بولا۔
 ”لگتا ہے تمہاری نظر بالکل ہی کمزور ہے۔“
 ”ہاں، بالکل صحیح کہا آپ نے تبھی تو ہم نے یہ
 چشمہ لگوا یا ہے۔“ وہ افسردہ لہجے میں اپنی عینک کو ہاتھ لگا
 کر بولا۔

”تم یہاں کیوں آئے؟“ مشعل جھنجھلا کر بولی۔
 ”ہم..... ہم یہاں اوپر کوٹھیاں دیکھنے آئے
 ہیں۔“ اللہ دتہ معصومیت سے بولا تو مشعل زیر لب
 مسکرانے لگی۔

”وہ ہے ناں کہ ہمارے ابا نے کہا ہے کہ ہم کوئی
 اچھی سی کوٹھی پسند کر لیں، وہ ہمیں خرید دیں گے۔
 ہماری شادی کا تحفہ.....“

”یہاں کوٹھی خریدو گے؟“ وہ حیرت سے پوچھنے
 لگی جیسے اس کے ابا نے کوئی کپڑا پسند کرنے کو کہا ہو کہ
 ہم خرید دیں گے۔

”ہاں، ہم نے ابا سے کہا ہے کہ ہم شادی کے
 بعد کراچی میں ہی رہیں گے۔“
 مشعل اسے گھورتی رہی۔

”پھر وہ کوٹھی ہم آپ کو رونمائی میں دے دیں
 گے۔“ بے تگے انداز میں شرماتے ہوئے اللہ دتہ بولا۔
 ”شٹ اپ..... جسٹ شٹ اپ.....“ مارے
 غصے کے مشعل کی رگیں تن گئیں۔

”ہم سمجھے نہیں.....“ وہ معصومیت سے بولا۔
 ”گو ٹو ہیل.....“ مشعل پاؤں پیچ کر..... کہتی
 وہاں سے چلی گئی۔

اللہ دتہ گہری سانس لے کر رہ گیا..... ”پتا نہیں
 مشی ہماری محبت کا جواب محبت سے کیوں
 نہیں دیتی.....“ وہ ریلنگ پہ دونوں ہاتھ ٹکا کر سوچ
 میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

مشی نیچے آئی..... جہاں عشرت جہاں، موجو کو
 ڈانٹ رہی تھیں۔
 ”کم بخت تجھ سے کوئی کام ڈھنگ کا ہوتا بھی ہے؟“

یہاں، دادو ہمارا بہت خیال رکھتی ہیں، ہاں مشی
 ہمیں بہت اچھی لگتی ہے، آپ جلدی سے آ جائیں اور
 منگنی نہ کریں بلکہ سیدھے سادے شادی کر دیں۔ ہم
 اب مشی کے بغیر فیصل آباد نہیں جائیں گے۔“ وہ چند
 لمحے کو خاموش ہوا جیسے دوسری طرف کی بات سن رہا ہو۔
 ”اوہو..... امی تیار کیسی.....؟ بینک بھرا پڑا
 ہے میرے پیسوں سے..... ہاں خوب دھوم دھام سے
 شادی ہو۔ ارے امی پورے کراچی کو پتا تو چلے..... اور
 ادھر فیصل آباد میں بھی چرے چرے ہوں کہ ہماری یعنی اللہ
 دتہ کی شادی ہے۔ پتا ہے امی، مشی ہمیں مسٹراے ڈی
 کہتی ہے، سچ بہت اچھا لگتا ہے۔ اس کے ہونٹوں سے
 اپنا یہ نام..... جی چاہتا ہے وہ کہتی رہے ہم سنتے
 رہیں۔“ وہ تہقہ لگا کر بولا۔

”نہیں امی، مشی مجھ سے بات نہیں کرتی، ہر وقت
 غصہ کرتی ہے، لگتا ہے ہم سے شرماتی ہے۔ پر امی ہمیں تو
 وہ بہت پسند ہے۔ بس اب آپ جلدی آ جائیں یہ نہ ہو کہ
 اتنی خوب صورت لڑکی ہاتھ سے نکل جائے۔ اچھا چلیں،
 اب میں فون بند کرتا ہوں۔“ دھاڑ سے دروازہ بند ہوا
 اور اللہ دتہ کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا مشعل ٹیرس پر کھڑی اپنی ہی
 سوچوں میں گم تھی کہ اللہ دتہ گنگنا تا ہوا ٹیرس پر آ گیا۔
 ”ایسا پیار کرنے والا میری جان
 تجھے ڈھونڈے نہ ملے گا
 ایسا بانکا اور سجیلا نوجوان
 تجھے ڈھونڈے نہ ملے گا“

وہ آنکھیں موندے ایسے گارہا تھا گویا اس نے
 مشعل کو نہیں دیکھا جبکہ وہ باہر لان سے ہی اسے دیکھ
 چکا تھا۔ مشعل ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے
 خونخوار نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

”ایسا بانکا اور سجیلا نوجوان.....“ وہ بدستور گاتا رہا۔
 ”تمہاری یہ بکو اس بند نہیں ہو سکتی۔“ مشعل دھاڑی
 ”ارے، آپ یہاں..... ہمیں پتا نہیں تھا کہ.....“

READING
 Section

مشعل کے رشتے کے سلسلے میں بات کر رہا تھا۔

”اے لوگھر کا لڑکا ہے، سیدھا سادہ معصوم سا.....“

”مگر آج کل کی لڑکیاں ایسے لڑکوں کو پسند

نہیں کرتیں، بھوندو کہتی ہیں، آپ انکار کر دیں اب بھی

وقت ہے۔“

”تم مجھے مت سمجھاؤ، اللہ دتہ کو مشی بہت پسند ہے۔“

”مگر آپ کی کو تو اللہ دتہ پسند نہیں ہے ناں.....“

”نہ پسند ہو، شادی کے بعد پسند آ جائے گا۔“

”یہ آپ کی بھول ہے۔“

”اچھا تم اس کا دل برانہ کرو.....“

تبھی اللہ دتہ نے انٹری دی۔

”ارے دادو آپ یہاں بیٹھی ہیں میں سارا گھر

تلاشتا پھر رہا ہوں۔“

”میں صدقے... خیریت تو ہے۔“

”ہاں خیریت ہے، بس پوچھنا تھا آپ سے کہ

بازار چلا جاؤں۔“

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں ضرور جاؤ..... کچھ لینا ہے؟“

”جی جو لینا ہے..... مگر کس کے ساتھ جاؤں۔“

”تم شانی کے ساتھ چلے جاؤ.....“ انہوں نے

ذیشان کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“

”تم خود چلے جاؤ۔“ شانی تڑ سے بولا۔

”اگر ہم شہر میں کھو گئے تو.....؟“ وہ انتہائی

معصومیت سے بولا۔

”ارے ذیشان، تم بچے کو لے جاؤ ناں؟ ویسے تو

سارا دن لوڑ لوڑ پھرتے ہو۔“

”ہم کار میں تیل ڈلوادیں گے ٹھیک ہے ناں دادو.....“

”آہم..... ہم..... ہم تو ایسے بولتے ہیں جیسے

لکھنؤ کے نواب ہوں۔“ وہ دل ہی دل میں بولا۔

”چلیں پھر.....“ شانی اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا دادو واللہ حافظ.....“ اللہ دتہ، عشرت جہاں

کو خدا حافظ کہنے لگا۔

”جاؤ اللہ کی امان میں۔“ عشرت جہاں بھی

”دادو آپ سمجھالیں اپنے لاڈلے کو۔“ مشی

غصے سے بولی۔

”کیا ہوا.....؟ کون سا لاڈلا.....؟“ عشرت

وہاں حق دق رہ گئیں۔

”وہی اے ڈی..... جہاں میں جاتی ہوں منحوس

وہیں چلا آتا ہے۔“ مشعل غصے سے بولی۔

”اے ہے وہ تجھ سے محبت کرتا ہے۔“ عشرت

جہاں مسکرائیں۔

”لغت بھیجتی ہوں میں اس پر اور اس کی محبت پر.....“

”اے ہے باؤلی ہوئی ہے۔“ عشرت جہاں

نے اپنی ناک پر انگلی رکھی۔

”اے چلتا کریں دادو..... ورنہ میں یہ گھر چھوڑ

کر چلی جاؤں گی۔“

”کیا مطلب ہے تیرا.....؟“ دادو نے حیرت

سے پوچھا۔

”بس یہاں اب آپ کا لاڈلار ہے گایا میں.....“

”تم بھی تو میری لاڈلی ہو.....“ عشرت جہاں

مزید کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر مشعل بات کاٹ کر بولی۔

”کبھی کبھی لاڈلی پر اب نہیں ہوں.....“ مشعل کی

آواز بھڑا گئی اور وہ تیز، تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں

چلی گئی۔

”کیا ہوا..... اماں، مشی کیوں غصے میں ہے؟“

ملیجہ نے ساس سے آکر پوچھا۔

”بس اللہ دتہ برا لگتا ہے، میں تو سوچ رہی ہوں فریہ

آ رہی ہے تو ممکنہ کے بجائے فوراً نکاح کر دیتے ہیں۔“

”کیا، کیا اماں.....؟ مشی مانے تو تب

ناں.....“ ملیجہ ہکا بکا رہ گئیں۔

”اس کا یہی علاج ہے، ارے ایسا سیدھا سادہ

پیسے والا داماد تمہیں کہیں نہیں ملنے کا۔“ عشرت جہاں

ہاتھ نچا کر بولیں اور ملیجہ شاک کی کیفیت میں تھیں۔

☆☆☆

”دادو آپ نے کیا سوچ کر مشی کا رشتہ اللہ دتہ

سے طے کیا؟“ لان میں دادو کے ساتھ بیٹھا ذیشان

دعائیں دیتی اندر چلی گئیں۔

☆☆☆

”اللہ دتہ میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔“ مشعل زور سے چلائی اور بیلنا اٹھالیا۔

”تم تصور تو کر کے دیکھو قسم سے ہیروئن لگو گی۔“ اللہ دتہ بہ دستور اسے چڑا رہا تھا۔

”دل چاہتا ہے میں تمہارا گلا ذبا دوں۔“ مشعل نے دانت کچکچائے۔

”نہ، نہ بہت درد ہوگا ہمیں۔“ اللہ دتہ نے جھٹ اپنی گردن پر ہاتھ رکھا۔

”اوہ مائی گاڈ.....“ مشعل اپنے ہاتھ پر مکا مارتی ہوئی پیر پختی وہاں سے نکل گئی۔ عاززہ پیٹ پر ہاتھ رکھے ہنسے جا رہی تھی اور اللہ دتہ معصومیت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

مشعل دہاڑ سے دادو کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ عشرت جہاں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”آپ نے آخر مجھ سے کس بات کا بدل لیا ہے؟“

”کیا ہوا میری جان.....؟“

”کچھ ہوا نہیں مگر ہو ضرور جائے گا..... آپ کا مسٹر اے ڈی مسلسل میرے پیچھے لگا رہتا ہے۔ جہاں سے گزروں واہیات گانے گاتا ہے، چٹکیاں بجاتا ہے، جان عذاب کر رکھی ہے میری۔“ مشعل مٹھیاں بچھ کر بولی۔

”منگلیتر ہے تمہارا تمہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔“

”دادو پلیز، مجھے کنوس میں ڈال دیں مگر ایسے چغد کے پلے نہ باندھیں۔“ مشعل ہاتھ جوڑ کر بولی۔

”بیٹا تم سمجھو تو اللہ دتہ بہت اچھا ہے، معصوم سا محبت کرنے والا..... خیال رکھنے والا اور آمدنی بھی بہت اچھی ہے، سب سے بڑھ کر تمہیں بہت چاہتا ہے۔“

”مگر میں تو اسے نہیں چاہتی..... بہت ہو گیا، میں کچھ کھا کر سو رہی ہوں گی، میں آپ کو بتائے دیتی ہوں۔“

”میں بھی بتائے دیتی ہوں، شادی تمہاری ہوگی تو صرف اللہ دتہ سے..... میں تمہاری ماں کی سب عادتیں جانتی ہوں، وہ نہیں چاہتی کہ تمہاری شادی اللہ دتہ سے ہوگی۔“

مشعل کچن میں کھڑی چائے بنا رہی تھی اور عاززہ بھی سبزی کاٹنے میں مصروف تھی۔ جیسی اللہ دتہ بھی کچن میں چلا آیا۔

”ارے آپ لوگ یہاں ہیں۔“

”خواتین کے لیے ہی کچن ہوتا ہے بھائی.....“

عاززہ مسکرا کر بولی۔

”اوہو آج عربی پک رہی ہے، ہمیں بہت پسند ہے عربی.....“ اللہ دتہ عاززہ کو اروی کاٹتے دیکھ کر بولا۔

”یہ عربی نہیں اروی ہے۔“ عاززہ ہنستے ہوئے بولی۔

”آپ کو بات تو سمجھ آگئی ناں یہی بہت ہے۔ اچھا یہ موجود کہاں ہے؟“

”کیوں کچھ چاہیے کیا.....؟“ عاززہ پوچھنے لگی۔

”آپ تو مصروف ہیں، مشی تم ہمیں ملک شیک بنا دو ناں.....“

”ہمارے گھر اتنا دودھ نہیں آتا جو ہر وقت تم ملک شیک ڈکارتے رہو۔“ مشعل جل کر بولی۔

”ولے تم آئے تھے تو ایک بھینس ہی لے آتے۔“ مشعل کپوں میں چائے ڈالتے ہوئے بولی۔

”یہ تم نے اچھا یاد دلایا۔ خیر شادی کے بعد جب تم یہاں آؤ گی تو ہم.....“

”بکومت.....“ اس کی بات کاٹ کر چلا تے ہوئے مشی نے کہا۔

”ویسے مشی ہم فارم ہاؤس پر رہیں گے، تم وہاں شیشم کے درخت پر جھولے ڈالنا اور یہ گانا گانا.....“

اب وہ کان پر ہاتھ رکھ کر لہک، لک کر گارہا تھا۔

”اچھا لہبیاں ٹہلیاں وے

وچ گجری دی پینگھ وے ماہیا“

”یہ گجری کیا ہوتی ہے؟“ عاززہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ اس نے اللہ دتہ کو آج ہی گاتے سنا تھا۔

”بھائی یہ گجری بیوی ہوتی ہے، دودھ پینے والے کو اکثر گجری کہتے ہیں..... جیسے ہم گجراور مشی گجری ہوگی۔“

READING
Section

196 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بسٹے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سمرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیزا 111 - سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی من کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 ٹیکس: 021-35802551

دوں گی۔" وہ سینہ ٹھونک کر بولیں۔
"اوہ دادو، مجھے مئی نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے خود اللہ دتہ ذرا بھی پسند نہیں..... جب وہ اپنی بھینسوں کی باتیں کرتا ہے تو اُف....." مشعل سر جھٹک کر بولی۔
"خیر تم کچھ بھی کہو میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا اور اگر تم نہ مانیں تو میں نعمان اور زمان کے ہاں چلی جاؤں گی، کہوں گی میرے مرنے پر بھی عثمان اور اس کے بیوی بچے نہ آئیں۔" عشرت جہاں قطعیت سے بولیں۔
"ٹھیک ہے، آپ جو چاہیں کریں، پاپا کو بلیک میل کریں مگر میں بلیک میل نہیں ہوں گی۔" مشعل کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

"کل فریڈہ آئی آرہی ہیں مگنی کرنے....."
عائزہ، بلال سے بولی۔
"ہاں آتورہی ہیں پر کیا مگنی بھی کریں گی؟"
"بلال اپنی مٹی بالکل بھی راضی نہیں ہے۔"
"میں کیا کروں..... راضی تو میں بھی نہیں ہوں۔"
"آپ پاپا سے بات کریں۔"
"وہ دادو کی وجہ سے مجبور ہیں۔"
"اولاد کی کوئی اہمیت نہیں؟"
"شاید نہیں....." بلال گہری سانس لے کر بولا۔
"مشی چار دن سے مسلسل اسے بے عزت کر رہی ہے مگر مجال ہے وہ اس کی سنے....."
"اب کیا، کیا جائے۔" بلال بھی فکر مند تھا "مشی سے کہو اللہ دتہ کو اپنے رنگ میں رنگ لے..... اور کیا....."
"ہاں بچہ ہے ناں جو اس کے رنگ میں رنگ جائے گا....." عائزہ نے سر جھکا کر کہا۔ اچانک ہی زور، زور سے بولنے آواز آنے لگی۔ عائزہ اور بلال تقریباً بھاگ کر کمرے سے باہر نکلے۔
مشعل، اللہ دتہ پر چیخ رہی تھی جو صوفے پر دبکا بیٹھا تھا۔
"کیا ہوا... کیا ہوا؟"

READING
Section

دادو بھی اونچا، اونچا بولنے لگیں۔
عائزہ اور بلال خاموش کھڑے تھے۔

☆☆☆

مشعل اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ لیے بیٹھی تھی
کہ عثمان احمد چلے آئے۔

”ارے پاپا آپ مجھے بلا لیتے۔“ وہ جلدی سے
لیپ ٹاپ آف کرنے لگی۔

”ایک بات کہنی ہے بیٹا، تمہید نہیں باندھوں گا
بس اتنا کہنا ہے کہ کل فریدہ آرہی ہے اور تم کوئی انکار
نہیں کرو گی، یہ میری مجبوری ہے کہ میں تمہاری اللہ دتہ
سے شادی کروں۔“

”کیسی مجبوری.....؟“ مشعل حیران تھی۔

”میری مجبوری، میری ماں ہے اور میں ان کی
بات نہ مان کر گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔ اچھی بچیوں کی
طرح تم مان جاؤ۔“

”پاپا آپ کو پتا ہے وہ کیسا ہے؟“ مشعل آہستہ
سے بولی۔

”بس سیدھا سادہ ہے، تعلیم واجبی ہے تو کیا
ہوا۔ بہت بڑا بزنس ہے ان کا..... اس کے الگ فارم
ہاؤس میں لگ بھگ دو تین کروڑ کی بھینسین گائیں ہیں۔
کاشن فیکٹری بھی اخلاق نے اس کے نام کی لگائی ہے
اور سب سے بڑھ کر اپنا ہے، تم خوش رہو گی۔“ انہوں
نے اس کا سر تھپکا۔

”پاپا، دولت خوشی کی ضامن نہیں ہوتی۔“ مشعل
کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”پھر بھی اللہ دتہ برا نہیں، میں نے ان چار دنوں
میں تجزیہ کیا ہے بہت سو فٹ نیچر کا ہے، دل کا برا نہیں سچا
اور کھرا ہے۔“

”یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟“ مشعل پوچھنے لگی۔
”ہاں، اگر تم نہ مانیں تو پھر سمجھنا کہ باپ تمہارا
مر گیا۔“

”اللہ نہ کزنے.....“ مشعل باپ کے گلے لگ کر
رونے لگی۔ عثمان احمد کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

دادو بھی باہر نکل آئیں۔
”آخر ہوا کیا.....؟“

”اسی سے پوچھیں، اسے جرأت کیسے ہوئی
میرے بالوں میں پھول لگانے کی؟“ مشعل غصے سے
لال پیلی ہو رہی تھی۔

اللہ دتہ اٹھ کر دادو کے کندھے سے لگ گیا گویا
پناہ گاہ کی تلاش میں تھا۔

”دادو..... وہ..... وہ..... ہم تو..... ہم تو.....“

”میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔“ مشعل آگے
بڑھی تو وہ ایک دم دادو کے پیچھے دب گیا۔

”اے ہے، بچے نے تمہیں پھول ہی تو دیا ہے
اور تم اس کا سر پھاڑ دو گی۔“

”اور کیا ہم نے کوئی گملا تو نہیں دے ڈالا.....“
اللہ دتہ نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔

”دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔“ مشعل زور
سے دھاڑی۔

”لو یہ کس طرح بات کر رہی ہو منگیترا ہے
تمہارا.....“ دادو مشعل کو ڈپٹ کر بولیں۔

”میں خون پی جاؤں گی تمہارا۔“ مشعل اپنے
ہاتھ آگے کیے۔ اللہ دتہ کی طرف لپکی۔

”دادو یہ تو آدم خور ہے ہمیں بچالیں۔“ اللہ دتہ
دادو سے لپٹ گیا۔

”کان کھول کر سن لو مٹھی، تمہاری شادی ہو گی تو
اللہ دتہ سے ہو گی۔ میرے جیتے جی تم کسی اور کی نہیں
ہو سکتیں۔“ عشرت جہاں قطعیت سے بولیں۔

”اس چغند سے شادی کرتی ہے میری جوتی.....“
مشعل تیزی سے پیر پٹختی وہاں سے جانے لگی مگر جاتے،
جاتے سنتی گئی کہ اللہ دتہ رو ہانسا ہو کر کہہ رہا تھا۔

”دادو، ہم نے مشعل سے شادی نہیں کرنی۔ کل
امی آرہی ہیں، آپ منع کر دیں وہ نہ آئیں۔ ہم کل ہی
فیصل آباد واپس چلے جائیں گے۔“

”تم کیوں جاؤ گے، میں دیکھتی ہوں کیسے تجھ
سے شادی نہیں کرتی مشعل، گلاب دادو کی کم بخت کا۔“

نہایت شستہ لہجے میں وہ مخاطب ہوا۔
 ”امی آپ ذرا باہر تو جائیں..... مجھے مشعل سے
 کچھ بات کرنی ہے۔“
 ”مگر کیوں.....؟ الطاف یہ تو راضی ہی نہیں تم
 سے شادی کو۔“

”آپ جائیں تو.....“ فریدہ کمرے سے نکل
 گئیں تو وہ مشعل کے قریب آیا۔

”تم اللہ دتہ سے شادی کو راضی نہیں ناں مگر
 الطاف زیدی سے شادی پر تو کوئی اعتراض نہیں
 تمہیں..... I am Altaf zaidi“ مشعل
 پریشان سی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

”دیکھو میری جانب اور تلاش کرو وہ خامی کہ تم
 مجھے ریجیکٹ کر سکو۔“

”تم..... تم فراڈی، دھوکے باز.....“ مشعل
 جیسے ایک دم ہوش میں آگئی اور اسے مارنے کو اٹھی۔
 اس نے مشعل کے ہاتھ پکڑ لیے۔
 ”مجھے تم نے بے وقوف بنایا.....“ وہ اس کی
 بات پر ہنس رہا تھا۔

”بے بنائے کو کون بے وقوف بنا سکتا ہے۔“ وہ ہنسا۔
 ”میں بے وقوف ہوں.....؟“ مشعل نے اسے گھورا۔
 ”کچھ کہوں گا تو شکایت ہوگی۔“ مشعل اسے
 وہیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا تاہم نہ کرو مگر تم مانے
 نہیں۔“ فریدہ، اللہ دتہ، الطاف کو ڈانٹ رہی تھیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں، میں اسے ابھی منالوں
 گا اور آپ کل مشعلی نہیں نکاح کیجیے گا ہمارا..... بس آپ
 کوئی ٹینشن نہ لیں۔ سب مجھ پر چھوڑ دیں۔“

”ہاں تم پہ چھوڑ دوں، ذلیل کراؤ گے میں ابھی
 عثمان بھائی سے بات کرتی ہوں۔ وہ بہت پریشان ہیں۔“
 ”انہیں سب پتا ہے۔“ فریدہ حیران تھیں۔

”بھابی میں کتنی کم فہم ہوں اللہ دتہ مجھے بے
 وقوف بناتا رہا اور میں بنتی گئی۔ بھی وہ کچن میں چلا آیا۔
 ”آپ چلے جائیں یہاں سے..... میں آپ کو

فریدہ اپنی نند آمنہ اور بیٹی انعم کے ساتھ آگئی
 تھیں اور وہ سب سے مل کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔ تبھی
 مشعل کونہ پا کر انہوں نے عائرہ سے کہا۔ ”ارے بھئی
 مشعل کو تو بلاؤ۔ میں اپنی بہو سے تو مل لوں۔“
 عائرہ مشعل کو لے کر آگئی۔

”کیسی خوب صورت ہو گئی ہے مشی..... پورے
 چھ سال بعد دیکھا ہے ناں۔“ وہ مشعل کو پیار سے گلے
 لگاتے ہوئے بولیں۔ اللہ دتہ بھی بیٹھا دیکھ رہا تھا آج
 مشعل نے کوئی سنتا نہیں دکھایا تھا۔

مشعل کے کمرے میں بیٹھی فریدہ اسے جوڑے
 اور دیگر سامان دکھا رہی تھیں جو وہ مشعل کی غرض سے
 فیصل آباد سے لے کر آئی تھیں۔ پانچ جوڑوں میں سے
 انہوں نے مشعل سے کہا کہ اپنی مرضی کا کوئی بھی پہن
 لیتا۔ وہ بہت خوش تھیں۔

”آئی مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ مشعل نے
 وہ جوڑے ایک طرف رکھ کر ان سے کہا۔

”ہاں بولو بیٹی.....“ فریدہ اس کی طرف دیکھ کر بولیں۔
 ”وہ دراصل، میں آپ کے بیٹے سے شادی نہیں
 کر سکتی۔“ مشعل بہ مشکل اٹک، اٹک کر بولی۔

”کیا کہہ رہی ہو تم؟“ فریدہ حیرت زدہ رہ گئیں۔
 ”سوری آئی آپ کو دکھ ہوا ہوگا مگر.....؟“

”کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو۔“
 ”نہیں..... نہیں مجھے کوئی بھی پسند نہیں.....“

مشعل جلدی سے بولی۔
 ”تو انکار کی وجہ.....؟“ فریدہ صدمے کی کیفیت
 میں تھیں۔

”مجھے اللہ دتہ پسند نہیں.....“ مشعل نے کہا۔
 تبھی دروازے پر دستک ہوئی.... اور آنے والا
 اندر آ گیا۔ مشعل آنے والے کو دیکھ کر ایک لمحے کے
 لیے حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔

اسکاٹی بلیو شلوار سوٹ میں سلیقے سے شیپو کیے
 بال سنوارے بغیر سرے کے جذبے لٹاتی آنکھیں اور

ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔“ اللہ دتہ نے عازرہ کو کچن سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ کچن سے چلی گئی۔
 ”کیا میں اتنا برا ہوں مشعل.....؟“ اس کا لہجہ بڑا گبیہر تھا۔

صراحی گری تھی۔“ مشعل منہ پھیر کر مسکرانے لگی ہے۔
 ”دادھر میرے سامنے مسکراؤ.....“ الطاف نے محبت سے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

”آپ بہت برے ہیں، آپ نے مجھ سے ٹانگ کھیلایا۔“
 ”اپنوں کے ساتھ ٹانگ کرنے کا مزہ ہی اور ہے۔“ الطاف مسکرایا۔ مشعل وہاں سے جانے لگی تو الطاف نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”ایسا بانکا اور بھیلایا.....“ وہ گنگنایا۔
 ”مجھے آپ اب بھی پسند نہیں۔“ مشعل نے کہا۔
 ”ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں پسند نہ ہوں ورنہ تم اتنے اطمینان سے میری بات نہ سنتیں..... مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ تم بہت سطحی سی لڑکی ہو جو ظاہر کو پسند کرتی ہے مگر ڈیر مشی ہر چمکتی شے سونا نہیں ہوتی..... انسان کا ظاہر تو کچھ بھی ہو سکتا ہے، اس کا پہناوا اچھا نہ ہو لب و لہجہ پسند نہیں آتا تو اسے اپنی پسند میں ڈھالا جا سکتا ہے..... مگر دل تو نہیں بدلے جا سکتے کہ دل اپنی پسند پر نہیں چلائے جا سکتے۔“

”فروجرم سنادی“ صفائی کا موقع نہیں دوگی۔“
 نہایت گبیہر لہجے میں وہ بولا۔
 ”مجھے کوئی وضاحت نہیں چاہیے۔“ مشعل نے کہا۔
 ”مگر میں تو وضاحت دوں گا۔“
 وہ اسے گھورتی رہی۔

”کیا زندگی میں دل کی کوئی اہمیت نہیں ہے؟“ مشعل نے پوچھا۔
 ”ہے دل کی اہمیت.....“ الطاف جلدی سے بولا۔ ”مگر دل تو اپنی من مانی کرتا ہے کسی کی نہیں سنتا جیسے میرا دل کہتا ہے دلہن میں لے کے جاؤں گا۔ قسم سے لے کے جاؤں گا۔“ الطاف ہنستے ہوئے بولا۔

”جب دادو نے مجھے تمہارے لیے پسند کیا تو یہی کہا کہ تمہیں کوئی پروپوزل پسند نہیں آتا۔ میں نے کہا میں ضرور مشی کو پسند آؤں گا مگر وہ بھی مجھے پسند آئی تو اور پھر میں نے کالج میں سوہنی ماہیوال ڈرامے کی تصویر دے دی، میں نے ڈرامے میں ماہیوال کا کردار ادا کیا تھا وہ گیٹ اپ والی تصویر تمہیں بھلا کیسے پسند آئی۔“

”آپ بہت برے ہیں، مجھے اتنا رلا یا ہے، بے وقوف بنایا۔“
 ”معافی بھی تو مانگ رہا ہوں۔“ وہ محبت سے بولا۔
 ”کب مانگی ہے معافی.....؟“ مشعل گھورتے ہوئے بولی۔

”پر آپ تو میٹرک فیل ہیں۔“ مشعل نے کہا۔
 ”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے ایگری کلچر میں ایم ایس سی اور ڈیری فارمنگ میں PHD کیا ہوا ہے۔“
 مشعل حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”اتنی دیر سے وضاحتیں دے رہا ہوں یہی تو معافی ہوتی ہے۔“
 ”اچھا یہ معافی ہوتی ہے مسٹر اے ڈی تو جائیں ہم نے آپ کو معاف کیا.....“ مشعل ہنستی ہوئی کچن سے بھاگ نکلی۔

”تم نے مجھے صرف میرے حلے کی وجہ سے ریجیکٹ کیا، میں یہاں آیا پھر سب سے میننگ ہوئی سب نے میرا ساتھ دیا اور مجھے پسند بھی کر لیا اور مشکل یہ تھی کہ مجھے بھی تم پہلی نظر میں بھاگنی تھیں ورنہ تو.....“
 ”ورنہ تو کیا.....؟“ مشعل نے پوچھا۔

”اچھا یہ معافی ہوتی ہے مسٹر اے ڈی تو جائیں ہم نے آپ کو معاف کیا.....“ مشعل ہنستی ہوئی کچن سے بھاگ نکلی۔

”میں چلا جاتا..... تمہیں ریجیکٹ کر کے مگر کیا کروں کہ تم تو ال میں گھس گئی تھیں پہلی نظر میں تمہیں تو

الطاف احمد کا زندگی سے بھر پور تہقہہ اس کی سماعتوں میں گونجنے لگا۔

شناخت

ام ایسان و تاضی

زندگی میں انسان کی روح کو بعض دفعہ ایسے زخم لگ جاتے ہیں جن پر دنیا کا کوئی مرہم، کوئی دوا قطعاً بے اثر ٹھہرتی ہے پھر ایسے زخموں کی پرورش وقت کرتا ہے۔ انہیں ہوا دے کر، اذیت و درد کے طویل صحرا سے گزار کر بالآخر ایسے ناسور میں تبدیل کر دیتا ہے جو لا علاج ٹھہرتا ہے۔ عمر بھر رستا ہے، نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے.....
سچ ہے جسم پر لگنے والے زخم تو پھر بھی بھر جاتے ہیں پر زبان کی دھار اور دھوکا و فریب کی کاٹ سے جو



READING
Section

2015 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

زخم روح پر لگتے ہیں انہیں ناسور ہی بننا ہوتا ہے۔ کریم بخش شاہ، شاہ پور کے سجادہ نشین چہرے پر بے تحاشا تھکن اور نقاہت لیے اپنے خاص کمرے میں نیم دراز تھے۔ پاس ہی ان کی چالیس سالوں کی رفاقتوں کی ساتھی، ان کے ہر دکھ، درد سے آشنا ان کی نصف بہتر بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھیں۔ وہ ان کے چہرے پر رقم اذیت دیکھ کر رہ نہ سکیں تو تشویش سے بول اٹھیں۔

”کیا بات ہے شاہ صاحب! طبیعت تو ٹھیک ہے ناں.....“ ویسے تو وہ عمروں سے رت جگوں کا شکار تھے پر رات شاہ صاحب کی حالت کچھ زیادہ خراب ہو جانے پر ان کا بڑا پوتا اذان شاہ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا جہاں ان کو ڈپریشن بتایا گیا تھا ساتھ ہی تاکید کی گئی تھی کہ انہیں ہر قسم کی پریشانی سے دور رکھا جائے۔

”اللہ پاک کا کرم ہے نیک بخت! بس دعا کیا کرو کہ اس پاک ذات نے جس آزمائش میں ڈالا ہے بس اس میں سرخرو ہو کر اس دنیا سے جائیں۔“ شاہ صاحب نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

”وہ مالک کسی کو کسی کی ہمت سے زیادہ نہیں آزما تا شاہ صاحب! اس پر بھروسہ رکھیں۔“ صدیقہ بیگم کی اپنی آواز نمکین آنسوؤں کے بوجھ سے بھرا گئی۔

”اذان شاہ آئے تو اسے ہمارے پاس بھیج دیجیے گا اور جب لنگر ختم ہو جائے تو الٹی بخش کو پیغام بھجوادیں کہ وہ مردانے میں ہمیں بلوالے گا۔“ انہوں نے صدیقہ بیگم کو کچھ ہدایات دیں تو وہ چونک گئیں۔

”آج اگر مریدین کو منع کر دیں..... آپ کی طبیعت.....“

”نہیں صدیقہ! مالک نے ہمارا نصیب پتا نہیں کس، کس ضرورت مند کی ضرورت سے جوڑ رکھا ہے۔ یہ لوگ ہر ماہ آج کی تاریخ کو ایک آس اور امید لے کر آتے ہیں۔ ہمارا دل نہیں مانتا ان کو خالی لوٹانے کو..... ہو سکتا ہے ہمارے حصے کی کوئی دعا تکمیل پانے کو ان لوگوں کے توسط کا انتظار کر رہی ہو۔“ انہوں نے صدیقہ بیگم کو مزید کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔

صدیقہ بیگم ان کے لہجے کا حتمی پن محسوس کر کے چپ کر کے باہر آ گئیں۔

یہ گاؤں اور پاس کے تین گاؤں بھی شاہ صاحب کی ملکیت تھے۔ وہی اس علاقے کے کرتا دھرتا تھے۔ زبان و عمل میں اپنے قول کے سچے کریم بخش شاہ کو یہاں کے لوگ بہت عزت و تکریم دیتے کیونکہ انہوں نے اس علاقے کی بہبود کے حوالے سے بہت سے ترقیاتی کام کیے سو کیے تھے اور بھی کئی حوالوں سے لوگوں کے لیے وہ بہت اہم تھے۔ ہر ماہ ان کے گھر کے باہر بنے مخصوص احاطے میں بے شمار ضرورت مند اپنی ضروریات کی تسکین اور مسائل کے حل کے لیے حاضر ہوتے۔ شاہ صاحب کی طرف سے لنگر کا انتظام ہوتا حتمی المقدور لوگوں کے مسائل سن کر حل کیے جاتے۔ ضرورت مندوں کو حیثیت کے مطابق ان کی ضرورت سے نوازا جاتا اور آخر میں ایک چھوٹے سے درس کا اہتمام ہوتا جس میں ہر بار شاہ صاحب کسی نہ کسی دینی و مذہبی موضوع پر بحث کر کے لوگوں کے فکر و شعور کو آگاہی کی دعوت دیتے۔ لوگوں کو اپنی ذات اور اللہ کی دی ہوئی دولت سے خوشیاں دینے والے کریم بخش شاہ اپنی ذاتی زندگی میں بے حد دکھی انسان تھے۔ ان کے دو بیٹے جواں سالی میں ہی ان کو چھوڑ گئے تھے۔ بڑے بیٹے کی وفات تب ہوئی جب وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ دوسرے گاؤں سے کسی شادی میں شرکت کے بعد گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ ان کا بڑا پوتا اذان شاہ اس وقت بارہ سال کا تھا اور پوتی چار سال کی تھی جبکہ دوسرے بیٹے کی وفات دل کا عارضہ لاحق ہو جانے کے باعث ہوئی۔ اس کی اہلیہ گھریلو ناچاتی کے باعث اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ شاہ صاحب اور صدیقہ بیگم ڈھسے گئے کھوکھلے ہو گئے۔ بیٹی اپنے ہی خاندان میں بیاہی تھی۔ اس کے بچے نانا کا گھر نزدیک ہونے کی وجہ سے یہیں پائے جاتے۔ خصوصی طور پر نو اسی خدیجہ پوتی عائشہ کی ہی ہم عمر تھی۔

☆☆☆

سر شام ہی ستارہ منزل میں رونقیں عروج پر آنا

READING
Section

202 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

شناخت

بغاوت کا سبب بنے ایسا ہم کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ تم کام سے نہیں لگتیں چلو یان لی تمہاری ضد..... پر آج سے ماسٹر صاحب تمہیں رقص و موسیقی کی تربیت دینے آئیں گے۔ پچھلے دنوں جمیل ستار نے تمہیں دیکھ کر مجھے ایک نیا راستہ دکھایا کہ تمہارا فیس اور فکر فلم لائن کے لیے بہت موزوں ہے۔ تھوڑا پالش ہو جاؤ تو وہ تمہیں اپنی نئی فلم میں انٹرو ڈیوس کرانے کو تیار ہیں۔ میں تو سمجھو خوشی سے پاگل ہو گئی ان کی بات سن کر..... ایک دنیا دیوانی ہوئی پھرتی ہے جمیل ستار کی فلم میں کام کرنے کو اور وہ تمہیں خود آفر کر رہے ہیں۔ کل سے دوبار ان کا فون آچکا کہ کب تم سے آکر مل لیں۔ تم بس آج سے پریکٹس شروع کر دو۔“ ستارہ بیگم نے اپنی خوشی میں اس کا فق ہوتا چہرہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔

”آئی..... میں وہ.....“

”بس خوشی! اس سے زیادہ رعایت تمہیں نہیں مل

سکتی۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔ ”فردوس کی بیٹی سمجھ کر میں پہلے ہی بہت ڈھیل دے چکی ہوں تمہیں ورنہ تمہیں پتا ہے ستارہ بیگم کو انکار کرنے والی لڑکیوں کو صرف چوبیس گھنٹے میں رستم کیسے سیدھا کر کے رکھ دیتا ہے کہ باقی ساری زندگی جو بھی کچھ کروالو پر رستم کے نام سے کیسے کانپ جاتی ہیں۔“ ان کے لہجے نے خوش بخت کے سارے جسم میں پھریری سی دوڑا دی۔ خوفناک شکل صورت والا کیم رستم واقعی باغی لڑکیوں کا چوبیس گھنٹوں میں وہ حال کرنا کہ ضدی سے ضدی لڑکی بھی یہی سوچ کر گھٹنے ٹیک دیتی کہ دوبارہ رستم کے ہتھے نہ چڑھنا پڑے۔

”آئی صرف ایک بار..... صرف ایک بار مجھے

میرے باپ کا نام و پتا بتادیں۔ مجھے ایک دفعہ اپنی قسمت آزمائینے دیں، آپ کو اپنی مری بہن کی قسم..... اگر انہوں نے مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہیں لوٹ کر آؤں گی آپ کے پاس..... بے شک آپ میرے ساتھ چلیں۔

شروع ہو جاتی تھیں۔ ہر طرف ایک گہما گہمی اور مخصوص رونق کا منظر تھا جو ہمیشہ کی طرح اسے کڑوا گھونٹ ہی لگا۔ سترہ سال اس نگر میں گزار لینے کے باوجود خوش بخت اس طرز زندگی کا خود کو عادی نہ کر پائی تھی۔ ورنہ ستارہ منزل میں ہر لڑکی سو لھویں سال میں قدم رکھتے ہی کام سے لگ جاتی تھی وہ شاید ستارہ بیگم کا اپنا خون تھی ان کی سگی بہن کی بیٹی جس کی ماں کو ایک شریف زادہ اپنی محبت کے سنہرے جال میں پھنسا کر گھر کی زینت بنانے کے وعدے کی ڈور تھما کر ان کی نظروں میں دھول جھونک کر لے گیا تھا..... پر محض ڈیڑھ سال بعد وہ بھی خوش بخت کو سینے سے لگائے لوٹ آئی تھی۔ ان لوگوں نے جو باتیں تو بڑی، بڑی کرتے ہیں..... پر کسی طوائف کا گھر بسانا کوئی نہیں برداشت کرتا فردوس بیگم پر زندگی اتنی تنگ کر دی تھی کہ وہ محض دو سال میں ہی تھک کر واپس اسی پناہ گاہ میں لوٹ آئی۔ فردوس بیگم کی عمر ہی مختصر تھی وہ ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئی اور ستارہ بیگم جدید دور کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ تنگ و تاریک گلیاں چھوڑ کر ایک پوش ایریے میں آ بسیں۔ ناز و ادا اور فن کی تربیت تو پہلے بھی دی جاتی تھی اب دور جدید کے بدلتے تقاضوں کے تحت لڑکیوں کو اسکول و کالج کی تعلیم بھی دی جانے لگی یہاں ستارہ بیگم کا کاروبار چمک اٹھا۔ بڑے، بڑے عہدے داروں اور سرپرستوں کی آڑ میں ستارہ بیگم کا کام اتنی صفائی سے چل رہا تھا کہ کسی قسم کے شک کی گنجائش نہ تھی۔ اگر تھی بھی تو اس قسم کے کاموں میں ٹانگ اڑانا کون پسند کرتا ہے..... ستارہ بیگم کو بہن کی نشانی سے لاکھ محبت سہی پر یہ منظور نہیں تھا کہ وہ اپنے آبائی پیشے سے ہٹ کر کچھ اور سوچے جبکہ خوش بخت گلے میں پھنسی ہڈی کی طرح ستارہ بیگم کو اٹک گئی اور اس گندے کاروبار کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ ستارہ بیگم نے پیار، ڈانٹ ہر طرح سے سمجھا کے دیکھ لیا تھا۔ اب ابھی وہ خالہ کے بلا بھیجنے پر ان کے حجرے کی طرف ہی آئی تھی۔

”تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی اور لڑکیوں میں

نہیں کس کے گناہ کا پھل ہے کو مارو دینا ہی بہتر ہے۔ ہر بار یہ بات سن کر اسے نئے سرے سے دکھ ہوتا حالانکہ بہت بار یہ بات سن چکی تھی۔

☆☆☆

اذان شاہ ابھی، ابھی شہر سے فیکٹری کی کچھ مشینری لوڈ کروا کے لوٹا تھا۔ بہت تھکا ہوا ہونے کے باعث چائے کی شدید طلب اسے کچن میں لے آئی جہاں ملازمہ کو چائے کا کہتا وہ اپنے کمرے کی جانب آ گیا۔ صدیقہ بیگم صبح تہجد کی اٹھی ہوئی درود اذکار سے فارغ ہو کر اس وقت کچھ آرام کرتیں، کریم بخش شاہ اس وقت کچھ لوگوں کے ساتھ باہر مردانے میں تھے سو وہ ان سے وہیں مل کر آیا تھا۔ فریش ہو کر آنے کے بعد اس نے خدیجہ کو چائے لاتے ہوئے دیکھا۔

”بہت مصروف ہو گئے ہیں آپ، آج کل نظر ہی نہیں آتے۔“ سلام کے بعد خدیجہ نے چائے رکھ کر اس سے کہا۔ اذان شاہ نے بہت حیرت سے اسے دیکھا ان کے درمیان اتنی بے تکلفی کبھی نہیں رہی تھی کہ ایک دوسرے کے معمولات کے متعلق باز پرس کی جاتی۔

”ہاں، آج کل فیکٹری کی تعمیر کا کام تکمیلی مراحل میں ہے تو اسی میں مصروف ہوں۔ ویسے عائشہ اپنے کمرے میں ہوگی اور چائے دینے کے لیے شکر یہ..... بانو کہاں چلی گئی، میں اس کے ذمے لگا کے آیا تھا چائے۔“ چائے کی چسکیاں لیتے اذان شاہ نے اسے بتا دیا کہ وہ اب یہاں سے جاسکتی ہے۔ خدیجہ کی آنکھوں کا بدلا ہوا رنگ وہ کب سے محسوس کر چکا تھا لیکن ابھی تک کسی کے بارے میں بھی اس حوالے سے اس نے نہیں سوچا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی میں بہت سی لڑکیاں اس کی رفاقت کا خواب لے کر اس کی جانب بڑھی تھیں پر دل کو کوئی بھایا ہی نہیں تھا پتا نہیں وہ گوہر مقصود کہاں تھا جس کی تلاش اسے تھی۔ خدیجہ خوب صورت تھی، اعلیٰ حسب نسب سے تھی۔ ب سے بڑھ کر اس کی کزن تھی پر اس نے اس کی آنکھوں کا پیغام پڑھ کر اس طرح نظر انداز کیا کہ پہلے جو بات چیت سلام

مجھے دیکھ کر وہ ضرور مجھے رکھ لیں گے۔ کوئی بھی باپ اتنا ظالم نہیں ہوتا کہ اتنے سالوں بعد بھی اپنی اولاد کو قبول نہ کرے..... آنٹی صرف ایک بار.....“ یک لخت وہ آگے بڑھی اور ستارہ آنٹی کے پیروں کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئی اور روتے ہوئے لجاجت سے التجا کی اسے لگا کہ اگر آج وہ نہ کہہ پائی تو ہمیشہ کے لیے انہی اندھیروں کا حصہ بن جائے گی اور ایسا ہی تو وہ نہیں چاہتی تھی۔

”ہونہہ تمہارا باپ! وہ نام نہاد شریف زادہ جس نے تمہیں اپنے وجود کا حصہ ماننے سے انکار کر دیا۔ تمہیں اور تمہاری ماں کو جان سے مار دینے کے درپے وہ شخص جس نے تمہیں تب دھتکار دیا تو اب کیسے تمہیں سینے سے لگائے گا۔ تم اس دنیا کی ہو تمہیں یہیں رہنا ہے باہر کی دنیا جو اس وقت جادو نگری دکھتی ہے درحقیقت بہت سفاک اور درندہ صفت لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ پتا ہے تمہاری ماں وہاں سے رات کے اندھیرے میں تمہاری اور اپنی جان بچا کر بھاگی تھی۔ ہمیں ساری دنیا طوائف کہتی ہے پر ہم جو کرتے ہیں علی الاعلان کرتے ہیں اور یہ ان جیسے لوگ.....“ انہوں نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

”یہ بعض دفعہ اتنے گرے ہوئے کام کر جاتے ہیں جنہیں سوچ کر ہم بھی شرماتا جاؤں..... ان کے دل بہت تنگ ہوتے ہیں۔ انہیں صرف لفظوں کے خوب صورت جال پھینکنے آتے ہیں..... اپنے نام نہاد شریف گھروں میں لے جا کر بسانا اور عزت دینا بہت دل گردے کا کام ہے اور باہر کی دنیا میں ایسا ظرف نہیں ہے میری بچی.....“ انہوں نے اسے اٹھا کر اپنے پاس صوفے پر بٹھایا اور خود سے لگا کر زندگی کی تلخی اور حالات کے اسرار اس کی سماعتوں میں اٹھیلنے لگیں، یہ دیکھے بغیر کہ اس کا دل و دماغ ایک ہی بات پر اٹک گئے تھے کہ تمہارے باپ نے تمہیں اپنا خون ماننے سے انکار کر دیا وہ تمہیں جان سے مار دینا چاہتا تھا اس کے گھر والوں کا بہت دباؤ تھا اس پر کہ ایسی بد چلن بیوی اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والی ناجائز اولاد جو پتا

READING
Section

204 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

تھا۔ تھکے ہوئے جسم اور دکھتے گلے کے ساتھ جب وہ اپنے کمرے کی جانب واپس آنے لگی تو ستارہ منزل میں رونقیں عروج پر تھیں۔ جی میں کیا سمائی کہ کمرے میں جانے کے بجائے لان میں آگئی کیونکہ میک اپ زدہ چہرے، ناز و ادا کے جلوے دیکھنے میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ستارہ منزل کی ساری لڑکیاں پُر جوش تھیں کہ پتا نہیں مہمان خصوصی کس پر اپنی نظر کرم فرمادیں اور وہ آسمان پر ہی پہنچ جائے سو سبھی کی تیاریاں اور نزاکتیں عروج پر تھیں۔ لمبے، لمبے جھولے لیتے اس نے اندر کی گھٹن کو باہر نکالنا چاہا پر اندر کا موسم جس زدہ ہو تو باہر کھلے پھولوں پر بھی خزاں اتری نظر آتی ہے۔ واپس آتے بے اختیار اس کے قدم استاد جمن کے کوارٹر کی طرف بڑھ گئے۔ استاد جمن یہاں کی پرانی یادگاروں میں تھے بقول ان کے اس کی ماں کو انہوں نے گودوں کھلایا تھا۔ کبھی کبھار جب جوش چڑھتا تو وہ ان کے پاس آجاتی کرید، کرید کر اپنی ماں، اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتی۔ استاد جمن کی وضعی اب انہیں کسی کام کی اجازت نہیں دیتی تھی، بیماریوں کا گڑھ استاد جمن کو ستارہ بیگم اپنی ماں کی نشانی سمجھ کر پرانی رہائش گاہ سے یہاں لے کر آئی تھیں ورنہ ایسی جگہوں پر محبت، مروت کی بات کرنا بھی حماقت ہی تھی۔ حسب عادت اسے دیکھ کر وہ خوش ہوئے، وہ ان کی طبیعت کا پوچھنے کے بعد پھر وہی ذکر لے کر بیٹھ گئی۔ اپنی ماں کا ماضی، باپ سے تنفر، ایسا کہتے، کہتے اس کی خوب صورت آنکھیں بھرا آئیں۔

”بغیر سوچے، سمجھے اور بغیر دیکھے بھالے انسان کو وفا اور بے وفائی کی کوئی پر نہیں پوچھتے بیٹا..... تم وہ سب کچھ بھول جاؤ، بھولے بغیر یہاں رہ نہیں پاؤ گی۔“ انہوں نے ہولے سے پاس بیٹھی خوش بخت کا سر تھپتھپایا۔

”رہنا بھی کب چاہتی ہوں ماسٹر جی..... میرا یہاں دم گھٹتا ہے۔ یہ خوب صورت درو دیوار مجھے خون چوسنے والے دیو لگتے ہیں جو کسی پل موقع پا کر مجھے مار دیں گے۔ ماسٹر جی..... کیا آپ نے میرے باپ کو دیکھا تھا؟“ اس

دعا تک محدود تھی وہ بھی ختم کر دی تھی تاکہ اس کے رویے سے اندازہ لگا کر وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے۔

☆☆☆

اس دن حالات سے شکست کھا کر اس نے اس راتے کی پہلی منزل کی طرف قدم بڑھایا تھا جس سے بچنے کے لیے اس نے ہر حربہ اختیار کیا تھا، ہر ترکیب آزمائی تھی پر جو چیز قسمت نے جس انسان کے لیے لکھ چھوڑی ہے وہ اسے ہر صورت مل کر رہتی ہے۔ اس کی خوب صورت آواز اور سانچے میں ڈھلا سراپا و چاند چہرہ یہ سب تو اسے ورثے میں ملا تھا۔

”کسی بھی فن کو سیکھنے کے لیے من کو دیگر آلائشوں سے پاک کر کے دھن اور لگن سے آبیاری کرنی پڑتی ہے تب ہی کامیابی قدم چومتی ہے اور گلے کا سُر اور جسم میں لوچ تو آتا ہی تب ہے جب دھیان کی ساری ڈوریں کس کر اسی طرف باندھ دی جائیں جہاں کا تقاضا ہیں۔“ وہ بے دلی سے ماسٹر صاحب سے پہلا سبق لیتی رہی۔ بچپن میں اسے کتھک کے اصول سکھائے گئے تھے۔ بے دھیانی اور ارتکاز کی کمی کے باوجود گلے کا سُر اور قدموں کی اٹھان ایسی تھی کہ دھیان، توجہ اور مشق کے بعد یہ لڑکی کیا قیامت ڈھائے گی۔ اس کے دل پر اس وقت کیا قیامت برپا تھی اس بات سے قطع نظر ماسٹر صاحب اس کا مستقبل سوچ کر اس پر رشک کیے گئے۔ اگلا دن اس کی قسمت میں ایک نیا اور انوکھا رنگ لایا تھا۔ آج کوئی بڑی شخصیت ستارہ بیگم کے ہاں مدعو تھی، سہ پہر سے ہی تیاریاں شروع تھیں۔ آج اس نے کالج سے چھٹی کی تھی۔ ستارہ بیگم نے تو گھر پر اسے دیکھ کر لگے ہاتھوں مشورہ بھی دے ڈالا تھا فلم کی ڈش دیتے ہی ویسے بھی اسے کالج چھوڑنا پڑے گا تو وہ ابھی سے کالج چھوڑ دے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس نے کوئی بھی جواب دے بغیر خاموشی میں ہی عافیت جانی اور کمرے میں بند ہو گئی۔ رات کو ہونے والے فنکشن کے پیش نظر ستارہ بیگم نے ماسٹر صاحب کو اس کی کلاس وقت سے پہلے لے لینے کو کہا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

نے آنسو صاف کر کے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔
 ”ہاں بیٹا! بڑا ہی بھلا مانس آدمی تھا۔ پتا نہیں
 کیسے راستہ بھٹک کر یہاں آ گیا ورنہ انداز و اطوار سے
 وہ کسی نیک گھر کا نوجوان لگتا تھا۔ تمہاری ماں بہت سے
 خواب لے کر اپنی ماں سے بہت جھگڑا کر کے چوری
 یہاں سے گئی تھی عزت اور چار دیواری کی خواہش
 لیے..... پھر پتا نہیں ایسا کیا ہوا کہ وہ محض ڈیڑھ سال
 بعد ہی تمہیں لے کر واپس آ گئی تھی۔ کاش کہ وہ واپس نہ
 آتی۔ بری بھلی برداشت کر لیتی تو آج تم یہاں نہ
 ہوتیں میری بچی..... اب اپنی قسمت سے سمجھو تا کرو کہ
 یہی ستارہ منزل تمہاری زندگی ہے۔“ وہ بولتے، بولتے
 چپ ہو گئے۔

”کیسے رہ جاتی ماسٹر جی.....! وہ لوگ ان کی اور
 میری جان کے درپے تھے، میرا باپ جو بڑے، بڑے
 دعوؤں کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر نکلا تھا..... میرے وجود
 کو اپنا خون ماننے سے انکار کر دیا تھا اس نے۔ کاش وہ
 مجھے مار ڈالتے اس وقت تو زندگی بھر کی اس سزا کو جھیلنے
 سے بچ جاتی جو ذلت کی صورت میرے مقدر میں میرے
 باپ کی وجہ سے آئی ہے۔ سنگدل سے سنگدل انسان بھی
 اپنی اولاد خصوصاً بیٹی کو اس بازار میں رُلنے کے لیے نہیں
 چھوڑتا۔“ وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔

”خوش بخت.....! بچے میری زندگی ایسا چراغ
 سحری ہے جو کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔ زندگی تو ساری
 گناہوں سے لتھڑی ہوئی ہے، کسی نیکی کے جھونکے کا
 گزر ہی نہیں اس میں پر مرتے، مرتے ایک اچھا کام کرنا
 چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ یہی نیکی مرنے کے بعد زادراہ
 بن جائے۔“ جب وہ روتے، روتے خود ہی چپ ہو گئی تو
 ماسٹر جی کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد گویا ہوئے۔

”تمہاری ماں جب تمہیں لے کر آئی تھی تو اس
 کے فوراً بعد تمہاری نانی نے اپنا کام دھندا سمیٹ کر
 تمہاری ماں کے ہمراہ دوسرے شہر کی راہ لی تھی۔ ستارہ
 بیگم کو البتہ اپنی جائیگی کے لیے وہیں چھوڑا، میں بھی
 وہیں تھا جب ایک روز.....“ وہ بولتے جا رہے تھے اور

خوش بخت دھک، دھک کرتے دل کے ساتھ ان کو سن
 رہی تھی۔ ان کی بات مکمل کرنے پر بھی اس میں کوئی
 حرکت پیدا نہ ہوئی نہ وہ کچھ بول سکی حالانکہ وہ رونا
 چاہتی تھی زور، زور سے۔

”میں نے تمہاری ستارہ بیگم سے ذکر کیا اس
 بات کا تو اس نے فوراً کہا اس باب کو نہیں بند کر دو اور
 آئندہ تمہاری زبان سے یہ بات نہ بھی نہ نکلے اس کے
 بعد آنا فانا ستارہ بیگم نے اپنا سب کچھ سمیٹا اور یہاں
 آن بسی۔ برسوں گزر گئے اس بات کو اس دل میں دفن
 کیے ہوئے پر آج تمہاری بات سن کر رہا نہیں گیا بیٹا۔“
 ان کا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر آن ٹھہرا۔

”ماسٹر جی ایک آخری احسان کر دیں مجھ
 پر..... مجھے ان کا نام اور پتا بتادیں، میں پوری زندگی
 آپ کا احسان نہیں بھولوں گی۔ میں ایک دفعہ اپنی
 قسمت آزمانا چاہتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر ان کے قدموں
 میں آ بیٹھی۔ ماسٹر جی پر سوچ نظروں سے اس کی
 جانب دیکھ کر کچھ سوچتے چلے گئے۔

☆☆☆

کریم بخش شاہ کو صبح سویرے کسی پنچایت کے
 فیصلے کی وجہ سے دوسرے گاؤں روانہ ہونا پڑا تھا۔
 انہوں نے اذان شاہ کو حسب معمول بہت سی ہدایات
 دیں اور خود رخصت ہو گئے۔ وہ بھی ناشتا کر کے پہلے
 زمینوں کی طرف نکل آیا۔ فصل کٹائی کے لیے تیار تھی۔
 اس نے بسم اللہ کر کے کٹائی شروع کر وادی کافی دیر
 وہیں رہا پھر ایک چکر فارم ہاؤس کا لگا کر موسی فروٹس کی
 ڈلیوری شہر بھیج کر خود گاؤں سے باہر جہاں وہ ایک
 فیکٹری تعمیر کروا رہا تھا آ گیا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے
 باوجود اس نے کسی بھی ملازمت کو ترجیح دینے کے
 بجائے اپنے علاقے میں اپنی تعلیم کو کام میں لانے کا
 سوچا تھا۔ اب اس جوس بنانے والی فیکٹری کی تعمیر بھی
 اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ دوپہر کا کھانا اس نے
 وہیں کھایا تھا پھر جس وقت وہ واپسی کے ارادے سے
 اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھا اس نے پکی سڑک سے ذیلی

READING
Section

206 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

میں رکھا۔ الماری سے اپنا ایک قدرے بڑا بیگ نکالا اس میں اپنے دوسوٹ، چھٹی رقم اس کے پاس موجود تھی وہ رکھی زیور اس نے جوں کاتوں رہنے دیا حالانکہ ستارہ بیگم اس حوالے سے اس پر بہت مہربان تھیں۔ گلے میں اپنی ماں کی نشانی ایک زنجیر کورہنے دیا۔

میرے نام کی خوش بختی

میرے نصیب پہ بھی اثر کر جا

مجھے وہ مل جائے

جس کی چاہ

مجھے صدیوں سے بنے چین رکھے ہوئے ہے

اک نسب کا نخر

اک باپ کا نام

اک چار دیواری

اور اک چادر

اس نے اپنی عزیز از جان ڈائری جو اس کی تنہائیوں کی ساتھی..... اس کے دکھوں کی مونہیں و ہمراز تھی میں ایک بار پھر اپنے احساسات منتقل کیے اور اسے بڑی عقیدت سے اپنے اسی بیگ میں رکھ دیا اور معمول کے مطابق وہ یونیفارم پہن کر کالج جانے کو تیار ہو گئی۔ پوری ستارہ منزل اس وقت خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی کہ جس وقت عام لوگ بیدار ہو کر اپنے کاروبار پر نکلتے ہیں۔ اس نے گھنٹی بجا کر اپنی ملازمہ خاص کو بلایا۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا گویا باہر آنے کو بے تاب ہو..... سو اس نے ناشتے کا منع کرتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی نکلوانے کا پیغام بھیجا تا کہ اسے کالج چھوڑ آئے۔ مقررہ وقت پر وہ کالج جانے کے لیے نکلی ایک مشکرانہ نظر ماسٹر جن کے کوارٹر پر ڈال کر وہ ڈرائیور سے پرکھڑی گاڑی میں آ بیٹھی۔ باوردی ڈرائیور اس کے بیٹھنے کا خطر تھا سو تیزی سے گاڑی باہر نکال لایا۔ اس نے ایک نگاہ غلط ستارہ منزل پر ڈالی۔ پتا نہیں قسمت کی بھید بھری جھولی میں اس کے لیے کیا اسرار چھپے تھے۔ اس بات کو سوچ کر آنکھیں ایک بار پھر نم ہو گئیں۔ آج سب کچھ نہیں آئی تھی وہ اپنی اس

سڑک پر ایک لڑکی کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ بری طرح چونک گیا۔ چونکنے کی وجہ وہ لڑکی نہیں بلکہ اس کا لباس اور حلیہ تھا۔ اگرچہ وہ لڑکی شلواری قمیص اور بڑے سے دوپٹے میں ملبوس تھی پھر بھی اس کے انداز اس کے غیر مقامی ہونے کا چہچہ، چیخ کر اعلان کر رہے تھے۔ شہر سے جولاری یہاں سے اس وقت گزرتی تھی غالباً وہ اسی میں سے اتری تھی۔ پاؤں میں جو گزرتے، سادہ سے کاشن کے لباس میں ملبوس اس لڑکی کا دوپٹا اگرچہ سر کو تو ڈھانپے ہوئے تھا پر یہاں اس گاؤں میں اس قسم کی بے پردگی کا تصور محال تھا اس کے گھر کی عورتیں تو ایک طرف پورے گاؤں کی عورتیں بڑی، بڑی چادروں سے اپنا جسم اور منہ ڈھانپ لیتیں جب کبھی باہر جانا ہوتا۔ آنکھوں پر لگے گاگلز اس نے اپنے بالوں میں انکا لیے ایسے کہ دوپٹا سر سے ڈھلک گیا۔ لہسا سا جھولانا بیگ لٹکائے وہ فیکٹری کی بیرونی دیوار کی تعمیر میں کام میں مصروف ایک مزدور کے پاس گئی اور ہاتھ میں پکڑی چٹ دکھا کر اس سے کچھ پوچھا۔ اذان شاہ چونکہ کچھ فاصلے پر تھا سو ان کی گفتگو تو نہ سن سکا لیکن اس نے مزدور کو وہ کاغذ اسے واپس تھماتے ہوئے دیکھا جو اب اسی (اذان شاہ) کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس لڑکی نے چونک کر اس کی جانب دیکھا پھر تیز، تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسی کی جانب آنے لگی۔ اذان شاہ الجھے ہوئے انداز میں گاڑی سے اتر آیا کہ اس نے جان لیا تھا کہ مزدور نے اسے اس کے پاس بھیجا ہے لیکن وہ کون تھی اور چٹ پر اس نے کیا لکھا تھا یہ تو قریب آنے پر ہی پتا چلتا۔

☆☆☆

ماسٹر جی کے پاس سنانے کے بعد اس کے دل کی حالت بدل چکی تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے کوئی تانے بانے بن رہا تھا۔ قسمت نے اسے ایک موقع دیا تھا۔ ساری رات اس نے اسی ادھیڑ بن میں گزاری۔ ماسٹر جی کے الفاظ اگرچہ دل و دماغ پر کندہ ہو گئے تھے پھر بھی احتیاطاً اس نے ایک کاغذ پر نام و پتہ لکھ کر بیگ

پیاری دوست سے ایک آخری بار ضرور ملنا چاہتی تھی۔
 سو دل موس کر رہ گئی۔ پہلا پیرینڈ بے دھیانی میں اٹینڈ
 کرنے کے بعد وہ واش رومز کی جانب آگئی۔ اندر جا
 کر بیگ میں رات کا رکھا گیا سوٹ نکال کر تبدیل کیا۔
 اسی سوٹ کا دوپٹا اچھی طرح سے اوڑھ کر گیٹ کی
 جانب آگئی۔ کلاسز لگی ہونے کے باعث بہت کم
 لڑکیاں باہر تھیں۔ گیٹ تک آتے اس نے اپنا منہ
 دوپٹے کی اوٹ میں چھپا لیا۔ گیٹ کیپر نے ایک...
 سرسری سی نظر ہی ڈالی تھی اس پر۔ وہ منتشر ہوتی دھڑکنوں
 کے ساتھ باہر آگئی۔ مین روڈ تک آ کر اس نے سامنے
 گزرتے ایک رکشے کو ہاتھ دے کر روکا اور پھر اسے
 لاری اڈے جانے کا کہہ کر اس میں بیٹھ گئی۔ پندرہ
 منٹ بعد رکشے نے اسے لاری اڈے تک پہنچا دیا۔
 اس نے بیگ میں رکھی ایڈریس والی پرچی کو نکال کر
 رکشا ڈرائیور سے درخواست کی کہ وہ اسے مطلوبہ لاری
 تک پہنچا دے۔ ڈرائیور بھلا مانس آدمی تھا۔ اس نے نہ
 صرف اسے مطلوبہ جگہ کی لاری تک پہنچا دیا بلکہ ٹکٹ
 لے کر اسے گاڑی میں بھی بٹھا آیا تھا۔ اسے چلنے میں
 ابھی کم از کم ایک گھنٹا تھا خوش بخت بار، بار بے چینی
 سے گھڑی دیکھتی رہی۔ اسے ستارہ بیگم کا خوف کھائے
 جا رہا تھا ابھی تو خیر اس کا کالج ٹائم تھا وہ اسی ٹائم میں
 ان سب کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ ہر اسٹاپ
 پر گاڑی رکتی وہ ہمہ تن گوش بیٹھ جاتی۔ پر اسے منزل
 مقصود تک پہنچتے پہنچتے پونے تین گھنٹے لگ گئے تھے۔

بالآخر اس کی منزل آگئی اور لاری اسے اتار کر
 دھول اڑاتی آگے بڑھ گئی۔ خوش بخت نے مین سڑک
 سے بائیں جانب جاتی ذیلی کچی پکی سڑک کو دیکھا۔
 جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے بورڈ پر شاہ پور لکھا
 صاف نظر آ رہا تھا۔ دوڑ دوڑ تک کسی ذی روح کا کوئی نام و
 نشان نہیں تھا۔ سڑک کے دونوں جانب گندم کی سنہری
 فصل تیار کھڑی تھی وہ آہستہ، آہستہ چلتی گئی۔ تھوڑی دیر
 سڑک پر چلتے رہنے کے بعد اسے دائیں طرف ایک
 بلند و بالا عمارت زیر تعمیر دکھائی دی جہاں کچھ مزدور کام

کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ خوش بخت کے قدموں
 میں تیزی آگئی۔ وہ اپنے بیگ کو مضبوطی سے پکڑے
 وہاں پر اینٹیں ڈھو کر لاتے ایک مزدور کے پاس
 آگئی۔ ان کے علاقے کے سرکردہ کریم بخش شاہ اور ان
 کے بیٹے احمد شاہ کی بابت دریافت کیا۔ جو اب اس مزدور
 نے اسے سائڈ پر کھڑی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے
 بتایا کہ یہ فیکٹری انہی کی زیر تعمیر ہے اور گاڑی میں بیٹھے
 ہوئے اذان شاہ ہیں جو کریم بخش شاہ کے پوتے ہیں۔
 آپ ان سے مل لیں۔ خوش بخت نے چونک کر دیکھا
 کچھ فاصلے پر ایک گاڑی موجود تھی جس پر اس کی سرسری
 نظر تو پڑی تھی پر جلدی میں اتنا اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ
 اس میں کوئی فرد بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اسی جانب چل
 پڑی۔ دفعتاً اس نے گاڑی میں سے ایک اونچے لمبے
 شخص کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا جو اسے اپنی طرف آتا
 دیکھ کر وہیں رک گیا تھا۔

”کیا آپ مجھے کریم بخش صاحب سے ملوا سکتے
 ہیں؟“ سلام کے بعد اس نے بہت اعتماد سے اذان
 شاہ کو دیکھتے ہوئے سوال کیا جبکہ اپنی عادت کے...
 برخلاف اسے نہایت غور سے دیکھتا وہ چونک گیا اسے لگا
 وہ اس سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہے یا دیکھ ضرور چکا
 ہے۔ کہاں؟ یہ یاد نہ آسکا۔

”جی ضرور..... آئیے میرے ساتھ، وہ میرے
 دادا ہیں۔“ اذان نے اسے تفصیل بتانا شروع کی کہ ان
 کی حویلی یہاں سے کچھ دور ہے، اسے گاڑی میں اس
 کے ساتھ چلنا پڑے گا لیکن فی الوقت بڑے شاہ
 صاحب سے اس کی ملاقات ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ آج
 صبح ہی کسی دوسرے گاؤں پر۔ ایک ضروری کام کے
 سلسلے میں روانہ ہو چکے ہیں۔

”ویسے آپ کریم بخش صاحب سے کس سلسلے
 میں ملنا چاہتی ہیں؟ اگر اس سلسلے میں، میں آپ کی کچھ
 ہیلپ کر سکتا تو.....“ اس سے بات کرنے کے ساتھ وہ
 بار، بار اس کی طرف دیکھ بھی رہا تھا کہ کون سی چیز ہے جو
 اسے الجھاتے ہوئے اس کی جانب مائل کر رہی ہے

READING
Section

208 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

بلو اتی ہوں۔ تمہارے ہی جتنی ہیں۔ نہ جانے کیوں صدیقہ بیگم بھی اسے دیکھ کر چونک گئیں۔ دل عجیب گداز سے بھر گیا۔

”کہاں سے آئی ہو بیچی.....؟“ انہوں نے ملازمہ کو بلا کر اس کے لیے کچھ ٹھنڈا لانے کا کہا اور خود اس کو دیکھتے ہوئے شفقت سے سوال کیا۔ اس نے وہی تفصیل دہرا دی جو اذان شاہ کو بتا کر آئی تھی۔ ماں، باپ کے سوال پر اس نے بتایا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے ساتھ ہی کاغذات میں اپنی ولدیت کے خانے میں لکھا وہ فرضی نام بھی بتا دیا جو وہاں درج تھا۔ وہ اپنی خالہ کے ساتھ رہتی ہے اور یہاں اپنے چند کلاس فیلوز کے ساتھ آئی ہے جو اپنے کام کے سلسلے میں ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔

”بچیاں بہت قیمتی خزانہ ہوتی ہیں اپنے ماں، باپ کا بچے..... بے شک آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئی ہیں لیکن اتنی دور آپ کی خالہ کو آپ کے ساتھ کسی بڑے کو بھیجنا چاہیے تھا۔“ صدیقہ بیگم نے بہت پیار سے اسے سمجھایا تو آنسو ضبط کرتے وہ مشکل سے اثبات میں سر ہلا پائی۔ ملازمہ اس کا کھانا وہیں لے کر آگئی تھی۔ کھانا کھا کر صدیقہ بیگم نے ملازمہ سے کہا کہ بچیتوں.... کو بلا لائے۔ ملازمہ کے جانے کے بعد خوش بخت نے بھی صدیقہ بیگم سے ان کے بال بچوں کی بابت دریافت کیا تو انہوں نے گلوگیر لہجے میں بتایا کہ ان کے دونوں بیٹے وفات پا چکے ہیں۔ بڑے بیٹے کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ ہی گزر گئیں۔ چھوٹے بیٹے کی بیوی سے اس کی علیحدگی ہو گئی تھی۔ بڑے بیٹے کے دو بچے اذان اور عائشہ تھے اور چھوٹے بیٹے کی کوئی اولاد نہیں تھی یہ کہتے ہوئے ان دونوں کا دل ہی خون کے آنسو رو دیا۔ مگر وہ ایک دوسرے کی دلی کیفیات سے بے خبر تھیں۔ خوش بخت جو اپنے باپ سے حساب لینے کو بے چین تھی کی موت کا سن کر جیسے اسی بل مر گئی۔ ستارہ آنٹی ٹھیک کہتی تھیں۔

”آپ لوگوں نے مجھے گھر میں جگہ نہیں دی تو دل

حالانکہ وہ لڑکیوں سے کوسوں دور بھاگنے والا شخص تھا۔ خوش بخت ایک دم گڑبڑا گئی کہ وہ اپنے آنے اور اپنے دادا سے ملنے کی کیا توجیہ پیش کرے یہ طے تھا کہ صحیح صورت حال کی جانچ کے بغیر وہ اپنی شناخت کروانا نہیں چاہتی تھی۔ سو فوری طور پر ذہن میں یہی آیا کہ وہ ایک اسٹوڈنٹ ہے اور دیہات میں ویمن لٹریسی ریٹ کے تھیس پر کام کرنے آئی ہے۔ باقی اسٹوڈنٹ بھی اس کے ہمراہ ہیں لیکن ان سب نے اپنے، اپنے علاقے منتخب کر کے کام شروع کر دیا ہے۔ اسے نزدیک کہیں سے پتا چلا ہے کہ کریم بخش شاہ ہی اس علاقے کے کرتا دھرتا ہیں وہی اس سلسلے میں اسے ٹھیک معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ بروقت بہانہ بنا لینے پر اس نے خود کو شاہباش دی یہ جانے بغیر کہ اس کی یہ بات اذان شاہ کو قطعی ہضم نہیں ہو پائی تھی۔ اکیلی لڑکی ذات کا شہر سے اتنی دور کا سفر کر کے آنا پھر بابا صاحب سے ملنے پر اصرار..... اس کے الفاظ کے برعکس اس کی آنکھوں میں ایک تجسس تھا، کھوج تھی جو اذان شاہ کو چونکا رہی تھی۔

لٹریسی ریٹ یا کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے آج کل طرح، طرح کی سہولیات دستیاب ہیں اس سلسلے میں وہ نیٹ سے ہیلپ لے سکتی تھی۔ بہر حال انہی ابھی سبھی سوچوں میں وہ لوگ حویلی پہنچ چکے تھے۔ اذان شاہ اسے سیدھا صدیقہ بیگم کے پاس لے آیا۔ مختصراً اس کے بارے میں انہیں بتایا۔ انہوں نے مہمان کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ اسے ان کے حوالے کرنے کے بعد واپس اپنے کاموں سے نکل گیا۔ ذہن ہنوز الجھن کا شکار تھا۔

خوش بخت عجیب سی حسرت اور ترسی ہوئی نگاہوں سے ارد گرد کا جائزہ لیتی ہوئی صدیقہ بیگم تک آئی تھی۔ اتنے بڑے، بڑے گھر رکھنے والوں کے دل کتنے تنگ تھے اس نے حسب عادت سوچنا شروع کر دیا۔

”بیٹا آرام سے بیٹھو..... سفر سے تھک گئی ہوگی۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو..... میں ابھی اپنی پوتی اور نوای کو

ہیں ایک بے تحاشا خوشی کے احساس نے اسے گھیر لیا۔ عائشہ کے استفسار پر وہی گھڑا گھڑایا جواب ان کو بھی سنا دیا جو اس سے پہلے اذان شاہ اور بی بی کو بتا چکی تھی پھر مزید ان کی تشفی ہو جائے اس نے بی بی سے کہا کہ ایک ملازمہ ہمراہ کر دیں تاکہ وہ اپنے تھیسس کا کچھ کام شروع کر سکے اور گاؤں میں گھر، گھر جا کر رپورٹ تیار کرنے میں وہ اس کی مددگار ہو۔ یہ خیال بھی اسے ابھی ابھی آیا تھا کہ اس نے جو بہانہ بنایا ہے اس پر ان سب کا یقین راسخ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک فرضی سروے کر ہی لینا چاہیے۔ عائشہ نے اصرار کیا وہ انہیں اچھی لگی ہے سو وہ لوگ کچھ دن اسے اور مہمان بنانا چاہیں گے۔ ساتھ ہی اس نے بی بی سے بھی اس بات کی تائید کروائی جو اپنے مخصوص بردبار لہجے میں اتنا ضرور بولیں کہ وہ لوگ ضرور اسے مہمان بنانا پسند کریں گے اگر جو اس کے گھر والے بخوشی اس کے یہاں رہنے پر راضی ہو جائیں۔ خدیجہ نے البتہ کچھ نہ کہا نہ ہی اسے عائشہ اور بی بی کا اس لڑکی کے لیے اتنا التفات پسند آ رہا تھا۔ جس کا اظہار اس نے اس وقت کر دیا جب خوش بخت ملازمہ کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔

”تمہیں کیا ضرورت ہے اس لڑکی کو اتنا سر چڑھانے کی۔ جو بھی کام کرنے آئی ہے وہ کرے تو چلتا کرو اسے، یہ کیا ہر ایرے غیرے سے اتنا گھل مل جانا مجھے نہیں پسند۔“ وہ جیسے ان سب کے ساتھ خود سے بھی خفا ہو گئی۔

”اوہو بھئی تمہیں کیا کہہ دیا اس بیچاری نے۔ کتنی پیاری ہے ناں بی بی بی یہ خوش بخت.....“ اسے جواب دے کر عائشہ نے بی بی کو مخاطب کیا۔

”ہاں بچے اللہ نصیب اچھے کرے، تم دونوں یہ بحث چھوڑو جا کر شریفوں کے ساتھ کچن میں کھانے کے لیے اور بھی کچھ اچھا بنالو۔“ بی بی نے بات کو سمیٹا اور ان دونوں کو باہر جانے کو کہا۔

خوش بخت، ملازمہ کے ساتھ کافی سارے

میں کیا دیتے جی تو میرے باپ کے حوالے کے ساتھ میرا کوئی ذکر ہی نہیں۔“ اس نے سوچا کچھ دیر آرام کرنے کی اجازت پر اسے۔ ملازمہ کے ساتھ مہمان خانے صدیقہ بیگم نے بھجوا دیا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس کے ضبط کی طنائیں ٹوٹ گئیں۔

”ابا اگر آپ زندہ ہوتے تو میں اپنے ہونے کا اپنی ذات کی شناخت کا مقدمہ لڑ لیتی اب کس سے جا کر فریاد کروں۔ کاش آپ ہم پر ایسا ظلم نہ کرتے۔“ وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔ پتا نہیں باپ کی موت کا اچانک صدمہ تھا یا اپنی ذات کی پہلے قدم پر نفی کا دکھ کہ اسے لگا عزت اور چادر کے حصول کی جس جنگ کو جیتنے کا عزم لے کر وہ نکلی تھی، اس میں پہلے قدم پر ہی وہ بری طرح ہار گئی ہے۔ بہت دیر رونے کے بعد دل کا بوجھ ذرا ہلکا ہوا تو وہ اپنے باپ کا گھر، اپنی جائے پیدائش ایک نظر دیکھنے کی غرض سے اٹھی اور مہمان خانے سے باہر آ گئی۔ طویل راہداری میں اسے ایک دو ملازماں ملیں جنہوں نے بی بی (صدیقہ بیگم) کے کمرے تک اس کی رہنمائی کرنی چاہی اور مزید کسی ضرورت کا پوچھا اس نے سہولت سے منع کر دیا کہ وہ حویلی دیکھنا چاہتی ہے۔ ہر جگہ رک کر وہ بہت کچھ محسوس کرتی اور آگے بڑھ جاتی کہ شاید یہاں وہ پاؤں، پاؤں چلی ہو، یہاں اس نے پہلا قدم اٹھایا ہو، پوری حویلی گھوم چکنے کے بعد وہ ایک بار پھر بی بی کے کمرے میں آ گئی۔ عجیب سا سحر تھا ان کی پاکیزہ شخصیت میں کہ اپنے پچھلے خیالات کے برعکس وہ اس تھوڑے سے وقت میں ہی ان سے شدید انسیت محسوس کرنے لگی تھی۔ بی بی کے کمرے میں اسے اپنی دونوں کزنز عائشہ اور خدیجہ ملیں۔ اسی سے ملتے جلتے نقوش خصوصاً آنکھیں رکھتی وہ دونوں اس سے خوشگوار انداز میں ملیں لیکن خدیجہ کو جب سے پتا چلا تھا کہ وہ اذان شاہ کے ساتھ آئی تھی وہ اسے دیکھنے کو بے چین تھی۔ اور اب اسے بہت گہری اور تنقیدی نظر سے دیکھا تھا۔ اسے جونہی یہ ادراک ہوا کہ عائشہ کی اور اس کی آنکھیں حیرت انگیز طور پر ملتے

ٹرینڈ بھی کم ہے، تعلیم کی طرف، کچھ لوگوں میں ہے بھی تو وہ مڈل تک ہی بھیج پاتے ہیں بچیوں کو..... بہت کم لوگ ہائی اسکول بھیجنا پسند کرتے ہیں اپنی بچیوں کو..... عموماً مڈل کے بعد ہی ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔ وہ اسے بڑی تفصیل سے بتا رہا تھا گویا کہ اس کے چھوٹے پراجیکٹ میں مدد کرنا چاہتا تھا۔ ویسے کوئی جبری رسوم و رواج کی زنجیر نہیں جکڑا ہوا ان لوگوں کو بس شروع سے جو سٹم چلا آ رہا ہے اسی کی پیروی کرتے آ رہے ہیں اور سب سے مین فیکٹر گرلز ایجوکیشن میں غربت کا بھی ہے۔ لڑکوں کا سب کو پتا ہوتا ہے کہ انہوں نے کچھ بن کر ایک فیملی کو سپورٹ کرنا ہے، گھر چلانا ہے جبکہ لڑکیوں کے حوالے سے ابھی ان میں اتنا شعور نہیں آیا بس یہ ہی ساری بات ہے۔ ”دھیے، دھیے بولتا وہ خوش بخت کو کسی اور ہی جہان کا مرد لگا اس کی دنیا کے مردوں سے مختلف..... شاید خون کی کشش تھی کہ اسے برا تو کوئی بھی نہیں لگا تھا سب لوگوں میں عجیب سی کشش محسوس ہوئی تھی اسے، کچن سے نکلتی خدیجہ نے بے حد ناگواری سے ان کو ایک ساتھ آتے دیکھا تو بس نہ چلا کہ اس لڑکی کو کھینچ کر اذان شاہ سے دور کر دے۔ اسے تو اذان شاہ کو چھو جانے والی ہوا بھی بری لگتی تھی کجا کہ یہ جیتی جاگتی خوب صورت اور شہری لڑکی۔

”آگئیں آپ بی بی پریشان ہو رہی تھیں۔ اصل میں ہمارے یہاں مغرب کے بعد لڑکیوں کا ادھر ادھر پھرنا اچھی بات نہیں سمجھا جاتا۔“ کچھ سمجھ نہ آنے پر خدیجہ نے اپنے دل کی کھولن کو باہر نکالنا چاہا۔ وہ دونوں چونک اٹھے۔

یہ یہاں مہمان ہیں خدیجہ اور میرے خیال میں اگر خیراں (ملازمہ) کے ساتھ گئی تھیں تو بی بی نے ہی بھیجا ہوگا۔“ اذان شاہ نے رسان سے خدیجہ سے کہا جو ٹیکسی نظروں سے دونوں کو دیکھتی دوبارہ کچن میں چلی گئی۔ ”آئیے میں آپ کو بی بی کے پاس چھوڑ دوں۔“ ایک نظر اس کے الجھے ہوئے چہرے پر ڈال کر اذان نے آگے قدم بڑھائے اور وہ جو خدیجہ کے

گھروں میں گئی۔ وہ کریم بخش شاہ کے گھر کی مہمان ہے، یہ جان کر سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس نے بھی ایک، ایک، دو، دو سوالات کیے سب سے۔ مغرب سے ذرا پہلے ہی وہ یہ کہہ کر لوٹ آئی کہ باقی کام کل کریں گے۔ اذان شاہ انہیں گیٹ کے پاس ہی مل گیا تھا۔ ملازمہ تو سلام چھوٹے شاہ کہہ کر اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی جبکہ خوش بخت وہیں اس کے پاس ہی رک گئی۔ کتنی مختلف نظریں تھیں اذان شاہ کی..... عزت و احترام کی لود تھی ہوئی۔ اور ستارہ منزل میں آنے والے ہر مرد کی نظروں سے یکسر مختلف جس میں ہر جذبہ ہوتا تھا سوائے عزت کے، احترام کے۔

”کام شروع کر دیا آپ نے خوش بخت صاحبہ! اس نے رک کر اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”جی کچھ گھروں میں گئی ہوں، باقی کام کوشش کروں گی ایک دو دنوں میں مکمل کر لوں۔ ویسے ایک بات میں نے نوٹ کی ہے کہ جن گھروں میں بھی میں گئی ہوں وہاں مردوں نے کالج، کئی نے یونیورسٹی سے بھی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے جبکہ عورتوں کو انہوں نے ان پڑھ ہی رکھا ہوا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“ وہ اس کے ساتھ، ساتھ اندرونی حصے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ اذان شاہ نے اس کا سلجھا مگر شائستہ انداز بطور خاص نوٹ کیا۔ وہ صبح والے لباس میں ہی ملبوس تھی۔

”جہاں تک ہمارے گھرانے کی بات ہے ہم لوگ جیسے دینی تعلیم کو ضروری سمجھتے ہیں اتنی ہی اہمیت دنیاوی تعلیم کو بھی دیتے ہیں۔ بابا صاحب نے اسی مقصد کے لیے گرلز پرائمری اسکول کو بہت کوششوں کے بعد مڈل تک اپ گریڈ کرایا ہے ہمارے گھر کی لڑکیاں عائشہ، خدیجہ نے یہیں سے مڈل کیا پھر شہر میں جا کر میٹرک اور ایف اے کے پیپرز دیے۔ بابا صاحب کو بہت شوق تھا کہ وہ آگے بھی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو ان کی طرف سے اجازت ہوگی لیکن دونوں کو ہی شوق نہیں تھا۔ اگلے مہینے خیر سے عائشہ کی شادی متوقع ہے..... اور جہاں تک بات ہے گاؤں والوں کی تو کچھ

نا قابل فہم رویے پر کھڑی کوئی نتیجہ اخذ کر رہی تھی چونکہ اس کی معیت میں بی بی کے کمرے کی طرف چل پڑی جو اس وقت مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے بیٹھی تھیں۔ اور بہ آواز بلند اپنے رب سے ہم کلام تھیں۔

”تیرے گناہ گار بندے ہیں مولا پر پھر بھی تیری مخلوق ہیں، تیرے پیارے نبی ﷺ کے اُمتی ہیں، میرے مالک ہم کمزور انسان ہیں، ہم پر پڑی ہوئی آزمائش کو مختصر کر دے میرے اللہ!“ ان کے آخری الفاظ کو سنتی خوش بخت کچھ دیر دروازے میں کھڑی ان کو گریہ کرتے دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔ اور یہ خون کا اثر یا اس کی معصوم اور بھولی بھالی شکل کہ دل میں جذبوں کا جو سمندر اس کے دل میں پھڑے ہوئے رشتوں کے لیے تلاطم مارنے لگا تھا ویسا ہی بی بی، عائشہ اور اذان بھی کچھ عجیب سا لگاؤ اور انسیت اپنے دل میں اس کے لیے محسوس کر رہے تھے۔ رشتہ تو خدیجہ سے بھی بنتا تھا اس کا لیکن رقابت ایک ایسا منشی جذبہ ہے جو باقی کے تمام جذبوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو شاید ویسی ہی کشش خوش بخت سے وہ بھی محسوس کرتی لیکن اسے بلا وجہ غصہ آئے جا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کی عائشہ سے بغیر کسی وجہ کے جھڑپ بھی ہو گئی کہ عائشہ کو ملازمہ کے ساتھ کھانے کا اتنا اہتمام کرتا دیکھ کر وہ اسے کچھ سنا گئی تھی اور عائشہ کی کوئی بھی تاویل سے بغیر غصے میں وہ اپنے گھر بھی سدھا رہی تھی اور زندگی میں پہلی بار ہی عائشہ نے اس کی پروا کیے بغیر سر جھٹک دیا تھا اور اپنے معمول کے کام سر انجام دیتی رہی۔ کھانا اذان نے مردانے میں جبکہ ان تینوں نے اکٹھے بی بی کے کمرے میں کھایا تھا۔ خوش بخت نے عائشہ سے فرمائش کی تھی کہ وہ اس کے پاس ہی سو جائے کہ وہ رشتوں کی ترسی ہوئی ہے اور اسے اس کی صورت میں ایک بہن نظر آرہی ہے ویسے بھی دن کو وہ تھوڑا آرام کر چکی تھی تو رات کو مشکل سے ہی.... نیند آتی۔ عائشہ نے غصہ نظروں سے بی بی کی طرف دیکھا انہوں

نے اثبات میں سر ہلا کر اجازت دے دی تھی۔ عائشہ اسے اپنے کمرے میں لے کر آئی تھی، خوش بخت نے کچھ سوچ کر اپنا آف پڑا ہوا موبائل سیل کھولا اس میں سیمل کے ان گنت میسج موجود تھے۔

”خوشی! کہاں ہو یار؟ تمہاری آنٹی نے میرا اور کالج والوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ تم جہاں بھی گئی ہو، میں اس بارے میں علم رکھتی ہوں۔ برپیل سے بھی کافی جھڑپ کر کے گئی ہیں، میرے گھر دھمکی آمیز کالز کا تانتا بندھا ہوا ہے؟ تم کہاں اور کیوں گئی ہو خوشی! اپنی آنٹی سے رابطہ کرو، وہ بہت پریشان ہیں اور بہت سے لوگوں کو پریشان کیا ہوا ہے۔“ اس سے پہلے کہ سیل پر کوئی کال ریسیو ہوتی اس نے گھبرا کر موبائل دوبارہ آف کر کے بیگ میں ڈال دیا۔

”کیا بات ہے خوش بخت.....! تم کچھ پریشان ہو گئی ہو، گھر میں تو سب خیریت ہے ناں.....“ عائشہ جو اسے میسجز پڑھتے اور چہرے کی رنگت متغیر ہوتے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے استفسار کیا، خوش بخت چونک گئی اور لمحوں میں خود کو سنبھال کر پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

”گھر سے میسجز تھے، میں ذرا بھی ادھر ادھر ہو جاؤں تو فوراً پریشان ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم بھی ہے کہ میں کہاں گئی ہوں۔“

”ہاں یہ تو ہے والدین کا رشتہ ہی ایسا ہے اولاد کے لیے محبتوں، اندیشوں اور فکرات کا بحر بیکراں لیے ہوئے۔“ عائشہ نے اسے تسلی دی تو دونوں بھول بھال کر ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں جو گمن ہوئیں تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

☆☆☆

”جانے کیوں میرا دل اس بچی کو دیکھ کر وہ بھولی بسری پادیں کریدنے کو کر رہا ہے جنہیں بھولنے کی ہم نے کوشش کی نہ ہم میں سکت تھی، وہ بھی تو اتنی ہی بڑی ہوگی۔“ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے صدیقہ بیگم تسبیح کے دانے گراتے زیر لب کچھ پڑھتے ہوئے وقت کو کچھ

READING
Section

212 ماہنامہ پاکیزہ اکتوبر 2015ء

کی زلف کا اسیر ہوا کہ جہاں دن کی روشنی میں بھی شریف لوگ گزرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ جس وقت بڑے شاہ صاحب کو شہر میں موجود ان کے حواریوں نے خبر دی اس وقت پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا انہوں نے فون پر تو احمد شاہ کو خوب سنائیں اور پہلی فرصت میں سب پڑھائی وغیرہ چھوڑ چھاڑ گاؤں آنے کا حکم دے ڈالا اور جب وہ آیا تو اکیلا ہرگز نہیں تھا۔ بازار میں بیٹھی فردوس بیگم کو اپنے نام کے ساتھ باندھ کر ماں اور باپ کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ دونوں میاں، بیوی حیرت و صدمے سے گنگ ہی رہ گئے۔ صدیقہ بیگم تو آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بند ہو گئیں۔ جبکہ بڑے شاہ صاحب نے احمد شاہ کو اسے واپس انہی گلیوں میں چھوڑ آنے کا حکم دے دیا اور دھمکی دی کہ دوسری صورت میں وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ پر اگلے ہی روز ان کو وہ حکم واپس لینا پڑا کہ لاڈلے بیٹے نے سلیپنگ پلو کی ایک بڑی مقدار حلق میں انڈیل لی

سال پیچھے لے گئیں جب انہیں احمد کی شادی کا بے حد ارمان تھا اور وہ تھا کہ آئیں بائیں شائیں کر کے ہر بار ٹال دیتا۔ بڑے بیٹے اور بہو کے انتقال کے بعد ان دونوں میاں، بیوی کی خواہش تھی... گھر میں غم کا جو جمود طاری ہے اسے توڑنے کے لیے ضروری تھا کہ احمد کی شادی کر دی جاتی اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی برادری میں کئی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں پر وہ ہاتھ آتا تب ناں..... اپنی پڑھائی کا بہانہ بنا کر وہ ان کے منصوبوں پر پانی پھیر دیتا اور اب جب بی بی نے شاہ صاحب سے کہا کہ وہی اس پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اپنے باپ سے ڈرتا بھی بہت تھا۔ انہوں نے ہامی بھری پر ان کے اصرار سے پہلے وہ ہو گیا جس کا ان کی سات پشتوں میں بھی کسی نے تصور نہیں کیا تھا۔ کریم بخش شاہ جن کی دور، دور تک نیک نامی کی دھوم تھی ان کے بیٹے نے ایک ایسا قدم اٹھالیا کہ آج بھی سوچتے تو ان کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی۔ پتا نہیں شہر میں کیسے، کیسے لڑکوں کی صحبت میں رہ کر وہ ان گلیوں میں رہنے والی فردوس بیگم

گم گشتہ
صیہونی سازشوں کا پردہ چاک کرتی ایک تلخ اور دلخراش داستان
آخری صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد** کا نیا انداز

خندگ عثمانی
تاریخ کے گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے صفحات کا دلکش
انداز..... **الیاس سینا پوری** کے قلم کا سحر

شیش محل
اسماء قادری کے قلم سے دل کے سازوں کو
چھیڑتا اور معاشرتی ناسوروں کو چھوڑتا ایک عجیب سلسلہ

ماروی
خواب ہونے والے سنہرے دن رات کے بدلتے تیور اور دلوں کے موسم
کا بدلتا انداز..... **محی الدین نواب** کی خوب صورت تحریر

اکتوبر 2015ء کے شمارے کی ایک تھلک

خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ

سینا پورس
ماہنامہ ڈائجسٹ

مزید
خطوط کی محفل،
محفل شعر و سخن
اور
ملک صفدر حیات کی تفتیش

کاشفِ زیر: منظرِ امامِ تنویرِ ریاض
سلیم انور، مرعباس میگیلی کہانیاں



تھی۔ ایک بیٹے کو کھونے کے بعد ان میں دوسرے بیٹے کو کھونے کا حوصلہ ہرگز نہیں تھا۔ بعد میں احمد شاہ کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کو سختی سے تاکید کرے کہ وہ یہاں کے طور طریقے جلد از جلد سیکھ لے اور اپنے پچھلوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لے۔ فردوس بیگم نے یہ بات سن تو لی تھی پر اس پر عمل کرنا شاید اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس گھر کی عورتیں جو باہر چادر لپیٹ کر جاتیں جن کے سروں سے دوپٹا سر کے کسی نے نہیں دیکھا تھا اس سے قطع نظر فردوس بیگم اپنے شب خوابی کے لباس میں ہی اٹھ کر ناشتے کی میز پر آ جاتیں۔ بی بی شرم سے منہ نیچے کر لیتیں۔ ملازما میں منہ میں انگلیاں دے کر ایک دوسرے کو اشارے کرتیں پر محبت کی جو پٹی احمد شاہ کی آنکھوں پر بندھی تھی وہ انہیں کچھ دیکھنے یا محسوس کرنے سے باز رکھے ہوئی تھی۔ کریم بخش زیادہ تر زمینوں کے پنچایت کے اور دیگر گاؤں کے مسئلوں کے حوالے سے باہر ہی رہتے۔ ایک دفعہ احمد شاہ کی بہن نے انہیں ساڑھی میں ملبوس دیکھا۔ وہ بھی ایسے کہ جسم چھپانے کے بجائے دکھائی زیادہ دے رہا تھا۔ وہ اپنی بھائی کو ٹوک بیٹھیں اور یہ ٹوک فردوس بیگم کو شدید ناگوار گزری انہوں نے صاف، صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جب ان کے خاوند کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو وہ کون ہوتی ہیں۔ سمیچہ بیچاری کیا کہتیں چپ ہو کر بیٹھ رہیں۔ فردوس بیگم نے بہن پر اکتفا نہیں کیا احمد شاہ جو زمینوں سے تھکے ہارے واپس آئے تھے پتا نہیں کیا ایسا کہا کہ فوراً ہی بہن سے جواب طلبی کرنے آن موجود ہوئے۔

”آپ انتہائی تنگ نظر اور تنگ دل لوگ ہیں..... خود ہی فردوس بیگم کا پچھلا حوالہ نہیں بھول رہے تو وہ کیسے بھلا پائے گی۔ برائے مہربانی ہمیں اپنی زندگی جینے دی جائے اور آئندہ اگر فردوس بیگم کو کچھ کہا گیا تو میں اور میری بیوی یہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔“ وہ دونوں ماں، بیٹی انتہائی دکھ اور حیرت کے عالم میں اپنے اس فرمانبردار بھائی اور بیٹے کو دیکھے چلی گئیں جو

دنوں میں ہی بدل گیا تھا۔ سمیچہ نے تو اس دن کے بعد سے آنا ہی کم کر دیا تھا۔ بھائی کے الفاظ اور رویے کا دکھ اتنا ہی شدید تھا۔ یہ بات البتہ بی بی نے مصلحتاً بڑے شاہ صاحب سے چھپالی تھی۔ انہی دنوں فردوس بیگم کی طرف سے ملنے والی خوش خبری نے ان سب کو یہ بات بھولنے پر مجبور کر دیا کہ ان کا تعلق کہاں سے تھا۔ بی بی ان کے ناز و ادا اور طور طریقے بھلا کر ان کے چاؤ چو نچلے اٹھانے میں مصروف ہو گئیں۔ دو ملازما میں فردوس بیگم کے لیے مخصوص کر دی گئی تھیں۔ احمد شاہ نے شہر میں اپنے دوست کے ساتھ مل کر ایک فوڈ فیکٹری کا آغاز کیا تھا وہ زیادہ تر وہیں رہتے۔ کوئی بھی چیز ہو تو وہ جب اس آتی ہے جب اس کی ضرورت ہو بغیر ضرورت جو چیز ملے اسے دھتکار دیا جاتا ہے بیکار اور اضافی جان کر فردوس بیگم عزت کی نہیں، دولت کی چاہ میں احمد شاہ کے پیچھے آئی تھیں عزت کی طالب ہوتیں تو وہیں رنج بس جاتیں لیکن انہیں عزت راس نہیں آئی تھی وہ بغیر ضرورت کے ملنے والی اس عزت کو دھتکارتی رہیں۔ انہی دنوں سمیچہ بیگم کے ایک دیور جو آوارہ فطرت انسان تھے بہر دن ملک سے واپس آئے۔ بی بی سے ملنے کی خاطر وہ گھر آئے تو فردوس بیگم کا خیرہ کر دینے والا حسن دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اوپر سے ادائے دلبرانہ..... فردوس بیگم جو مردوں کی آنکھوں کے رنگ پہچاننے میں کچھ زیادہ ہی ماہر تھیں ان کی پسندیدگی جو ان کی آنکھوں سے ہویدا تھی کو بھانپ گئیں اور اپنی اداؤں اور جلوؤں کے تیر چلا کر گویا ان کو بے بس کر چھوڑا۔ فردوس بیگم ان عورتوں میں سے تھیں جنہیں عمر کے ہر حصے میں مردوں سے تعریف و توصیف کی طلب رہتی ہے۔ احمد شاہ انہیں اپنے نام کا پابند کر کے اب نہ تو ہر وقت ان کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ سکتے تھے نہ ان کے حسن کے قصیدے اب صبح شام ان کے لبوں پر تھے سو کسی دوسرے مرد کی نظر میں یہ جذبہ دیکھتے ہی فردوس بیگم اپنا مقام اور مرتبہ بھول گئیں۔ اسماعیل شاہ کا ایک ہفتے میں تیسرا چکر بی بی کو چوٹا گیا ساتھ ہی بہو کے نرالے

پَرِخْلَوْصِ دَعَا

خدا آپ کے سارے غم ریت پر لکھ دے
کہ ہوا سے مٹ جائیں اور خوشیاں پتھر پر لکھ
دے کہ بارش بھی نہ مٹا سکے۔

اللہ کرے کہ ہر روز کا نکلتا سورج آپ
کے لیے ڈھیروں مسرتیں اور راحتیں لے کر
آئے۔ آمین۔

مرسلہ: صدف آصف، کراچی

اگلی صبح ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب حسب معمول
بڑے شاہ صاحب ناشتا کر کے اپنے ڈیرے پر سدھار
گئے۔ احمد شاہ شہر جانے سے پہلے ان کی قدم بوسی
کرنے آیا تو انہوں نے یہی بات چھیڑ دی۔ احمد شاہ
ان کی بات سن کر تھڑک ہی اٹھا۔

”بی بی میں آج تک سمجھتا رہا کہ فردوس غلط کہتی
ہے، آپ کیسے اس سے اتنی نفرت کر سکتی ہیں۔ اسمعیل
بھائی سے اس نے سلام دعا کیا کر لی آپ نے تو ایک
محاذ ہی بنا لیا اس کے خلاف... طعنے، طنز... خدا کے لیے
بی بی اتنا سوچ لیا کریں وہ میری بیوی ہے، میرے
ہونے والے بچے کی ماں ہے اور وہ بھلی مانس مجھے
ہمیشہ منع کرتی رہی کہ احمد میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا
کر لیتی ہوں آپ کے سامنے لیکن آپ بی بی سے کچھ
مت کہیے گا۔ ان سے آپ میرے لیے گستاخی کریں یہ
مجھے منظور نہیں۔ میں محبت اور خدمت سے کبھی نہ کبھی تو
ان کے دل میں جگہ حاصل کر ہی لوں گی بس..... مجھے
ان کی یہی بات تو تکلیف دیتی ہے کہ وہ مجھے میری پھلی
زندگی کے حوالے سے بہت کچھ سناتی ہیں ورنہ سانس
بہو میں چپقلش کس گھر میں نہیں ہوتی۔“ فردوس بیگم
ایک کائیاں عورت تھی اس نے پہلے ہی سے اپنی بنیاد
مضبوط کر رکھی تھی۔

”یہ دیکھیں بی بی بی..... میرے بندھے ہاتھوں کو

اطوار انہیں خبردار کر گئے۔ انہیں عورت کی اس قبیل کی
آج تک سمجھ ہی نہیں آسکی تھی کہ گھر، دولت، عزت،
اولاد جس عورت کو اللہ ہر نعمت سے نواز دے کیا اس کے
لیے کسی اور چیز کی طلب باقی رہتی ہے جس کا خاوند بھی
اسے دیکھ، دیکھ کر جیتا ہو لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ ہر
عورت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ انہوں نے پہلی بار انہیں
ٹوکا تھا۔ اسمعیل شاہ، صدیقہ بیگم سے سرسری سا حال
احوال پوچھ کر فردوس بیگم کے کہنے پر ڈرائنگ روم
میں بیٹھ جاتے۔ بی بی، بی بی نشستیں چلتیں۔ بنی سنوری، دل
لبھاتی عورت کی کمپنی سے کون کا فر مردانکار کر سکتا ہے ناز و
انداز سے جو کسر رہ جاتی وہ فردوس بیگم کا لباس پوری
کر دیتا۔ بی بی کو سمجھ نہ آتا بے حیائی کے اس طوفان کو
کیسے روکیں جس میں لگتا تھا ان کی عزت و ناموس سب
بہہ جائے گی۔ اس دن وہ اونچی آواز میں بولی تھیں اور
بہو کو اپنے کچھن ٹھیک کر لینے کو کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ
اپنی حرکتوں سے باز آجائے نہیں تو وہ احمد شاہ سے
شکایت کریں گی سو کریں گی بڑے شاہ صاحب کو بھی
مجبوراً سب کچھ بتانا پڑے گا۔ فردوس بیگم کو نہ تو ان کی
غصے سے لرزتی حالت متاثر کر پائی نہ ان کی دھمکی، الثا وہ
صوفی پر آرام وہ حالت میں بیٹھ کر ان کی اس کانپتی
لرزتی حالت کا حظ اٹھاتی رہیں۔

”دیکھو بڑی اماں، مجھے اس طرح کے قید خانوں
میں زندگی گزارنا ہرگز نہیں پسند، نہ ہی عادت ہے۔ اپنی
ماں کے گھر مجھے جانے نہیں دیا جاتا، گاؤں میں کہیں
آنے جانے کی اجازت نہیں ہے اس گھٹن اور زندان
کی سی زندگی میں اگر چند بل میں کسی کے ساتھ گزار کر
خوش ہو لیتی ہوں تو اس میں برا کیا ہے۔“ بی بی حیرت و
دکھ سے اس دیدہ دلیر عورت کی ڈھٹائی دیکھتی رہیں
جسے ان کے نہ جانے کس گناہ کے عوض ان کے گھرانے
پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ بہر حال ان کا پورا، پورا ارادہ تھا
کہ ایک بار احمد شاہ کو بتائیں گی ضرور کہ مرد جتنا بھی
اپنی بیوی سے محبت کیوں نہ کرتا ہو اپنی عزت اور غیرت
کے حوالے سے بہت جذباتی اور انا پرست ہوتا ہے۔

ہی دیکھ لیں، میری خوشی کو ہی دیکھ کر چپ ہو جایا کریں۔" وہ جو اسے سمجھانے کا ارادہ رکھتی تھیں نرم لفظوں میں ہی سہی، ان کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکا اور ان کے سفید براق دوپٹے میں جذب ہو گیا۔ پھیکے سے مسکراتے ہوئے انہوں نے احمد شاہ کے دونوں ہاتھ کھول دیے۔ سر پر ہاتھ پھیرا، وہ ایک طویل سانس لیتے ہوئے اٹھ گیا تھا۔ اذکار سے فارغ ہو کر جس پل وہ باہر آئی تھیں فردوس بیگم باہر موجود تھیں کچھ جتانی ہوئی اور مذاق اڑاتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ، انہوں نے اس نظر کے بعد دوسری نظر نہیں ڈالی تھی اس پر... باہر کھیلتی عائشہ کو لے کر اپنے کمرے میں آگئیں۔ اذان شاہ کو شروع سے ہی بورڈنگ ہاؤس میں ڈال دیا گیا تھا۔ صدیقہ بیگم بہت چپ ہو گئی تھیں۔ بس اب تو ہر پل ان کے لبوں پر یہی دعا رہتی ہے کہ بھلے ہی بیٹی رحمت ہوتی ہے پر وہ ایسی عورت کے لپٹن سے جنم نہ لے۔ پر کبھی دعائیں اس دنیا میں کب قبول ہوتی ہیں سو فردوس بیگم نے بھی ایک خوب صورت سی بچی کو جنم دیا۔ جس کا نام کریم بخش شاہ نے سجدہ شاہ رکھا تھا۔ زندگی اسی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ سجدہ شاہ چھ ماہ کی ہو گئی تھی۔ گول مٹول خوب صورت سی سجدہ سب کی آنکھوں کا تارہ تھی۔ اولاد دے کر فردوس بیگم کچھ زیادہ ہی پھیل گئی تھیں۔ برائی اور اچھائی کو کبھی نہیں چھپایا جاسکتا۔ اچھائی کی خوشبو اور برائی کی بدبو بلکہ سڑاندگی نہ کبھی اپنی پہچان ضرور کرا لیتی ہیں۔ ایسا ہی فردوس بیگم کے ساتھ ہوا تھا۔ اس دن خوب گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی جب ساتھ والے گاؤں سے کسی فونگی کی اطلاع پر بی بی اور بابا صاحب کو وہاں جانا پڑ گیا۔ عائشہ کو بی بی ساتھ ہی لے گئیں کہ وہ اسے اپنے ساتھ ہی رکھتی تھیں۔ ایک ملازمہ ان کے ہمراہ گئی تھی جبکہ باقی دو ملازمائیں گھر پر تھیں۔ خراب موسم کے پیش نظر احمد شاہ اپنے معمول سے جلدی آ گیا تھا۔ عصر میں ہی مغرب کا گمان ہو رہا تھا جب اس کی گاڑی نے حویلی کا پھاٹک کراس کیا۔ گاڑی کی آواز بھی بادلوں کی گھن گرج میں چھپ گئی۔ وہ دو تین فائلیں سر پر رکھے خود کو

بارش کی بو چھاڑ سے بچاتا تیزی سے حویلی کے صحن سے ہوتا ہوا بڑے ہال میں آیا وہاں پر مکمل سناٹا دیکھ کر سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا کمرے کا دروازہ کھول کر اس نے جو منظر دیکھا کوئی بھی غیرت مند مرد اسے دیکھ کر مر جانا پسند کرتا، کاٹ میں کلکاریاں بھرتی سجدہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اس کی ماں اس وقت ذلت کے کس گڑھے میں اتر چکی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسمعیل شاہ پر گھونسوں اور مکوں کی برسات کر دی۔ دراز میں سے ریوالور ڈھونڈتے ہوئے اس کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتا اسمعیل شاہ وہاں سے نکل بھاگا۔ احمد شاہ نے نفرت سے زمین پر تھوکتے ہوئے فردوس بیگم کو وہ تین لفظ کہے جو عورت کی زندگی کو گہنا دیتے ہیں اور اس غلیظ عورت کو فوراً سے بیشتر سجدہ کو ہاتھ لگائے بغیر وہاں سے نکل جانے کو کہا کہ طیش میں اسے اس آوارہ عورت کے خون سے ہاتھ نہ رنگنے پڑ جائیں۔ وہ اتنا طیش میں تھا کہ اسے لگا کہ وہ اگر نہیں رہا تو اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی اور وہ اس عورت کو مار ڈالے گا۔ سو اس نے روٹی ہوئی سجدہ کو جھپٹ کر اٹھایا اور دروازے پر ایک پل کو رک کر اس عورت سے اتنا کہا کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنا ناپاک وجود لے کر یہاں سے چلی جائے وہ اپنی بیٹی پر اس گھٹیا عورت کا سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتا۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے سجدہ کو لے کر نیچے آیا۔ پچھلی طرف کے کمرے سے باہر جا کر ملازمہ کو بلا کر سجدہ کو اس کے حوالے کر کے اس کا خیال رکھنے کو کہا اور خود تپتے دماغ کے ساتھ ڈیرے کی طرف آ گیا..... اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جیسی وہ فردوس بیگم کے گھر سے چلے جانے کا یقین کیے بغیر منظر سے ہٹ گیا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب فردوس بیگم ملازمہ سے سجدہ کو جھٹنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ رہ، رہ کر وہ سارے مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے جب بی بی نے اور اس کی بہن سمیعہ نے اسے فردوس کی بے راہ روی کی طرف دھیان دلانا چاہا تھا پر احمد شاہ نے ان کی ایک بھی نہیں سنی تھی۔ کتنی دیر بارش میں بھیگتے رہنے کے باوجود دل و

ثبوت اسے اپنے سہیل پر آنے والی کال پر مل گیا جب دوسری طرف سے ہنستے ہوئے فردوس بیگم نے کہا تھا۔

”میرا جرم اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بی بی مجھے سزا دی گئی تھی اب جو سزا میں تمہیں دوں گی وہ تمہیں تمام عمر تڑپائے گی۔ بہت شریف اور عزت والے سمجھتے ہوں ناں خود کو احمد شاہ..... کل جب تمہاری بی بی کی ہر رات نیلامی ہوگی تو میں دیکھوں گی کیسے اپنی نام نہاد شرافت کا ڈنکا بجاتے ہو۔“ اس کے زہر خند لہجے پر احمد شاہ

دماغ میں لگی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں وہ ناکام رہا تھا۔ فون کر کے بابا صاحب کی اور بی بی کی واپسی کے متعلق دریافت کیا۔ ان سے پتا چلا کہ موسم کی خرابی کے باعث وہ لوگ صبح ہی آسکیں گے۔ ریوالور کی موجودگی کا یقین کر کے وہ اسماعیل شاہ کے ڈیرے کی طرف آ گیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی شہر کی طرف نکلا ہے اس کے دماغ میں شرارے دوڑ گئے۔

”جہاں بھی چھپ جاؤ اسماعیل شاہ، اپنے گھر کی عورت کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔“ صبح کے چار بجے جا کر اسے معصوم سجدہ کا خیال آیا جسے وہ ملازمہ کے سپرد کر آیا تھا۔ واپس حویلی کی طرف آنے پر اسے اپنی... زندگی کا دوسرا اور شدید صدمہ برداشت کرنا پڑا جب ہال میں اس نے ملازمہ کو اکیلے سوتے دیکھا اسے جھنجھوڑ کر تیزی سے جگا کر سجدہ کی بابت استفسار کیا۔

”وہ..... وہ تو چھوٹے شاہ جی..... سجدہ بی بی کی طبیعت خراب تھی تاں چھوٹی بی بی اسے ڈاکٹر کو دکھانے شہر لے گئی ہیں۔ آپ پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔“ اس کے اتنے غصیلے اور شدید تیور دیکھ کر ملازمہ ہکلا کر بولی۔

”کک..... کہاں؟ کس کے ساتھ گئی ہے؟“ اسے اپنے حواس جواب دیتے محسوس ہوئے۔

”پتا نہیں جی، سجدہ بی بی بہت رو رہی تھی جی..... میں نے فیڈر بھی دیا پھر بھی چپ نہیں ہوئی۔ چھوٹی بی بی اوپر سے آئیں اور مجھے کہا کہ اسے ان کے حوالے کروں وہ شہر ڈاکٹر کو دکھانے گئی ہیں، میں سمجھی آپ کے ساتھ گئی ہیں جی، گھر خالی تھا اس لیے میں یہاں ہی سو گئی۔“ گھر کی سب سے قیمتی متاع لٹ گئی تھی اور وہ گھر کی حفاظت کے خیال سے سو رہی تھی۔ انہی اڑے حواس کے ساتھ وہ چوکیدار کے پاس آیا۔

”فردوس بی بی..... آپ کے کہنے پر ہی تو اسماعیل شاہ کے پاس گئی ہیں۔ اب تک تو جی انہیں واپس بھی آ جانا چاہیے تھا۔“ اس کی بات سن کر وہ اپنی ذلت کے احساس اور عزت کی پامالی کا غم مناتا رہا تھا اور وہ مکار عورت اس کی متاع کو لے اڑی تھی۔

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ ایک سال کا نام جہاں پرچا نہیں ملتا ہو۔
- ☆ شہر اور مل کے نام۔
- ☆ ممکن ہو تو ایک سال PTCL یا سہیل انٹر نیشنل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگرت
 C-63 نیو 11 سٹیشن ڈینس ہاؤسنگ اتارنی مین کورنگی روڈ، کراچی

35802552-35386783-35804200
 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

READING
 Section

217 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

صبح تک ان دونوں کی دوستی مزید پکی ہو گئی تھی اور عائشہ نے اسے منالیا تھا کہ وہ کچھ روز مزید ان کے ہاں قیام کرے گی۔ ویسے بھی دل سے تو خوش بخت بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ کچھ مدت یہاں رہے، اپنے ہونے کی، اپنی شناخت کی کتھی کا کوئی سرا ملنے تک۔ صبح بڑے شاہ صاحب واپس تشریف لے آئے تھے۔ خوش بخت، عائشہ کے ساتھ ان سے ملنے گئی۔ کئی ٹائیپے وہ اس پر سے نظر ہی نہ ہٹا سکے۔ کچھ دیر بعد ان کا کپکپاتا ہاتھ اس کے سر پر آٹھرا جو اسے کسی گھنے سایہ دار درخت کی طرح لگا۔ اس نے آنکھیں موند کر دیا یہی سکون محسوس کیا جیسا وہ مسافر محسوس کرتا ہے جو سفر کی کڑی صعوبتیں جھیل کر پتی دھوپ سے اس شجر کے نیچے آن رکے۔ بلاوجہ ہی آنکھوں میں آنسو اٹھ آئے۔ ”کیا پھر بھی یہ ایسی ہی شفقت کا مظاہرہ کریں گے اگر جو میں ان کو اپنی حقیقت بتا دوں تو بے بی بی، شاہ صاحب سے پنچائیت کے فیصلے کی بابت دریافت کرنے لگیں جس کی پیچیدگی نے بڑے شاہ صاحب کو ایک دن کے بجائے دو دن کے قیام پر مجبور کر دیا تھا۔ خوش بخت جھکا ہوا سر اٹھا کر بے اختیار بابا صاحب کو دیکھنے لگی جو آہستہ سے بتا رہے تھے کہ لڑکا تو نکل گیا لیکن لڑکی کو کاری کر دیا گیا۔ اس کے ماں، باپ تو بہت شور کر رہے تھے پر موقع پر بہت سے گواہان موجود تھے۔ اس لیے مجبوراً انہیں فیصلہ قبول کرنا پڑا۔

”ہاں نہیں کیوں آپ کے ایسے کسی بھی فیصلے پر جی دونوں ہولتا رہتا ہے۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔ جو ابابا شاہ صاحب نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”کسی بھی گناہ گار کو سزا دیے بغیر برائی کے عمل کو روکنا ناممکن ہے اور زنا جیسا جرم صدیقہ بی بی جس کے مجرم کو سنگسار کیے جانے کا حکم ہے، ایسے لوگوں کو ایسے چھوڑ دینا برائی کو بڑھانے کے لیے مہینز کا کام دیتا ہے۔ بہت بار ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش کی

ساکت رہ گیا۔ بی بی اور بابا صاحب صبح جب واپس آئے سب کچھ ختم ہو گیا تھا بے حیا کی اور بے راہ روی کے جس طوفان سے بی بی ڈرتی رہی تھیں وہ آ کر سب کچھ اپنے ساتھ بہا لے گیا تھا۔ اس گھر کی عزت، ناموس، آن بان، احمد شاہ نے روتے ہوئے بابا صاحب کو سب کچھ بتایا اور اپنے درد کو نقصان کو بتاتے اسے دل کا ایسا جان لیوا دورہ پڑا کہ اسپتال تک جانے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ اسماعیل شاہ ایک بار پھر ملک بدر ہو گیا تھا۔ بابا صاحب اپنی عزت، مقام و مرتبہ بھلا کر ان گلیوں تک گئے تھے جہاں ایک مجہول سے چلے والے آدمی کے سوا کچھ نہیں تھا جس نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کا ڈیرا مستقل ایک جگہ پر نہیں ہوتا وہ جگہ، جگہ پھرتے ہیں اور ابھی دو دن پہلے ہی وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ کندھوں پر غموں کی بھاری صلیب اٹھائے بڑے شاہ صاحب وہاں سے لوٹ آئے تھے۔ انہوں نے اپنے بے شمار ذرائع استعمال کر کے فردوس بیگم کو تلاش کرنا چاہا پر اسے زمین نکل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا کہ وہ دن اور آج کا دن یہ دل چیر دینے والی حقیقت ہر پل انہیں خون کے آنسوؤں لاتی کہ ان کے خاندان کی عزت، ان کے احمد شاہ کی نشانی زندہ تھی اور بد نام گلیوں کی زینت تھی۔ وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ وہ مزید عاجز بن گئے تھے۔ ان کی سخاوت میں اضافہ ہو گیا، کسی بھی سوالی کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے کہ ہو سکتا ہے کسی ضرورت مند کے منہ سے نکلی دعا کوئی معجزہ کر دے۔ بی بی کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ ہر روز رات کو جب ساری کائنات سو جاتی، ان کے زخموں کے ٹانگے ادھر جاتے ماضی اپنی پوری سخی سمیت ان کے سامنے آکھڑا ہوتا۔ دونوں میاں، بیوی جاگ کر راتیں تمام کرتے۔ زخم تو کبھی مندمل ہوا ہی نہیں تھا۔ کوئی یاد، کوئی بات، کوئی حوالہ، کوئی سلسلہ اسے ہرا کیے رکھتا جیسے کل اس پنچے خوش بخت کی آمد، اس کی شکل، معصومیت انہیں اپنی سجدہ کی یاد دلا گئی تھی۔ وہ آنسو پونچھتی انہیں تہجد کا وقت ہو چلا تھا۔ انہیں

غزل

اب تو تیری آنکھوں میں بس میری صورت نہیں ہوتی
اسے کہنا! فکر کرنے کے لیے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی

زمانہ، روزگار نے ایسا کر دیا معروف ہم کو
ورنہ کسی روز بھول جائیں ہم، ایسی صورت نہیں ہوتی

مت یاد کر تلخ ماضی کو اے دوست
کچھ یاد ماضی کی خوب صورت نہیں ہوتی

بہر کی یہ شام، دن اور رات باعثِ مجبوری
ورنہ ایسا نہیں کہ ہم کو تیری ضرورت نہیں ہوتی

جو لوگ بستے ہوں دریچے دل میں اے خنجر
دیکھیں ان چہرے کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی

شاعر: محمد امین خنجر

مرسلہ: قیصرہ شاہ، اسلام آباد

بے طرح پیارا آیا اس نے لباس تبدیل کر لیا اور آج ایک
بار پھر گاؤں کے باقی گھروں میں سروے کی غرض سے
بی بی کو بتا کر باہر آگئی۔ ملازمہ کو ساتھ لے کر وہ خود نہ آئی
کہ گاؤں کی عورتوں سے کریم بخش شاہ صاحب کے
گھرانے کے بارے میں کچھ معلومات لینا چاہتی تھی۔
کچھ خاص معلومات تو نہ مل سکیں بس باتوں، باتوں میں
اتنا پتا چلا کہ احمد شاہ کی شہری بیوی بہت حسین اور نخرے
والی تھی اور ایک رات بچی کو چپکے سے لے کر غائب ہو گئی
تھی۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ گاؤں کے ہر گھر میں ہی
تقریباً فردوس بیگم کے لیے منفی تاثرات پائے گئے تھے
جبکہ شاہ صاحب کے گھرانے کے اخلاق، سخاوت اور
مروت کی ہر کسی نے تعریف کی۔ واپسی پر وہ بے حد تھکی
ہوئی اور پڑمردہ تھی۔ کوئی سرا ایسا ہاتھ نہ آسکا تھا جس کو
لے کر وہ آگے بڑھ پاتی سو وہیں ایک سایہ دار درخت
دکھ کر کچھ دیر سستانے بیٹھ گئی۔ سامنے گندم کی سنہری

گنی لیکن بے راہ روی کی جس راہ پر وہ چل پڑے تھے
وہاں سے واپس پلٹنا ناممکن تھا ان کے لیے، خیر چھوڑیں
آپ بتائیں کہ اس بچی کا خیال رکھا یا نہیں آپ لوگوں
نے؟ کیوں عائشہ.....؟“ وہ پوچھنے لگے اور خوش بخت
جو ان کے نرم رویے اور لہجے سے ہمت پکڑے بیٹھی تھی
ان کے اس قدر سفاک فیصلے کا سن کر اندر سے بہت
خوفزدہ ہو گئی۔

”واقعی یہ لوگ مجھے اور میری ماں کو مار دینا
چاہتے ہوں گے۔“ یہاں آنے کے بعد پہلی منفی سوچ
نے اس کے اندر سر اٹھایا۔

”اس کا مطلب آئی ستارہ ٹھیک کہتی تھیں لیکن وہ
ماسٹر جی.....“ وہ الجھی ہوئی سوچوں میں بیٹھی رہی۔
ناشتے کے بعد خدیجہ بھی آن وارو ہوئی تھی۔

”لگتا ہے تمہارا کام ابھی نامکمل ہے؟“ پتا نہیں
واقعی اس کا لہجہ طنزیہ تھا یا خوش بخت کو ہی لگا۔
”نہیں، ایک دو دن میں مکمل ہو جائے گا۔“ اس

کے بعد وہ عائشہ سے معذرت کر کے اپنے عارضی قیام
گاہ یعنی مہمان خانے کی طرف آگئی۔

”ہونہہ پتا نہیں کیسے ماں، باپ ہوتے ہیں جو
اپنی بیٹیوں کو ایسے شتر بے مہار چھوڑ دیتے ہیں کہ جہاں
جی چاہے پھرو، جو جی چاہے کرو، نہ کوئی اتا نہ پتا.....
ایک ہمارے والدین ہیں، اپنی نانی، نانا کے گھر آنے
کے لیے سوختیں کرنی پڑتی ہیں تب کہیں جا کر آنے کی
اجازت ملتی ہے۔“ خوش بخت نے جانتے، جانتے اس
کے وہ سارے الفاظ سنے پھر سر جھٹک کر باہر چلی گئی۔

”پتا نہیں کیوں اے پیاری سی لڑکی تم مجھ سے
اتنی خار کھاتی ہو، ارے تم جانتی ہی کہاں ہو کہ میں اس
وقت کتنے محاذوں پر تنہا لڑ رہی ہوں بغیر کسی ہتھیار
کے..... میرے لیے نیا محاذ کھڑا مت کرو۔“ اس نے
ست روی سے چلتے ہوئے سوچا۔ تھوڑی دیر بعد
ملازمہ سے عائشہ کا ایک سوٹ وے کر گئی۔

”چھوٹی بی بی کہتی ہیں، یہ استعمال کیا ہوا نہیں ہے
آپ یہ تبدیل کر لیں۔ یہ بالکل نیا ہے۔“ اسے عائشہ پر

بخت پھیکے بڑتے چہرے اور سن ہوتے جسم کے ساتھ وہ سب کچھ سنے گئی۔ اذان شاہ چونک گیا جب اس نے خوش بخت کو ہاتھوں میں منہ چھپا کر بری طرح روتے دیکھا۔ اسے اس کو اس طرح روتے دیکھ کر شدید تکلیف ہوئی اور دل کی اس دوسری بغاوت پر وہ جھنجلا گیا۔ ضدی دل نے پہلی بغاوت اس لڑکی کو دیکھ کر اسی پر اپنے آئیڈیل کی مہر ثبت کر کے اسے حیران کر دیا تھا۔ جس لڑکی کو اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا جس کی حیثیت، شناخت، خاندان وغیرہ کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کے بارے میں وہ کیسے انتہائی جذبات رکھ سکتا تھا پر دل کو جب اپنی منوانی ہو تو وہ کون، کیسے کیوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ لوگ جو ملازم بھی حسب نسب کھنگال کر رکھتے تھے وہ کیسے اس لڑکی کو اپنانے کے بارے میں سوچ سکتا تھا سو اس نے اپنا دھیان یہاں وہاں لگانے کی کوشش کی اور سوچا ضرور تھا کہ اس سے اس کے گھر، خاندان کی معلومات ضرور لے گا، کیا پتا قسمت اس کا ساتھ دے جائے بظاہر شکل صورت اور گفتگو سے وہ اسے سلجھی ہوئی لڑکی لگی تھی۔ بی بی اور عائشہ نے بھی اس کی تعریف کی تھی لیکن کل شام اسے فیکٹری میں مشینری سیٹ کرانی تھی سو وہ لیٹ ہو گیا تھا جب ایک جیب پر اس نے تین افراد کو وہاں اترتے دیکھا جن کے چلیے اسے چونکا گئے اور ان میں سب سے کرخت اور عجیب شکل صورت والے آدمی نے جب خوش بخت کی تصویر دکھا کر اس کی بابت اسے ساری تفصیل بتا کر دریافت کیا وہ بے حد پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ گھر آ کر وہ خوش بخت سے اسی وقت ملنا چاہتا تھا پر کام سمیٹتے، سمیٹتے بھی اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ اس نے ان لوگوں کو ٹال دیا تھا لیکن وہ لوگ پورا پتا کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ صبح اس کا فیکٹری کا ایک اور چکر لگا تھا اور اب واپسی پر اس کی بابت دریافت کرنے پر اسے پتا چلا کہ وہ سروے کے لیے نکل چکی ہے۔ اب اس نے بے تحاشا روتے ہوئے اذان شاہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور کہا وہ صرف اسے دو دن دے دے وہ اسے سب کچھ سچ، سچ بتا دے گی پر اس وقت وہ اس سے کچھ مت پوچھے۔ اذان شاہ نے اپنے

فصل لہلہا رہی تھی۔ آسمان پر بادل تھے اور ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی اس لیے گرمی کا مجموعی تاثر کم تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ اٹھنے کو تھی اس نے اذان شاہ کو اسی طرف آتے دیکھا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسی کو ڈھونڈتے ہوئے آ رہا تھا۔

”میں حویلی سے آ رہا ہوں، وہاں سے پتا چلا کہ آپ سروے کے لیے نکلی ہیں، آپ کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آیا ہوں۔“ خوش بخت سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی جیسے اس کی تمہید کا مقصد جاننا چاہ رہی ہو۔ وہ اس سے تھوڑا دور ہو کر بیٹھ گیا کچھ دیر سامنے فصل پر نظر جمائے بیٹھے رہنے کے بعد اس نے اس کی طرف سر گھمایا کچھ دیر بغور اسے دیکھا اب کے خوش بخت گھبرا گئی۔

”آپ کون ہیں اور یہاں کیا کرنے آئی ہیں؟“ سنجیدہ لہجے میں کیا گیا سوال اس کا دماغ بھک سے اڑا گیا۔ وہ گڑ بڑا کر اسے وہی تفصیل بتانے ہی لگی تھی جب اذان شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور سابقہ انداز میں ہی بولا۔

”کل شام کو آپ کو ڈھونڈنے کچھ لوگ آئے تھے یہاں گاؤں میں، عجیب سی شکل اور حلیوں والے..... ان لوگوں کا حلیہ چیخ، چیخ کر یہ کہہ رہا تھا کہ وہ شریف لوگ... ہرگز نہیں ہیں۔ ان کے پاس آپ کی تصویر بھی تھی انہوں نے بتایا کہ آپ گھر سے بھاگ کر یہاں آ کر چھپ گئی ہیں۔ وہ بہت سراغ لگا کر اور تحقیق کر کے آئے تھے کہ آپ اپنے کالج سے کس رکشے میں بیٹھیں۔ اس نے آپ کو کہاں چھوڑا آخری بات جو بس کنڈیکٹر نے بتائی وہ یہی تھی کہ آپ یہیں اتری تھیں۔ میں نے پُر زور تردید کر کے فی الحال انہیں واپس تو بھیج دیا لیکن ان کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ انہیں میری بات کا یقین نہیں..... بابا صاحب کی حیثیت اور مقام کا خیال کر کے وہ واپس تو چلے گئے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ اس بار وہ کسی اور مضبوط منصوبہ بندی کے ساتھ آئیں..... اب آپ مجھے سچ، سچ بتائیں گی کہ آپ یہاں کیوں اور کس مقصد کے تحت آئی ہیں؟ آپ نے اپنا گھر کیوں چھوڑا؟“ خوش

دیکھ کر رہ جاتی پھر ایک حادثے میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تو اس کے ذہن میں جہاں بھی باپ کے حوالے سے جتنے سوالوں نے جنم لیا اس کی نانی اور ستارہ بیگم نے اس کا ذہن پر اگندہ رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

”یہ شریف لوگ صرف نام کے شرفا ہیں خوشی، تمہارا باپ جو تمہاری ماں کو اس گندگی سے نکال کر بڑے کروفر سے لے گیا۔ اسے کیا معلوم گندگی تو ذہن میں ہوتی ہے ان لوگوں کے ذہن بھی گندے تھے۔ تمہاری ماں کو کئی، کئی دن کمرے میں بھوکا پیاسا رکھا جاتا تھا اسے کسی سے ملنے، بات چیت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

گھر میں کئی ملازموں کے ہوتے ہوئے بھی میری بچی سے سارا کام کرایا جاتا۔ تمہاری دادی اور پھوپھو نے طعنے دے، دے کر اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ ہر آئے گئے کے سامنے ذکر کرتیں کہ کیسے اس کی ماں نے اداؤں کے تیر چلا کر تمہارے باپ کو بے بس کر ڈالا تھا اب بھی جب موقع ملا وہ بھاگ جائے گی اور جب تم پیٹ میں تھیں تو کئی ایسے حربے اور ٹوکے استعمال کرائے کہ بچہ پیدا ہی نہیں ہو لیکن تم نے اس دنیا میں آنا تھا سو آ کر رہیں۔ تمہارے باپ کو انہوں نے اتنا بہکا یا تمہاری ماں کے خلاف، اتنے الزامات لگائے کہ وہ تمہیں اپنے وجود کا حصہ ماننے سے انکاری ہو گیا۔ تمہاری ماں کی زندگی تو تنگ تھی ہی تم پر بھی کم ستم نہ ڈھائے۔ نہ تمہیں کپڑے لے کر دیے نہ دیگر ضرورت کی اشیا اور دودھ وغیرہ، ایک کپڑے میں لپیٹ کر فردوس تمہیں روتی رہتی پھر ان سب کا مسلسل بہکانا کام آ گیا تھا اور انہوں نے ایک ایسا منصوبہ ترتیب دیا کہ تمہاری ماں کو اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہا تھا کہ وہ ان ظالم لوگوں کے چنگل سے تمہیں بچالاتی ورنہ تو تمہیں مار ہی دیتے وہ لوگ۔ انہوں نے رشتے کے کسی آدمی کو پیسہ دیا یا کوئی اور لالچ کہ وہ اس پل، اس وقت وہاں آدھمکتا جب تمہارے باپ نے گھر آنا ہوتا فردوس لاکھ دہائیاں دیتی کہ وہ اسے نہیں جانتی لیکن وہ عورتیں یہی کہتیں کہ اس کو تمہاری بیوی نے ہی بلایا ہے۔ ایک رات جب اس مرد

اندر اودھم مچاتے سوالات کو بہ مشکل پیچھے دھکیلا اور اس کی درخواست پر کسی معمول کی طرح سر ہلا دیا۔ وہ اس کے پاس سے اٹھ کر تیزی سے وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ سارا دن اذان شاہ کسی اور کام کی طرف دھیان ہی نہیں دے سکا تھا۔ خوش بخت سائیں، سائیں کرتے ذہن کے ساتھ حوصلی آئی تھی۔ شومئی قسمت بی بی اسے اپنے کمرے میں اکیلی مل گئیں۔ عائشہ، خدیجہ کے گھر اپنی پھوپھو کی طبیعت دریافت کرنے گئی ہوئی تھی جو ایک مہینے سے ناساز تھی۔

”بی بی یونہی باتوں کے دوران گاؤں میں ایک آدھ جگہ آپ کی اس پوتی کا ذکر ہوا جو احمد شاہ کی بیٹی تھی کہ کبھی وہ نظر نہیں آئی۔“ اس کا سوال سن کر ان کے چہرے پر ناقابل بیان تاثرات درج ہو گئے۔

”بی بی جنہوں نے اس کا ذکر کیا انہوں نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی کہ وہ اور اس کی ماں کسی حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے چل بسی تھیں“ اس پل جتنی اذیت بی بی نے محسوس کی تھی اس سے زیادہ خوش بخت نے اپنے اندر اذیت کے اسی سمندر کو ٹھانٹیں مارتا محسوس کیا۔

”ستارہ آنٹی ٹھیک کہتی تھیں آپ نے کبھی میری ماں کو دل میں جگہ دی ہی نہیں تھی۔ اور ان کے حوالے سے مجھے بھی قبول نہیں کیا۔“ خود ترسی سے سوچتی کھانے سے انکار کرتی وہ اپنے کمرے کی جانب آگئی جہاں وہ رہائش پزیر تھی۔ اسے وہ دھندلے، دھندلے نقوش اور باتیں پوری جزئیات کے ساتھ یاد آنے لگیں جو کبھی فردوس بیگم، کبھی اس کی نانی اور اکثر ستارہ بیگم بتاتی تھیں، وہ باتوں کے مفہوم اور معانی و مطلب سمجھنے کی عمر میں نہیں تھی لیکن اس کی ماں کی باتیں اسے الجھن میں مبتلا ضرور کر دیتیں۔ جو پکڑ، پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا کر اس کی دلچسپی اور مطلب کی باتیں کرنے کے بجائے اس سے کہتی۔

”خوشی! تمہارا باپ ایک ظالم آدمی تھا، وہ تمہیں اپنی اولاد ماننے پر تیار نہیں تھا۔ اس کے گھر والے اس سے زیادہ ظالم تھے وہ بھی اسے بھڑکاتے کہ تمہیں اور مجھے جان سے مار دیا جائے۔“ وہ نا فہم نظروں سے ماں اور خالہ کو

ہے کہ باپ کے دل میں چھپی محبت نے جوش مارا ہو پر یہاں آکر اسے پہلا صدمہ اپنے باپ کی موت کا برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کا سب سے پہلا اور مضبوط حوالہ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے حوصلے کی دیوار میں دراڑ پڑی اور ہمت لڑکھرائی تھی۔ کبھی ان سب کے محبتوں سے لبریز رویے اسے اتنا پُر جوش کر دیتے کہ اسے لگتا اسے اپنی شناخت کر ادینی چاہیے پر اس کے بعد فوراً ہی کوئی ایسی بات ہو جاتی وہ پھر سے گھبرا جاتی۔ اب آگے کھائی اور پیچھے کنویں والا معاملہ تھا۔ ستارہ بیگم کے بندے سراغ لگا کر اس گاؤں تک پہنچ گئے تھے تو پھر یہ کسی بھی وقت ممکن تھا کہ وہ بڑے شاہ صاحب تک اس کا پوچھتے آن سکتے۔

اس نے بی بی سے ان کی پوتی کا جان کر پوچھا تھا کہ کچھ تو کہیں گی۔ کسی رویے کا اظہار پر انہوں نے سرے سے ان ماں، بیٹی کو مار کر بات کو ختم ہی کر دی تھی۔ اسے لگا ستارہ منزل کے درو دیوار اس کی قسمت میں لکھ دیے گئے ہیں۔ بالآخر اسے وہیں جانا ہے۔

بندگی اور اس میں کھڑی میں

کسی سہمی ہوئی ہرنی کے مانند

جس کے دونوں جانب

شکاری تاک میں ہیں

اک جانب ہیں ذلتیں بازار کی

دوسری طرف رشتوں کی نفرت کا زہر

معجزہ کاش مقدر کر دے

ذلتوں کا رخ موڑ

میرے رشتوں کو میرا کر دے

اس نے اپنے جھولا سے بیگ میں سے اپنی پیاری سہیلی (ڈائری) کو کسی متاع کی طرح باہر نکالا وہ جو اس کا ہر درد سمجھتی، سنتی بھی تھی اور اس کے سینے پر اپنا درد، اپنا ہر راز اتار کر اسے عجیب سا سکون ملتا تھا۔

”اپنی ذات کی شناخت کا حق ہر انسان کو ہے بڑے شاہ صاحب..... یہ تو طے ہے کہ میں ایک بار رو برو ہو کر اپنے نام اور حوالے کی جنگ ضرور لڑوں گی پھر

نے تمہاری ماں سے دست درازی کی کوشش کی اور احمد شاہ کے آجانے پر الزام فردوس کے اوپر ڈال دیا کہ اسی نے مجھے بلایا تھا نہ صرف آج بلکہ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار فردوس کے بلانے پر آچکا تھا۔ یہ سننا تھا کہ تمہارے باپ کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ وہ تم دونوں کو مار دینا چاہتا تھا۔ مت پوچھو کیسے جتنوں سے فردوس اسی برستی ہوئی تاریک رات میں تمہاری اور اپنی جان بچا کر نکلی۔“ یہ وہ کہانی تھی جو ان لوگوں نے کسی کمپیوٹر..... کی طرح اس کے دماغ میں فیڈ کر دی تھی۔ نانی کے مرنے کے بعد اس کی برین واشنگ کا کلی بیڑا ستارہ بیگم نے اٹھالیا اور اب وہ جب سے کالج میں آئی تھی، کچی عمر کے تقاضے اور باپ سے نفرت کو تیز کرنے کے لیے ستارہ بیگم نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی اور کہا تھا کہ ”بڑے ہو کر اسے اسی بازار کی رونق بننا ہے۔ ستارہ بیگم کی سیٹ سنبھالنی ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب میں خود تمہیں تمہارے باپ کے پاس بھیجوں گی تمہارا حق وصول کرنے..... ابھی تم چھوٹی ہو، تمہاری حیثیت میرے حوالے کی محتاج ہے۔ اپنی جگہ اور مقام اس جگہ پر مضبوط کرنے کے بعد جانا ان شرفا کے پاس۔“ پر جب سے خوش بخت نے اس دلدل میں اترنے سے انکار کر دیا تھا ستارہ بیگم نے اس کا ذہن دوسری طرف موڑنا چاہا تھا قلم لائن کی طرف اور ایک بار پھر اسے ڈراوا دینے لگی تھیں کہ جو لوگ پیدا ہوتے ہی اسے مار دینا چاہتے تھے وہ اب بھی اس کے ویسے ہی دشمن ہوں گے ستارہ بیگم کی بات مان لینے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا لیکن اپنی عادت اور فطرت کا کیا کرتی جو برسوں اس جگہ سے تعلق رہنے کے باوجود وہاں کے طور طریقے ہرگز اپنانے کو تیار نہ تھی۔ پھر انہی دنوں موسیقی اور رقص کی تربیت لینے کے دوران اسے ماسٹر جنم کی کچھ باتوں نے چونکا دیا جو انہوں نے اس کے دادا کے حوالے سے کی تھیں کہ وہ اپنی گمشدہ پوتی کو بہت بے قراری سے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ اسی بات نے اس کے اندر ایسی ہمت پیدا کی کہ وہ وہاں سے نکل آئی تھی۔ ہو سکتا

چاہے قبول کر لی جاؤں یا دھتکاری جاؤں..... میری قسمت، یہ تو طے ہے کہ ستارہ منزل میں مر کر بھی واپس نہیں جاؤں گی..... ذلت کی زندگی جینے سے وہ عزت والی موت قبول کروں گی جو یہ سوچ کر مجھے خوشی دے گی کہ کیا ہوا جو میرے اپنے مجھے نسب نہ دے سکے پر کچھ تو میرے حصے کا انہوں نے بچا کر رکھا تھا چاہے موت ہی سہی۔“ کتنی ہی لایعنی اور بے معنی باتیں وہ کسی بوجھ کی طرح ڈائری پر منتقل کر کے خود کو ہلکا کرتی گئی چونکی اس وقت جب ملازمہ کھانے کی ٹرے لے کر اندر آئی اور بتایا کہ بی بی پریشان ہو رہی ہیں کہ اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اس نے بابا صاحب کے متعلق دریافت کیا تو ملازمہ نے بتایا کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد تشریف لے آئیں گے۔ اس نے اسے تاکید کی کہ وہ ان کے آنے کا اسے ضرور بتائے اس نے ان سے ضرور ملنا ہے۔ کھانے کے ایک دو لقمے زہر مار کرنے کے بعد اس نے کپڑے جھاڑے اور باہر آگئی۔ عصر سے ذرا پہلے کا وقت تھا۔ بی بی کے پاس گاؤں کی کچھ عورتیں جمع تھیں، وہ ایک ملازمہ کو بتا کر اوپر چھت پر آگئی۔ اپنے باپ کی اور اپنی جائے پیدائش اور وہ کسی ڈر اور خوف کے بغیر الگ ہی طریقے سے محسوس کرنا چاہتی تھی۔ منڈیر سے جھانکنے پر دور پھیلے کھیتوں کا ایک سلسلہ نظر آیا۔ وہیں پر دو کمرے بھی بنے ہوئے تھے شاید اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوتے کہ کاٹھ کباڑ پڑا تھا اس میں اس بیکار سامان کو بغیر وجہ اٹھا کر، چھو کر محسوس کرنے لگی کہ ہو سکتا ہے کبھی ان پرانی چیزوں کو اس کے باپ نے ہاتھ لگایا ہو، اتنا ہی پرانا سامان تھا وہ..... تھوڑی دیر وہاں رکنے کے بعد وہ نیچے آئی تو بی بی ہنوز مصروف تھیں۔ باتوں، باتوں میں عائشہ ذکر کر چکی تھی کہ دوسری طرف اوپر والا پورشن کبھی اس کے چچا اور ان کے خاندان کے زیر تصرف تھا اور اب خالی تھا اور بی بی گاہے بہ گاہے اپنے بیٹے کی نشانی جان کر صاف کرائی رہتی تھیں۔ وہ سیرھیاں چڑھ کر اوپر آگئی۔ سیرھیوں کی رینگ کو اس نے بڑے پیار سے محسوس کیا کہ کتنی ہی بار احمد شاہ اسے تمام کر نیچے اترے ہوں گے اور وہاں پر دو کمرے تھے اور

ایک لمبی سی راہ داری اس نے پہلے کمرے کا درواہ کھولا تو وہ بے آواز کھلتا چلا گیا نفاست اور خوب صورتی کا شاہکار کمرہ..... بندے کے اچھے ذوق کی منہ بولتی تصویر تھا۔ سائڈ ٹیبل پر احمد شاہ تصویر میں ایک مغرور مسکراہٹ کے ساتھ پورے کروفر سے براجمان تھے۔ عائشہ کے پاس وہ تصویروں میں ان کی تصویریں دیکھ چکی تھی۔ تصویر کو آہستہ سے اٹھا کر اس نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کی ناپیدہ گرد صاف کی۔ برسوں کی باتیں تھیں جو اس نے کرنی تھیں کچھ پل کو اس نے تصور کیا کہ وہ خود اس کے سامنے ہیں اسی تصور کے زیر اثر وہ جو دل میں آیا ان سے کہتی چلی گئی ارد گرد سے بیگانہ ہو کر.....

☆☆☆

اذان شاہ کو الجھن میں ڈال کر وہ خود آرام سے تھی جبکہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ فیکٹری سے جلدی اٹھ کر وہ حویلی چلا آیا۔ بابا صاحب ڈیرے پر تھے۔ بی بی عورتوں کے درمیان گھری ہوئی تھیں۔ ملازمہ نے استفسار پر بتایا کہ عائشہ پھپھو کے گھر اور مہمان بی بی چھت پر گئی ہیں۔ وہ کچھ سوچ کر مہمان خانے کی جانب آگیا۔ اسے ڈھونڈنے آنے عجیب حلیوں والے لوگوں اور خود اس کے ہراساں روتے نے اس کے تجسس کو ہوا دی تھی۔ تبھی تو غیر اخلاقی بات کہ کسی مہمان کی غیر موجودگی میں اس کی ذاتی چیزوں کی کھوج کی جائے پر اس پل اسے اپنا روبرو عمل وقت کا تقاضا لگا۔ اس کی متاع اس کا جھولا سا بیگ سائڈ ٹیبل پر دھرا لے نظر آیا۔ اسے کھولنے پر اس میں آف پڑے ایک قیمتی سیل فون کی موجودگی اسے حیران کر گئی۔ آن کرنے پر اس کی کسی سہیلی کے لاتعداد میسجز ملے جسے اس کی غیر موجودگی میں ہراساں کیا جا رہا تھا، وہ اور اس کے گھر والے بے حد پریشان تھے، ماتھے پر لاتعداد شکنیں لیے اس نے کچھ دیر ناقابل فہم نظروں سے سیل فون کو گھورا جو کم و بیش وہی کہانی سن رہا تھا جیسی اسے ڈھونڈنے آنے والے لوگ سن رہے تھے۔ اس نے سیل فون آف کر کے پھر بیگ میں ڈالا، بیگ میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔

223 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

READING
Section

تجھے اپنی رحمتوں میں سمیٹ لوں گا
اس بات کو کسی پاک وحی کی صورت
تو نے دل میں اتارا
تب انسانوں کے وسیلے کو ڈھونڈنا چھوڑ
تیری رسی کو تھام کر میں نے
وہ سب پالیا
جو میرے حصے کا تھا بھی، نہیں بھی
جو مانگا تھا، نہیں بھی
پھر تو یوں ہے کہ
مرتے دم تک مجھ پر
شکر گزاری کے

کروڑوں سجدے واجب ہوئے“

اس نے سرشاری اور عاجزی کے انوکھے
احساسات کے ساتھ اپنے جذبات اپنی پیاری ڈائری
میں اتارے جو اسے اپنوں سے ملانے کا سبب بنی
تھی۔ ایک تشکر بھری آسودہ سانس کو ہوا کے سپرد کیا۔
اس روز اپنے باپ کی تصویر سے باتیں کرتے، وہ کب
سو گئی تھی پتا ہی نہیں چلا تھا، آنکھ کھلنے پر منظر تبدیل تھا۔
معجزہ ہو چکا تھا۔ اس کے بے حد پیارے اس کے ارد
گرد تھے وہ حیران نظروں سے بابا صاحب اور بی بی کو
دیکھتی رہ گئی جو بار بار اسے لپٹا کر رو پڑتے۔ ستارہ بیگم
نے بابا صاحب کو فون کر کے ہراساں کرنے کی کوشش
کی تھی پر اس بار بابا صاحب نے اس کی بازی اسی پر
الٹ دی تھی کہ آئندہ اگر اس نے انہیں فون کیا تو وہ اپنی
پوتی کے اغوا کا کیس کروا کے اسے اندر کرادیں گے اور
گواہان میں پہلی گواہ ان کی اپنی پوتی سجدہ شاہ ہوگی۔
ٹھیک ایک ماہ بعد اسے سب کی رضامندی سے
اذان شاہ کی دلہن بنا دیا گیا تھا کہ وہ رب کی اس کرم
فرمائی پر اس کا بے حد مشکور تھا جو دلوں کے بھید جان کر
خواہشات کو ایسے پوری کر دیتا ہے جس کی انسان توقع
ہی نہیں کر سکتا۔ بے شک وہ انسانوں سے ستر ماؤں
سے بڑھ کر محبت کرتا ہے۔



اسٹوڈنٹ اتنی رقم ساتھ لے کر نہیں گھوما کرتے۔ ایک
یونیفارم اور ایک ڈائری کے سوا کچھ ایسا نہیں تھا جس
سے اس کے سوالوں کا جواب مل پاتا۔ وہ بیگ دوبارہ
وہیں رکھ کر باہر آنے کو تھا جب اسے بیگ میں رکھی
ڈائری کا خیال آیا اس نے دروازے سے باہر جھانک
کر کسی کے بھی نہ ہونے کا یقین کیا اور ایک بار پھر
واپس پلٹ کر بیگ میں سے وہ ڈائری نکالی۔ پہلے پہل
اس میں بے ربط الفاظ، ٹوٹے پھوٹے خیالات جیسے خود
کلامی کا سا الفاظ کا سمندر تھا پھر کچھ صفحات پلٹنے پر جو
کچھ اس کی نظروں نے پڑھا اسے لگا کائنات کی گردش
وہیں رک گئی ہو۔ اگرچہ وہ ڈائری مسلسل اور تاریخ بہ
تاریخ نہیں تھی پر جتنا کچھ بھی اس میں درج تھا باقی کے
سیاق و سباق کو واضح کر رہا تھا۔ جوں، جوں بے تابی
سے ورق پر ورق پلٹتا گیا توں، توں اس کی رنگت سرخ
ہو کر تہمتا نے لگی تھی۔ اس کی ماں کی غلط بیابیاں، اس
کے خیالات اس کی ستارہ آئی اور اس کی مانی نے جو
کچھ اسے بتایا تھا وہ سب پھر اس کے اپنے خیالات
سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں تھا۔ اذان شاہ خوشی
اور جوش سے ڈائری ہاتھ میں لے کر تیزی سے باہر
آ گیا، بی بی باہر نہیں تھیں۔ وہ تیزی سے بابا صاحب
کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اسی وقت نماز پڑھ کر
واپس آئے تھے اور اس وقت اپنے بستر پر نیم دراز
تھے۔ آج کل ویسے بھی طبیعت کی ناسازی کے باعث
جلدی تھک جایا کرتے تھے۔

”بابا صاحب! اللہ نے آپ کی دعائیں سن
لیں..... اللہ کا کرم ہو گیا آپ کی، ہماری سجدہ مل گئی بابا
صاحب.....“ وہ والہانہ پن سے ان کی طرف بڑھتے
ہوئے بولا۔

بابا صاحب تیزی سے اٹھ بیٹھے جبکہ دروازے پر نماز
سے فارغ ہو کر اندر آئی بی بی وہیں ساکت ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

”تیرا یہ کہنا کہ اے بندے تو ایک قدم بڑھا
میں دس قدم بڑھا کر



اگر کہانی محبت کی ہے

فاطمہ حنان

جمال سے میری پہلی ملاقات روزگار ڈن کی
جھیل کے کنارے نصب اس اکلوتی بیٹیج پر ہوئی تھی۔
گہری آنکھوں اور گھنگرالے بالوں والا جمال جھیل
کنارے بیٹھا، جھیل کے ہی کسی منظر کا حصہ معلوم ہوتا
تھا۔ میری حساس طبیعت نے اس اداس شخص کے
دکھوں کا حصہ بننے کی خواہش کا اظہار کیا اور یوں میری

225 ماہنامہ پاکیزہ - اکتوبر 2015ء

READING
Section

کیا آپ شوگر سے مستقل نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے سخت پریشان ہے۔ کیونکہ شوگر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا اور اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے خاص قسم کا ایک ایسا شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر کے وہ مریض جو آج تک اپنی شوگر سے نجات حاصل نہیں کر سکے وہ ایک بار ہمارا شوگر نجات کورس بھی آزما کر دیکھ لیں۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر اپنی تمام علامات بیان کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوا لیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0300-652606 1

0301-6690383

فون اوقات

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

چند ہی سلاقاتوں نے میرے اس فیصلے کو مزید پختہ کر دیا اور میرے دل نے سالار کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ میں اس دن کے بعد کبھی روزگار ڈن نہیں گئی۔ میں نے اپنی زندگی کے کیوس پر جمال کی تصویر مٹا کر سالار کی تصویر بنادی اور اس میں اپنی پسند کے رنگ بھی بھر دیے اور یوں کچھ عرصے بعد میری سالار سے شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد ہم نے اسی شہر میں اپنا گھر بنایا..... سالار نے اب اپنا بزنس شروع کر دیا تھا اور بہت جلد ان کا شمار شہر کے معروف کاروباری حضرات میں ہونے لگا۔ میں ان کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ ہاں کبھی، کبھی رنگوں، پھولوں اور تیلیوں کو دیکھتی تو ایک آوارہ آرٹسٹ کا خیال آ جاتا..... انہی خیالات میں گم ایک دن نہ چاہتے ہوئے بھی میں روزگار ڈن کی طرف چل دی، میرے قدم بے اختیار ہی روزگار ڈن کی اس جمیل کی طرف بڑھ گئے۔ جمیل کے سامنے والی بیچ خالی تھی..... وہاں پر کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر کھڑی میں خالی آنکھوں کے ساتھ اس بیچ کی طرف دیکھتی رہی کہ اچانک میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک بوڑھا آدمی میرے عقب میں کھڑا تھا۔

”میں جمال کا باپ ہوں، جمال اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ تمہاری شادی کی خبر سن کر اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔“ میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ہاں، اخبار میں تمہاری تصویر اس نے دیکھ لی تھی۔“ اس بوڑھے آدمی کے یہ فقرے سن کر مجھے یوں لگا جیسے میرے منہ پر کسی نے زور سے تھپڑ مارا ہو۔ مجھ میں اب مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔ میں بھاگتی ہوئی پارک سے باہر نکل گئی۔ مجھے لگا کہ اب میں کبھی مسکرا نہیں سکوں گی۔ اب روزگار ڈن کی جمیل کنارے پتھی یہ بیچ صرف جمال کی نہیں بلکہ میرے دکھوں کی کہانی بھی سنائے گی۔



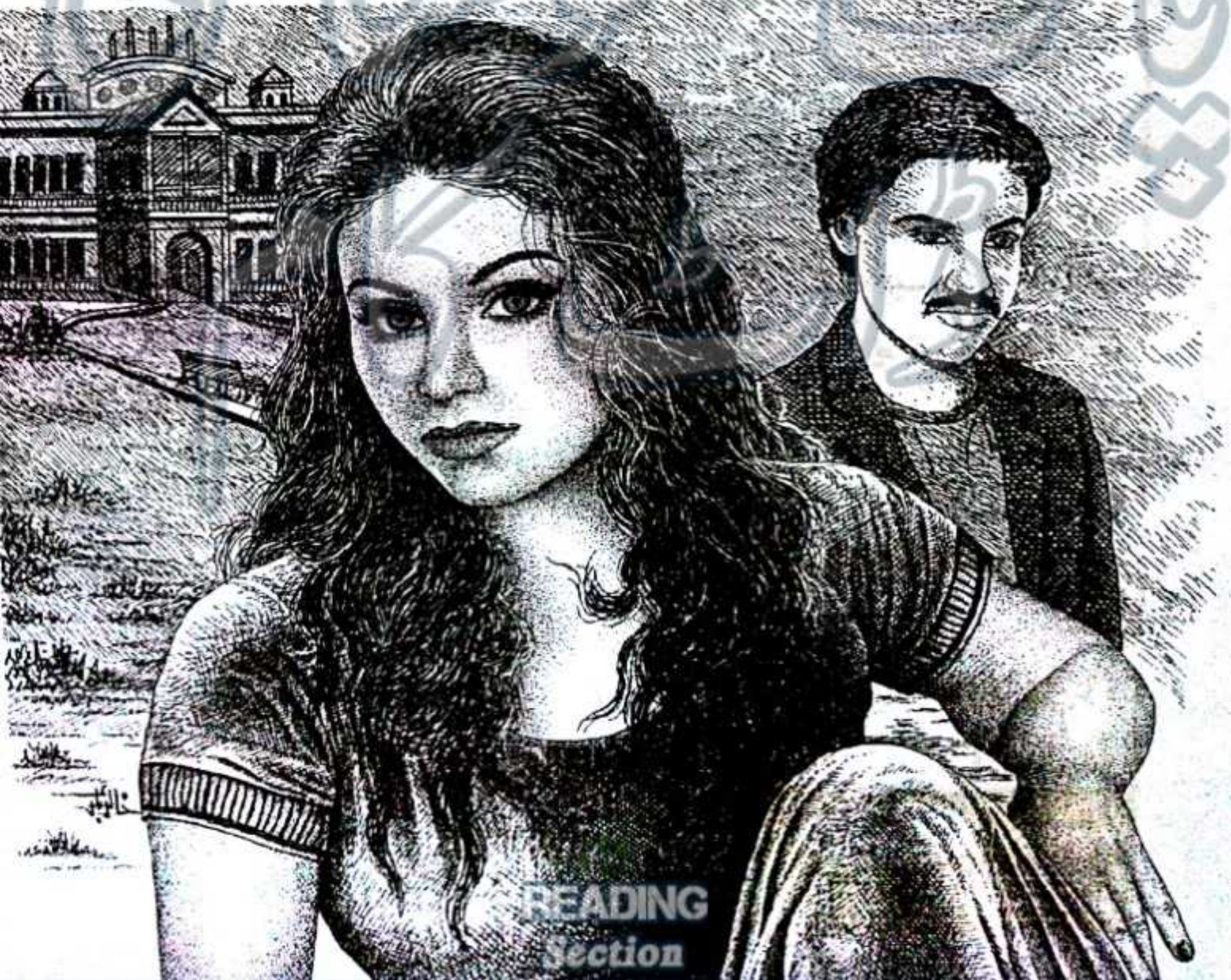
READING
Section

حقیقت

حسباجد

میں فائل پکڑے..... اسے سینے سے لگائے ان پتوں پر
پیر رکھتی..... اداسی کے سر کو محسوس کرتی ہوئی سر جھکا
کر ٹھوڑی فائل پر نکلے چل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد شوں
کی آواز نے ماحول کی خاموشی کو توڑا..... اس کا دایاں
ہاتھ فائل سے آزاد ہوا..... وہ ٹشو سے ناک رگڑتی اور
پھر نرمی سے سوکھے پتوں پر پیر رکھتی ہوئی اداسی کے سر
کو سنتی چلی جاتی۔ اس کے لیے اس شغل میں ایسا مزہ تھا
جیسے کسی بچے کو چاکلیٹ کھانے میں آتا ہے۔

یہ خزاں رُت کا عام سا دن تھا..... فضا میں دھند
برف کی سی صورت لگ رہی تھی..... درخت ٹنڈ ٹنڈ
ننگے کھڑے تھے۔ خزاں منہ کھول کر ہڑپ کر گئی تھی ان
کی ہریالی کو..... یوں لگتے تھے جیسے کوئی بڑھے بابے
ہیں جو تنوں پر ہزار ہا بھریاں لیے کھڑے تھے۔ زرد،
نارنجی سے سوکھے پتے جب پیروں کے نیچے آ کر...
پھر چراتے تو... صوفیہ کو عجیب سا مزہ آتا۔ اسے لگتا تھا کہ یہ
موسیقی ہے۔ اداسی کا کوئی سر ہے..... وہ دونوں ہاتھوں



READING
Section



READING
Section



”شوں.....“ اس نے ناک سکیڑی..... ایک دفعہ پھر سکوت ٹوٹا۔

”جتنی تمہیں ٹپالوجی سے محبت ہے..... آثار تو ایسے ہی نظر آ رہے ہیں..... ورنہ سمجھ لو ایک ”سپلی“ تو پکی.....“ وہ اس کے ہم قدم ہوتے ہوئے بولا۔
 ”فٹے منہ تمہارا معیز.....“ وہ بری طرح سے تپی۔
 ”ہا ہا ہا.....“ معیز نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ وہ اس کے قہقہے پر اور تپی..... اور تیز، تیز قدم اٹھاتے ہوئے جانے لگی۔

”ارے سنو ادھر کہاں جا رہی ہو..... ادھر سے چلتے ہیں ناں..... کالج کے گیٹ سے۔“ معیز نے پیچھے سے آواز دی۔

دراصل اس کا گھر زمیندار کالج کے قریب تھا۔ کالج کے گیٹ سے نکلو تو سڑک پار کر کے یہ سامنے والی گلی میں اور پیر یڈ بھی اسی لیے بنک کیا گیا تھا کہ وہ پھپھو کے گھر جا کر معیز سے تھیورمز سمجھے گی۔

”صوفی.....!“ معیز نے پہلی پکار بے اثر ہوتے دیکھ کر دو بارہ پکارا۔
 وہ رکی..... مگر مڑی نہیں تھی۔

معیز نے تھک کر گہری سانس خارج کی..... دونوں بازو فضا میں بلند کیے اور سر کونفی میں ہلانے ہوئے جاگنگ کرنے کے سے انداز میں بھاگتا ہوا اس تک گیا تھا۔

”کدھر جا رہی ہو؟“
 ”گھر.....“
 ”ہائیں..... اب کیا ہوا؟“ وہ حیران ہوا۔
 ”موڈ خراب کر دیا تم نے.....“ وہ برے موڈ کے ساتھ ہی بولی تھی۔

”اور وہ تھیورمز.....؟“ اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔
 ”پھر سہی.....“ صوفی نے ذرا مغلوط نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر نظریں چراتے ہوئے بھی بولی اور اس کے ساتھ ہی۔ ”شوں.....“

”میری attendance شارٹ ہوئی ناں تو.....!“ معیز نے آنکھیں دکھائیں۔
 ”ک.....“ ناں اتنی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“

معیز اب کی بار اس کی حرکت پر مسکرایا۔ وہ اس کے ساتھ اتنی خموشی سے چل رہا تھا جیسے پہلے وہ بھی کوئی ساکت کھڑا درخت ہو اور بس یوں ہی بے اختیار ہی اس کے ساتھ، ساتھ چلنے لگا تھا۔

اور وہ مجبور تھا اسی ست رفتار سے چلنے پر کہ جس رفتار سے صوفیہ چل رہی تھی۔ وہ تو اپنے مزے میں دھت ہو کر چلتی تھی اور ارد گرد سے مکمل بے پروا ہو کر مگر معیز اس کے مزے کے لیے اس کے ساتھ چلتا تھا اور باوجود اپنی پوری کوشش کے وہ اس اداسی کے سُر کو سننے سے قاصر تھا۔

یہ زمیندار کالج کے ایم اے بلاک کی بیرونی روش تھی جہاں پر درخت آسمان کی بلند یوں کو چھونے کی ناکام کوشش میں مصروف نظر آتے۔ وہ دونوں اپنا topology کا پیر یڈ بنک کر کے آرہے تھے۔

”صوفی پلیز.....“
 اور صوفی کے پیر اس التجائیہ پکار پر یکنخت رک گئے۔ اس نے برا سامنہ بنا کر معیز کو دیکھا۔

”کردیا ناں مزہ خراب.....“ وہ بد مزہ ہو کر بولی تھی اور پھر ایک اور ”شوں.....“
 ”میرا خیال ہے ہم نے ٹپالوجی کا پیر یڈ محض تمہارے مزے کے لیے بنک نہیں کیا۔“

”تو.....؟“ صوفی نے ناک رگڑتے ہوئے کہا۔
 ”ماشاء اللہ کیا تجا بل عارفانہ ہے جناب کا.....“
 ”ہی ہی ہی.....“ وہ اسے چرانے کو کھی کھی کر نے لگی۔ اس کی بچوں جیسی ہنسی پر معیز کی آنکھوں میں مسکراہٹ چمکی مگر وہ چھپا گیا..... انتہائی صفائی سے۔
 ”تم نے تھیورمز سمجھنے ہیں کہ نہیں.....؟“ معیز نے دھمکی سے کام لینا چاہا۔

”اب کیا کن پوائنٹ پر سمجھاؤ گے۔“ اس نے ہنسی سے کہتے ہوئے بیروں کو حرکت دی۔ لاہ لب معمول کی رفتار سے چل رہی تھی۔

READING
Section

230 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015

پرسونی بھی فلورکشن پر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ صوفی کے سامنے ایک چوکور ٹیبل دھری تھی جس کے دوسری طرف معیز بھی فلورکشن لیے بیٹھا تھا۔ ٹیبل پر نوٹس اور کچھ بکھرے صفحات تھے۔ معیز نے بے ساختہ مسکرا کر کافی کاگ اٹھایا اور لا تعلق سا نظر آنے لگا کیونکہ یہ ان دونوں بہنوں کی جنگ تھی۔

”یار حنا..... تم تو ایسے بی ہو کر رہی ہو جیسے ہمارے لیے دیگیں پکا، پکا کر تھک چکی ہو۔“ صوفی نے بھی اپنا گ اٹھا کر اسے چھیڑا۔

”چائے، کافی بنانا بھی بھلا کوئی کام ہے۔“ ہونٹوں سے لگانے سے پہلے اس نے حنا کو تھوڑا اور چھیڑا۔

”تو خود اٹھ کر بنالیا کرو ناں..... مجھے آرڈر کیوں کرتی ہو؟“ حنا کو سخت تپ چڑھی۔ اس نے ابھی تک اپنا کافی کاگ بھی نہیں اٹھایا تھا۔

”میتھ، میتھ، میتھ ہوا بنایا ہوا ہے میتھ کو..... میڈیسن اور انجینئرنگ سے زیادہ مشکل تو نہیں ہے یہ میتھ.....“ وہ تو جلی بھنی بیٹھی ہوئی تھی۔

”بندر کیا جانے اورک کا سواد.....“ صوفی نے پہلے شرارتی نظروں سے معیز کو دیکھا اور پھر جملہ داغا۔ دراصل یہ اس کے آرٹس پڑھنے پر چوٹ تھی۔

”ہا ہا ہا.....“ معیز کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

”معیز بھائی.....“ حنا نے پوری طاقت لگا کر آنکھیں پھیلائی اور پھر حلق کے بل چلائی تھی۔ یوں جیسے کہتی ہو ”آپ بھی.....“ اتنا دکھ تو صوفی کے جملے سے نہیں ہوا..... جتنا معیز کے قہقہے سے ہوا تھا۔

”آپ مجھے بندر سمجھتے ہیں۔“ اسی تپے ہوئے چہرے کے ساتھ پوچھا گیا۔

”نہیں، نہیں..... میں تو تمہیں اورک کے سواد سے نابلد سمجھتا ہوں۔“ معیز نے گڑبڑا کر کہا۔

حنا ذرا ریلیکس نظر آئی مگر یہ صوفی ہی..... ہی ہی..... پہلے وہ اپنی مشہور زمانہ ہنسی، ہنسی..... اور پھر بولی۔

”اور جو اورک کے سواد سے نابلد ہوتا ہے اسے کیا کہتے ہیں معیز.....؟“ ہونٹ دانٹوں تلے دبا کر

ناک رگڑتے ہوئے وہ بولی۔
”تو اتنے مزے لے، لے کر نہیں چلنا تھا ناں ٹھنڈ میں۔“ ذرا سا نرم پڑتے ہوئے اس نے کہا۔

”تم میرے ساتھ گھر چلو..... ادھر جا کر سمجھا دینا۔“ صوفی کے لہجے میں درخواست تھی۔ ”وہاں کون جائے اتنی سردی میں..... اپنے گھر میں تو.....“ معیز نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر وہ چپ ہی رہا۔ وہ جانتا تھا کہ صوفی کے گھر میں سلنڈر پر ہیٹر چلتے تھے..... اور اس کے اپنے گھر تو.....

”چلو.....“ سنجیدگی سے کہہ کر وہ اس کے ساتھ ہولیا تھا۔

☆☆☆

یہ گھر صوفیہ کے دادا کے زمانے کا بنا ہوا تھا۔ گو کہ وقت کے ساتھ، ساتھ اس میں کافی جدت لائی گئی تھی مگر اب بھی دادا کے زمانے کا بنا ہوا آتش دان ڈرائنگ روم میں موجود تھا اور جدت سے ابھی تک بچا ہوا تھا۔

اسی آتش دان میں اس وقت لکڑیوں کے بجائے ایک جدید طرز کا ہیٹر پوری آب و تاب کے ساتھ چل رہا تھا اور یقیناً سلنڈر پر ہی چل رہا تھا گیس تو آنے سے رہی..... حفاظت کے پیش نظر آتش دان کے ساتھ بنی کھڑکی کی جالی میں سوراخ کر کے پائپ اندر لایا گیا تھا..... سلنڈر کھڑکی کے باہر ہی پڑا ہوا تھا۔

اسی ہیٹر کی گرمائش کے سامنے وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ معیز ٹپا لوجی کے تھیورمز سمجھانے میں اور صوفی سمجھنے میں مصروف تھی۔

”بس کرو اب تم دونوں.....“ حنا نے لفظ تم دونوں پر دانت کچکچائے اور پھر بولی۔

”روز پیریڈ بنک کر کے آجاتے ہو اور مت میری ماری جاتی ہے..... کبھی کافی تو کبھی چائے..... کبھی چپس تو کبھی..... شرم نہیں آتی، تم دونوں سے چھوٹی ہوں.....“ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور پھر آخری جملہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر وہ دھب سے فلورکشن پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کے دائیں رخ

دونوں ابرو اچکا کر بے حد شرارتی انداز میں پوچھا گیا۔
 ”بندر.....“ معیز کے منہ سے پھسلا۔

”اور.....!“
 ”باہاہا.....“ صوفی اور معیز نے فلک شگاف قہقہہ

لگایا تھا۔

”آپ دونوں بھی ناں.....“ حنا نے کچا چبا جانے والے انداز میں کہا اور غصے سے واک آؤٹ کرنے لگی تھی کہ.....

”کم آن حنا سیریس نہ ہوا کرو..... جسٹ چل یار.....“ اس نے حنا کو کھائی سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے نیچے دوبارہ فلور کشن پر بٹھا دیا تھا۔
 ”چلو اپنی کافی ختم کرو۔“ اب وہ بے حد پیار سے کہہ رہا تھا۔

سر جھکا کر اس نے کافی کاگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ معیز ایک دفعہ پھر سے صوفی کو تھیوورمز سمجھانے لگا تھا۔ لیفٹ بینڈ سے فولڈر میں لگے صفحات پر لکھ رہا تھا اور سیدھے ہاتھ سے کافی پی رہا تھا سردی تھی مگر حسب عادت کف فولڈ کر رکھے تھے۔ صوفی دونوں ہاتھوں سے مگ پکڑے مسلسل سر ہلا رہی تھی اور حنا نے سر اٹھا کر معیز کو دیکھا..... اور پھر نظریں جھکا کر کافی پینے لگی تھی۔

☆☆☆

اتنی گہری وسیع کائنات میں

میں ہوں ایک نقطہ ذرا سا

لیکن یہ کہ.....

میں ہوں.....

اور میں اپنے ہونے سے

آگاہ ہوں.....

اور وہ تھا..... وہ واقعی اپنے ہونے سے آگاہ تھا۔ وہ گدڑی میں چھپا لعل تھا۔ وہ..... وہ کوئلہ تھا جسے ہیرا بننے میں سو سال لگنے تھے لیکن بنا اسے ہیرا ہی تھا..... وہ جانتا تھا ایک دن آئے گا کہ وہ اپنی زندگی کو اسی مقام پر دیکھے گا جہاں پر وہ اسے دیکھنا چاہتا ہے..... وہ جانتا تھا کہ کامیابیاں اس کی راہ ہکتی ہیں، وہ

منتظر ہیں اس کے قدموں کی اور اس کے قدموں کو چومنے کے لیے وہ بے تاب ہیں..... وہ جانتا تھا کہ خوش قسمتی کا تاج اس کے سر پر سجے گا اور ضرور سجے گا وہ محنت کرنے والوں کے قبیلے سے تھا۔

وہ ان پرندوں میں سے تھا جو کہ صحیح وقت پر صحیح اڑان بھرتے ہیں اور شکار کو دیوبچ لیتے ہیں۔ اسے اندازہ تھا بلکہ یقین تھا کہ اس کی طاقت اس کا ذہن ہے۔ اس کی صلاحیت، ذہانت ہے اور ذہانت کے آگے سب کچھ مات ہے.....

وہ تھا معیز بھٹی جو ایک عام سے اسکول ٹیچر کا بیٹا تھا۔ زمیندار کالج کے لیے اس کا نام نیا نہیں تھا۔ اس نے بی ایس سی میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ وہ میٹھ کا ماہر جانا جاتا تھا۔ میٹھ اس کا رومینس تھا۔ بی ایس سی میں کلاس کے تمام طلبا نے calculus کی وہ کتاب پڑھی تھی جو کہ s.m. yousuf نے لکھی تھی مگر اس نے وہ بھی پڑھی تھی جو thomas finney نے لکھی تھی۔ اس کے لیے ٹیچرز کا دماغ الگ سے کھایا اور اپنا الگ سے خراب کیا۔ وہ واحد اسٹوڈنٹ تھا کلاس کا جس نے نہ صرف وہ کتاب نیٹ سے ڈاؤن لوڈ کی بلکہ اس کے (حسابی سوالات) sums کے solutions (حل) بھی ڈاؤن لوڈ کیے تھے۔ وہ لاہور جا کر پنجاب یونیورسٹی سے نوٹس لایا کرتا تھا۔ اور پھر اپنا اور ٹیچر کا دماغ کھپایا کرتا تھا۔ اس کا خواب پی ایچ ڈی کرنے کا تھا۔ اسے اگرچہ اپنے باپ کی طرح ہی تعلیم کے شعبے سے وابستہ ہونے کا شوق تھا لیکن فرق تھا تو یہ کہ اسے کوئی عام سا اسکول ٹیچر نہیں بننا تھا..... وہ کسی اعلیٰ یونیورسٹی کا پروفیسر بن کر ریٹائرڈ ہونا چاہتا تھا۔

اور یہ کڑی محنت کا کام تھا اور جب محنت جمع ذہانت تو قسمت کو کوئی عذر نہیں کہ وہ آکر گلے نہ ملے..... اس کا مستقبل شاندار تھا، وہ جانتا تھا کیونکہ وہ اپنے ہونے سے آگاہ تھا۔

☆☆☆

READING
Section

232 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

دیکھنے لگی۔ چلتا ہاتھ رک گیا تھا۔ معیز کی سر توڑ محنت کا گواہ اس سے بڑھ کر کون تھا۔ اس کی زندگی اس طرح تھی جیسے پانی اپنی پوری طاقت سے ایک طرف کو بہتا ہو اور اسے بہاؤ کے الٹ چلنا ہو..... مکمل مزاحمت کے ساتھ..... زندگی..... زندگی نہ تھی یہ مکمل مزاحمت کا نام تھی..... حالات کے خلاف کی جانی والی سر توڑ مزاحمت..... صوفی نے اپنا دل دکھ سے بھرتے دیکھا۔

”ایسا کیوں ہوا بابا..... دادا اپنے وقت میں اٹلی گئے تھے۔ ہم خوشحال ہیں تو پھپھو کیوں نہیں..... ان کی شادی بھی کسی اچھے گھر میں کی ہوتی.....“ حنا نے دل گرفتگی سے کہا۔

شام کی چائے کا وقت تھا..... صوفی ابھی تک اپنی جگہ پہ اسی طرح بیٹھی تھی اور اب وہ معیز کے سمجھائے ہوئے تھیورمز کو ڈہرا رہی تھی۔ معیز جا چکا تھا۔ اس کا سیدھا ہاتھ مسلسل اور تیزی سے چل رہا تھا۔ جسے وہ روک کر چائے کے کپ سے ایک گھونٹ بھرتی اور پھر سے لکھنے میں مشغول ہو جاتی۔

”بابا..... کسی دن پھپھو کے گھر چلیں۔“ چائے پیتے ہوئے یک دم حنا نے باپ سے کہا جو وہیں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

”رہنے دو..... وہاں گیس تو ہوگی نہیں..... ایسے ہی ٹھہرتے رہیں گے وہاں جا کر.....“ صوفی نے مصروف سے انداز میں کہا تھا۔

”اب اس کا کیا مطلب..... کہ سردی میں کہیں جایا ہی نہیں جائے..... یونیورسٹی بھی ہیٹر ساتھ لے جایا کرو.....“ حنا برامان کر بولی۔

”جانے کو دل تو بہت کرتا ہے مگر ساجدہ خاطر داری میں اتنا اہتمام کر لیتی ہے کہ بندہ خود شرمندہ ہو جائے۔ ان کے حالات کا تو تمہیں معلوم ہی ہے۔“ حنا جانتی تھی کہ اماں بالکل صحیح بات کہہ رہی ہیں۔ وہ چپ سی ہو گئی۔

”کسی بہانے سے ساجدہ کو کچھ دینا بھی چاہو تو نہیں لیتی..... بڑی ہی غیرت مند ہے اور بیٹا اس سے بھی دو ہاتھ آگے.....“ صوفی جو ادھر سے کھانا کھا کر گیا ہو۔ دیکھو اب بھی کیسے چلا گیا۔“ ریحانہ قدرے ملال سے بول رہی تھیں۔

”ایک ہی گھر میں پلے بڑھے..... ایک ہی پلیٹ میں کھایا..... مگر نصیب ہے ناں لیکر کھینچ کر رکھ دی ہے اس نے بہن بھائیوں میں، وہ غریب اور ہم اللہ کا فضل ہے۔ کس کا کب زور چلا نصیبوں کے آگے..... بچہ بھی دیکھو اتنی محنت کر رہا ہے، دکھ ہوتا ہے دیکھ کر.....“ شجاع صاحب نے مغموم ہو کر کہا۔

صوفی نے نظریں اٹھا کر حنا کو دیکھا اور پھر ایک دم اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ رخ بدل کر چلتے ہیٹر کو

تھی۔ اور اب وہ بھالو، بھالوسی دکھ رہی تھی۔ اسی دوران باہر سے گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو اس نے جلدی، جلدی اپنا بیگ اور فولڈر اٹھایا اس طرح کی سردی میں کمرے سے باہر نکلنا ایسا ہی تھا جیسا کہ محاذ جنگ پر جانا ہو..... اور صوفی کی تیاری کو دیکھ کر لگتا تھا کہ تعیناتی سیاجن پر ہوئی ہے اور آج ہی ہوئی ہے۔

محن میں نکلنے کے بعد اس نے چند لمحے کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر دیکھا کہ بھلا سردی لگتی ہے یا نہیں اور بالفرض سردی لگے تو مزید کچھ پہنا جاسکتا ہے یا نہیں.....

”کبخت ابھی نہیں لگ رہی اور یونیورسٹی میں جاتے ہی پچھڑی سہیلی کی طرح آگے ملتی ہے۔“ یقیناً سردی کو ہی کو سا گیا تھا۔

”پاں..... پاں.....“ زوردار ہارن کی آواز تھی۔

”آئی بابا.....“ وہ پہلے چلائی اور پھر باہر کو بھاگی۔ بابا پہلے ہی گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

☆☆☆

مصروفیت کی وجہ سے آج بابا اسے بیرونی گیٹ پر ہی اتار گئے تھے ورنہ تو اندر داخل پوائنٹ تک چھوڑ کر آتے تھے۔ وہ قائل کو سینے سے لگائے، دونوں ہاتھ بگلوں میں دا بے درمیانی رفتار... سے چل رہی تھی۔ سامنے ہی اسکول کی عمارت تھی جہاں پر اس وقت ہو کا عالم تھا۔ اسکول جلدی اشارٹ ہوتا تھا جبکہ یونیورسٹی کی ٹائمنگ سیٹ تھی۔ اس کے دائیں رخ پر روش سے ذرا نیچے کھیل کا میدان تھا۔ جہاں پہ اتنی دھند کے باوجود کالج کے لڑکے کھیل رہے تھے۔

اس نے ایک اچھتی سی نظر ان پر ڈالی اور پھر سر جھکا کر چلنے لگی۔ جیسے ہی وہ مڑ کر ایم، اے پلاک والی روش کی طرف چلنے لگی تو اسے سامنے سے معیز آتا دکھائی دیا تھا۔ وہ چند منٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ اسے آتا دیکھ کر رک گئی۔

وہ بھی اسی کی طرح فولڈر کو سینے سے لگائے اپر کا ڈسر پر گرا بے دونوں ہاتھ بگلوں میں دبائے چلا

نہیں ہوئی تھی کہ اماں نے اس کی شادی اپنے چچا کے بیٹے سے کر دی جو خاندان کا واحد پڑھا لکھا فرد تھا۔ اور وہ اکیلا مرد تھا جو ملازمت کرتا تھا سرکاری اسکول ٹیچر تھا۔ بعد میں اباجی نے مجھے اٹلی بلا لیا اور خود واپس آگئے۔ تو بس حالات وہیں سے بدلنا شروع ہوئے جب میں باہر چلا گیا تھا۔ معیز دو ماہ کا تھا جب اباجی فوت ہوئے..... وہ جیسے اپنا نو اسادیکھنے کو ہی زندہ تھے بس.....“ شجاع بھٹی نے اک آہ بھر کر بات ختم کی تھی۔

”بابا پھر تو اس گھر میں پھپھو کا بھی حصہ ہوا نا.....“ صوفی یک دم بولی تھی۔

انہوں نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

”اللہ بخشے اباجی اپنی زندگی میں ہی حصے کے برابر رقم ساجدہ کو دے گئے تھے۔ اس رقم سے ہی تو ساجدہ نے ابھی والا مکان خریدا ہے جس میں وہ لوگ رہتے ہیں۔“ صوفی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر یک دم اذاتوں کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ اس نے ہونٹ بچھینچ کر شانوں پر پھیلے دوپٹے کا ایک پلو سر پر ڈال لیا۔

☆☆☆

آج اس کا دل یک دم یونیورسٹی سے چھٹی کرنے کو چاہا مگر آج سرعنائیت کا لیکچر تھا جو وہ مس کرنا فورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

سارے لیکچرز میں سے ایک سرعنائیت کی ہی تو سمجھ آتی تھی اسے اسی بنا پر groups اس کا فورٹ سبجیکٹ تھا۔

”کیا مصیبت ہے یار..... صرف ایک لیکچر کے لیے اتنی سردی میں یونیورسٹی جاؤ۔“ بے ساختہ جھنجلا کر وہ واٹس روم کی طرف بڑھی۔

گھٹنوں تک آتی براؤن رنگ کی قمیص کے اوپر اس نے اونی سوٹر پہنا..... پھر فروالا کالے رنگ کا کوٹ چڑھایا۔ سر پر ٹوپی پہنی اور اس اونی ٹوپی کے اوپر اس نے کالے رنگ کا اسٹول پیٹ لیا تھا کہ ٹوپی چھپ گئی تھی بیروں پہ دو، دو موزے چڑھانے کے بعد جاگرز پہنے اور آخر میں پھر بلیک کلر کے گلوں کی باری آئی

READING
Section

234 ماہنامہ پاکیزہ اکتوبر 2015ء

☆☆☆

ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی وہ دونوں میں کون اور تو کون کی تفسیر ہو جایا کرتے تھے۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ صوفی اور وہ آگے پیچھے کلاس میں داخل ہوئے تھے۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی لڑکوں کے لیے مخصوص کرسیوں کی لائن تھی درمیان میں گزرنے کا راستہ اور دوسری طرف لڑکیوں کے لیے کرسیوں کی لائن..... معین تو داخل ہوتے ہی پہلی کرسی پر جا بیٹھا تھا۔ صوفی بھی خموشی سے لڑکیوں والی لائن میں چلی گئی تھی۔ ابھی لیکچر شروع ہونے میں کچھ دقت تھا۔ سر ابھی تک نہیں آئے تھے۔ لڑکوں کی فلک شکاف آوازیں اور لڑکیوں کی ہنسنابٹ کلاس میں پھیلی ہوئی تھی۔

صوفی نے جگہ سنبھالنے کے بعد فائل کو کرسی کے ہتھے پر رکھا۔ بیگ کندھے سے اتار کر گود میں رکھا اور اس میں سے سیل فون نکال کر معین کو میسج کرنے لگی تھی۔

”سر عنایت کا لیکچر ختم ہوتے ہی اٹھ جانا۔“ معین نے سوالیہ نشان بھیجا۔ جواباً غصے والی اسمائل گئی تھی اور آگے سے جواب آیا۔ اوکے..... ایک عدد اسمائل کے ساتھ۔

☆☆☆

”معین..... دو قسم کی سبزی لے لو..... میں سالن بنا کر رکھ جاؤں گی۔“ لیکچر ختم ہوتے ہی وہ دونوں باہر نکل آئے تھے اور اب... صوفی پھوپکا ہوا کرنے جا رہی تھی۔

”سبزیاں تو لے لوں..... مگر بناؤ گی کس پر..... گیس تو ہوگی نہیں.....“ فولڈر بغل میں دبا کر وہ والٹ نکالنے لگا تھا کہ اچانک رک کر بولا۔

”اسی پر بناؤں گی جس پر پھوپکا ہوا ہے۔“ وہ کچھ تنک کر بولی تھی۔

”یو مین لکڑیاں.....؟“ وہ بیک پاٹ سے والٹ نکالتے نکالتے اسے رک کر دیکھنے لگا۔

جواباً وہ اسے گھوری ڈال کر آگے بڑھ گئی تھی۔

”تم چلو..... میں سبزی لے کر آتا ہوں۔“ پیچھے

235 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

READING
Section

آ رہا تھا۔

”السلام علیکم.....“ اسے دیکھتے ہی معین نے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام.....“

”آج بڑی ٹھنڈ ہے یار.....“ وہ رکے بنا بولا۔ صوفی بھی اب ساتھ، ساتھ چل رہی تھی۔ معین نے بغلوں میں سے ہاتھ نکالے فولڈر کو بغل میں دبایا اور دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر منہ کی گرم بھاپ سے گرمانے کی کوشش کرنے لگا۔ صوفی نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”ٹیوشن پڑھا کر آئے ہو؟“

”نہیں، آج نہیں گیا۔“

”کیوں.....؟“

”امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”کیا.....؟ کیا ہوا پھوپکو.....؟“ صوفی کے قدم

یکلخت رکے تھے۔

معین کو بھی رکنا پڑا۔

”ٹھنڈ لگ گئی..... جس کی وجہ سے رات میں

واہنگ ہوتی رہی۔“

”اور تم چھوڑ کر آ گئے۔“ اس نے افسوس کے

سے انداز میں کہا۔ ایسا افسوس کا انداز جس سے اگلے بندے کو شرمندگی دلائی گئی ہو۔

”سر عنایت کا لیکچر.....“ معین نے مجبوری بیان کی۔

اور صوفی ٹھنڈ میں کچھ اور ٹھنڈی پڑی تھی۔ ایک

گہری سانس بھر کر پھر سے چلنے لگی۔

”تو پھر تم ناشتا تو نہیں کر کے آئے ہو گے؟“

اس نے پوچھا۔

”نہیں، چائے ہر سک کھا کر آیا ہوں۔“ معین بولا۔

صوفی نے اس جواب پر سر جھٹکا تھا۔ بڑا اعلیٰ

ناشتا تھا۔

”اب کیسی ہیں پھوپو.....؟“

”بس ٹھیک ہی ہیں۔“ یہ ہی باتیں کرتے ہوئے

وہ مطلوبہ بلاک تک پہنچ گئے تھے۔

www.Paksociety.com سے آواز دے کر معین نے کہا تھا۔ اس کی اس بات پر صوفی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا مگر معین دھندلا سا گیا تھا۔

پھر صوفی تو کالج گیٹ سے نکل کر سڑک کر اس کے سامنے گلی میں چلی گئی تھی جبکہ معین سبزی والے کو دیکھنے لگا تھا۔

☆☆☆

”پھپھو کی طبیعت خراب ہے، میں ان کے پاس جا رہی ہوں آپ لوگ بھی آجائیں۔“ میسج پڑھتے ہی حنا یک دم پریشان ہو گئی تھی۔

”ای..... صوفی کا میسج آیا ہے کہ پھپھو ٹھیک نہیں ہیں۔“

حنا کچن میں سے بولتی ہوئی نکلی تھی۔

”یا اللہ خیر..... کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟“

”اب یہ تو جا کر ہی معلوم ہوگا۔“ حنا نے لاعلمی سے کندھے اچکائے۔

”اے ابو کو فون کرو اور کہو کہ گاڑی بھیج دیں۔“

اتنے میں تم بھی تیاری کر لو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔

☆☆☆

یہ ایک چار منزلہ مکان تھا جس میں داخل ہوتے ہی صحن تھا۔ صحن عبور کر کے برآمدہ اور برآمدے کے پار بنے دو کمرے..... ایک طرف چھوٹا سا کچن بنا ہوا تھا جو امریکن اسٹائل کا نہیں تھا۔ پھپھو چوکی پر بیٹھ کر کھانا پکاتی تھیں۔

صوفی کو ایک تو بیٹھ کر پکانے میں مشکل پیش آرہی تھی اور دوسرا بڑا مسئلہ لکڑیاں..... پھپھو کے پاس لکڑیوں پر کھانا بنانے والا لوہے کا چولہا تھا جس نے آج کل کیس والے چولہے کی جگہ سنبھالی ہوئی تھی۔

معین اور وہ دونوں ہی اپنی پوری کوشش کر چکے تھے..... لکڑیاں سلگتیں، دھواں چھوڑتیں..... صوفی کی آنکھوں کو پانی سے بھر میں لیکن آگ نہیں بھڑک رہی تھی۔

”اللہ..... پھپھو کیسے جلا لیتی ہیں؟“ صوفی نے شوں کرتے ہوئے ہاتھ کی پشت سے گالوں پر بہنے والا پانی صاف کیا..... اور ایک دفعہ پھر سے جھک کر سلگتی لکڑیوں کو پھونک مارنے لگی تھی۔

وہ اب صاف زچ نظر آرہی تھی۔

”چھوڑو رہنے دو، میں باہر سے لے آتا ہوں کچھ.....“

وہ صوفی نے اپنے ہاتھ کی پشت سے گالوں پر بہنے والا پانی صاف کیا..... اور ایک دفعہ پھر سے جھک کر سلگتی لکڑیوں کو پھونک مارنے لگی تھی۔

وہ اب صاف زچ نظر آرہی تھی۔

”چھوڑو رہنے دو، میں باہر سے لے آتا ہوں کچھ.....“

وہ صوفی نے اپنے ہاتھ کی پشت سے گالوں پر بہنے والا پانی صاف کیا..... اور ایک دفعہ پھر سے جھک کر سلگتی لکڑیوں کو پھونک مارنے لگی تھی۔

وہ اب صاف زچ نظر آرہی تھی۔

”چھوڑو رہنے دو، میں باہر سے لے آتا ہوں کچھ.....“

وہ صوفی نے اپنے ہاتھ کی پشت سے گالوں پر بہنے والا پانی صاف کیا..... اور ایک دفعہ پھر سے جھک کر سلگتی لکڑیوں کو پھونک مارنے لگی تھی۔

وہ اب صاف زچ نظر آرہی تھی۔

”چھوڑو رہنے دو، میں باہر سے لے آتا ہوں کچھ.....“

وہ صوفی نے اپنے ہاتھ کی پشت سے گالوں پر بہنے والا پانی صاف کیا..... اور ایک دفعہ پھر سے جھک کر سلگتی لکڑیوں کو پھونک مارنے لگی تھی۔

وہ اب صاف زچ نظر آرہی تھی۔

اس کی اس بات پر صوفی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا مگر معین دھندلا سا گیا تھا۔

اس نے آنکھیں میچ کر سارا پانی آنکھوں سے باہر نکالا پھر ہاتھوں کی پشت سے گالوں کو صاف کیا۔ معین کی شکل اب واضح ہو گئی تھی۔

”تم دیکھنا میں آگ بھڑکا کر ہی چھوڑوں گی۔“ اک عزم سے دانت پیس کر کہتے ہوئے وہ پھر سے پھونک مارنے کو جھکی۔

جبکہ معین..... وہ اس جملے کا جواب دینا چاہتا تھا.....

بھر پور طریقے سے دینا چاہتا تھا مگر..... ہا..... یہ مصلحتیں۔

اس نے سر جھکا کر اپنی شدید مسکراہٹ چھپائی۔

اسی دوران ایک دم ڈورنیل گونجی تھی۔

”ای آگئیں۔“ صوفی مڑ جوش ہو کر اٹھی تھی۔

جوش اس لیے کہ اب امی آگ جلائیں گی اور وہ ہی کھانا بنائیں گی۔ اس سے تو یہ کام ہونے سے رہا۔

”تم نے ان لوگوں کو ڈسٹرب کیا؟“ معین از حد شاک سے بولا تھا۔

صوفی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی بات اڑائی تھی اور باہر دروازہ کھولنے کو بھاگی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک پرانی طرز کا نواڑی پلنگ تھا جس پر پھپھو تکیے کے سہارے لحاف اوڑھے نیم دراز تھیں۔ اب حالت کافی سنبھل چکی تھی۔ بخار تھا مگر شدت کم تھی۔

کمرے ہ دروازہ شدید سردی کی بنا پر بند تھا۔ صوفی پھپھو کے پیروں کی طرف لحاف میں دیکھی ہوئی تھی۔

البتہ ریحانہ اور حنا کرسیوں پر ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ابا اور ظفر پھوپھا دوسرے کمرے میں موجود تھے۔ ریحانہ نے آکر نہ صرف کھانا بنایا تھا بلکہ اب انہی کی بدولت وہ اس ٹھنڈ میں چائے کی عیاشی بھی اڑا رہے تھے۔

معین نے پاؤں کی ٹھوک سے دروازہ کھولا کیونکہ اس کے دونوں ہاتھوں میں دیکتے ہوئے کونکوں کی انگیٹھی تھی جو اس نے لا کر کمرے کے وسط میں رکھی تھی۔

وہ صوفی تھی جو سب سے پہلے چھلانگ مار کر بستر

READING
Section

236 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

حقیقت

”کوئی نئی اطلاع دو بیٹا..... یہ تو خبر پرانی ہو چکی۔“
ریحانہ نے شگفتگی سے جواب دیا۔

”ام..... ی ی.....“ صوفی نے بے حد برامانا۔
ریحانہ اور معین کھل کر ہنسے تھے..... جبکہ
حنانہ..... کتنی شعوری کوشش کی تھی اس نے کہ وہ معین کی
طرف نہ دیکھے..... تب بھی جب وہ دونوں آمنے
سامنے بیٹھ کر بول رہے تھے اور اب بھی جبکہ وہ عین اس
کے سامنے آ کر بیٹھا تھا مگر یہ کہ محبت میں شعوری کوشش
کا کیا کام..... محبت کو شعوری کام ہی جتتے ہیں۔

جیسے ابھی ابھی ہوا تھا..... اس نے بے ساختہ
چائے کے کپ پر مرکوز آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور
پھر فوراً نظریں چائے پر جمی گہرے براؤن رنگ کی تہ پر
جمادی تھیں۔

جس راہ نہیں جانا..... اس کے کوس گننے کا بھلا کیا
فائدہ..... چھوڑو..... دفع کرو..... مٹی ڈالو..... کیا
فائدہ ہاں..... بھلا کیا فائدہ.....

☆☆☆

صبح تک صوفی کا فلوزور پکڑ چکا تھا اس لیے وہ
ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ کچھ رات کو پھپھو کے گھر سے
واپسی بھی کافی دیر سے ہوئی تھی۔

امی نے صبح حنا اور اپنی کام والی بوا کو ابانے کے ساتھ پھپھو
کے گھر بھیج دیا تھا۔ انہوں نے پھپھو کے گھر کی ابتر حالت کل
دیکھی لی تھی سوان کی مدد کی غرض سے انہیں بھیج دیا تھا۔

آج سورج زمین والوں کو منہ دکھانے پر راضی
ہو ہی گیا تھا گو کہ اس کی شعاعیں اب بھی دھند کی سی
تھیں۔ مگر درجہ حرارت میں نمایاں بہتری آگئی تھی۔

حنانے آ کر سارا گھر صاف کروایا تھا۔ بوانے
کھانا پکانے میں بھی مدد کی تھی۔ اور اب حنا چائے کا
کپ پکڑے پھپھو سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے ہی معین آیا۔ بیرونی
دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے سے اس نے جانا
تھا..... آنے والا وہ ہی تھا کیونکہ پھوپا تو اپنے کمرے
میں ہی تھے جنہیں وہ ابھی ابھی چائے دے کر آئی تھی۔

سے نکلی تھی اس سے پہلے احتیاطاً خالی کپ سر کے عین
اوپر بنی شیلف پر رکھا تھا۔

ویسی ہی شیلف یا کارنیز جو پرانے زمانے میں
کمروں میں ضرور بنایا جاتا تھا۔

”جیتے رہو معین.....“ گھٹھڑی بن کر انگیٹھی کے
پاس بیٹھتے ہوئے وہ بولی تھی۔

معین ہنس پڑا اور اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ کر ہاتھ
تاپنے لگا۔ صوفی کی آنکھوں میں ابھی تک پانی آرہا تھا۔

”ابھی کیسے جلسیں... یہ لکڑیاں.....؟“ اس نے پوچھا۔
”ابانے جلا کر دی ہیں۔“ اس نے مسکراتے

ہوئے جواب دیا۔

”صبح یونیورسٹی آؤ گی؟“

”نہیں.....“ اس نے ٹٹو سے ناک رگڑتے
ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ”بہت سردی ہے۔“ اور پھر بھیگی

آنکھیں صاف کی تھیں۔ فلوزور پکڑ رہا تھا۔
”یہ دیکھتے ہوئے کتنے خوب صورت لگ رہے

ہیں ناں.....“

اس نے اچانک معین سے کہا تھا۔

وہ جو ہاتھ گرم کر کے اٹھ رہا تھا اس کی اس بات
پر ٹھہر گیا۔

”نزی پاگل ہو تم..... اللہ جانے کیسی، کیسی
چیزوں میں خوب صورتی تلاش کر کے لے آتی ہو.....“

اداسی کا سُر..... دیکتے انگارے..... خوب صورت
بے وقوف.....“ وہ بولتے، بولتے اٹھ کر اماں کی

پائنتی کی طرف جا بیٹھا تھا۔
اماں کے پاؤں دبانے کی خاطر وہ اپنے ٹھنڈے

.... ہاتھ گرم کر رہا تھا۔
صوفی نے رخ بدل کر اسے منہ چڑایا تھا۔

وہ سر جھٹک کر مسکرایا تھا بولا۔
”مامی، آپ کی بڑی والی بیٹی پاگل ہے۔“ اس

نے اب امی کے پیروں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے
ریحانہ کو مخاطب کیا تھا جو کہ اس کی امی سے باتیں
کر رہی تھیں۔

READING
Section

دن اس تیزی سے گزر رہے تھے گویا چوبیس نہیں چار گھنٹے ہوں ابھی کل کی ہی تو بات تھی کہ اس کا پارٹ ون کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ اسے کسی اور چیز کا ڈر نہیں تھا بس ٹپالوجی کی فکر تھی۔ کہیں ٹپالوجی اسے شرمندہ نہ کروادے۔

یا پھر کہیں پورے رزلٹ کو ہی خراب نہ کر دے مگر یہ کہ وہ پاس ہوگئی تھی وہ بھی ستر فیصد اسکور کے ساتھ اور آج پارٹ ٹو کا بھی رزلٹ آؤٹ ہو چکا تھا۔

اس کی ہائی فرسٹ ڈویژن تھی جبکہ معزز..... میتھس اس کا رومینس تھا ناں تو یہ رومینس کے ساتھ نانصافی ہوتی اگر وہ ٹاپ نہ کرتا۔ اسی خوشی میں پھوپھو اور پھوپا مٹھائی لے کر ان کے گھر آئے ہوئے تھے۔

گرمی کے دن تھے اور وہ سب چار پائیاں چھت پر ڈالے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ موسم خوشگوار تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہی آندھی چلی تھی سوا ب ہوا فرائے بھرتی چل رہی تھی۔

آمنے سامنے پچھی چار پائیوں کے درمیان رکھی میز پر چائے مع لوازما ت کے موجود تھی۔ صوفی سب کو چائے سرو کر رہی تھی۔

اس نے چائے کا کپ لا کر معزز کو دیا جو کہ منڈیر پر چڑھ کر بیٹھ ہوا تھا۔ پھر وہ واپس مڑی اور اب سمو سے، بسکٹ، گلاب جامن سے بھری پلیٹ اور اپنے لیے چائے کا کپ بھی ہاتھ میں تھا۔ پلیٹ لا کر اس نے معزز کے پاس منڈیر پر ہی رکھی تھی۔

”حنا..... تم بھی ادھر آ جاؤ.....“ اس نے آواز دے کر حنا کو بھی بلایا۔

”آتی ہوں.....“ مصروف سے انداز میں جواب آیا مگر درحقیقت ٹالا گیا تھا۔

”اب کیا کرو گے؟“ اس نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی کہ چائے کے ساتھ کچھ واٹے بھی کھائے۔

”ظاہر ہے کہیں جاب کے لیے اپلائی کروں گا۔“

لا شعوری طور پر کپ پہ اس کی گرفت سخت ہوئی تھی۔ جیسے، جیسے قدموں کی چاپ دروازے کے قریب سے قریب تر ہو رہی تھی ویسے، ویسے اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

دروازہ کھلا..... ”السلام علیکم.....“ معزز کے اندر قدم رکھنے سے پہلے اس کی آواز آئی اور پھر وہ بھی آگیا۔ وہ ٹیوشن پڑھا کر آ رہا تھا۔

حنا نے زیر لب سلام کا جواب دیا مگر مڑ کر نہ دیکھا..... وہ اس کے بائیں رخ پر موجود تھا۔

”اوائے تم.....“ معزز کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس نے مڑ کر معزز کو دیکھا اور ایک خیر سگالی مسکراہٹ اچھالی اور پھر فوراً رخ بدل کر سر جھکا لیا۔

”تم کب آئیں؟“ وہ اماں سے سر پر پیار لینے کی خاطر اس سے چند فٹ کے فاصلے پر آ کر جھکا اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

”صبح سے آئی ہوئی ہے بچی.....“ اس کے بجائے پھوپھو نے تفصیلات بتائیں۔

”کھانا؟“ اس نے ہموار لہجے میں پوچھا۔ اور یہ ہموار لہجہ کتنی دقتوں سے ہموار ہوا تھا..... یہ حنا کا اللہ ہی جانتا تھا۔

معزز نے سر کے اشارے سے ہاں میں جواب دیا تھا۔ وہ اپنے جو گرز اتارنے میں مصروف تھا اور وہ تیز، تیز قدموں سے چلتی باہر نکل آئی۔

باہر آ کر اس نے گہری سانس لی..... حلق سے کچھ نیچے اتارا اور کچن کی طرف مڑ گئی۔

لیکن کچن میں جانے سے پہلے ایک اور کام کیا تھا..... بابا کو کال کرنے کا۔

”بابا..... آ کے مجھے لیس جائیں۔“ اس نے اپنی آواز کو دھیمار کھا تھا مگر اسے اپنا لہجہ بھیگا، بھیگا سا لگا۔

محبت کے مندرجات میں دکھ سب سے پہلے درج ہوتا ہے۔ بیچ کر رہنا..... اس سے کہ یہ سب سے پہلے دکھ کے مفہوم سے ہی آگاہی بخشتی ہے۔

☆☆☆

حقیقت

تھی۔ سموسہ بھی دونوں نے مل کر آدھا، آدھا کھایا تھا۔

☆☆☆

”شادی نہیں کرنی۔“

اور اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے معیز کی آنکھوں کے تاثر کو جھٹکنا چاہا تھا مگر اس کی آنکھوں کی شوخیاں..... وہ صوفی کو کھائے جا رہی تھیں۔ وہ منڈیر سے لگ کر کھڑی تھی..... مگر منظر اب بدل چکا۔ وہ لوگ واپس جا چکے تھے۔ چار پائیاں بھی اٹھادی گئی تھیں۔ حنا خالی برتن نیچے لے جا چکی تھی اور جب وہ منڈیر پر رکھی پلیٹ اٹھانے آئی تو.....

”یہ رہنے دو.....“ صوفی نے منع کر دیا تھا۔

پلیٹ میں ابھی تک آدھا گلاب جامن جوں کا توں پڑا تھا۔ صوفی اٹھانے کی ہمت ہی نہیں کر پائی تھی۔ معیز اگرچہ اس کا بچپن کا دوست تھا اور کزن تھا پر اتنی تک وہ دونوں ساتھ، ساتھ پڑھے تھے اور اب یونیورسٹی میں پھر سے اکٹھے ہو گئے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا جیسا آج ہوا..... اس کی آنکھوں کا تاثر..... وہ بھونچکا رہ گئی تھی۔ اس نے کبھی ایسے..... اس طرح سے اس حوالے سے معیز کے لیے نہیں سوچا تھا۔ وہ دوست تھا، بے تکلفی تھی..... مگر محبت..... یہ نہیں تھی۔ معیز اسے بہت عزیز تھا وہ اسے کامیاب دیکھنا چاہتی تھی مگر اس کے ساتھ زندگی گزارنا..... یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

جیسے ہی معیز کی چاب لگتی تھی پھوپھو نے ان کے گھر آ جانا تھا۔ وہ جان گئی تھی اور بہت ہی اچھی طرح سے جان گئی تھی۔ اسی لیے تو معیز کی نظروں کی شوخیاں اسے کھائے جا رہی تھیں۔ لیکن پھر یوں ہوا کہ معاملات صوفی کے حق میں ہوتے چلے گئے تھے۔

☆☆☆

”یہ کیا ہے صوفی.....؟“ وہ بے طرح سے الجھا

ہوا تھا۔

”کیا ہے معیز.....؟“ وہ حد سے بڑھ کر انجان بنی۔

”تم نے بلال کے پروپوزل کے لیے ہاں کہہ

اس کے لیے بھی اپلائی کروں گا۔“

”حنا.....! کیا کر رہی ہو یا..... ادھر آ جاؤ۔“

صوفی نے پھر سے آواز دی۔

اب کی بار حنا نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا مگر آئی نہیں..... پھوپا گاؤں کا کوئی واقعہ سنا رہے تھے اور حنا کی دلچسپی تھی کہ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”کل کے نیوز پیپر میں PCS کی لیکچررشپ کی ویکینسز آئی تھیں۔ تم نے نہیں دیکھیں؟“

”نہیں.....“

”میں تو پلائے کرنے لگا ہوں..... کیا تم کرو گی؟“

”توبہ کرو..... میں نے ابھی کچھ دن ایم ایس سی

کی تھکن اتارنی ہے..... انجوائے کرنا ہے..... دو سالوں کے سارے رسالے پڑھنے ہیں اور سارے ڈرا بے دیکھنے ہیں۔“

وہ اپنے پلان سے اسے آگاہ کر رہی تھی اور وہ مسکرا کر اس کے پلانز سن رہا تھا۔

”شادی نہیں کرنی؟“ معیز نے اچانک پوچھا۔

اور صوفی کا پہلا تاثر حیرت کا تھا۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔ حیرت بنتی بھی تھی۔ معیز اور اس کے درمیان ایسی کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اشاروں سے بھی نہیں اور نگاہوں سے بھی نہیں..... اور دوسرا تاثر..... اس کا چہرہ بری طرح سے سرخ پڑا۔

”بکومت.....“ وہ اس سے نظریں پھیر کر سر جھکا

کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”ہا ہا ہا.....“ معیز اپنے قبضے کا گلا گھونٹ کر ہنسا۔

صوفی نے اسے گھورتے ہوئے اس کا خالی

چائے کا کپ اٹھایا اور میز پر رکھنے چلی گئی۔

یکا یک پھوپا کے قصبے میں اسے اتنی دلچسپی محسوس

ہوئی کہ وہ وہیں حنا کے پاس بیٹھ کر نہیں سننے لگی۔

معیز نے سر جھٹکا اور پاس رکھی پلیٹ میں موجود

ایک گلاب جامن کوچنگ سے آدھا کیا اور پھر ایک حصہ اٹھا

کر منہ میں ڈالا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب صوفی دیکھے گی تو

دوسرا حصہ اٹھا لے گی۔ اس سے پہلے بھی وہ یہ ہی کر چکی

READING
Section

”تو..... تو پھر.....؟“ وہ ایسا معما..... ایسا حساس سوال بن کر کھڑی تھی جس کے سلجھاؤ کا کوئی سرا نہ ملتا ہو..... جو کسی طریقے سے حل نہ ہوتا ہو..... کسی طرح سے سمجھ نہ آتا ہو۔

مکمل طور پر undefined ہو جیسے..... اس نے سوال کیا تھا..... جواب دینا تھا مگر وہ چپ کھڑی تھی۔

”میری مرضی کافی نہیں معین.....“ پھر کافی دیر بعد وہ نرمی سے بولی۔

”او کم آن صوفی..... یہ مت کہو کہ تمہاری مرضی میرے ساتھ نہیں.....“ اس کی بات اڑادی گئی یوں چٹکیوں میں۔

”کیوں.....؟ یہ تمہارے ساتھ ہی کیوں ہو سکتی ہے؟“ صوفی چڑی اور چڑ کر پوچھا۔

”ہم بچپن سے ساتھ رہے ہیں صوفی.....“ وہ حیران ہوا۔

اور صوفی خاموش ہو گئی تھی..... تھک سی گئی تھی۔

”صوفی اب بھی اگر تم نے مجھے کوئی سولڈ ریزن نہیں بتایا تو میں تمہیں تھپڑ دے ماروں گا۔“ وہ اس کی نموشی سے چڑا۔

اور اس کے لہجے سے لگتا تھا کہ ہاں..... آج وہ ایسا ہی کرے گا اور ضرور کرے گا۔ صوفی نے شا کڈ ہو کر اسے دیکھا۔

”مجھے مجبور مت کرو کہ تمہیں دکھی کروں۔ مان جاؤ..... اور چلے جاؤ..... جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ سمجھ لو کہ وہی میری مرضی ہے۔ کوئی بہت ہی اچھی لڑکی.....“

”شٹ اپ.....“ اور وہ بری طرح سے دھاڑا۔

صوفی نے بے ساختہ آنکھیں بند کر کے اس لرزش کو اپنے اندر روکا جو اس دھاڑ سے اس کے اندر اٹھی تھی۔ اس نے گہری سانس بھر کر خود کو پُر سکون کرنا چاہا۔

معین کا چہرہ دیکھا..... اور خود کو وہ بات کہنے کے لیے تیار کیا اور..... اور پھر معین نے دنیا کی تلخ ترین بات سنی..... زندگی کا بدترین جھٹکا کھایا۔ سچی مگر زہر

دی؟“ وہ رکا۔ ”کیا تم انجان تھیں..... کیا تم جانتی نہیں تھیں؟ چلو ٹھیک ہے مان لیا کہ تم نہیں جانتی تھیں تو میں اب تمہیں.....“

”میں جانتی نہیں تھی مگر پھر جان گئی تھی معین.....“ اس نے یک دم اس کی بات کاٹی تھی۔

”پھر بھی.....؟“ وہ ترنت بولا۔

”ہاں پھر بھی.....“ صوفی نے اب وقفہ دے کر کہا تھا۔

وہ اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلاتا رہا۔

”دنیا کا بلکہ اس پوری دنیا کا کوئی دوسرا شخص کوئی بھی دوسرا شخص معین نہیں ہو سکتا..... کسی بھی دوسرے شخص کے پاس معین جیسا دل نہیں ہو سکتا..... معین جیسی نظر نہیں ہو سکتی..... وہ نظر کہ جس سے وہ صوفی کو دیکھتا ہے۔ لفظ محبت کم ہے۔ لفظ پیار جھوٹا ہے۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں مگر.....“

”تو پھر تم کیسے بلال کو فوقیت دے سکتی ہو مجھ پر..... کیوں کیسے.....؟“ صوفی نے بے اختیار اپنی کپٹی مسلی تھی۔

”معین ضروری تو نہیں جو جذبہ تمہارے دل میں ہے وہ ہی جذبہ ویسی ہی شدت کے ساتھ میرے دل میں بھی موجود ہو؟“

”اچھا ٹھیک ہے..... نہیں تو نہ سہی مگر ہم اچھی زندگی پھر بھی گزار ہی لیں گے..... بلکہ اس الو کے..... کے ساتھ جیسی گزارو گی ناں اس سے کہیں اچھی گزار لیں گے۔“

”نہیں.....“ صوفی نے آہستگی سے سر جھکا کر نفی میں سر ہلایا۔

اور معین اتنا خاموش ہوا کہ ساکت لگتا تھا..... جیسے پھچان..... بے حس و حرکت.....

”تم بلال کو پسند کرتی ہو؟“ اس نے اپنا سب سے پہلا خدشہ سب سے آخر میں بیان کیا۔

”نہیں.....“ صوفی نے اب بے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا تھا۔

ساتھ، ساتھ سنبھلے والا ہاتھ بھی چل رہا تھا۔ نیند کی شدت سے ہاتھ رک کر ڈھلکتا اور ڈھلک کر نیچے گرنے لگتا تو وہ فوراً الرٹ ہو کر پھر سے جھلنے لگتی..... معیز کی نیند بھک سے اڑی۔

”زیادہ گرمی لگ رہی ہے؟“ ساتھ والی کرسی پر بیٹھے ہوئے وہ بولا۔ اور وہ چونکی کم ڈری زیادہ.....
”آف..... بندہ بتا کر تو آتا ہے..... جان ہی نکال دی۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

معیز نے نرمی سے اسے دیکھا، اسے اس پر ترس آیا اور وہ اب مشترکہ طور پر خود کو اور معیز کو پنکھا جھل رہی تھی۔
”لاؤ میں جھلتا ہوں۔“ معیز نے اس کے ہاتھ سے پنکھا لیا۔

”رہنے دیں.....“ اس نے احتجاج کیا مگر معیز نے سنی ان سنی کر دی۔

وہ اب اسے اور خود کو پنکھا جھل رہا تھا۔ چند لمحوں بعد معیز نے اسے اپنے کندھے سے سر نکالتے دیکھا اور اس کے تھوڑی دیر بعد وہ وہیں پر سو گئی تھی۔ اس کی سانس کی ہموار رفتار بتا رہی تھی کہ وہ سو چکی ہے۔ معیز نے ایک گہری سانس بھری اور جسم کو ذرا سی بھی حرکت دینے سے روکا۔ وہ کب سے بے آرام تھی، وہ نہیں جانتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی..... وہ یوں ہی آرام کر لیتی تو اچھا تھا۔ وہ اب بھی اسے پنکھا جھل رہا تھا لیکن وہ صرف پنکھا ہی نہیں جھل رہا تھا۔

سامنے پھیلی چاندنی میں دیکھتے ہوئے اس کا ذہن بہت کچھ سوچنے کے قابل ہو چکا تھا۔
ایک حقیقت ابھی ابھی اس پر کھلی تھی اور کیا ہی برے طریقے سے کھلی تھی۔

☆☆☆

”میرا بہت دل تھا صوفی کے لیے..... معیز اور اس کی بنتی بھی بہت ہے مگر جو اللہ کو منظور..... اللہ اس کے نصیب اچھے کرے بس..... معیز کی پچیس، تیس ہزار کی بھی نوکری لگتی ناں تو میں بھابی سے مانگ لیتی صوفی کو..... چلو جو اللہ کرے..... جیسے اس کی

جیسی کڑوی اور تلخ حقیقت کا سامنا کیا تھا۔
”کیا یہ سب کہنے والی صوفی ہوگی؟ کیا یہ سب صوفی نے کہا تھا؟ کیا واقعی..... ہیں..... واقعی ہی میں؟“

☆☆☆

سخت گرمی تھی اتنی کہ نہا، نہا کر بھی کچھ نہیں بنتا تھا۔ جس کروٹ لیٹو وہ ہی پسینے میں شرابور..... ایسے میں اگر بجلی بھی بند ہو تو..... وہ تنگ آ کر اٹھی..... ایک نظر دھت سوئے معیز پر ڈالی۔

”یا اللہ..... یہ کیسے سو رہا ہے۔“ اسے واقعی شدید حیرت ہوئی تھی۔ کمرے سے باہر نکل کر برآمدے میں چلی آئی۔ یہ تو طے تھا جب تک لائٹ نہیں آئی..... نیند بھی نہیں آئی..... وہ برآمدے میں رکھی کرسی پر دونوں پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔ پورے چاند کی رات تھی۔ چاندنی سارے صحن میں کھل کر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ضرور اس چاندنی کو انجوائے کرتی اگر چھوڑ نہ ہوتے تو.....

”سی.....“ چھروں نے باجماعت ہو کر اس کے پیروں پر حملہ کیا تھا اور اس نے سی کر کے ہاتھ میں پکڑا پنکھا اپنے پیروں پر دے مارا۔ اور تو کوئی طریقہ علاج اس وقت میسر نہیں تھا۔ وہ چند لمحے ہاتھ سے پنکھا جھلتی..... جہاں پہ چھرا ٹیک کرتے ہاتھ روک کر وہیں یہ پنکھا دے مارتی اور پھر سے پنکھا جھلنے لگتی..... اس مشق سے ایک بازو تھک جاتا تو دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیتی۔ لائٹ کو گئے گھنٹا ہو گیا تھا۔

”اللہ.....“ اس نے زچ ہو کر ایک دفعہ پھر سے پنکھا پیروں پر دے مارا۔

پسینے سے شرابور..... نیند سے چور آنکھیں..... دکھتا سر اور اوپر سے گرمی..... چھروں کی بھن بھن اسے خواہ مخواہ میں ہی رونا آیا اور پھر ساتھ میں اپنا اے سی والا کرا بھی یاد آیا۔

معیز کی نیند بھی شدید گرمی سے ٹوٹی تھی۔ وہ بیڈ پر نہیں تھی..... اسے حیرت تھی کہ کہاں گئی؟ جب تھوڑی دیر بعد بھی وہ نہ آئی تو وہ خود اٹھا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔
وہ برآمدے میں پڑ کر کرسی پر جھول رہی تھی۔

مرضی.....“ اماں کی آواز کمرے سے باہر آرہی تھی اور آواز افسوس کے شدید تاثر میں ڈولی ہوئی تھی۔

دوٹوں کی۔“

”میری آپ سے بھی بہت اچھی دوستی ہوتی اگر آپ میرے ساتھ پڑھے ہوتے، میرے ساتھ بچپن میں کھیلے ہوتے.....“ وہ اس کے ترنت جواب دینے پر مسکرایا۔ وہ چھت کو جانے والی سیڑھیوں پر چائے کا کپ لیے بیٹھی تھی جبکہ وہ گرل کے پاس اپنا کپ پکڑے کھڑا تھا۔

”یعنی کہ میں گھانٹے میں رہا.....“ ایک گھونٹ بھر کر اس کے دوپٹے سے ڈھکے سر کو دیکھ کر اس نے کہا۔ صوفی نے مسکراہٹ روکنے کے لیے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سر اٹھا کر سامنے دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔ جیسے کہتی ہو مجھے کیا معلوم..... وہ اب دونوں ہاتھوں میں کپ تھامے چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ اس انداز پر بلال کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

”بہت سے لوگوں کے دل ٹوٹے ہوں گے تمہاری اور میری منگنی سے۔“

وہ صاف اسے چھیڑ رہا تھا۔ صوفی کے کئی امیدوار تھے خاندان بھر میں..... کبھی اس کے اخلاق کے متاثرین میں سے تھے۔ البتہ بلال سے رکھی سی بات چیت ہوتی تھی..... اور وجہ وہ شہر سے باہر زبردستی تعلیم رہا تھا۔ وہ ایک دم اٹھی۔ کپڑے جھاڑ کر درست کیے۔ بلال کے ہاتھ سے خالی کپ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے کچھ حیران ہوتے ہوئے کپ دیا۔ اسی لمحے صوفی نے اچانک بلال کی آنکھوں میں دیکھا۔

”شکر کریں کہ آپ کا دل ٹوٹنے سے بچ گیا۔“

اور پھر مزے سے کہہ کر وہ بڑے آرام سے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

وہ حیران ہوا اور پھر ہنس دیا۔ ایسا صوفیہ شجاع ہی کہہ سکتی تھی۔ اسے اس کا یہی انداز تو بھایا تھا۔ پورے خاندان کی واحد لڑکی..... جس نے نہ صرف ایم ایس سی کیا بلکہ کوا بجو کیشن میں رہ کر کیا۔ پورے خاندان میں صرف وہ تھی جس نے اسٹینڈ

وہ سن سکتا تھا اسی ایک نام کی بازگشت..... صوفی..... صوفی..... صوفی..... ذہن سے لے کر دل کی دھڑکن تک..... ہر طرف ہر جانب..... پر صوفی نے تو کیا کہہ ڈالا تھا۔ تو صوفی ایسے سوچتی تھی.....؟ پر صوفی ایسے کیسے؟ تو وہ سب کچھ خود ہی فرض کیے بیٹھا تھا..... اور حیرانی اتنی شدید تھی کہ دکھ کو ڈھانپ چکی تھی اور جب یہ نام اس نے اماں کے کمرے کے سامنے سنا تو رک گیا۔ بے اختیار اس نے اپنی کپٹی کو مسلا۔

اماں ایک دم کمرے سے باہر نکلیں اسے یوں کپٹی مسلتے ہوئے دیکھ کر چوکی تھیں۔

”کیا ہو معیز.....؟ سر میں درد ہے کیا؟“

انہوں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا جس سے وہ کپٹی مسل رہا تھا۔ معیز کے ہاتھ کی حرکت فوراً رکی۔

”اماں کپ کب باہر آئیں؟“ اس نے حیرانی سے پیچھے کھلے دروازے کو دیکھا۔

”معیز.....؟“ وہ چونکا۔

”جی، سر میں درد ہے..... ایک کپ چائے تو بنا دیں۔“ ناہموار لہجہ..... پریشان چہرہ..... وہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اماں نے پہلے کبھی معیز کو سردرد سے اتنا بے حال ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ فکر مند ہوئیں..... کاش کہ وہ سردرد ہی ہوتا..... کاش کہ.....

☆☆☆

”میں تو سمجھا تھا کہ تم انکار کرو گی۔“

”کیوں.....؟“

READING
Section

242 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

بھی خاندان میں ہی ہیں تو اتنی اعلیٰ تعلیم کا مقصد.....؟ کل کو پھر مسئلہ کھڑا ہوگا کہ جی اب پڑھے لکھے مرد سے شادی کرنی ہے..... اسے یہ بات بہت دور تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ پورے خاندان کے چند گھرانے شہر میں آباد تھے باقی تو سب آج بھی... کڑیا نوالہ میں ہی سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ اسی طرح تعلیم بھی صرف چند انہی شہری گھرانوں میں ہی محدود تھی۔ کل کلاں کو کھپنا اس نے خاندان میں ہی تھا تو ایسے... میں؟ اور ان کا خاندان ایک سخت روایت پسند خاندان تھا۔ جس میں شادیاں اپنوں میں ہی کی جاتی تھیں۔ وہ خاندان کسی (بھول بھلیاں) maze کی طرح تھا..... سرنگ در سرنگ مگر آپس میں جڑے ہوئے۔

”خیر..... میری بلا سے؟“ تب بلال نے یہ سوچ کر اپنی جان چھڑائی تھی مگر نہیں جانتا تھا کہ یہ بلا اسی کے حصے میں آئی تھی اور اس کی اپنی مرضی سے ہی آئی تھی۔

☆☆☆

آج بلال سے بڑی بہن کی منگنی تھی ساری کزنز جمع تھیں۔ وہ کچن میں پانی پینے آیا تھا جبکہ صوفی ٹرے اٹھائے کچن میں داخل ہوئی تھی۔ تب وہ تھرڈ ایئر میں تھی اور نیا، نیا شوٹا چھوڑا تھا ایم ایس سی کرنے کا..... عمر کے لحاظ سے وہ معیز اور صوفی سے بڑا تھا مگر پھر بھی یہ ایچ ڈیفرنس باقی کزنز کے مقابلے میں کم ترین سطح پر تھا۔ باقی سب صوفی سے اتنے بڑے تھے کہ صوفی کسی کو پاجی اور کسی کو بھاجی کہہ کر بلاتی تھی۔ معیز تو خیر منتوں مرادوں کے بعد ملنے والا بچہ تھا جبکہ (صوفی کے ابا) شجاع کی شادی دیر سے ہوئی تھی..... انہیں اسٹیبلش ہونے میں کافی وقت لگا تھا۔

ایسی سلام دعا تو بلال کی صوفی سے کبھی کبھی ہوتی ہی رہتی تھی مگر آج اس نے اس سلام دعا میں بطور خاص صوفی کو غور سے ملاحظہ کیا تھا۔

اور پھر اس شام..... اس شام ہونے والی گفتگو.....

☆☆☆

یہ اسی خراب دماغی حالت کا نتیجہ تھا کہ وہ pcs

لیا تھا۔ جبکہ باقی ساری لڑکیوں کو ایف اے یا زیادہ سے زیادہ بی اے سے آگے... پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ کجا کہ وہ کو ایجوکیشن جوائن کرتیں وہ یوں کہ صوفی نے ارادہ کیا اور ڈٹ گئی..... اور جب آپ ڈٹ جائیں..... کوشش کرنے پر مصر رہیں تو قدرت بھی ایک، ایک کر کے سارے راستوں کے بند دروا کر دیتی ہے اور صوفیہ شجاع کے لیے بھلا کون بنا راستہ..... ہاں معیز..... معیز بھٹی.....

☆☆☆

وہ گجرات کا ایک راجپوت بھٹی گھرانہ تھا جس کی پچھلی نسل کے تقریباً سارے مرد باہر کے ممالک میں جا کر روزی کما رہے تھے۔ تعلیم کی اتنی اہمیت نہ تھی اس خاندان میں..... اس زمانے میں صرف ظفر (صوفی کے پھوپھا) واحد پڑھے لکھے مرد تھے لیکن جیسے، جیسے پیسہ آتا گیا۔ چند فیملیز شہر میں شفٹ ہوتی گئیں اور شہر میں آکر بچوں کو اچھے اسکولز میں ایڈمیشن لے کر دیتے رہے۔ انہی گھرانوں میں ایک صوفی کے ماموں کا گھرانہ بھی تھا۔ بلال پانچ بہن بھائی تھے اور پانچوں کے پانچوں تعلیمی میدان میں ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کمپیوٹر سائنس کا بہت چرچا تھا۔ بلال اپنا MCS کرنے کے لیے لاہور ہاسٹل میں رہائش پزیر تھا۔ اس نے میٹرک کے بعد ساری تعلیم لاہور ہی سے حاصل کی تھی۔ انہی دنوں اڑتی، اڑتی خبر اس تک پہنچی تھی کہ اس کی پھوپھی بڑی بیٹی (صوفی) نے کو ایجوکیشن میں پڑھنے کی ضد کی ہے گو کہ وہ خود ایک ایسے ہی مخلوط ادارے میں تعلیم حاصل کر رہا تھا مگر وہ اپنے خاندان کی لڑکیوں کے لیے یہ بات ہرگز، ہرگز پسند نہیں کرتا، یہ خبر سن کر اسے برا لگا۔ صوفی سے اس کی اتنی بات چیت نہیں تھی لیکن بلال کے بہن بھائیوں سے صوفی کی بہت اچھی سلام دعا تھی اور آنا جانا بھی ظاہر ہے ہوتا ہی رہتا تھا۔ اسے صوفی کچھ اکھڑ مزاج اور روڈ سی محسوس ہوئی۔ جب پتا تھا کہ ان کے خاندان میں اکثر بے جوڑ شادیاں ہوتی ہیں مگر ہوتی

READING
Section

کا امتحان کلیئر نہیں کر پایا تھا۔ ”ہا.....“ اپنی انگلیاں کھلے منہ پر رکھ کر اس نے بے یقینی سے معین کو دیکھا..... پھپھو اور پھوپا کو دیکھا..... وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

اور پھر معین نے اسے اپنی طرف آتا دیکھا تھا۔ انتہائی بے یقینی سے اس نے جنرل کی سطح پر ہاتھ پھیرا تھا۔ ”تم نے بتایا نہیں.....“ اس نے چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔

”سر پرائز.....“ معین نے مسکرا کر کندھے اچکائے۔ ”میسے کہاں سے آئے؟“ وہ اب اس کے پاس کھڑی پوچھ رہی تھی۔

”انسٹانٹ منٹ پہ لیا ہے۔“ معین اب جنرل کو گھسیٹ کر صحن کے ایک طرف رکھ رہا تھا۔

اس نے بے ساختہ آسمان کو دیکھ کر شکر کی سانس بھری۔ یہ کسی نعمت سے کم ہرگز نہیں تھا..... گجرات میں گرمی..... گرمی نہیں آگ برسی ہے اور ایسے میں لوڈ شیڈنگ.....

”اوہ میرے اللہ..... شکر ہے تیرا..... لاکھ، لاکھ شکر ہے۔“ بار، بار وہ زپر لب یہ جملہ دہرائی رہی۔

وہ اس ماحول میں رہنے کی عادی نہیں تھی اور عادی بنتے، بنتے..... مشکلات سے لڑتے، لڑتے اس کے بال سفید ہو جانے تھے۔ ہڈیاں گھس جانی تھیں اور کھنچا ہوا ماس ڈھلک جاتا تھا۔

”اوہ میرے اللہ..... شکر ہے..... شکر ہے مولا..... احسان ہے تیرا۔“ جتنا شکر کرتی کم تھا۔ وہ جانتی تھی۔

☆☆☆

وہ 12 بائی 12 کا ایک کمر تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے والی دیوار کے ساتھ ڈبل بیڈ تھا۔ ساتھ میں سائڈ ٹیبل..... ایک طرف ڈریسنگ اور بیڈ کے دوسری طرف ایک الماری اور لیس جی..... کمر اپر ہو گیا تھا..... ایسے میں معین نے بڑی مشکل سے گھسیٹ گھساڑ کر اپنی کمپیوٹر ٹیبل کمرے میں فٹ کر لی تھی۔ عین الماری کے ساتھ اور اسی کمپیوٹر ٹیبل کے آگے بیٹھا وہ بار، بار گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر اسے

”میں..... میں معین بھٹی..... میں..... میں pcs کا ایگزام.....“ اسے لگا کہ اس کا پوزیشن ہولڈر ہونا ایک گالی تھا..... ایک طعنہ تھا..... منہ پر لٹے ہاتھ سے پڑنے والا طمانچہ تھا۔

یہ اس کی زندگی کی دوسری بڑی بے یقین صورت حال تھی جس کا وہ شکار ہوا تھا..... کہنے کی بات نہیں تھی وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہ اپنے ماں، باپ کے لیے کیا تھا..... وہ ان کے لیے پارس تھا ایسا پارس جو غریبی کو چھوٹا تو وہ امیری بن جاتی..... بد حالی کی طرف نظر کرتا تو وہ خوشحالی میں بدل جاتی..... اور اس نے..... اس نے کیا کیا.....

کیا محبت اس قابل تھی کہ اس کے لیے وہ اپنے گھر والوں کو برباد کر دیتا؟

ٹھیک ہے اس کا وجود محبت کھا جاتی لیکن اس سے جڑے رشتے..... وہ کسی طرح سے کسی طور سے بھی اس بات کے مستحق نہیں تھے کہ وہ اس کی محبت سے متاثر ہوتے۔ وہ ہرگز، ہرگز بھی مستحق نہ تھے۔ اور پھر اس نے وہ راز پالیا کہ جسے توازن کہتے ہیں۔ اس نے اپنے دل کو محبت کے لیے کھلا چھوڑ دیا مگر ذہن کو متاثر نہ ہونے دیا۔

کوئی حق حاصل نہیں تھا محبت کو کہ وہ اسے اس طرح سے ناکارہ کر دیتی کہ اس کے ماں باپ کو زک پہنچتی۔

☆☆☆

اس کے سونے جاگنے کے اوقات لائٹ سے مشروط ہو چکے تھے۔ رات کی نیند بھی دن میں پوری کرنے کی کوشش کرتی مگر ناکام ہوتی۔

اسے معلوم تھا کہ ایک گھنٹے بعد بجلی نے چلے جانا ہے تو وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ گہری نیند میں تھی کہ کسی نامانوس سے شور سے آنکھ کھلی تھی۔ وہ چند لمحے آوازوں سے صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی، آوازیں کچھ شور سا بننے لگی تھی۔ وہ جلدی سے دوپٹا اوڑھ کر پیروں میں چپل اڑس کر باہر آئی تو.....

READING
Section

244 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

تھی مگر پھر بھی..... ساری عمر وہ ان سہولیات کو حاصل کرنے کی خواہش میں مبتلا رہے گی۔ اپنے دل کو مارتی رہے گی۔

گن، گن کر پیسے بچایا کرے گی تاکہ وہ مختلف انٹارنٹ پر لی ہوئی چیزوں کی قسطیں ادا کر سکیں۔
”اچھا کھا نہیں سکے گی، اچھا پہن نہیں سکے گی۔“
معیز نے دفعتاً آنکھیں بند کر کے اپنے حلق سے کچھ نیچے اتارا تھا۔

”کیا یہ نا انصافی نہیں تھی؟“

کیا یہ اس کا حق نہیں تھا کہ وہ اپنے لیے اپنے برابر کا جوڑ دیکھتی؟

”زندگی میں مادی چیزوں کی اہمیت ہوتی ہے اور اگر نہیں ہوتی تو وہ مادی رویہ ہوتا ہے۔“ اس نے کبھی معیز سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ جیسے حالات تھے جتنی مالی استطاعت تھی وہ اسی میں ایڈ جسٹ کرنے کی کوشش کرتی تھی..... کبھی طعنہ نہیں دیا تھا۔
یہ تھا اس کا غیر مادی رویہ..... مگر ضرورتیں..... وہ تو مادی چیزوں سے ہی پوری ہوتی ہیں۔

پیٹ کا تین وقت کا کھانا محبت نہیں بھرتی۔ معیز کو آج وہ حلاج جتنا فرق بڑا واضح ہو کر نظر آیا تھا..... وہ ہی فرق جو کچھ عرصے پہلے تک اسے نظر ہی نہیں آتا تھا اور یہ اتنا بڑا فرق تھا کہ منہ کھولے اس کو نگل جانے کو.... بے تاب تھا۔

مائی نے بڑی اچھی تربیت کی تھی دونوں بیٹیوں کی..... وہ دونوں کھانا بنانے اور گھر سنبھالنے میں طاق تھیں مگر یہ کہ ہمیشہ سے گھر کی صفائی ستھرائی کا کام ہمیشہ سے ان کے ہاں کام والیاں کرتی تھیں ان دونوں نے تو کبھی جھاڑو تک نہیں پکڑا تھا مگر کام والی سے بڑے اچھے طریقے سے گھر صاف کروالیا کرتی تھیں اور یہاں آکر..... شادی کے بعد معیز نے خود اسے بنا کسی حجت کے..... پھٹا کسی عذر کے گھر کی صفائی کرتے دیکھا تھا۔

اسے ایک دم احساس ہوا تھا کہ وہ کہاں.....

چھوٹے تخت پر نماز پڑھتا دیکھ رہا تھا۔

آج نماز معمول سے زیادہ ہی لمبی ہو گئی تھی۔ پورا گھر جنرل کی عنایت کردہ بجلی کی وجہ سے جگمگا رہا تھا۔ اس نے سارے گھر کی لائٹیں جلائی ہوئی تھیں کہ جنرل کی بجلی مفت کی بجلی لگتی تھی..... اور پھر یہ بجلی سردیوں میں تو ہونی نہیں تھی کہ گیس ہوگی تو جنرل چلے گا نا..... معیز نے سر جھٹک کر پھر سے کمپیوٹر پر نظریں جمائیں..... اسی دوران وہ چہرے کے گرد سے دوپٹا کھولتی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔

”کتنا اچھا لگ رہا ہے نا معیز.....“ بیڈ پر اس کی طرف آ کر بیٹھتے ہوئے وہ بچوں کے سے اشتیاق سے بولی تھی۔

معیز نے مڑ کر اسے دیکھا..... چند لمحے اس کی چمکتی آنکھوں کو دیکھتا رہا.....

”ہوں.....“ اور پھر رخ واپس موڑ لیا۔
”نماز آج لمبی نہیں ہو گئی تمہاری؟“
”ہاں..... شکر انے کے نفل پڑھ رہی تھی۔“ سادگی سے کہہ کر وہ دونوں ٹانگیں اوپر کر کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔
”اور ابھی تو اور لمبی ہونی ہے۔“

”اچھا..... وہ کیسے.....؟“ وہ اپنے کام میں مصروف بولا تھا۔
”جب لے سی آئے گا..... جب گاڑی آئے گی،

جب ہم اس گھر کو ری نوویٹ کروائیں گے۔ جب امریکن اسٹائل میں کچن بنوائیں گے۔ تو ہر ایک چیز کے لیے نفل پڑھا کروں گی نا.....“

وہ ایک کے بعد ایک خواہش گنوا تی چلی گئی تھی۔ وہ کوئی طعنہ تھا نہ طنز..... بس اپنی خواہشات کا اظہار تھا اور معیز.....

اس کا ماؤس پر چلتا ہاتھ رکا..... نظریں کمپیوٹر اسکرین پر ساکت ہو کر رہ گئیں۔

وہ ان سب سہولیات کی عادی تھی..... وہ ان سہولیات میں پل کر بڑی ہوئی تھی۔ نصیب نے اس کی شادی معیز سے کرا تو دی اور وہ ایڈ جسٹ بھی ہو ہی گئی

کہاں اور کیسے، کیسے کپڑے پہنے تھے۔ ساری عمر..... ساری عمر وہ ویسی ہی زندگی حاصل کرنے کی تک دو میں مصروف رہے گی جیسی کہ وہ اپنے باپ کے گھر گزار کر آئی تھی اور پتا نہیں کہاں..... کہاں صبر کرے گی اور کیسے، کیسے جبر کرے گی۔ کیا یہ زیادتی نہیں تھی؟

”کیا ایک امیر گھر کی لڑکی کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے اپنے جیسا ہی مالدار جوڑ حاصل کر سکے؟“

اور یہ ہی پہلے معمولی سا نظر آنے والا فرق بعد میں خلیج جتنا بڑا اور گہرا ہو کر لومیر جز میں سے لو کو کھا جاتا ہے اور انجام طلاق کی یا مسلسل ازدواجی چپقلشوں کی صورت میں نکلتا ہے۔

معاشرہ گواہ ہے ایسا ہی ہوتا ہے نا.....

☆☆☆

مغیرہ باجی کی منگنی کی تقریب ختم ہوئی تو سب لڑکیوں نے ادھر ہی بلال کے گھر ڈیرا ڈال لیا تھا..... آج اتنے عرصے بعد سب اکٹھے ہوئے تھے رت جگے کا پروگرام بن چکا تھا۔ صوفی سب کے لیے چائے بنا کر لائی تھی۔

”آپ کو نہیں لگتا کہ آپ کا کوا بجو کیشن میں بڑھنے کا فیصلہ غلط ہے؟“ وہ اپنا چائے کا کپ لے کر بیٹھی ہی تھی کہ اس نے بلال کو کہتے سنا..... وہ بری طرح سے چونکی..... حاضرین نے بھی گردن گھما کر بلال کو دیکھا۔

”نہیں.....“ بڑے اعتماد سے جواب آیا تھا۔

”آپ اپنی پوزیشن خراب کر رہی ہیں۔“

”وہ کیسے.....؟“

”آپ اچھی طرح سے جانتی ہیں..... اپنی روایات کو بھی اور اپنے خاندان کو بھی.....“

”تو.....؟“ وہ جیسے اسے زچ کرنے کے موڈ میں تھی۔

”اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فائدہ جبکہ یہ بھی پتا ہو

کہ کسی نے جا ب تو کرنے دینی نہیں.....“ وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اور بس.....“

صوفی اطمینان سے مسکرائی یوں جیسے وہ اسے اسی پوائنٹ تک لانا چاہتی ہو۔

”آپ کے لیے تعلیم جا ب حاصل کرنے کا ذریعہ ہوگی..... جبکہ میں ایسا نہیں سوچتی.....“

اس نے بلال کی ٹھنڈی سی بے عزتی کی۔

”میرے لیے تعلیم شعور کا نام ہے..... میں گھر بیٹھ کر رشتے کا انتظار نہیں کر سکتی..... خاندانی سیاستوں پر

سیر حاصل بحث نہیں کر سکتی..... فضول قسم کی لڑائیوں کا حصہ نہیں بن سکتی..... کسی نے کیا پہنا.....

کیوں پہنا..... کیسا پہنا یا یہ کہ کیا لیا نہیں لیا..... آئی ایم سوری..... مجھے یہ سب نہیں کرنا۔ زندگی بڑی اہم شے

ہے..... میں اسے سمجھنا چاہتی ہوں اور سمجھنے کے لیے شعور کا ہونا بہت ضروری ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ

میں سیکھوں کہ جب کوئی میرے ساتھ برے طریقے سے پیش آئے تو میں اس کے ساتھ اچھا رویہ رکھ

سکوں..... چلو اچھا نہ سہی کم از کم خاموش رہنا ہی سیکھ لوں..... یہ سب وسعت القلبی سے آتا ہے مگر قلب کو

وسیع ہونا کون سکھاتا ہے بلال بھائی..... یہ ذہن ہی ہوتا ہے۔ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں؟“

وہ کچھ دیر رکی تو بلال حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اس سے اتنے تفصیلی جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

”اور کیا..... جاننے کی کوئی حد ہے۔“ وہ پھر

شروع ہو گئی تھی۔ ”میرے لیے تعلیم جاننے کا ایک ذریعہ ہے..... جا ب حاصل کرنے کا نہیں..... میں نے

میتھ کو بھی اسی لیے چنا کہ یہ ہمیں سمجھنا سکھاتا ہے۔ رٹا لگانا نہیں..... سوال سمجھے بنا حل نہیں ہوتے اور سوال

سمجھنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے..... اسٹیپ بائے اسٹیپ سوال کو کھولا جاتا ہے، حل کی طرف لے جایا جاتا ہے

اور پھر آخری اسٹیپ پر سوال حل ہو جاتا ہے۔ ایک منطقی دلیل کے ساتھ..... ایک ایسی منطقی دلیل کہ جس کو

READING
Section

246 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

حقیقت

دے۔“ اب وہ مزہ لیتے ہوئے بولی تھی۔ اور وہ سب ان دونوں کی طرف متوجہ ہو کر ان کی بحث سن رہے تھے۔ ہنس پڑے تھے۔

اور یوں معزز بھٹی..... صوفیہ شجاع کے لیے ایک راستہ بن گیا..... ہر طرح کے اعتراضات کا منہ یہ ہی کہہ کر بند کیا گیا تھا۔

”ارے.....! معزز بھی تو ہو گا ناں صوفی کے ساتھ..... اکیلی تھوڑی ہے وہ.....“

☆☆☆

محبت ہمیشہ سے ہمارے اندر موجود ہوتی ہے۔ لیکن آشکار ہونے کے لیے یہ کسی نہ کسی شے کی محتاج ضرور ہوتی ہے۔ چاہے وہ لمحہ ہو، کسی کی حسین ادا، بات کرنے کا انداز یا پھر کوئی خوب صورت عادت.....

اور پھر پتا لگتا ہے کہ ہا..... ہم بھی تو اسیر محبت تھے۔ ارے یہ کب ہوا..... اچھا تو یہ ایسا تھا۔

کیا ہم بھی.....؟

کیا واقعی ہم بھی.....

یقین نہیں آتا مگر حالات و واقعات کبھی، کبھی...

مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

اور پھر محبت یوں سامنے آتی ہے کہ جیسے یہ تو کبھی اوجھل تھی ہی نہیں۔ یہ تھی اور بس یہ ہی تھی۔

☆☆☆

وہ سال معزز کے لیے بڑا سخت ثابت ہوا تھا۔ اس کی بہت بڑی امید تھا اور وہ ناکام ہو گیا تھا۔ انہی دنوں گجرات میں ایک نیا کامرس کالج کھلا تھا۔ جس کے پرنسپل معزز کے ابو کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ وہ اچھی طرح معزز کی قابلیت سے آگاہ تھے۔ انہوں نے اسے وہاں جا ب آفر کی تھی جیسے معزز نے ہنسی خوشی قبول کر لیا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ہفتے کے دو دنوں میں اسے ایم فل شام کی کلاسز لینے اسلام آباد آنا پڑتا تھا۔

کالج کی جا ب بھی تھی اور اپنی پڑھائی الگ..... پہلے اس کا مقصد کامیاب ہونا تھا اور اب یہ

کوئی چیلنج نہیں کر سکتا..... زندگی کے مسائل بھی سمجھ سے حاصل ہوتے ہیں اور میں وہ سمجھ سیکھ لینا چاہتی ہوں۔ آپ کو لگتا ہے کہ یہ گھر بیٹھے ہو سکتا ہے؟“

”اور آپ کو لگتا ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے شعور سکھارے ہیں؟“ بلال نے ترنت کہا تھا۔

”نہیں، وہ ڈگری لینا سکھارے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسکو کیسے کیا جائے یہ سکھارے ہیں..... مگر

پھر بھی ان سب چیزوں کے مابین کہیں نہ کہیں تعلیم ڈیلیور ہو رہی ہوتی ہے اور وہ فرق قائم کر دیتی ہے جس سے ہم کسی کو ان پڑھ اور پڑھا لکھا کہتے ہیں۔

کتابوں میں اخلاقیات کا درس ہوتا ہے یہ اب طالب پے منحصر ہوتا ہے وہ کتنا سیکھتا ہے اور پھر اس سیکھے ہوئے

کو معاشرے میں کیسے اپلائی کرتا ہے۔ بلال بھائی میں ذرا چیزوں کو عمومی زاویے سے دیکھنے سے پرہیز کرتی ہوں۔ تعلیم کا سب سے پہلا مقصد

behavioural change ہوتا ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ آج کل کی تعلیم اپنے پہلے مقصد کو ہی

پورا کرنے میں ناکام ہے۔“ وہ کسی مباحثے کی شریک لگ رہی تھی۔

”مثلاً.....؟“ بلال نے پوچھا۔

”بھئی تعلیم سکھاتی ہے جھوٹ مت بولو اور ہم بولتے ہیں، کھلم کھلا..... علانیہ اور یہ ہی تو ناکامی ہے۔“

وہ یوں بات کر رہی تھی جیسے زیادہ دلائل دینے پر اسے ثرانی ملنی ہو۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں، خاندان والے کبھی اس کی پروا نہیں کریں گے۔ آپ جانتی ہیں کہ وہ آپ پر انگلیاں اٹھائیں گے۔“

بلال نے جان بوجھ کر کر دار کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کا انداز اب دھیما تھا۔

”ارے واہ..... ایسے کیسے انگلیاں اٹھائیں گے..... یہ معزز..... یہ بھی تو ہو گا ناں وہاں..... یہ میرا

خون نہ پی جائے۔ اگر میں کوئی ہنگی بھینگی کروں تو..... وہیں پہ شوٹ نہ کر دے مجھے..... گاڑ کے نہ رکھ

READING
Section

پیسہ کماتا بن چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ پیسہ ہی تھا جو کہ اس کے حالات بدل سکتا تھا۔

دو دنوں ہاتھوں سے پیار دیتے ہوئے بولی تھیں۔ اور وہ واقعی وہیں بیٹھ کر سارا دن تسبیح پڑھ کر اس کے لیے دعا مانگنا چاہتی تھیں مگر کچھ بشری تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ کافی دیر بعد وہ کھانا بنانے کے لیے اٹھی تھیں۔

مگر یہ کیا..... باوجود اپنی پوری کوشش کے ان کے لیے اٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں جوڑوں کے درد کی شکایت ضرور تھی مگر آج تو لگتا تھا کہ جوڑ فریز ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور اسی اٹھنے کی کوشش میں وہ لڑکھرائیں اور بے توازن ہو کر تخت سے نیچے جا گری تھیں۔ انہوں نے بے ساختہ چیخ ماری مگر گھر میں کوئی ہوتا تو سنتا ناں..... ظفر صاحب بھی گھر سے باہر تھے۔ عجب... بے بسی کا عالم تھا وہ رو پڑیں..... گو کہ وہ ادھیڑ عمر عورتوں کی طرح بھاری بھر کم نہیں تھیں مگر پھر بھی یوں بے توازن ہو کر گرنے سے بری طرح سے چوٹ کھائی تھی۔ دائیں بازو میں درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں۔ انہوں نے اٹھنا چاہا مگر اٹھ نہ پائیں..... بس یہ مشکل خود گھسیٹ کر بیٹھنے کے قابل ہو سکی تھیں۔ نماز کی چوکی سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھے اب وہ بری طرح سے ہانپ رہی تھیں..... دائیں بازو کو اٹھا کر گود میں رکھا۔ تکلیف بے حد تھی اتنی کہ کراہیں ابل رہی تھیں۔ آنسو بچوں کی طرح گالوں پر بہ رہے تھے۔

تکلیف سے زیادہ بے بسی کا احساس رلار ہا تھا۔ اور پھر پہلی بار..... پہلی بار..... کسی مصیبت میں انہوں نے خود کال کر کے بھائی کو بلایا کیونکہ ظفر صاحب کے پاس سیل فون نہیں تھا..... ایک معین کے پاس ہوتا اور ایک گھر میں.....

شجاع دوڑے، دوڑے آئے تھے..... نہ صرف وہ بلکہ ان کی پوری فیملی..... اور تب تک ساجدہ سر جائے نماز پر رکھے بے دم سی ہو کر وہیں بیٹھی رہیں۔ اتنی بھی ہمت نہ تھی کہ کسی ہمسائے کو ہی آواز دے ڈالتیں۔

☆☆☆

اور پھر جیسے صوفی اور حنا کی ڈیوٹی لگ گئی تھی ایک جاتی

یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر خرابی تب پیدا ہوئی جب ماں، باپ اس کی شکل دیکھنے کو بھی ترسنے لگے۔ صبح ناشتا کر کے گھر سے نکلتا تھا..... ایک جگہ سے دوسری جگہ دوسری جگہ سے تیسری اور تیسری سے..... یہ ایک لمبا سلسلہ تھا جو پورے دن پر محیط تھا..... اور اس کے پاس تو اپنی ٹرانسپورٹ تک نہیں تھی۔ سارا دن لوکل ٹرانسپورٹ پر دھکے کھاتا یا پھر کسی کو لیگ سے لفٹ لے لیا کرتا..... پانچ بجے کھانا کھانے گھر آتا تھا اور اکثر یہ کھانا skip ہو جایا کرتا تھا..... کڑی محنت کا دور تھا..... اور وہ کر رہا تھا..... کڑی محنت..... مگر اب یہ محنت..... محنت نہیں لگتی تھی یوں لگتا تھا کہ وہ خود کو ضائع کر رہا ہے..... یا پھر شاید یہ کہ اس نے اپنے غم و غصے کو ازجی کا نام دے کر محنت میں جھونک دیا تھا۔ یوں جیسے کوئی ریت سے بھرے بیگ پہ دھڑا دھڑکے برساتا ہے اور جتنے وہ لکے برساتا ہے اتنا ہی غصہ اور بڑھتا ہے پورا زور لگا کر چڑھتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں کو تکلیف میں مبتلا کیے اس ریت سے بھرے بیگ کو نیست و نابود کر دینا چاہتا ہے۔ معین بھی تو یہی کر رہا تھا مگر سوال یہ تھا کہ وہ کس کو نیست و نابود کرنا چاہتا تھا..... خود کو یا پھر محبت کو خود کو یا پھر..... یا پھر محبت کو.....

کچھ اور وقت گزرا معین نے اپنا دوسرا چانس avail کیا تھا اور آج اسے pcs کا ایگزامین دینے لاہور جانا تھا۔ ایم فل بھی اب بس مکمل ہونے کو تھا۔

”امی میرے لیے دعا کیجیے گا بہت زیادہ.....!“

اسے یک دم یاد آیا کہ اس نے سیل فون امی کے پاس نہیں رکھا اور وہ دروازے سے پلٹ کر وہاں تک آیا تھا اور موبائل اٹھا کر ان کے پاس جائے نماز پر رکھا۔ انہیں جوڑوں کا مسئلہ تھا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا مشکل تھا۔

”جب تک تمہارا پیر ہوتا رہے گا میں یہاں بیٹھی تسبیح پڑھتی رہوں گی۔ فکر نہ کرو معین بیٹا..... اللہ محنت کرنے والوں کو ضرور نوازتا ہے۔“ وہ اس کے سر پر

READING
Section

248 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

چہرے کو دیکھ کر سنجیدگی کا لیول ناپا۔ فائدہ تو کچھ تھا نہیں ناراضی چھپانے کا..... بہتر تھا کہ جھگڑا کہہ کر اصل بات چھپالیتی۔ وہ ”نہ“ کہتی..... معزز کی حرکتیں ”ہاں“ ہوتیں..... تو فائدہ جھوٹ بولنے کا۔

”آنے دو آج اسے تو میں.....“ پھپھونے دانت کچکچائے۔

”نہیں پھپھو..... آپ بیچ میں مت آئیں، میں خود ہی بیچوں گی۔“ صوفی نے صاف ”دیکھ بہن سائڈ پر ہو جا تیرا معاملہ نہیں.....“ والے انداز میں کہا تھا۔ پھپھو چپ ہو گئیں۔

☆☆☆

اس دن سنڈے تھا معزز نے کالج و اکیڈمی سے چھٹیاں لے رکھی تھیں کہ اس کے فائنل ایگزامز تھے۔ ایم فل بھی وہ HEC کی طرف سے ملنے والے اسکالر شپ کی بدولت کر رہا تھا۔ تبھی اس قابل ہو سکا تھا کہ ماں کا علاج کروانے میں مشکل پیش نہ آئی تھی حالانکہ ارادہ بانیگ لینے کا تھا مگر..... ارادوں کا کیا ہے تو وہ بنتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔ صوفی کے لیے اچھا موقع تھا وہ چھت پر میز کرسی لگائے..... پڑھنے میں بری طرح سے غرق تھا..... اس کے پیروں میں صفحات اور بال پوائنٹس مردہ حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ مردہ یوں کہ وہ استعمال شدہ تھے۔ صوفی نے ایک نظر اسے دیکھا..... ماتھے پر بے اختیار ابھر آنے والی تیوریوں کو ہاتھ سے پکڑ کر دور کیا اور پھر چائے کا گنگ عین اس کے سامنے لا کر رکھا۔

معزز نے ایک دم ہاتھ روک کر گنگ کو گھورا..... مگر نظریں اٹھا کر صوفی کو نہیں دیکھا تھا۔

پھر اس نے اشتعال سے گگ اٹھایا، چائے کو اپنے پیچھے موجود دیوار پر گرایا اور ٹھا کر کے کپ میل پر رکھا..... یوں جیسے کہتا ہو.....

”لو پی لی چائے اب.....؟“ اور پھر ویسے ہی لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ صوفی نے حق دق ہو کر اسے دیکھا وہ بھی تو اسی خاندان کی تھی ناں..... اس نے کپ

تو دوسری آجاتی تھی..... ساجدہ کا بازو فریکچر ہو گیا تھا اور کون تھا ان کا جو ساتھ دیتا..... بھائی تھا اور اس کی بیٹیاں۔

حنا کو تو ویسے بھی چپ کسی بیماری کی طرح لگی ہوئی تھی۔ ایک صوفی تھی جب آتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے بہار آگئی ہو۔

جیسے زندگی کھل کر مسکرائی ہو۔ پھپھو صوفی کی کمپنی میں زیادہ خوش رہتی تھیں۔ حنا..... جی پھپھو..... جی اچھا پھپھو..... ٹھیک ہے پھپھو اور بس لفظ ختم..... زبان گونگی..... جبکہ صوفی..... اُف.....

”پھپھو آج آپ کی آنکھوں کے اوپر سرمہ لگاؤں؟ پھپھو آج آپ کی چھیا نہ بنا دوں، چلیں جوڑا بنا دوں..... پھپھو آپ لپ اسٹک کیوں نہیں لگاتیں..... میں لگاؤں؟“ اور کچھ نہ سو جھتا تو پھپھو آپ کو ظفر پھوپا سے کتنا پیار ہے؟ آپ کی لومیرج بھی یا ارنیج..... ظفر پھوپا ویسے پیار سے آپ کو کیا کہتے ہیں..... جان..... یا پھر جانو..... آئے ہائے جانو بڑا ہی چپ ہے بتائیے ناں پھپھو.....“ ایسے ہی تو وہ خوش مزاج و خوش اخلاق مشہور نہیں تھی۔ وہ کبھی ہنستیں کبھی زچ ہو جاتیں اور کبھی ایک عدد پیار سے سر پر چپت لگا دیتیں۔

مگر یہ ہی پٹر پٹر بولتی صوفی اس وقت یک دم خاموش ہو جاتی تھی جب معزز آتا تھا۔ پھپھونے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے درمیان موجود کشیدگی کو محسوس کر لیا تھا گو کہ وہ ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔

معزز آتا..... خود ہی کھانا نکالتا اور پھر اپنے کمرے میں غرُاب..... اور صبح بنانا شتے کے گھر سے باہر..... اور وہ بھی جلدی جان بوجھ کر بہانہ..... اکیڈمی..... حالانکہ اس وقت کوئی اس کا پیچھا کرتا تو وہ سیدھا طلحہ نان سینٹر پر پایا جاتا۔

”تمہارے اور معزز کے درمیان کوئی لڑائی ہوئی ہے؟“ اور پھر بالآخر پھپھونے پوچھ ہی لیا تھا۔

صوفی نے سانس روک کر پھپھو کو دیکھا۔

”جی پھپھو!“ کہہ کر ایک گہری سانس لی۔ دیکھا وہ بھی تو اسی خاندان کی تھی ناں..... اس نے کپ

اٹھایا اور وہیں دیوار پر دے مارا..... ایک زور دار چھنا کے کی آواز گونجی..... معیز نے سشدر ہو کر اسے دیکھا۔ وہ غصے سے سرخ چہرہ لیے اسے گھور رہی تھی۔

”کیا بے ہودگی ہے؟“ وہ بھتا اٹھا۔
 ”کون سی..... چائے والی یا گ والی..... میں نے تو تمہیں بس یہ بتایا ہے کہ غصہ محض چائے کو گرانے سے ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ تمہیں گ بھی چائے کے ساتھ دیوار پر دے مارنا چاہیے تھا.....“ سرخ چہرے کے برعکس وہ ٹھنڈے انداز میں بولی۔

”شٹ اپ صوفی اور دفع ہو جاؤ۔“ صوفی کا چہرہ کچھ اور سرخ ہوا..... دل تو چاہتا تھا کہ ایک ٹھوکر مار کر اس کی میز الٹ دے مگر وہ جانتی تھی کہ کم از کم اسے تو تحمل سے مظاہرہ کرنا ہی تھا۔

”میں بھی اسی ٹون میں..... انہی الفاظ میں تمہیں جواب دے سکتی ہوں..... بلکہ اس سے بھی کڑا جواب دے سکتی ہوں مگر نہیں..... میں ہر حال میں پابند ہوں کہ میں ”تحمل“ کا مظاہرہ کروں۔“ مگر لفظ تحمل بے حد سخت انداز میں چبا کر کہا گیا تھا۔

”تمہیں تکلیف کیا ہے؟“ ٹھنڈی بے عزتی نے معیز کو اور سیخ پا کیا۔

”یہ ہی..... یہ ہی تو میں پوچھنے آئی تھی۔ پھوپھل مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ معیز سے جھگڑا ہولپنے میں نے کہا..... ہاں ہوا ہے اب تم مجھے یہ بتا دو ان کو کیا اصل بات بھی بتا دوں؟ اور پھر جن خاندان والوں نے میرے لڑکوں کے ساتھ پڑھنے پر باتیں نہیں بنائی تھیں اور بالفرض کیس بھی تو وہ سامنے نہیں آئیں، وہ آج یہ کہتے ہوئے پائے جائیں..... ہاں جی دو سال اکٹھے پڑھتے رہے..... یہ تو ہونا ہی تھا..... یہ چن تو چڑھنا ہی تھا۔ کسی اور کے ساتھ نہ سہی..... تمہارے ساتھ ہی گندا کر دیں لوگ مجھے..... میں معیز..... ٹھیک ہے؟“ پہلی بار وہ غصے اور طنز سے بولی تھی۔

اور معیز وہ..... وہ بری طرح چونکا تھا۔
 وہ چند لمحے اس کے سرخ اور برہم چہرے کو دیکھتا رہا۔

”تو تم نے محض اس لیے میری محبت کو دھتکارا صرف اس لیے کہ لوگ تمہیں میرے ساتھ گندا کریں گے، یہ زیادتی ہے۔“ یک دم اس کا لہجہ اس کا انداز بدلا تھا۔ وہ جیسے بات کی تہ تک پہنچا تھا ورنہ تو اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ صوفی ایسی ہو سکتی ہے۔ وہ..... وہ بات بھی کہہ سکتی تھی۔

”دفع کرو لوگوں کو..... وہ تو باتیں بناتے ہی ہیں..... صوفی اپنے اور میرے درمیان سے لوگوں کو نکال دو..... میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ میں اب بھی کہتا ہوں کہ کوئی تمہیں معیز کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا..... بلال بھی نہیں.....“

”تو بلال کو چھوڑ دوں؟ سنگنی کا کیا کروں..... توڑ دوں؟“ اس نے ترنت پوچھا مگر اس کی نظروں میں کھا جانے والا تاثر تھا۔
 ”تو تم ایک سنگنی کے پیچھے اپنی زندگی برباد کرو گی؟“

سوال برائے سوال..... جواب ندارو۔
 ”معیز تم کیوں نہیں قبول کر رہے کہ میں نے اپنی صرف اپنی مرضی سے یہ فیصلہ کیا ہے..... تم کیوں اپنی محبت مجھ پر تھوپ رہے ہو..... مجھے نہیں ہے تم سے محبت.....“ وہ جیسے زچ ہوئی اور پھر ذرا اونچی آواز سے پھٹ پڑنے والے انداز میں بولی تھی۔ معیز کی غیرت پر جو تا پڑا تھا۔ ہر دفعہ کوئی ضروری تھا کہ وہ یوں ہی بے عزت ہوتا۔ ہر دفعہ ہی.....

”صوفی چلی جاؤ ورنہ اللہ کی قسم میں تمہیں مار دوں گا.....“ اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ سے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے سختی سے کہا۔ اس کے چہرے سے ہی اس کے جذبات ضبط کرنے کا اندازہ ہو رہا تھا اور بہت اچھی طرح سے ہو رہا تھا..... وہ چپ رہی مگر ہنسی نہیں.....

”معیز تم ایک پڑھے لکھے انسان ہو..... میری بات کو سمجھو..... مجھے اسپیس دو، انا کا مسئلہ مت بناؤ.....“ یہ کہاں لکھا ہے کہ محبت برابر ہے محبت کے اور یہ کہاں



صرف ہونٹ لرزے تھے

میں آج بھی تپتے صحرا میں
تہانگے پاؤں
اس کے انتظار میں کھڑی ہوں
جس نے جاتے ہوئے
عجلت میں
کوئی عہد و پیمانہ بھی نہ کیا
صرف پلٹ کر
اک لمحے کے لیے اتنا پوچھا تھا
تمہیں مجھ سے محبت ہے؟
مرے ہونٹوں پہ آ کر لفظ
جم سے گئے تھے
صرف ہونٹ لرزے تھے
یہ کہہ کر وہ چلا گیا
تم لڑکی نہیں برف ہو
جب سے اب تک
چلتے صحرا میں
ہونٹوں پہ ٹھہرے ہوئے منجمد
لفظوں کے
تکھلنے کا انتظار کر رہی ہوں
کلام: سیماسراج، پرنسپل عثمانیہ گرلز کالج کراچی

درج ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے تو مجھ پر بھی لازم ہے کہ میں بھی تم سے محبت کرو..... تم مجھ پہ محبت ٹھونس رہے ہو اور دل باختیار نہیں..... کبھی جو تم سے پوچھا جائے ناں کہ ایک لڑکی کی شادی اس کی مرضی سے ہونی چاہیے تو تم ترنت کہو ہاں..... ہاں ہونی چاہیے، ضرور ہونی چاہیے اس کا قانونی اور مذہبی حق ہے کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ تم تعلیم یافتہ ہو اور نہ کا لفظ تمہارے تعلیم یافتہ ہونے سے میل نہیں کھاتا مگر معیز..... عمل.....؟ عمل کہاں ہے؟ میں نے یہ ہی حق استعمال کیا..... یا مجھے یہ حق حاصل نہیں اس لیے کہ معیز بھٹی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ جواب دو۔“

”صوفی تمہاری باتیں صرف میرا دماغ خراب کر رہی ہیں اور کچھ بھی نہیں.....“ وہ اسی بگڑے انداز میں بولا تھا۔

صوفی نے بے بسی سے ایک گہری سانس بھری سیڑھیاں چڑھتے ہی ذرا قاصلے پر معیز کی ٹیبل تھی اور وہ سیڑھیوں والی سائڈ پر معیز کے بائیں رخ پر کھڑی تھی۔

”عورت کی مرضی سے مراد ہمیشہ محبت یا محبت کی شادی ہی نہیں ہوتی معیز..... مرضی میں اور بھی بہت سی چیزیں آتی ہیں..... مثلاً یہ کہ میں دیکھوں کہ تم مجھے کیسا لائف اسٹائل دے سکتے ہو اور جیسا تم مجھے دے سکتے ہو وہ میرے لیے قابل قبول ہے بھی کہ نہیں۔ یہ میرا حق ہے اور تم محبت کے نام پر اسے مجھ سے چھین نہیں سکتے۔ اسے ڈی گریڈ نہیں کر سکتے۔ میری مرضی..... میرا جائز حق ہے اور عورت کی مرضی ہمیشہ محبت ہی نہیں ہوتی۔ یہ بات تمہیں مجھے اپنی زندگی دے کر سمجھانی پڑے گی۔“ وہ بولنے سے باز نہیں آرہی تھی۔

”تم.....“ وہ غرایا..... اور ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھا اور اس کی طرف رخ موڑا تھا۔

”دفع ہو جاؤ صوفی ورنہ.....“ اشتعال شدید تھا۔ چہرہ سرخ اور رگیں ابھری ہوئی تھیں..... صوفی پہلی بار سہم کر پیچھے ہٹی اور آنکھوں میں یک دم آنسو بھر آئے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ اور بھی ابھرا تھا۔

کھودینے کا احساس..... اس نے ہونٹ بھیج کر اسے دیکھا..... نفی میں سر ہلایا اور مڑ کر تیزی سے سیڑھیاں نیچے اتر گئی تھی۔

صوفی اور معیز کی کہانی ادھر ہی ختم..... ٹھیک اسی جگہ پر جہاں معیز کے دل پر ایک اور زخم لگا اور جہاں صوفی کی آنکھ نم ہوئی تھی..... بس ختم..... وہیں پہ ختم..... وہ دونوں ایک دوسرے کے دل سے اتر گئے تھے۔

☆☆☆

پھپھو کے کمرے سے باہر رک کر اپنے آنسو صاف کئے گلا کھنکھار کر صاف کیا..... اور پھر اندر چلی گئی۔

”بہت بڑا بد تمیز ہے آپ کا بیٹا.....“ ناراض لہجے میں بولتی ہوئی وہ پھپھو کے پاس جا بیٹھی تھی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز تھیں۔

”ہائے اتنے زوروں کا غصہ آیا ہوا ہے معیز کو۔ ارے کیا اس نے مگ توڑ ڈالا؟“

”جی.....“ صوفی نے مسکرا کر کہا مگر آنکھیں بھر آئیں اور اس نے آنسو پی لیے اس طرح کہ پھپھو کو نظر نہ آئے۔

”پچھلے دنوں ہی تمہارے پھوپالائے تھے وہ شیشے کے براؤن مگ..... چھ سو کے چھ مگ..... توڑ کر رکھ دیا۔“ پھپھو کا انداز سخت ملال زدہ تھا۔

”بد تمیز سو روپے کا نقصان کر دیا..... چلو خیر مانا کہ نہیں.....؟“

”نہیں مانا..... پر مان جائے گا۔“ وہ اچانک پھپھو کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔ آنسو بہہ گئے..... آرام سے..... نرمی سے..... آسانی ہو گئی تھی۔

”لو! نقصان بھی کر دیا اور مانا بھی نہیں.....“ ان کا ملال کچھ اور بڑھا اور صوفی نے سوچا۔

”امی کہتی تھیں میرے ہاتھ میں سوراخ ہیں..... جب تک روز کے دو تین برتن توڑ نہ لوں..... چین نہیں آتا.....“

وہ چھت پر جانے سے پہلے..... ہاتھ میں ٹرے

پکڑے پھپھو کے پاس آئی تھی۔

”پھپھو..... معرکہ ہونے والا ہے..... یہ مگ ٹوٹنے کی آواز بھی آئی ناں تو آپ نے کمرے سے باہر نہیں نکلنا..... معیز اگر زور، زور سے بولے تب بھی نہیں.....“ اس نے سختی سے تاکید کی تھی۔ وہ جانتی جو تھی کہ مگ ٹوٹنے کی نوبت آ ہی جانی ہے۔

”چلو معیز کے ہاتھوں سے نہ سہی..... اس کے اپنے ہاتھوں سے ہی سہی..... ٹوٹ تو گیا تھا ناں مگ..... کیا مگ..... اور کیا دل.....“ ایک ہی جیسے تھے کانچ کے.....

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

☆☆☆

”معیز یہ دیکھیں۔“ اس نے بے حد پرجوش سے انداز میں شاپنگ بیگ میں سے ایک جوڑا نکالا اور اس کے سامنے پھیلا دیا تھا۔

گوکہ وہ ایسی چیزوں سے بالکل نا بلد تھا مگر پھر بھی معیاری اور خوب صورت چیز کی پہچان ہر ایک کو ہوتی ہے۔

”زبردست.....“ وہ مسکرا کر بولا۔

”کہاں سے لیا ہے.....؟“ وہ روانی میں برانڈ کا نام بتا گئی۔ میز کو جھٹکا لگا..... برانڈ کا نام ہی کافی تھا۔

”اتنے پیسے تھے تمہارے پاس؟“ وہ حیران ہوا۔

”نہیں..... آدھے تھے..... آدھے امی نے دے دیے۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی تھی۔ جیسے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا..... معیز کے ماتھے پر تیوریاں پڑ گئیں۔

”تمہیں میرے دیے ہوئے پیسوں سے ہی شاپنگ کرنی چاہیے تھی۔ مامی کیا سوچتی ہوں گی؟“

”اتنے کانشس کیوں ہو رہے ہیں؟ امی نے دیے بھی مجھے سوٹ لے کر دینا تھا دو کے بجائے ایک اچھا سوٹ لے لیا میں نے۔“ معیز پریشان تھا اور وہ حیران.....

”اب کی بار جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو یقین کرو میں اسے آگ لگا دوں گا مگر یہ گوارا نہیں کروں گا کہ میری بیوی میرے بجائے، اپنے ماں، باپ کے پیسے استعمال کرے..... ٹھیک ہے

READING
Section

کوالٹی ہی معتبر رہے گی جا ہے کتنی چیب ہی کیوں نہ ہو..... وہ یہ بھی نہیں سمجھیں گی کہ آدھے پیسے مامی نے دیے..... انہیں لگے گا کہ یہ فضول خرچی تم نے ہی کی ہے، ان کے بیٹے کی کمائی فضول میں اڑائی ہے۔ اوکے..... سمجھ آیا یا نہیں آیا.....“

”اوکے“ وہ اس نے سر ہلا کر اس کو... جواب دے دیا۔

وہ بار، بار نم آنکھوں کو صاف کرتی ہوئی اس کا بیگ پیک کر رہی تھی..... کل فلائٹ تھی اس کی..... ساری پیکنگ کرنے کے بعد اس نے بھاری بھر کم بیگ کو گھسیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیا..... اور خود تھک کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

معیز کے ساتھ بڑا کچھ جھپلا تھا اس نے مگر جدائی..... آہ..... یہ کہاں سے آگئی تھی۔

کل وہ لندن جا رہا تھا..... پی ایچ ڈی کرنے..... h e c کے اور سیز اسکا لرشپ کے تحت..... اور وہ اس سے کہنا چاہتی تھی نہ جائے..... اس کی لیکچررشپ تھی ناں..... گزارہ ہو رہا تھا..... آگے بھی ہوتا رہے گا..... مگر..... کہہ نہیں پائی تھی۔ وہ کب تک ایسی زندگی جیتے..... اور خوشحالی کی لائن پر کھڑے ہونے کے لیے جدائی تو برداشت کرنی ہی پڑے گی ناں..... ہر کوئی..... ہر کوئی حالات کو بدلنے کے لیے کوشش کرتا ہے..... معیز نے بھی کی تھی۔

”اس کا ارادہ محنت تھا جو کئی بار ٹوٹ پڑنے کو بے تاب ہوا مگر وہ ڈٹا رہا..... مسر رہا..... اڑ گیا.....“ معیز اپنے دوستوں سے مل کر آیا تو کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی رونی شکل ملاحظہ کی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے یار..... اسکا پ ہے ناں..... گھٹنوں باتیں کیا کریں گے۔“ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کا سراپے کندھے سے لگاتے ہوئے معیز نے کہا تھا۔ وہ حسب توقع آنسو بہانے لگی..... کچھ لمحوں کے لیے خامشی چھا گئی۔

”تمہارا بڑا مشکور ہوں میں..... تم نے تنگی میں میرا

میرے پاس اتنے پیسے نہیں جتنے تمہارے ماں، باپ کے پاس ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم ان سے پیسے مانگتی پھر دو..... تم کیوں اپنے اور ان کے اسٹیٹس کے فرق.....“

اور بس..... وہ یک دم گونگا ہو گیا تھا۔ یادوں کو لے کر انسان افسوس، دکھ، پچھتاوے یا خوشی کو ہی محسوس نہیں کرتا کبھی، کبھی یادیں چابک بھی مارتی ہیں..... اور بے حد بری طرح سے مارتی ہیں۔ معیز نے آنکھیں بند کر کے..... ہونٹوں کو بھینچا اور ذرا سی دیر کو بے حس و حرکت ہو گیا..... یوں..... یوں جیسے اسی لمحے میں جا پہنچا ہو..... زور کا وار تھا..... اور پھر منہ کھول کر ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا جو صدے کی سی کیفیت میں بہہ پڑنے والے آنسو لیے گیلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”آئی ایم سوری.....“ وہ اس کے قریب ہوا۔ ”سوری، سوری۔“ رک، رک کر لفظ ادا کیے اور وہ رخ موڑ کر رو پڑی۔ معیز نے بے اختیار ماتھا مسلا۔ پھر اسے کندھوں سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا اور خود کمپیوٹر ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بالکل اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”میں لاؤ ڈ ہو گیا تھا..... سوری فار دیٹ.....“ ”میرے ماں باپ ہیں وہ معیز اور.....“ ”دشش..... دشش..... بس.....“ معیز نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے مزید بولنے سے روکا۔ وہ سسکتی رہی مگر بولی نہیں۔

”زندگی میں بہت سی چیزیں سمجھانے سے سمجھ نہیں آتیں، یہ صرف تجربے سے ہی سمجھ میں آتی ہیں..... تو سمجھ لو کہ مجھے بھی ابھی ابھی ایک تجربہ ہوا.....“ اس کے ہاتھوں کو تھپتھپاتے ہوئے معیز نے کہا۔

”امی کو یہ سوٹ مت دکھانا اور اگر دکھاؤ بھی تو یہ مت بتانا کہ خود خریدا ہے..... کہنا کہ تمہیں مامی نے لے کر دیا ہے..... ساری عمر انہوں نے گن، گن کر پیسے کو خرچ کیا..... پائی، پائی کر کے جمع کیا..... وہ کبھی کوالٹی کے فرق کو نہیں سمجھیں گی۔ ان کے لیے ہمیشہ

ساتھ دیا حالانکہ ایسی زندگی گزارنا تم جیسی لڑکی کے لیے بڑا سخت۔ کڑا امتحان تھا..... بڑا ہی سخت..... مگر..... اُف تک نہ کی تم نے..... مجھے حیرت ہوتی ہے تمہارے صبر پہ..... تمہارے حوصلے پر..... کتنا کپرو مائز کیا ناں تم نے.....“ وہ کندھے سے الگ ہوئی..... دونوں ہاتھوں سے گالوں کو صاف کیا اور اسے دیکھا۔

سوال پر حیران ہوئی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
”کیسی بے تکلی بات ہے.....“ وہ جیسے اس کی بے وقوفی پر ہنسی۔

”نہیں..... مجھے بتاؤ، کیا ایسا تھا؟“ معیز نے اصرار کیا۔

”ہاں..... تھا.....“ اور اس نے شرارت سے بڑے آرام سے اعتراف کیا۔

”مجھے بتایا کیوں نہیں..... نہیں..... بلکہ مجھے پتا کیوں نہیں چلا..... کیوں..... کیوں آخر..... کیوں نہ چلا.....؟“ وہ ایک بار پھر حیران ہوا۔

”پتا تب چلتا ناں اگر میں پتا لگنے دیتی تو.....“ وہ ناز سے بولی۔

اور یک دم..... بالکل ہی اچانک..... معیز کی سمجھ میں ایک بات آئی تھی۔

صوفی بھی تو اس وقت ایسے ہی حیران ہوئی تھی ناں جب اس نے اظہار کیا تھا..... وہ بھی لاعلم تھی۔ بالکل اسی طرح سے جیسے کہ وہ لاعلم رہا تھا اور اس نے لگادی اپنی ساری قوت..... اور چڑھ آیا آج کا دن..... وہ پارس ہونے سے صرف دو قدم دور تھا۔

”کیوں روتی ہو..... چند سالوں کی ہی تو بات ہے..... پھر دیکھنا تم گاڑی پر سیریں کرو گی..... نوکرانیوں سے کام کرواؤ گی..... اچھے، اچھے کپڑے پہنو گی.....“ اسے ساتھ لگائے امی اپنے تئیں اسے پچکار رہی تھیں۔ کیونکہ وہ رورہی تھی..... لیکن حقیقت میں یہ ان سب کی خواہشات تھیں۔ معیز نے سر جھٹک کر آخری بار پاکستان کے آسمان کو دیکھا..... وہ آسمان جہاں پہ اسے تارہ بن کر چمکنا ہی تھا..... ہاں..... اسے چمکنا ہی تھا..... اسی چمک دمک کے ساتھ کہ وہ سب سے نمایاں ہوتا..... سب تاروں میں سے زیادہ چمکدار اور واضح..... آگہی اچھی چیز ہے مگر شرط یہ کہ عمل مثبت ہو۔

☆☆☆

محبت کو ہمیشہ اپنے ہونے کا ثبوت چاہیے ہوتا ہے اور وہ یوں ملتا ہے کبھی کسی لمحے سے اک نظر سے..... کسی

”عورت کو حق ہے کہ اگر وہ چاہے تو معیز! حق مہر میں پہاڑ کے برابر سونا بھی مانگ سکتی ہے اور اگر چاہے تو لوہے کے زنگ آلود چھلے کے بدلے بھی نکاح کر سکتی ہے..... ساری بات چاہت کی ہے..... مرضی کی ہے..... اپنی خوشی کی ہے۔ تمہارے ساتھ زندگی سخت ہوگی..... میں جانتی تھی مگر میرا جذبہ بہت طاقتور تھا معیز..... اتنا کہ اس نے مشکل کو مات دے دی..... میرے لیے چیزوں کو آسان کر دیا۔“ وہ شگفتگی سے بولی تھی۔

”چائے لاؤں.....؟“

”ہاں.....“ معیز نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ چائے بنانے کے لیے اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور معیز نے سوچا کتنا سچ کہا اس نے.....

”ساری بات چاہت کی ہے..... مرضی کی ہے..... چاہت..... مرضی..... خوشی؟ طاقتور جذبہ.....“ وہ بری طرح سے چونکا۔

”تو کیا..... کیا یہ.....؟“ وہ اتنا بے یقین تھا جیسے یہ دنیا کے ناممکنات میں سے سب سے آخری ممکن ہو جانے والی چیز ہو..... وہ اٹھا اور تیزی سے کچن کی طرف گیا۔

”بات سنو.....“ اس کے ہاتھ سے کپ لے کر ایک طرف رکھا اور ہاتھ پکڑ کر کچن سے باہر لے آیا۔

”ارے کیا ہوا..... چائے تو..... اوہو..... معیز.....“ وہ بولتی ہوئی اس کے ساتھ تقریباً گھسٹی ہوئی کمرے تک آئی۔ کمرے میں لا کر اس نے ہاتھ چھوڑ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کیا۔

”کیا ہے؟“ وہ ذرا سا چڑ کر بولی۔

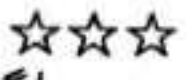
”تو تمہیں مجھ سے محبت تھی؟“ وہ اس کے اس

READING
Section

254 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

حقیقت

تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اسے بھی محبت ہو جاتی مگر یہ مگر یہ کہ اس کی احتیاط نے اسے کبھی معیز کے بارے میں اس طرح سے سوچنے ہی نہیں دیا تھا۔ اور کچھ ذہن پر صرف میتھس میں ایم ایس سی کرنے کا بھوت سوار تھا۔ سب کہتے تھے کہ یہ لڑکوں کا مضمون ہے صوفی نہ پاس ہوگی..... اور صوفی کو جیسے ضد ہوگئی..... اس نے کر کے ہی دکھانا ہے..... اور ضرور دکھانا ہے..... یہ کیا بات ہوئی اب مضمون میں بھی تخصیص ہونے لگی لڑکے عموماً میتھس میں تیز ہوتے ہیں..... معیز بھی تھا..... جبکہ اسے دماغ خرچ کرنا پڑتا تھا..... اس کا سارا دھیان..... ساری قوت وہیں پر صرف ہوتی رہی..... یوں کہ میتھس نے اسے کہیں اور دیکھنے ہی نہیں دیا اور سوچنے ہی نہیں دیا مگر اسے تو کرنا تھا ہر حال میں ہر طرح سے..... وہ حساب کتاب کی اس قدر عادی ہوگئی کہ پھر دنیا کو بھی اسی نظر سے دیکھنے لگی..... دو جمع دو، چار..... چار ہی ہوتا ہے تو پھر اس کا پانچ کیسے ہو جاتا..... وہ کچھ حقیقتوں کی سختی سے قائل تھی۔



صوفی اگلے دن گھر واپس چلی گئی تھی اور حنا کو بھیج دیا۔ اللہ، اللہ کر کے پھپھو کا پلستر کھلا تو دونوں بہنوں کی ڈیوٹی ختم ہوئی۔ ساجدہ زیر بار تھیں..... ممنون تھیں، بیٹیوں کی طرح خیال رکھا دونوں بہنوں نے۔ چار پانچ ماہ گزرے..... موسم بدلا اور پھر سردی آگئی۔

ان کے بازو میں درد رہنے لگا..... کچھ بڑھاپے کی چوٹ تھی اور کچھ سردی کی..... وہ گھر کے کام کاج سے بھی رہ گئیں..... درد بعض اوقات ایسا اٹھتا کہ انہیں بے حال کر کے چھوڑتا..... ایسے میں کبھی کبھار بھتیجیوں کو بھی بلانا پڑ جاتا تھا۔ انہیں اچھا نہیں لگتا تھا..... مجبوری تھی۔ وہ شرمندہ ہوتیں..... کچھ خاندان والوں نے بھی کہنا شروع کر دیا کہ بہولے آئیں..... اب آپ سے گھر نہیں سنبھالا جائے گا۔ اسی دوران معیز pcs کا امتحان پاس کر کے لیکچرار پائینٹ ہو گیا تھا۔ دن پھرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ معیز نے اسی پر بس نہیں کیا تھا۔

واقعے سے یا پھر..... یا پھر شاید کسی گفتگو سے بھی..... اور اس شام کی گفتگو کے بعد ہاں معیزہ باجی کی معنی والی شام یادگار ہوگئی تھی اور یوں صوفی جیسے اس کی نظر میں آگئی تھی۔ کیسی شفاف سوچ کی مالک لڑکی ہے..... ڈرتی ہے نہ جھجکتی ہے..... بولتی جاتی ہے، ہنسے جاتی ہے..... وہ اس کی نظر میں آئی تھی..... پھر عادات کیسے مخفی رہ پاتیں۔ بلال اس پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اپنے دل، جگر، معدے، گردے سب سمیت.....

اس کی نظریں صوفی کو کچھ بتاتی تھیں۔ کوئی سبق پڑھاتی تھیں..... ایک راہ گزر پر چلنے کا اشارہ کرتی تھیں..... مگر صوفی..... وہ ایک کایاں چیز تھی..... پکڑ میں ہی نہیں آتی تھی، جانتی سب تھی۔ جب کسی کی نظریں کچھ سمجھانے پر تل جائیں تو وہ ہی نہیں سکتا کہ عورت لاعلم رہے۔ بلال نے کچھ کہا اور نہ صوفی نے کوئی جواب دیا۔ وہ منتظر تھا کہ اس کی تعلیم مکمل ہو جائے..... اس نے سارے خاندان سے بھڑک کر داخلہ لے لیا تھا..... محبت چاہے ٹھانٹیں مارتی رہ جاتی لیکن اتنا تو اس کا حق تھا کہ اسے تعلیم مکمل کرنے دی جائے اور پھر جیسے ہی تعلیم مکمل ہوئی تو بس..... انکار کرنے کی وجہ کوئی نہیں تھی۔ بلال ہر لحاظ سے اس کے لیے جچتا تھا..... حسب نسب، مال و دولت، شکل صورت، دین اور دنیا..... سب میں وہ اس کے برابر کا ہی تو تھا..... تو انکار کیسے ہوتا.....



وہ دونوں پرائمری تک ساتھ پڑھے تھے پھر اسکول الگ، الگ ہو گئے۔ لڑکوں کا علیحدہ اور لڑکیوں کا الگ..... معیز بچپن کا دوست تھا، اکٹھے کھیلے تھے۔ تھپڑ کھائے بھی تھے اور مارے بھی تھے۔ اکٹھے روئے تھے تو ہنسے بھی تھے۔ خاندان بھر میں وہ دو ہی تھے جو کہ بچے تھے باقی تو کوئی لڑکپن میں تھا تو کوئی جوانی کو چھوڑا تھا۔

یہ دوستی اور بھی پروان چڑھی جب وہ دونوں یونیورسٹی میں اکٹھے ہوئے تھے۔ صوفی کو اعتراف تھا کہ ان دو سالوں میں وہ معیز کے بے حد قریب ہوگئی

READING Section

”صوفی.....“ اور پھر وہ ایک دم بہن کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔
 ”میں سمجھتی رہی معیز تم سے۔“ وہ روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔

”آہ..... میں کتنی پاگل تھی۔“

”صوفی..... میرے ساتھ یہ بھی ہونا تھا.....
 محبت یوں بھی مل جایا کرتی ہے..... ہیں صوفی.....؟“
 اور صوفی کیا کہتی..... وہ تو خود حیرت زدہ تھی۔
 حیرت یہ نہیں تھی کہ حنا اور معیز..... حیرت یہ تھی
 کہ حنا، معیز کو چاہتی تھی اور اسے پتا بھی نہیں چلا۔
 اس نے روتی ہوئی گلے کا ہار بنی بہن کو کھینچ کر
 اتارا اور شانوں سے پکڑ کر سامنے کیا.....

”دل پیا کر دا اے کہ رکھ کے چھوڑ مارا تیری
 بو تھی تے.....“

صوفی کا غصہ ہمیشہ اپنی مادری زبان میں ہی ٹھنڈا
 ہوتا تھا۔ اردو میں غصہ کرنے کا مزہ ہی نہیں آتا تھا۔
 ”دیا کیوں نہیں.....“ (بتایا کیوں نہیں) اس
 نے آنکھیں نکالیں۔

”وہ میں سمجھی تم اور معیز.....“ حنا منمنائی۔
 ”در فٹے منہ حنا..... مجھے پتا تھا کہ بلال نے مجھ
 پر نظر رکھی ہوئی ہے تو پھر میں معیز کی طرف کیسے
 دیکھتی.....؟“ پہلے غصے سے اور پھر آنکھ مارتے ہوئے
 بے حد شرارت سے کہا تھا۔

اور حنا ترگالوں کے ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔
 صوفی نے اس کی طمانیت کو محسوس کیا اور خود بھی
 مطمئن ہو گئی۔ محبت ایک طاقتور جذبہ ہے۔ اتنا کہ ہر
 چیز کو تہس نہس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
 زندگی ہنس پڑنے کو بے تاب تھی مگر ایک شخص تھا
 جس نے اب بھی ہونٹوں کو پابند کر چھوڑا تھا۔ وہ اب
 بھی اڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

اور یوں حنا کی شادی معیز سے ہو گئی حالانکہ
 تیاری تو صوفی کے لیے تھی لیکن جب نصیب تن کر کھڑا

پھر سے اسکا لرشپ کے لیے اپلائی کر دیا تھا۔ اسے پی
 ایچ ڈی جو کرنی تھی۔ اماں کی حالت کو دیکھتے ہوئے معیز
 نے انہیں کام والی رکھنے کا مشورہ دیا اور..... اور انہوں
 نے اسے شادی کا مشورہ دے ڈالا۔ اور بس.....

حالات ایسے تھے کہ معیز کو ماننا ہی پڑا.....
 وہ..... وہ حنا کے لیے بھند تھیں۔ اپنا خون..... اپنی
 بچھتی..... اور سب سے بڑھ کر جو اس نے خدمت
 کی..... اوپر سے بڑھاپے کا ایسا نقشہ کھینچا کہ معیز کو
 ہتھیار ڈالنے ہی پڑے تھے۔ ویسے بھی جب نصیب
 سامنے تن کر کھڑا ہو تو مفر کے ملتا ہے؟

☆☆☆

صوفی کی شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری
 تھیں۔ گو کہ ابھی دن طے نہیں ہوئے تھے مگر تیاریاں
 زور شور سے جاری تھیں۔ بلال کے ابا بیرون ملک
 میں تھے تو بس ان کا ہی انتظار تھا۔ سال سے اوپر ہو چلا
 تھا مگر ان کے آنے کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ کچھ
 کاغذات کا مسئلہ تھا۔

وہ جیسے ہی آتے..... شادی کے دن طے
 ہو جانے تھے۔ ایسے میں ایک دن ساجدہ خاتون
 آگئیں..... حنا کا ہاتھ مانگنے..... ریحانہ اور شجاع ہکا بکا
 رہ گئے تھے۔

ساجدہ سوچنے کے لیے وقت دینے کو بھی تیار
 نہیں تھیں۔ ان کا اصرار تھا کہ شادی جلد کر دیں کیونکہ
 معیز نے اسکا لرشپ کے لیے اپلائی کر رکھا ہے جیسے ہی
 لگا وہ باہر چلا جائے گا۔ کچھ اپنی طبیعت کا رونا..... تو
 بس..... حنا کو جب پتا چلا کہ پھپھو کس لیے آئی ہیں تو وہ
 ساکت ہو کر مرنے والی ہو گئی تھی۔

”صوفی..... صوفی..... پھپھو..... میرے
 لیے.....“ وہ گرتی پڑتی لڑکھڑاتی ہانپتی ہوئی آئی تھی۔
 ”پھپھو معیز کا رشتہ مانگنے آئی ہیں..... میرے
 لیے.....؟“ اس کا ”میرے لیے.....“ کہنا اس طرح
 سے تھا جیسے شدید بے یقینی لاحق ہو چکی ہو..... صوفی بھی
 دم بخود تھی۔

READING
 Section

256 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

”ٹھیک ہوں.....“ وہ گود میں رکھے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

اور پھر خاموشی.....
”میں..... میں بچوں کو دیکھتی ہوں۔“

”بیٹھ جاؤ صوفی..... مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ اس نے نرمی سے ٹوک دیا۔ اور صوفی..... اس کی تو جیسے سانس رک گئی تھی۔ وہ اب..... اب کیا کہنے والا تھا۔ صوفی نے وحشت سے اسے دیکھا اور پھر گردن موڑ کر اندر دیکھا۔ حنا کی بچوں کو ڈانٹنے کی آواز باہر تک آرہی تھی۔

”جہاں اتنے سال گزر گئے وہاں ساری عمر بھی گزار لیتے..... راز..... راز ہی رہتا مگر یہ معین.....“ اس نے پھر سے گھبرا کر معین کو دیکھا اور کچھ کہنا چاہا۔
”میں تم سے سوری کرنے آیا ہوں۔“ اس کی آنکھوں کی گھبراہٹ یک دم حیرانی میں بدلی۔
”سوری.....؟“

”اس دن کی بدتمیزی کے لیے جس دن میں نے تمہاری چائے گرائی تھی۔“

وہ ساکڈ ہوئی اور پھر ہنس دی۔
”تم معین..... تم اب اتنے عرصے بعد.....“ وہ ایک دم پُر سکون ہوئی تھی۔

”ہاں اب..... اتنے عرصے بعد..... کیونکہ اتنے عرصے بعد جا کر ہی تو سمجھ آئی ہے کہ تم ٹھیک تھیں..... اور تم نے اس دن ایک، ایک بات بالکل ٹھیک کہی تھی کہ صوفی..... میں تم پر محبت ٹھونس رہا تھا، وہ چیز جو ٹھونسنے کی ہرگز نہیں تھی۔ آئی ایم سوری فار ایوری تھنگ۔“ اس نے شفاف سی مسکراہٹ سے ہلکی سی شرمندگی سے کہا۔

اور صوفی کو لگا دل میں کھپا کا نٹا بس اب نکل گیا تھا۔ وہ بھی مسکرا دی تھی۔

”تم اس دن روئی کیوں تھیں؟“
”کس دن.....؟“ صوفی نے چونک کر پوچھا۔
”اسی دن جس دن گم تم نے توڑا اور الزام مجھ پر

ہو جائے تو مفر کہیں نہیں۔
پہلے امریکن اسٹائل میں کچن بنا..... پھر سارے گھر میں ٹائلز لگیں، اے سی لگا..... اس کے بعد کام والی آئی..... گھر کی ساری پرانی چیزیں ایک کے بعد ایک کر کے بدلنے لگیں۔ فریج سے لے کر بوسیدہ پردوں تک سب..... اور پھر گاڑی بھی آگئی۔ اور اب وہ گھر..... پھپھو کا گھر تو لگتا ہی نہیں تھا۔ یہ حنا کا گھر تھا۔ وہ اب براڈ ڈکٹرے پہنتی..... کریڈٹ کارڈز سے شاپنگ کرتی تھی۔ اس کی بیٹی روٹس میں پڑھتی تھی۔ جادو کی چھڑی گھومی تھی..... نہیں..... معین پارس بن گیا تھا۔

وہ آج Nust کا پروفیسر تھا۔ اکیس گریڈ کا پروفیسر..... سب سے نوجوان پروفیسر کہ جس کا گریڈ اکیس تھا۔ زندگی کو بدلنا ہی تھا اور وہ بدل ہی گئی تھی۔ لیکن معین کو مسکراہٹ کا راز دے گئی تھی۔ کچھ حقیقتیں بے حد اچھی طرح سے سمجھا جاتی ہیں۔

☆☆☆

موسم ابر آلود تھا اور یہ اس کی امی کا ہی گھر تھا۔ وہ دونوں بہنیں بڑے عرصے بعد یوں اکٹھی ہوئی تھیں وہ برآمدے میں بیٹھ کر چائے پی رہی تھیں اور ان کے بچے سامنے لان میں کھیل رہے تھے۔

صوفی کا بیٹا اور حنا کی بیٹی..... اچانک بارش کے قطرے گرنے لگے تو حنا بھاگ کر بچوں کو بلانے گئی تھی۔ وہ انہیں لے کر اندر چلی گئی۔ دونوں نے ہی کپڑے خراب کر لیے تھے۔

صوفی نے مسکرا کر حنا کو دونوں بچوں کو لے جاتے دیکھا اور پھر گردن موڑ کر برستی بارش کو دیکھنے لگی۔

”کیسی ہو صوفی.....؟“ کوئی بے حد آہستگی سے آکر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا اور نرمی سے پوچھا۔

وہ ساکت ہوئی..... کتنا عرصہ ہو گیا تھا نا..... اس نے بارش سے نظریں ہٹائیں۔ اسے دیکھنے سے گریز کیا..... کپ سامنے ٹیبل پر موجود ساسر میں رکھا اور بولی۔

quantity نہیں quality دیکھوں گی اور نہ تم
quantity پر زور دو گے۔ تم اس فرق کو کیوں نہیں
سمجھتے معیز.....“ اس نے بے حد زچ ہو کر یہ بات کہی
تھی۔ اور وہ بے حد بے یقین ہو کر اس کی بات سن رہا
تھا۔ اس نے کیا، کیا گنوا دیا تھا..... وہ اس کا دل نہیں
دکھانا چاہتی مگر.....

”صوفی..... تم..... تم اپنے اور میرے بیچ پیسے کی
لائن کھینچ رہی ہو؟ تم..... تم اتنی مادہ پرست ہو؟ محبت
کوئی معنی نہیں رکھتی تمہارے لیے..... تم..... مادہ
پرست عورت.....“ آخر میں اس کا بے یقین انداز تشفر
سے بھر گیا تھا۔

”تم معیز..... تم اتنی محنت کیوں کر رہے ہو؟
ہاں..... کیوں؟ انہی مادی چیزوں کے لیے
ناں..... زندگی میں مادی چیزوں کی اہمیت ہوتی
ہے..... گرنہیں ہوتی تو وہ مادی رویہ ہوتا ہے..... اور
مجھے بتاؤ..... انگلیوں پر گن کر بتاؤ کہ کب میرا رویہ ایسا
ہوا..... کیا میں نے تمہارے ساتھ اسی پلیٹ میں
نہیں کھایا جس میں تم نے کھایا؟ کیا میں اسی جگہ پر نہیں
بیٹھی جہاں تم بیٹھے ہو.....؟ کب میرے غلو ص میں تم
نے کمی دیکھی؟ میں نے کب غرور تکبر کیا؟ کب میں
نے تم سے تمہاری مالی حالت کی وجہ سے قطع تعلق کرنا
چاہا..... معیز میرا حق ہے کہ میں اپنے لیے..... اپنے ہی
جیسے اسٹینڈرڈ کا جوڑ حاصل کروں..... مجھے حق ہے کہ
میں اپنی مرضی سے شادی کروں“ دکھ اور غصہ صوفی کی
آواز کی لرزش کا باعث بنا تھا۔

”تم..... تم صوفی..... تم لکھوالو مجھ سے..... تم
پچھتاؤ گی..... ساری عمر پچھتاؤ گی..... تم نے محبت کو
دھتکارا..... تم اس کو ترسو گی..... ساری عمر ترسو گی..... یاد
رکھنا..... تم ترسو گی.....“ بے حد سخت نفرت سے کہہ کر
اس نے چلے جانا چاہا مگر صوفی یک دم آگے آگئی تھی۔

”کیوں..... کیوں ترسو گی میں محبت کو.....
کیوں.....؟ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا.....؟ ہرگز بھی
گناہ نہیں کیا..... میں نے تم یا تمہاری محبت کو دھتکارا

ڈال دیا، تمہیں معلوم ہے تمہارے جانے کے بعد امی نے
مجھے کتنی سنائی تھیں۔“ وہ یوں بولا جیسے اسے ابھی تک ان
صلواتوں کا غم ہو..... وہ سر جھٹک کر ہنس پڑی۔

”میں نے اس دن تمہیں کھو دیا تھا معیز..... ایک
اچھے کزن اور دوست کو..... اس کے بعد اسے مجھے نہیں
ملنا تھا..... وہ نہیں ملا..... اور نہ ملے گا۔“

چند لمحوں کے بعد سنجیدگی سے اس نے کہا تھا۔
معیز کے دل عین دل میں کچھ چبھا اور پھر چبھتا ہی
گیا..... وہ ٹھیک کہتی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تو ہو گیا تھا مگر
وہ بے تکلفی نہیں ہو سکی تھی۔ صوفی ایک گہری سانس بھر کر
اٹھی۔ میز سے برتن سے سیٹے۔

”چائے لاتی ہوں۔“ اور پھر کہہ کر چل گئی تھی۔
اور معیز برستی بارش کو دیکھتے ہوئے اسی دہکتے دن
میں جا پہنچا۔

☆☆☆

”مجھے مجبور مت کرو معیز کہ میں تمہیں دکھی کرو.....
مان جاؤ اور چلے جاؤ..... جو ہو رہا ہے ہونے دو..... سمجھ لو
کہ یہ ہی میری مرضی ہے..... کوئی اچھی لڑکی.....“
”شٹ اپ.....“ اور وہ دہاڑا۔

صوفی نے آنکھیں بند کر کے اس دہاڑے سے اٹھنے
والی لرزش کو اپنے اندر ہی اندر روکا، ایک گہری سانس
بھر کر خود کو پرسکون کیا اور معیز کا چہرہ دیکھا۔ پھر اس نے
خود کو وہ بات کہنے کے لیے تیار کیا۔ اس نے کہا.....
”معیز میں تمہارے ساتھ ایڈ جسٹ نہیں
ہو سکتی.....“

”کیا مطلب ہے نہیں ہو سکتی..... بودے بہانے
مت بناؤ صوفی..... تمہاری اور میری بہت اچھی انڈر
اسٹینڈنگ ہے۔“

”انڈر اسٹینڈنگ اس وقت بھک سے اڑ جاتی
ہے جب سوشل اسٹینڈس میں زمین آسمان کا فرق ہو
..... تب میں کبھی تمہاری بات نہیں سمجھوں گی..... اور نہ
تم میری..... میرے لیے اسٹینڈرڈ اہم ہوگا اور
تمہارے لیے یہ سب سے زیادہ غیر اہم چیز..... میں

READING
Section

258 ماہنامہ پاکیزہ اکتوبر 2015ء

حنا نے کیسے اچھے طریقے سے ہر چیز کو سہہ کر
وقت گزارا تھا۔

معیز کو بھی محبت نامی چیز بھول جاتی اور وہ مصر رہتا
کہ صوفی اسی لائف اسٹائل کو اپنائے جو کہ معیز کا تھا۔

مگر وہ کیسے اپناتی..... پچیس سال جس لائف
اسٹائل کے ساتھ اس نے زندگی گزاری تھی..... پچیس

دنوں میں کیسے بھول جاتی..... کیسے ترک کر کے معیز کے
رنگ میں رنگ جاتی..... اور کتنے ہی لمحات آئے معیز کی

زندگی میں جہاں صوفی کی کہی باتوں نے کیسی روشنی کا سا
کام کیا تھا۔ اور اسے حنا کو سمجھنے میں آسانی ہو گئی تھی اور

حنا..... محبت ایک باکمال چیز ہے..... کمال کرنا اور کمال
دکھانا یہ ہمیشہ اس کے لیے اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا

ہے۔ حنا کے لیے معیز کے حالات مسئلہ ضرور تھے مگر اس
میں وہ محبت نامی ہمت تھی جس کی بددلت اس نے وہ سو

سال کے جیسے لمبا عرصہ گزار لیا تھا۔ معیز خوش تھا، مطمئن
تھا، ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔

صوفی سے محبت ہوئی تھی اب وہ محبت تھی یا نہیں
تھی..... اس سوال کا جواب ڈھونڈنا بے مقصد تھا۔ اور

وہ یہ بات جانچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس سے حنا کی
عزت پہ حرف آتا..... اور ایسا تو وہ نہیں چاہتا تھا وہ ایسا

کبھی نہ گوارا کرتا.....

مگر یہ کم بخت دل..... سب کچھ سمجھنے، جاننے،
پرکھنے اور معترف ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں خالی

پن کا شکار رہتا تھا۔

اس کو جو کسی زمانے میں محبت نامی گھن لگا تھا ناں
اس گھن نے دل کے ایک حصے کو کھالیا تھا..... ایک کسک

سی تو اب رہتی ہی تھی۔ اور ادھوری..... نامکمل
چیزیں..... بعض اوقات مکمل ہو کر بھی مکمل نہیں ہوتیں۔

اور اس بات کا احساس دلاتی رہتی ہیں کہ
ہاں..... کچھ نامکمل ہے اور کچھ ادھورا ہے ہاں ایسا تھا
ہے اور ایسا ہی ہے۔

بھی نہیں..... میں نے نرمی سے انکار کیا ہے اور
بس..... میں ضرور تمہارے ساتھ تمہارے ہی جیسی

زندگی گزار لیتی اگر مجھ میں بھی محبت کی طاقت ہوتی
تو..... مجھ میں نہیں ہے اتنی طاقت اور تم..... تم یاد رکھنا

معیز بھٹی..... یاد رکھنا اور دیکھنا..... میں تمہارے
سامنے..... انہی آنکھوں کے سامنے ایک اچھی اور

خوشحال زندگی گزاروں گی اور لکھو الو مجھ سے محبت مجھے
مل کر رہے گی۔ مجھے ترسنا نہیں پڑے گا کیونکہ میں نے

گناہ نہیں کیا..... اپنے حق کو استعمال کیا ہے اور
بس..... اور معیز ایک غصے بھری..... نفرت بھری نظر

اس پر ڈال کر وہاں سے چلا آیا تھا۔

☆☆☆

”چائے.....“ معیز ایک دم چونکا..... صوفی اس کے
سامنے ٹیبل پر چائے کا کپ رکھ رہی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا

تھا..... صوفی اس کے سامنے تھی اور ایک خوشحال زندگی کا
چلتا پھرتا اشتہار نظر آتی تھی۔ بلال کی محبت بھی کوئی ڈھکی

چھپی بات نہیں تھی۔ وہ آج بھی اس پر فریفتہ تھا۔
وہ سمجھ سکتا..... اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ صوفی اور اس

کی شادی ہوتی تو پھر محبت کہیں نہ ہوتی۔ ان کے
درمیان موجود فرق محبت کو کھا جاتا۔

وہ سمجھ سکتا تھا اور اب تو بہت ہی اچھی طرح سے سمجھ
سکتا تھا..... صوفی کے سر پر اپنی ذات، اپنی عزت کے

گٹھڑ کا بار تھا۔ جسے وہ سر پر اٹھائے، ایک پتلی ڈوری پر
ننگے پاؤں چلتی تھی اور لوگ..... ان کی نظریں..... اس

کے پیروں پہ..... کب پھسلے..... کیوں پھسلے.....
کیسے پھسلے اور کس کے لیے پھسلے۔ تو صوفی احتیاط

کرتی تھی اور اتنی کرتی تھی کہ محبت کے وجود سے خالی
ہو گئی۔ وہ سمجھ سکتا تھا سو سال جتنا عرصہ نہ سہی.....

”ہیرا“ بننے میں کئی سال کا عرصہ لگ ہی گیا تھا۔ اور
اگر یہ عرصہ صوفی کے ساتھ گزرتا تو ہوتا

کیا.....؟ لڑائیاں، جھگڑے، ناچاقیاں..... صوفی کو
سمجھ ہی نہیں آتا کہ کپرو ماٹز کیسے کرنا ہے جبکہ محبت خود

بخود یہ گر سکھادتی ہے۔



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



دعا..... مددِ الہی

ذلتیں مقدر بن جاتی ہیں..... اور ان کا علاج تو صرف یہ ہے کہ اپنے برے اعمال کو ترک کریں اور انتہائی سچے دل اور انتہائی عاجزی و انکساری سے اپنے رب کے حضور استغفار اور دعا کریں یہ نسخہ علاج خود اس رب کریم کا بتایا ہوا ہے۔ آج وقت کی سب سے اہم ضرورت دعا ہے۔ دعا کے لغوی معنی ہیں خدا سے مانگنا..... التجا، مناجات.....

جن اعمال سے اللہ تعالیٰ کی مدد زمین پر اترتی ہے ان میں دعا بھی شامل ہے۔ دعا ایک ایسی عظیم الشان عبادت ہے جو ہر حال میں نفع لے کر آتی ہے۔ ایک ایسی عبادت ہے جو طوفانوں کا رخ موڑ سکتی ہے۔ دعا عاجزی کا نہایت خوب صورت اظہار ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے..... "اے میرے رسول ﷺ جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں، ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کہیں وہ مجھے پکارے قبول کرتا ہوں۔" (سورہ بقرہ: ۱۸۶)

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ "تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو۔ گڑ گڑا کر کے بھی اور چپکے، چپکے بھی..... واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو حد سے نکل جائیں۔" (سورہ اعراف، ۵۵)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا..... "تم میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا۔ (یعنی دعا مانگنے کی توفیق دے دی گئی) اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دیے گئے۔"

تمام تعریف اور تمام تر حمد و ثنا صرف اور صرف اللہ عزوجل کے لیے ہے جو اس کائنات کا مالک اور خالق ہے جس نے رات کو پردہ بنایا اور نیند کو آرام و راحت کا ذریعہ اور دن کو حرکت و عمل کے لیے قرار دیا۔ جس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے زندہ اور سلامت اٹھایا اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی خواب گاہ بنا دیتا۔"

ایسی حمد اس رب کی..... جو ہمیشہ، ہمیشہ رہے اور جس کا سلسلہ قطع نہ ہو اور مخلوق اس کی گنتی کا شمار نہ کر سکے..... اے میرے رب! تو نے ہمیں پیدا کیا اور ہر لحاظ سے درست پیدا کیا۔ موت دی اور زندہ کیا۔ بیمار ڈالا اور شفا بھی بخشی..... سب سے زیادہ اے رحم کرنے والے مالک ہماری حاجتیں پوری فرمادے۔ ہماری دعاؤں کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت عطا فرما..... کہ اطمینان ہو تو تیری فرمانبرداری میں..... سرور ہو تو تیری عبادت میں..... خواہش ہو تیرے ثواب کی تیری رضا کی..... اور کنار کشی ہو تو ان چیزوں سے جو تیرے دردناک عذاب کا باعث ہیں..... بے شک تو بڑی قدرت والا ہے۔ درود و سلام ہو ہمارے پیارے نبی سرور کائنات ﷺ پر ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر..... (آمین)

☆☆☆

آج تمام دنیا میں جس کثرت سے مسلمان ہیں مگر اسی قدر پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں اور سخت مصائب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جب کردار اور اعمال میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو یہ تمام پریشانیاں، تکالیف اور

اللہ تعالیٰ سے جو دعا مانگی جاتی ہے ان میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ یہ پسند ہے کہ اس سے (دنیا و آخرت میں) عافیت کی دعا مانگی جائے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں، میرے متعلق جیسا چاہے وہ گمان کرے۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ، ساتھ ہوتا ہوں جو شخص مجھے دل میں یاد کرتا ہے اس کو اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور جو اجتماع میں میری یاد کرتا ہے میں اجتماع میں اس کی یاد کرتا ہوں۔ میری جمعیت اس کی جمعیت سے بہتر ہے جو مجھ سے بالشت بھر قریب ہوتا ہے میں اس سے ہاتھ بھر قریب ہوتا ہوں جو میری طرف چند قدم چلتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”دعا مومن کا ہتھیار ہے..... دین کا ستون ہے اور زمین و آسمان کا نور ہے۔“

سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”دعا عبادت کا مغز ہے۔“

”اللہ کے نزدیک دعا سے زیادہ عظیم چیز کوئی نہیں ہے۔“

”بندہ دعا کے ذریعے تین چیزوں میں سے ایک جانے نہیں دیتا یا تو اس کا گناہ بخش دیا جاتا ہے یا اسے کوئی اچھی چیز فوراً عطا کر دی جاتی ہے..... یا آئندہ کے لیے خیر کر لی جاتی ہے۔“

”اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل و کرم کی درخواست کرو..... اللہ کو یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی اس سے مانگے.....“

حضرت ابو ذر فرماتے ہیں کہ۔ ”نیکی کے ساتھ دعا کی اتنی ضرورت ہے جتنی کھانے میں نمک کی.....“ حضرت سلمان فارسی نے فرمایا..... ”بندہ جب خوشی میں اللہ کو پکارتا ہے (اور اللہ کو عیش میں یاد رکھتا ہے) پھر اس پر مصیبت پڑتی ہے تو فرشتے عرض

کرتے ہیں پروردگار! تیرے بندے پر مصیبت پڑ گئی ہے اس کا دکھ دور کر غرضیکہ فرشتے عرض کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش قبول فرمالیتا ہے اور اس کے برعکس جب بندہ سکھ میں اللہ کو نہیں پکارتا، دکھ پڑنے پر پکارتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں اب اللہ کو پکارا..... غرض یہ کہ فرشتے اس کی سفارش نہیں کرتے..... تو جو اللہ پر اعتماد کرتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔

ایک قول ہے کہ تم مجھے توبہ کے ساتھ یاد کرو..... میں مغفرت کے ساتھ تم کو یاد کروں گا۔ تم دعا سے مجھے یاد کرو، میں عطا کے ساتھ تم کو یاد کروں گا..... تم گناہوں پر پشیمانی کے ساتھ میری یاد کرو، میں کرم کے ساتھ تمہاری یاد کروں گا..... تم دلوں سے میری یاد کرو، میں بے چیدیاں دور کر کے تمہاری یاد کروں گا۔ تم ایمان کے ساتھ میری یاد کرو، میں جنت دے کر تمہاری یاد کروں گا۔ تم اظہارِ عجز کر کے میری یاد کرو..... میں نفرتیں معاف کر کے تمہاری یاد کروں گا..... تم میری یاد دہیں کرو جہاں تم ہو..... میں تمہاری یاد دہیں کروں گا جہاں میں ہوں..... بلاشبہ جو اللہ کا ذکر کرتا ہے اللہ اس کو یاد رکھتا ہے..... جو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اللہ اس کو زیادہ دیتا ہے۔

☆☆☆

حضرت ابراہیم ادھم سے کسی نے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں مگر وہ دعا قبول نہیں کرتا.....؟ آپ نے جواب دیا..... ”تم رسول کو پہچانتے ہو مگر ان کے طریقے پر نہیں چلتے..... قرآن کو جانتے ہو مگر اس پر عمل نہیں کرتے..... اللہ کی دی ہوئی نعمت کھاتے ہو مگر اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ جنت کو جانتے ہو مگر اس کو طلب نہیں کرتے۔ دوزخ کا اقرار کرتے ہو مگر اس سے خوف نہیں کھاتے۔ شیطان کو پہچانتے ہو مگر اس سے مقابلہ نہیں کرتے بلکہ اس کی موافقت کرتے ہو، موت کو جانتے ہو مگر اس کے لیے تیاری نہیں کرتے مردوں کو دفن کرتے ہو مگر عبرت حاصل نہیں کرتے تم نے اپنے عیبوں کا خیال چھوڑ دیا

اور لوگوں کی عیب جوئی میں لگے ہوئے ہو۔“ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”دعا مومن کا ہتھیار اور دین کا ستون ہے۔“

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ: ”دعا مومن کی سپر ہے جب تم بار بار دروازہ کھٹکھاؤ گے تو وہ تمہارے لیے کھول دیا جائے گا۔“

حضرت امام زین العابدین کا ارشاد ہے کہ: ”دعا بلا و مصیبت کو نال دیتی ہے۔“ حضرت امام جعفر صادق کا ارشاد ہے کہ: ”دعا تیز دھا روالی انی سے بھی زیادہ موثر و کارگر ہوتی ہے۔“ اسلام میں دعا کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ اس کے ترک پر جہنم کی وعید تک وارد ہوتی ہے..... چنانچہ ارشاد الہی ہے کہ: ”مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا وہ لوگ جو غرور و تکبر کی وجہ سے میری عبادت سے منہ موڑ لیتے ہیں وہ ذلیل ہو کر جہنم واصل ہوں گے۔“

دعا سے عبد و معبود کا رشتہ استوار اور عبودیت اور الوہیت کا رابطہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے۔

دعا کے چند آداب ہیں اگر ان کا خیال کر لیا جائے تو بہت بہتر ہوگا.....

دعا کے لیے افضل اوقات کا خیال رہے..... جیسے سال میں عرفے کا دن ہے..... مہینوں میں رمضان ہے۔ دنوں میں جمعہ ہے اور اوقات میں سحر کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ”اور سحر کے وقت وہ استغفار کرتے ہیں۔“

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ”جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ دنیا پر جلوہ افروز ہوتا ہے (بے شک وہ لامکاں و لازماں ہے) اور فرماتا ہے کہ کوئی ہے جو مجھ سے دعا مانگے اور میں قبول کروں، کوئی ہے جو مجھ سے درخواست کرے اور میں عطا کروں، کوئی ہے جو مجھ سے مغفرت چاہے اور میں اس کی مغفرت کروں.....“

سرکارِ دو عالم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”اذان اور تکبیر کے درمیان دعا نہیں ہوتی۔“

”رونے دار کی دعا رد نہیں ہوتی۔“ ”سجدے کی حالت میں دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں۔“

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ”بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، سجدے میں بکثرت دعائیں کیا کرو.....“ دوسری جگہ ارشاد فرمایا.....

”مجھے رکوع اور سجدے میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، اس لیے رکوع میں اللہ تعالیٰ کی عظمت بیان کیا کرو اور سجدے میں دعا کے لیے کوشش کیا کرو..... سجدے اس لیے متعین کیے گئے ہیں کہ تمہاری دعائیں قبول ہوں۔“ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا۔

”تمہارا رب حیا والا ہے، کریم ہے۔ اسے اس بات سے شرم آتی ہے کہ اس کا بندہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور وہ انہیں خالی لوٹا دے۔“

حضرت انس فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ دعا کے لیے اس قدر اٹھایا کرتے تھے کہ بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو جاتی تھی۔

آنحضرت کا یہ معمول تھا کہ جب آپ دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے تو اپنے چہرے پر پھیرے بغیر نہ ہٹاتے.....

دعا میں قافیہ بندی کا تکلف نہ کرے..... اس لیے کہ دعا مانگنے والے کی حالت آہ و زاری کرنے والے کے مشابہ ہے..... ایسے شخص کو تکلف زیب نہیں دیتا..... بہتر ہے کہ صرف وہی دعائیں مانگے جو ماثورہ منقول ہیں، ہر شخص دعا کے صحیح طریقے سے واقف نہیں..... ایک بزرگ کسی واعظ کے پاس سے گزرے وہ دعا میں قافیہ بندی کر رہا تھا..... بزرگ نے فرمایا..... تم اللہ کے سامنے فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کر رہے ہو، میں نے حبیبِ عجمی کی دعا سنی ہے..... وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا کرتے تھے۔

”اے اللہ! ہمیں خالص بنا..... اے اللہ ہمیں قیامت کے روز رسوا مت کرنا..... اے اللہ ہمیں خیر کی

توفیق عطا کر۔“

کر رہے ہو۔“ اللہ کی حمد و ثنا سے دعا کی ابتدا کرو۔
حضرت ابوسلیمان دارنی فرماتے ہیں کہ جو شخص
اللہ سے کچھ مانگنا چاہے اسے اپنی دعا کے اول و آخر
درود شریف ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ
دونوں درود قبول کر لے گا تو رب کی شان سے یہ ممکن
ہی نہیں کہ دونوں درودوں کے درمیان کی دعائیں رد
فرمادے۔

☆☆☆

دعا کا تعلق باطن سے ہے۔ قبولیت کا اصل اور
قریب ترین سبب یہ ہے کہ بارگاہِ خداوندی میں صدق
دل سے توبہ کرے اور حقداروں کے حقوق ادا کرے۔
بنی اسرائیل میں ایک مرتبہ زبردست قحط پڑا۔
حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ تین بار شہر سے باہر
تشریف لے گئے اور بارش کے لیے دعا کی لیکن دعا
قبول نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بذریعہ وحی مطلع
فرمایا..... کہ میں تمہاری قوم کی دعا قبول نہیں کروں گا
کیونکہ تم لوگوں میں ایک چغتل خوری کی عادت میں مبتلا
ہے۔“ حضرت موسیٰ نے عرض کیا۔ ”یا اللہ
ہمیں بتلا دیجیے کہ وہ کون شخص ہے تاکہ ہم اسے الگ
کر دیں۔“ حکم ہوا..... ”اے موسیٰ چغتل سے میں تم کو
منع کرتا ہوں اور میں ہی چغتل کھاؤں.....“ آپ نے
بنی اسرائیل کو کہا کہ تم سب چغتل سے توبہ کرو سب نے
توبہ کی..... اس وقت مینہ برسنے لگا۔

☆☆☆

حضرت مالک بن دینار فرماتے ہیں کہ بنی
اسرائیل پر قحط پڑا۔ وہ کئی بار بارش کے لیے نکلے لیکن
بارش نہیں برسی ان کے پیغمبر پر وحی ہوئی کہ ان سے کہہ
دو کہ تم میری طرف ناپاک بدنوں سے نکلتے ہو اور وہی
ہاتھ میرے سامنے پھیلاتے ہو، جن سے بہت سے
خون کیے اور تم نے اپنے پیٹوں کو حرام سے بھر رکھا ہے،
اب میرا غصہ تم پر زیادہ ہو گیا ہے..... اور دوری کے
سوا تم کو مجھ سے ہرگز کچھ نہیں ملے گا۔

حضرت عطا سلمیٰ کہتے ہیں کہ ایک سال

حضرت حبیب عجمی کی دعاؤں کی برکات مشہور
ہے۔ کہتے ہیں جب وہ دعا کرتے تھے تو ایک بڑی
تعداد دعا میں شریک ہوتی تھی۔

جو دعائیں سرکارِ دو عالم ﷺ سے مروی ہیں، ان
دعاؤں میں بے ساختگی ہے تکلف اور بناوٹ نہیں.....
مثال کے طور پر یہ دعا ہے کہ ”میں امن و امان کی
درخواست کرتا ہوں وعید کے دن! اور جنت کی
درخواست کرتا ہوں ہمیشگی کے دن مقرب بندوں کے
ساتھ..... شاہدین کے ساتھ، رکوع کرنے والوں اور
سجدہ کرنے والوں کے ساتھ..... اور ان لوگوں کے
ساتھ جو عہد پورا کرتے ہیں..... بے شک تو رحیم ہے
محبوب ہے تو کرتا ہے جو چاہتا ہے.....“ اس طرح کی
بہت سی دعائیں آنحضرت ﷺ سے منقول ہیں.....
اگر کوئی شخص منقول دعائیں نہ پڑھنا چاہتا ہو تو تضرع
(رونا، گڑگڑانا) اور انکساری کے ساتھ دعا کرے.....
کہ اللہ تعالیٰ کو عبارت آرائی کے بجائے تضرع اور
انکساری پسند ہے۔

☆☆☆

”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو چاہتا ہے تو اسے
آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے تاکہ اس کی گریہ و زاری
سنے.....“
”قبولیت کے یقین کے ساتھ دعا مانگو اور یہ جان
لو کہ اللہ تعالیٰ غافل دل کو قبول نہیں کرتا۔“

”جب تم دعا کرو تو رغبت زیادہ رکھو اس لیے کہ
اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز بڑی نہیں ہے۔“ دعا کے
الفاظ تین بار کہے..... آنحضرت ﷺ تین مرتبہ دعا
فرماتے اور تین مرتبہ سوال کرتے، اگر دعا کی قبولیت
میں تاخیر ہو تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے،
آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ تمہاری دعا اس
وقت قبول ہوگی جب تم جلدی نہ کرو گے اور یہ نہ کہو گے
کہ میں نے دعا کی تھی مگر قبول نہیں ہوئی۔ جب دعا کرو
تو بار، بار سوال کرو اس لیے کہ تم رب کریم سے دعا

زبردست قحط پڑا، ہم سب بارش کی دعا کے لیے آبادی سے باہر پہنچے..... قبرستان میں اچانک حضرت سعدون مجنون سے ملاقات ہوگئی انہوں نے مجھ سے دریافت کیا..... ”عطا! کیا قیامت کا دن ہے یا قبروں سے لوگ نکل کھڑے ہوئے ہیں؟“ میں نے عرض کیا..... ”نہ قیامت کا دن ہے اور نہ لوگ قبروں سے نکلے ہیں..... یہ تو شہر کے لوگ ہیں جو بارش کی دعا کے لیے آئے ہیں۔“ سعدون نے پوچھا..... ”کون سے دلوں سے دعا مانگنے آئے ہو، آسمانی دلوں سے یا زمینی دلوں سے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”آسمانی دلوں سے۔“ انہوں نے کہا..... ”اے عطا! لوگوں سے کہہ دو کہ وہ کھوٹے سکے نہ چلائیں، پرکھنے والا بڑا بیٹا ہے، وہ تمہارے دام فریب میں گرفتار نہیں ہوگا۔“ پھر انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا اور ربِّ کائنات کے حضور یہ دعا کی ”اے اللہ! تو اپنے بندوں کے گناہوں کی وجہ سے اپنے شہروں کو برباد مت کر..... بلکہ اپنے اسمائے مکنون کے صدقے میں اور ان نعمتوں کے طفیل میں جو پردہ غیب سے ظاہر نہیں ہوتیں، بکثرت بیٹھا پانی عطا فرما..... تاکہ اس پانی کے ذریعے تیزی زمین سیراب ہو اور تیرے بندے اپنی پیاس بجھائیں تو ہر چیز پر قادر ہے۔“ راوی کہتے ہیں کہ سعدون مجنون ابھی دعا ختم بھی نہیں کر پائے تھے کہ آسمان پر بادل چھا گئے اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔

سعدون یہ کہتے ہوئے چل دیے..... ترجمہ..... ”زاہد و عابد لوگ فلاح پاب ہوئے کیونکہ انہوں نے اپنے رب کے لیے فاقہ کشی کی ہے، وہ اپنی بیمار آنکھوں کو حق کی محبت کے لیے نیند سے دور رکھتے ہیں، رات گزر جاتی ہے اور وہ جاگتے رہتے ہیں، اللہ کی عبادت میں اس قدر مشغول ہیں کہ لوگ ان کو پاگل سمجھتے ہیں۔“

☆☆☆

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں طواف کر رہا تھا مہری نگاہ ایک عورت پر پڑی جس کے

کندھے پر ایک چھوٹا سا بچہ تھا اور وہ بار، بار کہہ رہی تھی کہ یا کریم یا کریم عہدک القدیم..... میں نے اس عورت سے دریافت کیا..... کہ تیرے اور اللہ کے درمیان کیا عہد ہے.... تب اس عورت نے بتایا کہ ایک بار میں کشتی میں سوار ہوئی، تاجروں کی جماعت بھی ہمارے ساتھ تھی۔ اتفاقاً بہت زور کا طوفان آیا اور کشتی غرق ہوگئی۔ صرف ایک تختے پر میں میرا بچہ اور ایک حبشی مرد جو دوسرے تختے پر تھا سلامت رہے..... جب صبح ہوئی تو وہ حبشی مرد پانی کو ہٹاتے، ہٹاتے میرے قریب آیا اور ہمارے تختے پر سوار ہو گیا..... اس کے ناپاک ارادے کو دیکھ کر میں نے اس کو کہا۔ اے بندہ خدا، ہم اس مصیبت میں گرفتار ہیں اور تو اپنی شیطانی ہوس کو پورا کرنا چاہ رہا ہے..... میرے انکار پر اس حبشی مرد نے ہاتھ لمبا کر کے میرے بچے کو جو میری گود میں تھا اٹھا کر دریا میں ڈال دیا..... میں نے آسمان کی جانب نگاہ کی..... اور اپنے مہربان رب کو پکارا..... ”اے اللہ! تو اس آدمی کے قلبی ارادوں کے درمیان حائل ہونے والا ہے۔ اپنی طاقت اور قدرت سے میرے اور اس کے درمیان دوری کر دے کہ تو سب چیزوں پر قادر ہے.....“ قسم ہے اللہ کی میں ابھی ان کلمات کو پورا بھی نہ کر پائی تھی کہ ایک جانور منہ کھولے ہوئے دریا سے نکلا اور اس حبشی کو نگل گیا..... اور غوطہ لگا کر پانی کی تہ میں چلا گیا..... اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی قوت سے مجھے اس شخص سے بچالیا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے..... پھر مجھے دھکیلتی ہوئی ایک جزیرے پر لے گئیں۔ میں نے سوچا کہ یہاں کی سبزی اور پانی پر گزارہ کروں گی جب تک اللہ میری نجات کی کوئی صورت پیدا نہ کر دے..... کہ وہی نجات دینے والا ہے، اس طرح چار روز اور گزر گئے۔ پانچویں دن دور سے ایک کشتی نظر آئی میں نے ٹیلے پر چڑھ کر ان کی طرف اشارہ کیا..... ان میں سے تین آدمی ایک ناؤ پر سوار ہو کر میری طرف آئے اور مجھے لے کر کشتی میں داخل ہوئے..... میں جب کشتی میں داخل ہوئی تو کہا

READING
Section

264 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

دعوت قبول فرماتے تھے۔ تاجر امید و ناامیدی کی حالت میں بیٹھا رہا..... تب شیخ نے تاجر کی دعوت قبول فرمائی۔

تاجر نے نہایت پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا..... جب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ابو غالب کے مکان پر تشریف لے گئے تو وہاں پہلے ہی شہر کی معزز ترین ہستیاں موجود تھیں۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ انواع و اقسام کے لذیذ کھانے چنے گئے۔ آخر میں ابو غالب کے دو ملازم ایک بہت بڑا مٹکا اٹھا کر لائے اور اسے کمرے کے ایک گوشے میں رکھ دیا۔ حاضرین کی نظریں سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کے چہرہ مبارک پر مرکوز تھیں مگر آپ سر جھکائے استغراق کے عالم میں تشریف فرما تھے۔

کچھ دیر بعد حضرت شیخ نے حکم دیا کہ مٹکا اٹھا کر آپ کے پاس لایا جائے۔ خادم نے وہ مٹکا اٹھا کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔

”اسے کھول دو.....“ آپ نے حکم دیا..... جب مٹکے کا منہ کھولا..... تو اس کے اندر ایک جذامی، اپانچ اور ناہینا لڑکا تھا.....

”ابو غالب.....! تم نے اس بچے کو مٹکے میں کیوں قید کر رکھا ہے؟“ حضرت شیخ نے اپنے میزبان سے پوچھا۔

”حضور! میرا بچہ جذام کے مرض میں مبتلا ہے اندھا اور اپانچ ہے، اسے کہاں لے جاؤں؟“ ابو غالب زار و قطار رو رہا تھا۔

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کھڑے ہوئے اور بیمار لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا۔ ”بچے! اللہ کے حکم سے باہر آ جا اور پروردگار کی اس خوب صورت دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ۔“ جیسے ہی حضرت شیخ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ اپانچ اور جذامی لڑکا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ پھر وہ خوشی کے عالم میں چینٹا ہوا ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی دعا کا اثر دیکھ کر

دیکھتی ہوں کہ میرا بچہ جس کو اس حبشی نے دریا میں ڈال دیا تھا ایک شخص کے پاس ہے۔ یہ دیکھ کر مجھ سے رہانہ گیا۔ اور بے ساختہ آگے بڑھ کر اس شخص سے بچے لے کر چومنے لگی۔ اور کہا یہ میرا بچہ ہے میرے جگر کا ٹکڑا ہے، کشتی والے کہنے لگے تم پاگل ہو دیوانی ہو یا تمہاری عقل ماری گئی ہے، تب میں نے کہا کہ میں پاگل نہیں ہوں پھر سارا ماجرا ان کو سنایا..... میرا واقعہ سن کر ان لوگوں نے سر جھکا لیا پھر بولے اے لڑکی..... تو نے عجیب قصہ سنایا ہم بھی تجھے اپنی بات سناتے ہیں۔ جو تمہارے لیے بھی تعجب کا باعث ہوگا..... ہم کشتی میں سوار چل رہے تھے کہ ایک بڑا دریائی جانور ہمارے سامنے آکھڑا ہوا..... یہ بچہ اس کی پشت پر تھا اور ایک منادی آواز دے رہا تھا کہ اگر تم لوگ اس بچے کو لے کر نہ چلو گے تو تم ہلاک ہو جاؤ گے..... چنانچہ ہم میں سے ایک آدمی آگے بڑھا اور اس دریائی جانور کی پشت سے اس بچے کو لے آیا۔ اس کے کشتی پر آتے ہی وہ جانور غوطہ مار کر غائب ہو گیا..... ہمیں اس سے بھی اور تیرے بیان کیے ہوئے قصے بھی بہت تعجب ہوا..... چنانچہ ان سب نے اللہ کی بارگاہ میں توبہ کی..... اور اس عظیم رب کا شکر ادا کیا..... جو اپنے مظلوم بندوں کی دعاؤں کو سنتا ہے اور مصیبت زدہ کی مدد کرتا ہے..... بے شک پاک ہے وہ اپنے بندوں پر لطف کرنے والا..... سبحان اللہ.....

☆☆☆

ایک بار بغداد کا ایک مشہور تاجر ابو غالب فضل اللہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی مجلس میں حاضر ہوا۔ اور آپ کو دعوت دی..... ”سیدی! دعوت قبول کرنا مسنون ہے، اس لیے آپ مجھ گناہ گار کی دعوت بھی قبول فرمائیں۔“

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے۔ اہل مجلس کو خیال گزرا کہ آپ انکار فرمادیں گے کیونکہ آپ دولت مندوں کے مکان پر تشریف نہیں لے جاتے تھے اور نہ کسی امیر کبیر شخص کی

READING
Section

تمام حاضرین دم بخود تھے۔ ابو غالب کے مکان میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میزبان اور مہمانوں کی اس بے خبری کے عالم میں سیدنا شیخ کھانا کھائے بغیر وہاں سے چلے آئے۔

☆☆☆

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ اجودھن میں قیام پزیر تھے۔ ایک دن ایک غریب بوڑھی عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی.....
”میں بیوہ ہوں، اور میری تین جوان بیٹیاں ہیں، آپ دعا فرمادیں کہ ان کی شادی کا بندوبست ہو جائے۔“ بوڑھی عورت کا سوال سن کر حضرت بابا فریدؒ نے اپنے خادم سے فرمایا: ”آج جس قدر نذریں آئی ہیں وہ ان خاتون کے حوالے کر دو۔“
خادم نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا..... ”سیدی آج تو کوئی بھی نذر لے کر حاضر نہیں ہوا“ حضرت بابا فریدؒ کچھ دیر سوچتے رہے اس دوران بوڑھی عورت رونے لگی۔

”میں نے تو آپ کی سخاوت کے بڑے چرچے سنے ہیں، اب میں کہاں جاؤں؟ آپ کے سوا میرا کوئی سہارا نہیں۔“

”سہارا تو صرف اللہ کا ہوتا ہے، اس فقیر کو بھی اسی کا سہارا ہے.....“ حضرت بابا فریدؒ نے عورت کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔

عورت اپنی ضرورتوں کی اسیر تھی بابا سے ضد کرتی رہی..... آخر بابا فریدؒ نے کہا.....

”بی بی.....! مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھالاؤ.....“
عورت پہلے تو حیران ہوئی پھر خانقاہ سے باہر جا کر مٹی کا ڈھیلا اٹھالائی۔

حضرت بابا فریدؒ نے بہ آواز بلند تین مرتبہ سورہٴ اخلاص پڑھی اور مٹی کے ڈھیلے پر دم کیا..... اہل مجلس حیران رہ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مٹی کا وہ حقیر ٹکڑا سونے کی ڈلی میں تبدیل ہو گیا۔

”تمہاری بیٹیوں کی شادی کے لیے یہ کافی رہے“

گا۔“ حضرت بابا فریدؒ نے سونے کا وہ ٹکڑا عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

”ہاں یہ بہت ہے۔“ عورت نے سونے کا وہ ٹکڑا لیا اور خانقاہ سے باہر نکل گئی۔ گھر پہنچ کر عورت کی نیت بدل گئی... سونا بنانے کا نسخہ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ حریص عورت نے غسل کیا صاف کپڑے پہنے اور خوشبو لگائی۔ پھر بڑے، بڑے پتھر سامنے رکھ کر سورہٴ اخلاص کا ورد کرنے لگی..... حضرت بابا فریدؒ نے سورہٴ اخلاص صرف تین بار پڑھی تھی مگر اس عورت نے اپنے عمل میں شدت پیدا کرنے کے لیے تین سو بار پڑھی اور پتھروں پر دم کر دیا..... عورت کا خیال تھا کہ یہ سارے پتھر آن کی آن میں سونے کے بن جائیں گے مگر بار، بار دم کرنے کے باوجود پتھروں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

وہ حریص عورت تین دن تک یہی عمل کرتی رہی مگر جب کچھ نہ ہو سکا تو مجبوراً حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگی۔

”آپ نے غسل کیا اور نہ خوشبو لگائی بس تین بار سورہٴ اخلاص پڑھی اور مٹی سونا بن گئی..... میں نے پورے گھر کو خوشبو سے مہکا دیا۔ کلام الہی کا ورد کرتے، کرتے اپنی زبان گھس ڈالی مگر پتھر، پتھر ہی رہے۔ آخر کیوں.....؟“

بوڑھی عورت کی بات سن کر بابا فریدؒ مسکرا دیے..... ”اللہ نے تمہاری بیٹیوں کی شادی کا بندوبست کر دیا..... اس کا شکر ادا کرو اور اپنے ذہن کو دوسرے معاملات میں مت الجھاؤ۔“

مگر نادان عورت پر بابا فریدؒ کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ایک ہی ضد کرتی رہی..... ”آخر میرے عمل میں کیا کمی رہ گئی پتھر سونا نہ بن سکا۔“

”تیرے عمل میں کوئی کمی نہیں تھی۔ غسل کا اہتمام تھا، خوشبو کی کثرت تھی محنت تھی..... غرضیکہ تیرے پاس سب کچھ تھا بس تیرے منہ میں فرید کی زبان نہ تھی۔“ یہ کہتے، کہتے حضرت بابا فریدؒ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے یہ اظہارِ تشکر کے آنسو تھے کہ ربِّ عظیم نے اپنے ایک

READING
Section

266 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

اعضا ڈھیلے پڑے ہوئے ہوں، آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوں اور تمام انداز و اطوار سے مسکینی اور بے بسی ظاہر ہو رہی ہو کہ عبدیت کی یہی شان ہے کہ بندہ اپنے پروردگار کو نہایت عاجزی کے ساتھ گڑ گڑا کر پکارے..... دعا کرنے سے پہلے کوئی نیک عمل ضرور کیجیے..... مثلاً صدقہ و خیرات کیجیے..... کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیجیے یا نفل نماز کا اہتمام کیجیے..... اپنے رب کی بارگاہ میں اپنی ضرورت و حاجت رکھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھیے پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کیجیے اور نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجیں۔ اس کے بعد اپنی ضرورت اس کی بارگاہ میں بیان کیجیے..... دعا کی قبولیت کے معاملے میں اپنے رب پر پورا بھروسہ رکھیے اگر دعا کے اثرات جلد ظاہر نہ ہوں تو مایوس ہو کر دعا چھوڑ دینے کی غلطی کبھی نہ کیجیے..... قبولیت دعا کی فکر میں پریشان ہونے کے بجائے صرف دعا مانگنے کی فکر کیجیے..... برابر دعا کرتے رہیے..... اللہ کے حضور اپنی عاجزی، احتیاج اور عبدیت کا اظہار خود ایک عبادت ہے۔ مومن کی شان ہی یہ ہے کہ وہ رنج و راحت، دکھ، سکھ، تنگی و خوشحالی، مصیبت و آرام بہر حال میں اپنے اللہ کو ہی پکارتا ہے۔ اس کے حضور اپنی حاجتیں رکھتا ہے اور مستقل اس سے خیر کی دعائیں کرتا رہتا ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ دعا کا خاتمہ آخر میں (آمین) کہہ کر کرے..... اگر اس نے ایسا کیا تو بس اللہ تعالیٰ سے ملے کرالیا۔

☆☆☆

اے اللہ.....! اس مضمون کو تحریر کرتے ہوئے مجھ سے دانستہ یا نادانستہ کوئی غلطی کوئی کوتاہی یا کوئی کمی ہوگئی ہو تو میرے رب اپنی اس حقیر بندی کو معاف فرمادے کہ تو بہت معاف کرنے والا رب ہے..... آمین۔

اس مضمون کی تیاری میں سات مستند کتب سے مدد لی گئی ہے۔

بندے کی زبان میں (دعا) کیسیائی تاثیر پیدا کر دی تھی۔

☆☆☆

ہمیں روشنی چاہیے تو ہمارے لیے بہترین مینارہ نور اولیائے کرام صحابہ کرام، آل رسول اور سب سے بڑھ کر آپ ﷺ کی حیات طیبہ ہے..... اگر ہم ذرا سا غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے ساری رات رو رو کر بہت عاجزی سے گڑ گڑا کر اللہ سے دعائیں مانگیں لیکن کیا کسی بھی موقع پر آپ ﷺ نے کوئی دنیاوی چیز یا آسائش مانگی.....؟ کیا زندگی کے مسائل سے نجات کی دعا مانگی؟ یقیناً نہیں..... تو پھر ہماری دعائیں دنیا تک محدود کیوں رہتی ہیں۔

آپ ضرور دعا مانگیں اور گڑ گڑا کر مانگیں اور وہ مانگیں جو آپ ﷺ مانگا کرتے تھے..... ہم اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق مانگیں، ہم اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ سکتے ہیں..... اس کی پناہ مانگ سکتے ہیں، شیطان کے خلاف، اللہ سے اس کا رحم مانگ سکتے ہیں اور اگر کہیں اللہ ہمیں توفیق دے تو ہم اللہ سے خود اس کی ذات مانگ سکتے ہیں..... یہ مانگنا ہی تو ہے کہ ہم اس سے اس کی ذات مانگ لیا کریں۔

تو دعا صرف اپنے رب سے مانگیں..... کیونکہ وہی ہماری دعائیں سننے والا ہے۔ دعا گہرے اخلاص اور پاکیزہ نیت سے مانگیں اور اس یقین کے ساتھ مانگیں کہ جس رب سے آپ مانگ رہے ہیں وہ آپ کے حالات کا پورا، پورا علم بھی رکھتا ہے اور آپ پر انتہائی مہربان بھی ہے۔ دعا پوری توجہ، یک سوئی..... اور حضور قلب سے مانگیں..... اپنے گناہوں کے انبار پر نگاہ رکھنے کے بجائے اپنے رب کے بے پایاں عفو و کرم اور بے حد و حساب جو دوسخا پر نظر رکھیں..... دعا انتہائی عاجزی اور خشوع و خضوع کے ساتھ مانگیں..... اس طرح کہ آپ کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال سے لرز رہا ہو۔ سر اور نگاہیں جھکی ہوئی ہوں آواز پست ہو اور

رفعت شبانہ

اپنی اسی ایک جگہ رخصتی تک رہتی ہے۔ ابٹن بھی وہیں لگایا جاتا ہے اور وہ پیلے کپڑوں میں ہی پورا وقت رہتی ہے۔ ابٹن لگانے کے لیے باہر سے کسی ماہر عورت کو بلایا جاتا ہے۔ دو تین دن کے بعد مہندی کی رسم ہوتی ہے جن کو وہ ”بکی“ کہتے ہیں۔ اس میں تمام برادری والے شرکت کرتے ہیں۔ باہر سے ناچنے والی میراثیوں کو بلایا جاتا ہے تین چار گھنٹے وہ ناچتی ہیں اور جتنے بھی مہمان ہوتے

ہمارا معاشرہ رسومات سے عبارت ہے ہم کتنے بھی جدت پسند ہو جائیں لیکن ہماری جڑیں اسی معاشرے سے جڑی ہوئی ہیں، کوئی بھی تہوار یا شادی ان رسومات کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ حالانکہ ان تمام رسومات کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ہمارے ملک پاکستان میں مختلف زبانوں کے لوگ رہتے ہیں۔ یعنی پاکستان مختلف پھولوں کا گلدستہ ہے۔ ہر



رفعت شبانہ اور ان کے شوہر تاج محمد انصاری

ایک کے رسم و رواج، طور طریقے، ملبوسات اور رہن سہن تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بہت حد تک ملتے جلتے ہیں۔

میرا تعلق کراچی سے ہے، میں اسی شہر میں پیدا ہوئی، تعلیم اسی شہر میں حاصل کی لیکن شادی سندھ کی ایک فیملی میں ہوئی۔ جن کا تعلق لاڑکانہ سے ہے۔

میری شادی میں ویسے تو کوئی خاص رسم نہیں ادا کی گئی لیکن شادی کے بعد میں سسرالی رشتے داروں، بھانجوں، بھتیجیوں کی شادیوں میں شرکت کرتی رہی ہوں اس لیے وہاں کی رسومات کا مجھے اندازہ ہے۔ ویسے تو مجھے عام طور پر رسومات پسند نہیں ہیں لیکن ناپسندیدگی کے باوجود میں نے ان میں شرکت کی ہے۔

سب سے پہلے وہاں مایوں کی رسم ہوتی ہے جس میں دلہن کے منہ پر ایک پیلے رنگ کا ماسک سی کر باندھ دیا جاتا ہے جس میں آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور دلہن

ہیں اور گھر والے سب ایک دوسرے کے سروں پر رکھ کر پیسے دیتے ہیں۔ جسے ”گھور“ (ghor) کہتے ہیں پھر کھانا ہوتا ہے زیادہ تر پلاؤ بنتا ہے۔ پھر دلہن کے گھر سب جاتے ہیں اور اس کی رسم کرتے ہیں۔

دلہن کے سر پر تیل لگاتے ہیں، منہ میٹھا کرتے ہیں اور اس کے ہاتھ پر پیسے رکھتے ہیں۔ جسے وہ خرچی کہتے ہیں اور دلہن کی چوٹی کا ایک بل کھول دیتے ہیں

READING
Section

268 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

آرسی مصحف ہوتا ہے۔ یہ قرسی رشتے دار آکر دلہن اور دولہا کے ٹکریں مارتے ہیں یعنی دلہن کے سر کو دولہا کے سر سے ٹکراتے ہیں اور پھر خرچی دیتے ہیں (روپوں کی صورت) دولہا کو گلاس سے دودھ پلایا جاتا ہے دونوں ایک دوسرے کا جھوٹا دودھ پیتے ہیں۔ دولہا، دلہن کے ہاتھ میں چاول دیتا ہے، دلہن، دولہا کے ہاتھ میں دیتی ہے تاکہ آپس میں محبت اور برکت رہے۔

روٹی یا کپاس توڑ کر ایک دوسرے کو دیتے ہیں، ان تمام رسومات کے بارے میں اگر پوچھو کہ یہ کیوں کرتے ہیں تو معلوم نہیں، ہمارے آباؤ اجداد کرتے رہے ہیں اس لیے ہم بھی کرتے ہیں۔

ان تمام رسومات کو کرتے، کرتے رات کے دو تین بج جاتے ہیں اور پھر تاروں کی چھاؤں میں دلہن رخصت کر دی جاتی ہے۔ دوسرے دن ولیمہ ہوتا ہے۔

ہاں کی شادیوں کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ سارا خرچہ دولہا والے کرتے ہیں۔ (زیادہ تر معاشروں میں یہی ہے۔۔۔ ہوتا ہے سوائے انڈیا پاک کے) دولہا والے (جتنے دن بھی فنکشن ہوتا ہے) پورا کھانا وہی بنواتے ہیں اگر چار دن شادی ہوگی تو چاروں دنوں کا کھانا دولہا پکوائے گا۔ شادی والے دن بھی دلہن والوں کو کھانا دے گا جو وہ اپنے مہمانوں کو کھلائیں گے۔

دلہن والے صرف جبینز اور زیورہ دلہن کو دیتے ہیں، دولہا والے دلہن کو شادی کا جوڑا دیتے ہیں اور دلہن والے دولہا کو۔

دولہا والے ساری برادری کے بڑے لوگوں کو جوڑے دیتے ہیں یعنی ہر گھر میں ماں، باپ کو یا گھر کے بڑے کو۔

صبح دلہن کی ماں کے گھر سے بھر پور ناشتا آتا ہے۔ پھر صبح دولہا گھر کے بڑوں کو سلام کرنے جاتا ہے وہاں دولہا کو سب پیسے دیتے ہیں جس کو خرچی کہتے ہیں۔ غرضیکہ ہر جگہ کی الگ، الگ رسمیں اور رواج ہیں اور یہ سب خوشی سے کی جاتی ہیں۔

اس طرح سات سہاگنیں دلہن کی چوٹی کے سات بل کھولتی ہیں۔

یہ سب ان کی مہندی والے دن ہوتا ہے اور رات بھر سب جاگتے ہیں۔ اور خوب ہلا گلا کرتے ہیں۔

مہندی کے اگلے دن رخصتی ہوتی ہے، سب لوگ مختلف تیاریاں کر رہے ہوتے ہیں، اگر سردیاں ہوتی ہیں تو دولہا کے لیے بھری (busri) بنائی جاتی ہے یہ اس طرح ہوتی ہے جیسے کہ ہمارے گھروں میں دال بھری یا آلو بھری روٹی ہوتی ہے بھری میں گڑ چل کر باریک کر لیا جاتا ہے اور اس کو روٹی میں بھر کر اصلی گھی کے ساتھ پکایا جاتا ہے۔ پھر دوپہر تک گھر کے سارے مرد جمع ہوتے ہیں اور

پھر دولہا کے بازو پر امام ضامن باندھا جاتا ہے جس کو گھانا کہتے ہیں۔ دعا کرائی جاتی ہے اور پھر گنج بکس بٹتے ہیں اور پھر دو تین بجے تک تمام خواتین اور مرد ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں وہاں دولہا کو ایک صونے پر بٹھایا جاتا ہے اور پھر سب رشتے دار خاص طور پر نوٹوں کے ہار اس کے گلے میں ڈالتے ہیں۔ دولہا کے علاوہ اس کے ماں اور

باپ کو بھی ہار پہنائے جاتے ہیں۔ ان ہاروں کے پیچھے دینے والوں کے نام بھی لکھے ہوتے ہیں پھر دوپہر کا کھانا ہوتا ہے۔ جو پانچ بجے تک جاری رہتا ہے اس دوران خوب ڈانس ہوتا ہے رات کے ٹیک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے پھر تقریباً نو دس بجے دلہن کو پارلر لے جایا جاتا ہے وہاں دلہن تیار ہوتی ہے اور دوبارہ رات کا کھانا ہوتا ہے۔

سارے لوگ دوبارہ تیار ہوتے ہیں پھر تقریباً گیارہ بجے نکاح ہوتا ہے پھر دلہن بھی پارلر سے تیار ہو کر آ جاتی ہے پھر زمین پر ایک بڑا قالین بچھایا جاتا ہے۔ خاندان کے سارے لوگ جمع ہوتے ہیں وہاں پر دلہن اور دولہا کو آسنے سانسے بٹھاتے ہیں۔ ان کے ساتھ بہت ساری خواتین بھی بیٹھتی ہیں اور ایک قرسی رشتے دار خاتون قریب بیٹھ کر تمام رسومات کرتی ہے۔ اس میں دلہن قالین پر لال کپڑے پر بیٹھتی ہے پھر وہاں دولہا کو نایا جاتا ہے وہ اگر ایک گھڑے (مٹی کا) پر پاؤں رکھ کر اس کو توڑتا ہے یعنی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے اور پھر دلہن کے سامنے بیٹھتا ہے۔





ابھرتی ہوئی گلوکارہ

شیریں نوا سارہ رضا خان تفصیلی ملاقات

قارئین کرام! السلام علیکم! آپ کے لیے ایک اور نیا دلچسپ اور بھرپور سلسلہ لیے حاضر ہیں جس میں فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے تفصیلی ملاقات کروائی جائے گی اس سلسلے میں نوجوان نسل کے نمائندہ مغنیہ سارہ رضا خان آج ہمارے ساتھ ہیں۔ اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیکھ شعلہ سا لیک جائے ہے آواز تو دیکھو وہ شیریں سخن ہے جو نہایت کسنی میں منظر عام

READING
Section

270 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

پر آئی اور چھاگئی گویا ”وہ آئی، گنگنائی اور فتح کر لیا“ اپنی میٹھی آواز سے سماعتیں معطر اور دلوں کو تسخیر کرنے والی سارہ رضا خان نے موسیقی کی دنیا میں قدم رکھا اور پھر قدم بڑھاتی چلی گئیں۔ سارہ یہ سفر... نہایت محبت، عقیدت اور مشقت سے طے کر رہی ہیں جب ہی ہر گام پر کامیابی ان کی منتظر رہتی ہے۔ عوام کی جانب سے ملنے والے بے حساب ریوارڈ سارہ رضا کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ سارہ کو اگر اس بات پر فخر ہے کہ موسیقی کے حوالے سے ہمارے یہاں صلاحیتوں کی کمی نہیں تو بہت ملال ہی نہیں بلکہ گلہ بھی ہے اس بات کا کہ ان کی قدر نہیں بالخصوص نوآموز فنکاروں کی موسیقی کی تربیت کے لیے حکومتی سطح پر کوئی اقدامات نہیں کیے گئے، کوئی ایسا مستند سرکاری ادارہ نہیں جو موسیقی کو فروغ دے سکے۔ سارہ کو اردو، پنجابی، سرائیکی، سندھی، انگریزی اور چینی زبانوں میں گانے پر عبور حاصل ہے۔ مدھر آواز کی مالک سارہ رضا خان اور کیا کہتی اور کیا چاہتی ہیں۔ آپ بھی پڑھیے۔

سارہ رضا خان ❖..... میں نے بہت کم عمری میں بولنا شروع کر دیا تھا اللہ کے فضل سے حافظہ بھی بہت اچھا ہے۔ میرے پاپا مرحوم قاری قدیر احمد خان بہت عمدہ نعت خواں تھے۔ ان سے نعتیں سن، سن کر میں بھی نعتیں پڑھنے لگی۔ اس وقت میں دو، ڈھائی سال کی تھی۔ سب میری آواز کی تعریف کرتے تو میرا حوصلہ بڑھتا۔

پاکیزہ ❖..... رضا آپ کے پاپا کے نام کا بجز نہیں ہے پھر آپ اپنے نام کے ساتھ رضا کیوں لگاتی ہیں؟ سارہ رضا خان ❖..... اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پاپا کو والہانہ عقیدت و محبت تھی اس لیے آپ کے اسم گرامی کی نسبت سے پاپا نے ہم سب بہن بھائیوں کے نام کے ساتھ رضا لگایا ہے۔ اور یہ اسی نسبت کا اعجاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت نوازا ہے۔

پاکیزہ ❖..... پہلی مرتبہ اپنے فن کا مظاہرہ کب اور کہاں کیا؟

سارہ رضا خان ❖..... نو برس کی عمر میں کیوٹی وی کے کل پاکستان مقابلہ نعت خوانی میں صوبہ پنجاب سے شرکت کی۔ فائنل کے لیے منتخب ہوئی اور فائنل میں دوسرا انعام حاصل کیا۔

پاکیزہ ❖..... کون سا نعتیہ کلام پڑھا تھا؟ سارہ رضا خان ❖..... علامہ اقبال کا نعتیہ کلام پڑھا تھا۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب کمپوزیشن بھی میری تھی۔

پاکیزہ ❖..... ماشاء اللہ اتنی کم عمری میں آپ نے مشکل کلام کا انتخاب کیا۔ اس حوالے سے کوئی ایسا تعریفی فقرہ جس نے آپ کے اعتماد کو مزید جلا بخشی؟

سارہ رضا خان ❖..... ماما میرے ساتھ تھیں۔ پروگرام کے پروڈیوسر نے میری نعت خوانی کو بہت سراہا اور ماما سے کہا کہ اسے باقاعدہ موسیقی کی تربیت دلوائیں۔

پاکیزہ ❖..... ماما نے اس پر عمل کیا؟

پاکیزہ ❖..... سارہ! ماشاء اللہ آپ کا نام بہت پیارا ہے۔ کس نے نام تجویز کیا؟

سارہ رضا خان ❖..... بہت شکریہ، آپ نے میرے نام کی تعریف کی مجھے خود بھی اپنا نام بہت پسند ہے مجھ سے سات سال بڑے میرے بھائی کو مجھے دیکھتے ہی... اپنی انگریزی کی کتاب کی سارہ یاد آگئی انہوں نے کہا یہ بھی اسی کی طرح good girl ہے اس کا نام سارہ رکھیے۔ یوں میرا نام سارہ رکھ دیا۔ پاکیزہ ❖..... سارہ یعنی ”خوشی دینے والی“ کہا جاتا ہے کہ نام کا اثر شخصیت پر پڑتا ہے آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟

سارہ رضا خان ❖..... وہی جو عام خیال ہے۔ الحمد للہ اکثر لوگوں کو میری ذات سے خوشیاں ملتی ہیں، میری دعا ہے کہ یونہی میں لوگوں میں خوشیاں بانٹی رہوں (آمین)

پاکیزہ ❖..... اپنے خوش لمحہ ہونے کا احساس



سکھاؤں گا لیکن اس کو درمیان سے نہیں چھوڑنا ہے، مکمل کرنا ہے اگر آپ راضی ہیں تو آجائے گا۔

پاکیزہ ♦..... ان کے دل میں یہ خیال کیوں آیا کہ آپ درمیان سے چھوڑ دیں گی؟

سارہ رضا خان ♦..... اکثر یہ کہہ کر کہ موسیقی گناہ ہے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، ماما نے کئی کتابوں کا مطالعہ کیا، مطمئن ہونے کے بعد سر رؤف کی شاگردی میں مجھے دے دیا۔ میں نے بہت محنت اور لگن سے کم عرصے میں سیکھ لیا۔

پاکیزہ ♦..... موسیقی کا مطلب کیا ہے؟

سارہ رضا خان ♦..... ہوا میں گرہ لگانا۔

پاکیزہ ♦..... ارے یہ تو کارِ محال ہے، کیسے کر لیا؟

سارہ رضا خان ♦..... یقیناً مشکل بلکہ مشکل ترین کام ہے۔ اللہ کی رضا کے بغیر میں یہ کام کر ہی نہیں سکتی۔ اللہ نے کروالیا اور میں نے کر لیا۔

پاکیزہ ♦..... موسیقی کی تربیت کے ابتدائی دور میں کسی تقریب میں ہنر آزمایا؟

سارہ رضا خان ♦..... الحمرا آرٹس کونسل لاہور کی جانب سے گورنر ہاؤس پنجاب میں محفلِ موسیقی کا اہتمام کیا گیا اس وقت کے صدرِ پاکستان جناب پرویز مشرف بھی تقریب میں موجود تھے۔

پاکیزہ ♦..... آپ نے کیا سنا یا تھا؟

سارہ رضا خان ♦..... چند اتوری چاندنی میں جیا

سارہ رضا خان ♦..... ماما نے میرے شوق کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے فوری اس جانب توجہ دی۔ ان دنوں ماما ایوانِ اقبال میں علامہ اقبال کا فارسی کلام سیکھنے جاتی تھیں ایوانِ اقبال کے ساتھ ہی الحمرا آرٹس کونسل لاہور ہے۔ وہاں ماما نے سر رؤف سے ملاقات کر کے میری موسیقی کی تربیت کے لیے بات کی تو انہوں نے مجھ سے کچھ سنانے کو کہا تب میں نے انہیں نیرہ نور جی کی مشہور غزل سے ہر چند سہارا ہے تیرے پیار کا دل کو۔ سنا کی سر رؤف سن کر حیران ہوئے اور بہت خوش بھی انہوں نے ماما سے کہا کہ اس کی آواز میں ”مُرکیاں“ ہیں۔ میں اسے

کہ کیمرا اور لائٹس کیا ہے؟ پروگرام کیسے کرتے ہیں؟ اور پھر میری کامیابی کے لیے دروازے کھلتے چلے گئے۔ ناظرین کی کثیر تعداد نے مجھے سراہا تھا۔

پاکیزہ ❖..... کون سا ٹی وی شو وجہ شہرت بنا؟
سارہ رضا خان ❖..... انڈین شو: "سارے گاما پاپا"
سے عالمی سطح پر مقبولیت اور شہرت ملی۔

پاکیزہ ❖..... "سارے گاما پاپا" میں آپ کا انتخاب کس بنیاد پر کیا گیا؟

سارہ رضا خان ❖..... استاد غلام علی خان صاحب نے "مستی ہی مستی" میں میری پرفارمنس سے متاثر ہو کر مجھے فون کیا تھا کہ آپ کو انڈیا مقابلے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ میرے اور امی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ موسیقی کی دنیا کی اتنی بڑی ہستی مجھے فون کرے گی۔ سارے گاما پاپا کے کوآرڈینیٹر نے میرا ٹکٹ بھیجا تو میں نے انکار کر دیا کہ اپنی ماما کے بغیر میں کہیں نہیں جاتی پھر انور ادھا کا فون آیا کہ ہم نے آپ کی ماما کا ٹکٹ بھی کر دیا ہے یوں ہم سارے گاما پاپا کے لیے انڈیا چلے گئے۔

پاکیزہ ❖..... اتنے بڑے شو میں پاکستان کی نمائندگی کرنا کیسا لگ رہا تھا؟

سارہ رضا خان ❖..... بہت اچھا، بہت لطف آیا۔ سب نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔

پاکیزہ ❖..... ایسا مرحلہ آیا کہ خود کو پاکستان کا سفیر ثابت کیا؟

سارہ رضا خان ❖..... یقیناً..... چونکہ مقابلہ موسیقی پاک بھارت کے درمیان تھا اس لیے چودہ اور پندرہ اگست مل کر منائی تھی۔ تب انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ آزادی سے پہلے ہم ساتھ تھے، دکھ نہیں ہوتا کہ اس دھرتی کے دو حصے ہو گئے؟ جواب میں نے کہا کہ "جب دو بھائیوں کی شادی ہوتی ہے اور وہ الگ، الگ گھر میں رہنے لگتے ہیں لیکن کھڑکیاں اور دروازے کھلے رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں ہم الگ ملک ضرور ہیں لیکن ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہیں۔" میرے جواب پر سب نے

جلا جائے رے اور اکھیاں چھم چھم و سیاں..... آپ کی عمر کے لحاظ سے مشکل انتخاب تھا حاضرین کو پسند آیا؟

سارہ رضا خان ❖..... جی ہاں بہت زیادہ، جب میں سنا کر جانے لگی تو سب نے کھڑے ہو کر مجھے داد دی۔ جناب پرویز مشرف نے حیرت و مسرت سے کہا تم نے گالیاں میں نے ہنس کر کہا جی میں نے گالیاں لیا۔ الحمرا آرٹس کونسل کی جانب سے مجھے ۲۵ ہزار کیش کا انعام دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۱ اگست کو اپنی سالگرہ کے موقع پر صدر مشرف نے اسلام آباد بلایا۔ نیرہ نور جی مدعو تھیں ان کی موجودگی میں گانا میرے لیے بہت فخر کی بات تھی۔ اس وقت تک مجھے صرف نو گانے یاد تھے، میں نے وہی سنا دیے۔ صدر مشرف نے بھی میرے ساتھ گایا۔ ۵۰ ہزار روپے نقد انعام میں دیے مجھے بہت خوشی ہوئی اپنی مرضی کے گانے گائے اور انعام میں اتنے سارے پیسے۔ اس کے بعد آرمی آفیسرز اور کور کمانڈرز نے اپنی تقریبات میں بلانا شروع کر دیا۔

پاکیزہ ❖..... موسیقی کے کون سے ٹی وی شو میں پہلی مرتبہ حصہ لیا؟

سارہ رضا خان ❖..... A TV کا شو تھا "مستی ہی مستی" گئی تو میں وہاں گانے کے لیے تھی اور آڈیشن کے بعد میرا گانا منتخب بھی ہو گیا اور میں نے گایا بھی لیکن میں بہت زیادہ بول رہی تھی۔ پروڈیوسر نے میری پوشیدہ صلاحیت کو بھانپ لیا تھا انہوں نے میرا کمپیئرنگ کا آڈیشن لیا۔ اور مجھے بطور معاون کمپیئر رکھ لیا اور کچھ عرصے بعد مجھے اس پروگرام کی ہوسٹ بنا دیا گیا۔

پاکیزہ ❖..... گویا ہوسٹ سگر پر حاوی ہو گئی؟

سارہ رضا خان ❖..... (ہنستے ہوئے) بالکل بھی نہیں۔ ہر پروگرام میں گانا گاتی تھی میں۔

پاکیزہ ❖..... تجربہ کیسا رہا؟ آئندہ کامیابیوں کے لیے راہ ہموار ہو گئی؟

سارہ رضا خان ❖..... بلاشبہ یہ ایک کامیاب تجربہ تھا۔ مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا خاص طور پر یہ

پاکیزہ ✦..... ”جنگ سُر کی،
جیت سنگیت کی“ میں حصہ لینے کا
خیال کیسے آیا؟

سارہ رضا خان ✦..... سارے
گاما پاپا اور سُر شیتر کے پروڈیوسر
نے مجھے فون کیا کہ پاکستان سے
گانے والی اچھی بچیاں بتائیں،
میں نے کئی لڑکیوں کا بتا دیا
انہوں نے آڈیشن دیا لیکن کوئی
بھی منتخب نہ ہو سکی، انہوں نے
مجھ سے کہا تو میں نے اپنے
کانسرٹس کی مصروفیت کی وجہ



سے انکار کر دیا پھر یہ کہ ہالینڈ کا ٹرپ بھی ان ہی دنوں
تھا۔ لیکن میرے انکار پر انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے
نہ سہی اپنے دیس کے لیے آجائے دو دن میں نے سوچا
اور پھر فیصلہ کر لیا کہ پاکستان کے لیے کچھ کر سکتی ہوں تو
ضرور کروں گی اور تمام شوز اور ہالینڈ کا ٹرپ بھی کینسل
کر دیے۔

پاکیزہ ✦..... آپ کی کارکردگی کیسی رہی؟
سارہ رضا خان ✦..... بہت اچھی رہی پہلے شو
میں ڈھولنا سنا کر ٹرائی لی۔

پاکیزہ ✦..... اس شو کی خاص بات کیا تھی؟
سارہ رضا خان ✦..... سب سے زیادہ خاص
بات تو یہی تھی کہ انڈیا اور پاکستان سے واحد لڑکی تھی جو
فائنل تک پہنچی۔

پاکیزہ ✦..... آپ کی ٹیم کی کامیابی میں آپ کا
کتنا حصہ رہا؟

سارہ رضا خان ✦..... الحمد للہ کافی کیونکہ جب
ہمارے پاکستانی بھائی کسی وجہ سے کوئی گانا نہیں گاسکتے تھے
تو کیپٹن مجھ سے کہتے کہ تم گاؤ ہمارا پڑا بھاری ہو گیا۔
پاکیزہ ✦..... کامیابی کے بالکل قریب آ کر سُر
شیتر اکیوں چھوڑ دیا؟

سارہ رضا خان ✦..... فائنل میں مجھ پر ذاتی حملے

کھڑے ہو کر خوشی کا اظہار کیا۔

پاکیزہ ✦..... سارے گاما پاپا کا کوئی اعزاز؟
سارہ رضا خان ✦..... ہر راؤنڈ میں منتخب ہوئی۔
ہاں ایک راؤنڈ میں گولڈ کی چین ملی، آشا بھوسلے جی
نے بہت پیار دیا اور حوصلہ افزائی کی اور سب سے بڑا
اعزاز تو یہ ہے کہ مجھے ”دختر پاکستان“ کا خطاب ملا۔

پاکیزہ ✦..... سارے گاما پاپا کتنے عرصے چلا؟
سارہ رضا خان ✦..... چھ مہینے چلا پھر بمبئی
بلاسٹ کی وجہ سے انجام تک نہ پہنچ سکا اور ہم پاکستان
واپس آ گئے۔

پاکیزہ ✦..... دختر پاکستان کے خطاب کے
ساتھ واپس آئیں تو کیسے پزیرائی ہوئی؟

سارہ رضا خان ✦..... وہاں میری عمدہ کارکردگی
کو بہت سراہا گیا۔ یہاں آئی تو ہمارے میڈیا نے وہ
پزیرائی اور حوصلہ افزائی نہیں کی جس کی میں توقع کر رہی
تھی۔ ہاں عوام سے ضرور داد ملی۔

پاکیزہ ✦..... میڈیا کے اس رویے کا سبب کیا تھا؟
سارہ رضا خان ✦..... آپ نے دیکھا نہیں ہمارا
میڈیا منشی کاموں کا ہمیشہ چرچا کرتا ہے۔ وینا ملک انڈیا
سے آئی تو ہر چینل نے فخریہ اس کا انٹرویو نشر کیا، گویا اس
نے وطن کا خوب نام روشن کیا ہو۔

READING
Section

274 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

ہماری ۸۰ فیصد خواتین پہنتی ہیں۔ کہ میں بھی ان کی طرح متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ہمارا میڈیا یہی چاہتا ہے کہ میں بھی اوروں کی طرح میڈیا پر نظر آؤں لیکن عوام مجھے اسی دوپٹے اور سادگی میں پسند کرتے ہیں۔ آپ لوگ بھی دعا کریں کہ تمام عمر اسی دوپٹے کے ساتھ اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتی رہوں۔ آمین

پاکیزہ ❖..... پاکستان سے باہر کون سے ملکوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا؟

سارہ رضا خان ❖..... چائنا، ہالینڈ، انڈیا، جرمنی، ساؤتھ کوریا۔

پاکیزہ ❖..... موسیقی کے پیشے کی مشکلات کیا ہیں؟

سارہ رضا خان ❖..... گلوکاروں کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو فنون لطیفہ کے دیگر شعبوں سے متعلق فنکاروں کو دی جاتی ہے۔ رومانیہ میں ۱۳۲ ملکوں کے بچوں کے درمیان موسیقی کا مقابلہ تھا پاکستان نے مجھے جج کی حیثیت سے منتخب کیا وہاں پاکستان سے پہلی مرتبہ کسی کو بلا یا تھا لیکن میرا رومانیہ کا ویزا کینسل ہو گیا۔

پاکیزہ ❖..... پہلے بھی تو ثقافتی طائفے جاتے تھے اب یہ مسئلہ کیوں ہو گیا؟

سارہ رضا خان ❖..... سارا قصور حکومت کا بھی نہیں، ہمارے پاکستانی فنکاروں نے بھی بہت خرابیاں پیدا کی ہیں وہ باہر جاتے ہیں تو میوزیشن ساتھ لے جاتے ہیں اور پھر وہیں چھوڑ کے آجاتے ہیں اور وہ وہاں کمائی کرتے ہیں اس وجہ سے اب سنگرز کو آسانی سے ویزے نہیں ملتے۔

پاکیزہ ❖..... آپ کے خیال میں وہ کون سے حکومتی اقدامات ہیں جو موسیقی کے پیشے کی مشکلات دور کرنے میں معاون ثابت ہوں گے؟

سارہ رضا خان ❖..... سب سے پہلے تو اپنے گلوکاروں کی اہمیت کو تسلیم کریں۔ تمام اچھے سنگرز کو گڈ لسٹ میں رکھیں۔ سنگرز ایسوسی ایشن قائم کریں۔ اچھے گلوکاروں کے لیے پیج رکھیں۔ وزارت ثقافت کو چاہیے کہ نامور اور اچھے گلوکاروں کے بیرون ممالک

شروع ہو گئے تھے۔ ہوا یوں کہ میں نے ہیر گائی ہیر کی دھن میں ایک نعتیہ شعر پڑھا، میرے سر پر دوپٹا تھا۔ ہمیشہ بھٹ کا اعتراض یہ تھا کہ آپ شو میں دوپٹا لے کر کیوں آئیں؟ اس پر دوپٹا میں نے سر پر لے لیا تو ہمیشہ بھٹ نے کہا آپ دکھاوا کر رہی ہیں۔ رونا لیلیٰ نے کہا آپ بولتی بہت ہیں سیاستدان بن جائیں۔ اتنی بڑی گلوکارہ کے منہ سے یہ باتیں سن کر میں حیران رہ گئی۔ غصہ تو بہت آ رہا تھا پر میں نے صرف اتنا کہا کہ سیاستدان تو جھوٹ بولتے ہیں میں جھوٹ کیوں بولوں؟ جہاں تک دوپٹے کی بات تھی تو یہ پاکستانی خواتین کی پہچان ہے، میں نے گانوں کے انتخاب سے لے کر لباس تک میں محتاط رویہ رکھا تھا۔ مجھے بہت زیادہ افسوس اور دکھ اس بات کا تھا کہ اس موقع پر موجود میرے پاکستانی بھائیوں نے چپ سادھ لی میرا دفاع تک نہ کیا۔ تب میں نے شو چھوڑنے کا اصولی فیصلہ کر لیا پھر بھی میری پاکستانی ٹیم کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ انہوں نے کہہ دیا شو چھوڑنا ہے تو چھوڑ دو۔ گجدر نے روکا کہ شو چھوڑ کر نہ جاؤ لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ یہ میرے وطن کی عزت و وقار کا سوال تھا۔ انڈین آرٹسٹ اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے ساڑھی باندھتی ہیں اگر میں نے پاکستان کی ثقافت کو عزیز رکھا تو کیا برا کیا!

پاکیزہ ❖..... پاکستان میں آپ کے اس اقدام کو کس نظر سے دیکھا گیا؟

سارہ رضا خان ❖..... بہت اچھی نظر سے، سب نے میرے اس فیصلے کو بہت سراہا۔

پاکیزہ ❖..... پاکستان میں کبھی آپ کا دوپٹا اور روایتی انداز مسئلہ بنا؟

سارہ رضا خان ❖..... جی ہاں اور یہ نہایت حیرت اور افسوس کی بات ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ گانا گانے کے لیے خوش گلو اور موسیقی کے رموز کو سمجھنا ضروری ہے نہ کہ ماڈرن لباس زیب تن کرنا۔ الحمد للہ میں خوش لباس ہوں، دوپٹا ہمارے لباس کا لازمی جز ہے میں بھی وہ لباس پہننا پسند کرتی ہوں جو



سارہ رضا خان اپنی والدہ کے ساتھ

بھنگڑا کی فرمائش بھی ہوتی ہے۔
مجھے اچھا لگتا ہے کہ ورثائل گلوکارہ
بنوں۔ میں نے دونوں پر محنت کی
ہے۔ میرے موڈ پر منحصر ہے۔ کبھی
کلاسیکل میں سکون ملتا ہے تو کبھی
پاپ میوزک بھلی لگتی ہے۔

پاکیزہ ✦..... پس پردہ
گائیکی کا تجربہ کیسا رہا؟

سارہ رضا خان ✦..... بہت
اچھا، ایک ہی مووی میں متضاد اور
مختلف موڈ کے کئی گانے گائے
جاتے ہیں مجھے شروع ہی سے
شوق تھا، انڈیا جا کر اور بڑھ گیا۔

پاکیزہ ✦..... ماضی اور حال کی
موسیقی میں واضح فرق کیا ہے؟

سارہ رضا خان ✦..... بنیادی بات محنت اور لگن
کی ہے۔ پہلے ایک گانا بیس، پچیس دن میں تیار ہوتا
تھا۔ اب دو گھنٹے میں تیار ہو جاتا ہے۔ عجلت کی وجہ سے
پائدار نہیں ہوتا۔

پاکیزہ ✦..... اگر ۶۰، ۷۰ء کی دہائی کی فلمی موسیقی
کا زمانہ لوٹ آئے تو ہماری نئی نسل اسے بہ آسانی قبول
کر لے گی؟

سارہ رضا خان ✦..... کیوں نہیں؟ میں نے لائیو
شوز میں ۶۰، ۵۰ سال پرانے گانے سنائے تو نوجوان
نسل نے بہت شوق سے سنے۔

پاکیزہ ✦..... سب سے زیادہ کس کے گانوں کی
فرمائش ہوتی ہے؟

سارہ رضا خان ✦..... میڈم نور جہاں کے گانوں
کی۔ میڈم کے گانے گانا اور انہیں پسندیدگی کی سند ملنا
دونوں ہی میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ میڈم سے
ملاقات نہ کرنے کا قلق ہمیشہ رہے گا۔

پاکیزہ ✦..... کیا وجہ ہے کہ موسیقی کا شوق تو نظر
ذوق نہیں؟

کے لیے شوز کروائیں۔ پاکستان کی تمام آرٹس کونسلز
میں شوز ہونے چاہئیں۔ ڈراما آرٹسٹ کی طرح سکر کی
بھی قدر ہونی چاہیے۔ حال ہی میں کس اسٹائل ایوارڈ
میں عائشہ عمر کو بیسٹ سکر ایوارڈ دیا گیا ہے۔ جو میری
نظر میں غلط ہے۔ عائشہ عمر اداکارہ بہت اچھی ہے
عائشہ کو خوب صورت کے کردار کے لیے ایوارڈ دیتے تو
یقیناً یہ ان کا حق بنتا ہے۔ آرٹسٹ کے لیے ریلیزنگ
کمپنی اور کاپی رائٹس کے قانون بنائے جائیں تاکہ
موسیقی کے البم ریلیز ہوں۔

پاکیزہ ✦..... کلاسیکل اور پاپ موسیقی دو
متضاد بلکہ حریف شعبے ہیں ماشاء اللہ آپ کو دونوں پر
عبور حاصل ہے عوام کی جانب سے کس میں زیادہ
پزیرائی ملی اور آپ کی اپنی تسکین کس میں ہے؟

سارہ رضا خان ✦..... بلاشبہ کلاسیکل بنیاد ہے
موسیقی کی۔ وہ اصل چیز ہے اور موسیقی کی روح بھی۔ وہ
میرے اندر اتر جاتی ہے۔ لیکن اگر میں پاپ گاؤں تب بھی
سُر تو وہی ساتوں ہی رہیں گے۔ جہاں تک عوام کی بات ہے
تو موسیقی کے شو میں اگر مجھ سے پہلی سی محبت میرے
محبوب نہ مانگ کی فرمائش ہوتی ہے تو اسی زور شور سے کسی

سارہ رضا خان ❖..... میری بڑی بہن کو بہت کم عمری میں طلاق مل گئی تھی۔ اس صدمے سے وہ سائیکی ہو گئی تھیں۔ گو میں اس وقت بہت چھوٹی تھی لیکن ان کی تکلیف کا میں نے بہت اثر لیا۔ اس وقت تو اپنی کسنی کے سبب کچھ نہیں کڑسکی لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ مصروفیت ان کے لیے بہت ضروری ہے بلکہ مطلقہ خواتین کے لیے مصروفیت ہلکے ہاتھ ساتھ ذہنی اور معاشی مضبوطی بہت ضروری ہے، میں نے سوچا جب میری بہن دیگر مطلقہ خواتین کے مسائل اور پریشانیاں دیکھیں گی تو انہیں اپنا دکھ چھوٹا لگے گا اور حوصلہ بھی بڑھے گا تب وہ اعتماد سے سر اٹھا کر جینا سیکھ جائیں گی۔ تب ماما کے مشورے سے میں نے این جی اوکھولنے کا فیصلہ کیا۔

پاکیزہ ❖..... آپ کی این جی او کی نوعیت کیا ہے؟

سارہ رضا خان ❖..... طلاق یافتہ خواتین کو تین ماہ کا سلائی کڑھائی اور بیوشین کورس کرایا جاتا ہے۔ ایک سہ ماہی میں صرف ۶،۷ خواتین ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہم ابھی زیادہ افورڈ نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ وہ خواتین جو مشکلات کے باوجود عزم و حوصلے سے زندگی کا سفر ثابت قدمی سے طے کر رہی ہیں۔ گاہے گاہے ان کے لیکچر کا اہتمام بھی ہوتا ہے جس سے خواتین ہمت پکڑتی ہیں اور یہ این جی او میں ماما کی نگرانی میں چلا رہی ہوں۔

پاکیزہ ❖..... عموماً این جی او بہت بدنام ہیں۔

آپ اپنی این جی او کا دفاع کیسے کریں گی؟

سارہ رضا خان ❖..... ہم نے پہلے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ این جی او اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت چلائیں گے، کسی سے ڈونیشن نہیں مانگیں گے۔ کیونکہ ڈونیشن دینے والوں کا محتاج بننا پڑتا ہے۔ اپنے اصولوں کے منافی کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم نے اپنی این جی او کو ان تمام برائیوں سے دور رکھا جن کی وجہ سے این جی او بدنام ہیں۔

پاکیزہ ❖..... آزادی نسواں کی کس حد تک قائل ہیں؟

سارہ رضا خان ❖..... شوق کا تو کوئی مول ہی نہیں لیکن ذوق آہستہ، آہستہ پروان چڑھتا ہے۔ اگر میڈیا اچھی موسیقی کو پلیٹ فارم دے تو سنی بھی جائے گی اور ذوق دکھائی بھی دے گا۔ اچھی موسیقی کو پروموٹ نہ کر کے ہمارے میڈیا نے موسیقی کا ذوق ختم کر دیا۔

پاکیزہ ❖..... آپ کے گائے ہوئے ٹی وی ڈراموں کے ٹائٹل گیت عوام میں بہت مقبول ہیں۔ ”میرے قاتل میرے دلدار“ کے ٹائٹل سونگ کا ایوارڈ پا کر کیا احساسات تھے؟

سارہ رضا خان ❖..... ہم ٹی وی نے ”میرے قاتل میرے دلدار“ کے ٹائٹل سونگ ایوارڈ کا اعلان ضرور کیا تھا مگر مضحکہ خیز المیہ یہ ہے کہ ایوارڈ ڈراما پروڈیوسر کو دیا گیا۔

پاکیزہ ❖..... رمضان ٹرانسمیشن کا تجربہ کیسا رہا؟

سارہ رضا خان ❖..... بہت عمدہ۔ بہت لطف آیا۔ دینی و علمی معلومات اور گفتگو سننے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ میں نعت بھی پڑھتی تھی اور نعت پڑھتا تو ہمیشہ ہی سے میری روحانی تسکین کا باعث رہا ہے۔

پاکیزہ ❖..... نعت خوانی میں کن باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں؟

سارہ رضا خان ❖..... ایسی نعتوں کا انتخاب کروں جو نعت کے بنیادی مقصد یعنی حضور انور ﷺ کی تعریف پر پوری اترتی ہو۔ جہاں لفظ سے زیادہ دل یعنی عشق مصطفیٰ ﷺ نظر آئے۔ زیادہ تر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی حضرت بہنواد لکھنوی اور علامہ اقبال کا نعتیہ کلام پڑھتی ہوں۔

پاکیزہ ❖..... فنی زندگی کے حوالے سے تو بہت باتیں ہو گئیں اب گفتگو کا رخ آپ کی نجی زندگی کی جانب موڑتے ہیں۔ اچھا یہ بتائیں موسیقی کے علاوہ اور کیا مصروفیات ہیں؟

سارہ رضا خان ❖..... میری اپنی این جی او ہے۔ خاتون ویلفیئر سوسائٹی کے نام سے۔

پاکیزہ ❖..... این جی او کھولنے کا خیال کیسے آیا؟

ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال کی بہت سی خوبیاں مجھ میں بھی ہیں۔ (واہ بھئی)

پاکیزہ..... فرصت کے اوقات میں کیا کرتی ہیں؟
سارہ رضا خان..... چھوٹے بھائی سے کھیلتی ہوں دنیا بھر کی میوزک نیٹ سے سرچ کرتی ہوں اور جب یہ نہیں کرتی تو مزے سے بھرپور نیند لے لیتی ہوں۔

پاکیزہ..... مطالعہ سے دلچسپی ہے؟
سارہ رضا خان..... بہت زیادہ اور یہ شوق ماما سے وراثت میں ملا ہے۔ مختلف موضوعات پر اردو اور انگریزی کی کتابیں پڑھتی ہوں۔

پاکیزہ..... ڈائجسٹ پڑھنے کا کبھی اتفاق ہوا؟

سارہ رضا خان..... کبھی؟ (ہنستے ہوئے) ہر ماہ ہوتا ہے لیکن پہلے میں افسانوں اور ناولوں کے علاوہ سب کچھ پڑھتی تھی پر اب افسانے بھی پڑھنے شروع کر دیے ہیں۔ مجھے جلت رنگ پڑھ کر بڑا مزہ آتا ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں سماجی برائیوں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ ماما سارا رسالہ پڑھتی ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب ماما پاکیزہ کے لیے افسانے بھی لکھیں گی۔ (جی ضرور)

پاکیزہ..... پاکیزہ کی قارئین بہنوں سے کچھ کہیں گی؟
سارہ رضا خان..... جو بھی اچھی باتیں پڑھیں انہیں اپنی زندگی کا حصہ بنالیں۔ اسلامی اور پاکستانی کلچر کو بحال کریں اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال ضرور کریں اور دوسروں کو بھی اس سے فائدہ پہنچائیں کہ یہ اللہ کی شکرگزاری کا بہترین طریقہ ہے۔

☆☆☆

جی قارئین! آپ کو پاکیزہ کی یہ مہمان اور ان کی گفتگو یقیناً پسند آئی ہوگی۔ انشاء اللہ اسی طرح آپ کی فرمائشوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم میزبانی کے فرائض انجام دیتے رہیں گے۔ بہت سی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت طلب کرتے ہیں اللہ نگہبان!

☆☆☆

سارہ رضا خان..... ہمارے مذہب اور معاشرے نے جو حدود قائم کر دی ہیں۔ اسی تک رہنا ہی پسند کرتی ہوں۔ خواتین کی غیر ضروری آزادی کی قائل نہیں۔

پاکیزہ..... فیشن کرتے وقت کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

سارہ رضا خان..... فیشن خواہ مغربی طرز کا ہو یا مشرقی، وہ کرنا چاہیے جو بھلا لگے۔ جس میں آپ دلکش نظر آئیں اور باوقار بھی۔ ولگر نہیں لگنا چاہیے۔

پاکیزہ..... کیسے کھانے شوق سے کھاتی ہیں؟ اور کن چیزوں سے پرہیز کرتی ہیں؟

سارہ رضا خان..... پلاؤ بے حد پسند ہے۔ وال چاول شوق سے کھاتی ہوں۔ کھانا بہت چپکانہ ہو لیکن خوش ذائقہ ضرور ہونا چاہیے۔ کھٹے کھانے نہیں کھاتی اور ٹھنڈا پانی نہیں پیتی۔

پاکیزہ..... کیسے لوگ اچھے لگتے ہیں؟
سارہ رضا خان..... محبت کرنے والے صاف

دل لوگ۔
پاکیزہ..... آپ میں سب سے اچھی اور بری عادت کون سی ہے؟

سارہ رضا خان..... جھوٹ نہیں بولتی، اگر کبھی غلطی سے بول بھی دوں تو ضمیر ملامت کرتا رہتا ہے۔ بہت پریشان ہو جاتی ہوں اور اللہ سے بہت معافی مانگتی ہوں۔ بری عادت یہ ہے کہ کبھی، کبھی بہت غصہ آجاتا ہے۔ حالانکہ جتنی تیزی سے آتا ہے اتنی ہی تیزی سے چلا بھی جاتا ہے لیکن جاتے، جاتے ندامت دے جاتا ہے تب میں جس پر غصہ کروں اس سے اور اللہ سے بھی معافی مانگتی ہوں۔

پاکیزہ..... بُرج کون سا ہے؟ آپ پر اس کے اثرات ہیں؟

سارہ رضا خان..... عقرب ہے اثرات پر تو کبھی غور نہیں کیا ہاں ہمیشہ اس پر خوشی اور فخر محسوس کیا ہے کہ علامہ اقبال اور میرا یوم پیدائش ایک ہی

بہنوں کی محفل

مدیر

عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!

حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔ پیاری بہنو..... اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو۔ یا الہی دونوں جہان میں ہم سب کی خیر ہو اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے۔ آمین ثم آمین۔

قارئین کرام! آپ سب کو عید الاضحیٰ مبارک ہو۔ مجھے اپنے ہر قاری سے یہ پوری، پوری امید ہے کہ گوشت بانٹتے ہوئے غریب، غربا اور مساکین کا خیال ضرور رکھیں گے۔ اس لیے قربانی کا گوشت یہ سوچ کر ڈیپ فریزر کے خانوں میں نہ رکھیں کہ بعد میں کام آجائے گا بلکہ یہ سوچ کر مستحقین میں بانٹیں..... کہ ہماری قربانی کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔

پیاری بہنو..... آج میں قصور کے ان بچوں کے بارے میں لکھنا چاہ رہی تھی جن سے درندہ صفت انسانوں نے ان کا بچپن چھین لیا اور جن کے والدین کے دلوں میں وہ دکھ بھر دیے جو تا زندگی وہ نکال نہیں پائیں گے۔ میں ان بھینٹ یا صفت انسانوں کے بارے میں بھی لکھنا چاہ رہی تھی..... جو گدھے، سور اور مرے ہوئے جانوروں کا گوشت سپلائی کر کے سمجھ رہے ہیں کہ وہ فائدہ اٹھانے والوں میں سے ہیں..... میں ان طرم خان لوگوں کے بارے میں بھی لکھنا چاہ رہی تھی جو جان بچانے والی جعلی ادویات فروخت کر کے بدی کا کاروبار کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ یہ سب لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ نہیں ہو سکتا..... تو شاید وہ صحیح ہی سمجھتے ہوں گے..... کہ ان موضوعات پر اخبارات بھرے ہوتے ہیں۔ اب ہوتا کیا ہے..... اور کب ہوتا ہے..... اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتے اس لیے آج میں اپنی ایک مستقل تبصرہ نگار بہن کے خط کے کچھ حصے شامل کر رہی ہوں۔ خط پڑھ کر آپ کو وہ عام سی باتیں لگیں گی مگر اس لڑکی کے لیے وہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ میں چاہتی ہوں اس خط کا جواب آپ دیں، جس میں بھرپور انداز میں اس کے مسئلے کا حل بتایا جائے۔

تو آئیے پڑھتے ہیں اپنی ایک مستقل تبصرہ نگار بہن کا خط..... انجم باجی، پلیز میرے مسئلے کا کوئی حل بتادیں۔ شادی کو چھ سال ہوئے ہیں، شادی کے دوسرے دن سے میں نے یہ طریقہ دیکھا کہ میرے میاں صبح کے دس بجے اپنے دوستوں کے پاس چلے جاتے اور دو بجے آتے پھر شام کو پانچ بجے سے آٹھ بجے تک، اس دوران ان دوستوں کے فون بھی آتے رہتے، اگر جلدی گھر آجاتے، شروع میں مارے جھجک کے میں نے کچھ پوچھا نہیں، ایک عزیزہ نے انہیں اسٹور گاؤں میں کھول کر دیا۔ وہاں ہفتے میں ایک بار جاتے اور آجاتے۔ بعد میں پتا چلا کہ دو دوست ہیں جو گورنمنٹ جاب کرتے ہیں اگر ہم کہیں باہر جائیں تو بھی فون کر، کر کے پوچھتے رہتے ہیں۔ دن میں دو بار ان دوستوں کے پاس جانا ضروری ہے۔ بھلے آندھی آجائے یا طوفان..... اگر کسی دن میاں کی طبیعت خراب ہو اور وہ نہ جائیں تو دوست گھر پر آکر ان کو لے جاتے ہیں۔ میرے ماں، باپ حیات نہیں..... ایک بھائی ہے جو شادی کے بعد ہمیں پوچھتا نہیں..... میرے میاں میں لحاظ بالکل نہیں، کمانے کا کہوں تو طلاق کی دھمکی دیتے ہیں، جانتے ہیں مجھے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ روز تین، تین گھنٹے دوستوں کے پاس جا کر یہ کیا کرتے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ مجھے نہیں پتا..... ان کی فیملی میں ماشاء اللہ سب ڈاکٹر، انجینئر ہیں، ان کے خاندان والوں کو کئی بار بتایا انہوں نے بھی سمجھایا مگر کوئی اثر نہیں۔ مرد کی کمائی سے گھر چلتا ہے مجھے جاب ٹیوشن بھی نہیں کرنے دیتے۔ میرے سارے زیور بک گئے ہیں، کہتے ہیں اللہ پالے گا نوکری کی بات مت کرو، اب خود بھی نوکری نہیں کریں گے، مجھے بھی نہیں کرنے دیں گے تو گھر کیسے چلے گا۔ ان کی کزن نے جب سے ناراض ہو کر اپنا اسٹور واپس لے لیا ہے۔ تب سے حالات برے ہو گئے ہیں۔ دن رات ان دوستوں کو بددعا دیتی ہوں کہ کہیں چلے جائیں، میرا میاں کمانا تو شروع کرے۔ مگر وہ صبح دیر تک سوئے ہیں اور پھر مجھے

منحوس کہتے ہیں۔ کہتے ہیں نوکری کی بات مت کرو، عمر گزر گئی اب نوکری کون دے گا، حالانکہ عمر ابھی چالیس سال ہے، میں کہتی ہوں ریٹائرڈ لوگ بھی بچے پالنے کے لیے پارٹ ٹائم کر رہے ہیں تو پھر طلاق کی دھمکی..... اولاد سے زیادہ ان کو وہ دوست پیارے ہیں۔ اب تو بہتری کی امید میں میرا حوصلہ بھی ختم ہونے لگا ہے۔ تہجد پڑھ، پڑھ کر ان کے لیے بہت دعائیں مانگتی ہوں مگر یہ نہیں سدھرتے۔ کئی بار مجھے مارتے بھی ہیں۔ آپ بتائیں میں کروں تو کیا کروں.....؟

میرا اپنی بہنوں سے رابطہ خطوط کے بعد فونز کے ذریعے زیادہ رہتا ہے اور دنیا بھر سے فون آتے ہیں..... اور کبھی، کبھی تو ایسی شخصیات کے بھی فون آجاتے ہیں..... جن سے بات کرنا بھی سعادت کے زمرے میں آتا ہے..... کچھ دن قبل میرے پاس فریدہ کا دوانی کا نیویارک (امریکا) سے فون آیا۔ وہ وہاں قرآن پاک کی تفسیر کی کلاسز لیتی ہیں اور درس دیا کرتی ہیں۔ اور وہاں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں..... انہوں نے ہمیں روحانی مشوروں کے سلسلے میں کئی مشورے دیے۔ اس سلسلے کو بے حد پسند کیا..... اس کے بعد انہوں نے عذرار رسول کو ذیشان کی شادی کی مبارک باد دی۔ ڈاکٹر فاطمہ کی تعریف کی..... اور عظمیٰ آفاق کے طرزِ تحریر کو بے حد سراہا..... فریدہ کا دوانی پاکستان کی معروف شخصیت عبداللہ کا دوانی کی عزیزہ ہوتی ہیں..... اور عبداللہ کا دوانی سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی ہے مگر ان جیسے لوگ کم، کم ہی دیکھے ہیں کہ بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں..... المختصر یہ کہ فریدہ کا دوانی جب بھی پاکستان آئیں گی..... ادارہ پاکیزہ سے ضرور رابطہ کریں گی۔

اور اب آئیے پہلے ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے ابھی پڑھ لیں اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

7 ستمبر بروز پیر کی شام سن سیٹ کلب ڈینٹس میں محترمہ عذرار رسول کی جانب سے اپنی رائٹرز کے اعزاز میں ایک عید ملن پارٹی دی گئی جس میں ہماری بہت سی مصنفات، تبصرہ نگار، بہنوں نے شرکت کی..... آئندہ ماہ اس تقریب کی تصاویر کے ساتھ رپورٹ آپ پاکیزہ میں پڑھیں گی..... اور یہ بھی آپ جان ہی گئی ہوں گی کہ اس کی رپورٹ کون لکھ رہا ہے..... اب مجھے نام بتانے کی ضرورت تو نہیں ہے نا.....

اس سے پہلے کہ آپ مصنفات کی سرگرمیوں اور خطوط کی شیرینی میں گم ہو جائیں میں آپ سب کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ کو ذیشان کی شادی کی تصاویر بے حد پسند آئیں اور اس کے ساتھ شادی کا احوال بھی..... بہت سی بہنوں نے تصاویر کی کمی کی شکایت کی ہے، تو یہ شکایت انشاء اللہ آئندہ کسی موقع پر دور کر دی جائے گی..... آپ یہ سوچیں کہ بہت سے لوگوں کی تصاویر لگنے سے رہ گئیں..... حتیٰ کہ عذرار رسول کی چھوٹی بہن کی تو ایک تصویر بھی نہیں ہے۔ ابھی عید ملن کی تقریب میں، میں نے شادی کا البم دیکھا..... تو اندازہ ہوا..... کہ دولہا، دلہن کے خوب صورت ترین پوز تو لگنے سے ہی رہ گئے..... بہر حال آپ کی پر خلوص محبتوں کے لیے صرف جزاک اللہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

اس سال الحمد للہ پاکیزہ کی مصنفات اور تبصرہ نگار بہنوں کی ایک بڑی تعداد نے حج کی سعادت حاصل کی۔ آپ سب کو بے حد مبارک باد۔

مصنفہ فرحت احمد، گلشن حدید، کراچی۔

مستقبل تبصرہ نگار، مسز نزہت اشفاق کی بیٹی عینی اور داماد ثروت، کراچی۔

پاکیزہ کی مستقل قاری امیر اور ان کے شوہر مسرت، دہلی۔

پاکیزہ کی مستقل قاری، مسز روجی شارق، کراچی۔

پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسرت رانی تحصیل کی بیٹی اور داماد، کراچی۔

پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ احمد، راول پنڈی۔

روینہ فرید ایک بہت اچھی مصنفہ ہیں، ان کی تحریر میں سادگی کے ساتھ روانی بھی ہے..... اور ایک منظر کشی

بھی..... روشن آجکینے..... معروف خواتین کے انٹرویو پر مبنی کتاب ہے جس میں تعارف کا قرینہ خوب صورتی اور محبت کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں بائیس خواتین کے بارے میں تفصیلی معلومات درج ہیں۔ اس کتاب کی قیمت صرف چار سو روپے ہے۔ کتاب حاصل کرنے کا پتہ یہ ہے۔ اکیڈمی بک سنٹر (ABC) ڈی۔ 35۔ بلاک۔ 5 فیڈرل بی ایریا کراچی، فون نمبر..... 021.36809201

✽ عظمیٰ آفاق سعید کے سفر ناموں پر مشتمل کتاب ذرا سا گھوم لوں میں کی کمپوزنگ مکمل ہو گئی ہے۔ یہ کتاب انشاء اللہ بہت جلد آب القریش پبلی کیشنز لاہور سے حاصل کر سکیں گے۔

- ✽ پاکیزہ کی مستقل قاری صبا سید کی شادی شکاگو میں ہو گئی ہے (مبارک باد)
- ✽ پاکیزہ کی مستقل قاری ثنا اپنی فیملی کے ساتھ ان دنوں امریکا سے کراچی آئی ہوئی ہیں۔ (خوش آمدید)
- ✽ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار صوفیہ نے اپنا بوتیک کھول لیا ہے۔ (مبارک باد)
- ✽ پاکیزہ کی مستقل قاری بسم حفیظ الرحمن بمبئی نے انڈیا سے فون کر کے ذیشان کی شادی کی مبارک باد دی۔ (ماشاء اللہ)
- ✽ پاکیزہ کی مستقل قاری، زینیرا مبارک، کوہاٹ کا نکاح ہو گیا ہے۔ (مبارک باد)

دعائے صحت کے لیے

- ☆ مصنفہ عطیہ عمر، کراچی بے حد علیل ہیں۔
- ☆ مصنفہ سعدیہ رئیس موکی تبدیلیوں کے باعث علیل ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات بیمار ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی بستر عیال پر ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ گلینہ ضیا بخش، کراچی کی بیٹی مریم بیمار ہے اور کوہاٹ میں عظیم، گلینہ کے ماموں بھی علیل ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل قاری روبینہ اسلم، پیاری اسپتال سے گھر آ گئی ہیں مگر ہنوز بستر عیال پر ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شگفتہ ناصر، قیصل آباد علیل ہیں۔
- ☆ پاکیزہ کی مستقل قاری بسم حفیظ الرحمن بمبئی، انڈیا کا بیٹا بیمار ہے۔ اس کی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے دعا کریں۔
- ☆ پاکیزہ کی قاری ستارہ، کراچی بیمار ہیں۔

انتقالِ پرِمال

- ☆ اس ماہ ہماری بہت پیاری مصنفہ فرحانہ ناز ملک، ان کی والدہ، بہن اور بھائی کی پہلی برسی ہے۔
 - ☆ پاکیزہ کی قاری ڈاکٹر نسreen، کراچی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئیں۔
- نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین مرتبہ سورہ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کریں۔

☆☆☆

بھ اقبال بانو کی رائے، بورے والا سے۔ ”اس ماہ صرف ذیشان کی شادی کا احوال پڑھا اور بار، بار پڑھا..... اور ہر دفعہ پڑھ کر یوں لگا جیسے پہلی بار پڑھ رہی ہوں..... ماشاء اللہ عظمیٰ نے بہت خوب صورت انداز میں لکھا ہے۔ تقریب، مہندی کا وہ لمحہ جب وہ پلیٹ میں کھانا لے کر جا رہی تھیں اور کسی نے ذیشان کی ساس صاحبہ سے ان کا تعارف کروا دیا تھا..... ایسے لمحات اکثر شادیوں میں بہت سے لوگوں نے جھیلے ہوں گے..... اور پھر شادی میں ویٹرس کا بار، بار آنا..... اور اس کی مزاحیہ سوچ..... یہ سب باتیں اور چیزیں عام سی ہیں مگر ان کو کوئی لکھا نہیں کرتا..... اور عظمیٰ تو کوئی لگی لپٹی رکھتی ہی نہیں ہے..... اس کی تحریر کا یہ کھرا پن بہت اچھا لگتا ہے..... سب کی تصویریں غضب کی ہیں، عذرا رسول بہت پیاری لگ رہی ہیں، مصنفات نے بھی خوب پوز بنائے ہوئے ہیں..... مگر تصویریں مزید ہونی چاہیے تھیں۔“ (بانو اتنی ڈھیر ساری تصویریں دیکھ کر بھی تمہاری تسلی نہیں ہو رہی ہے، تم کیا چاہ رہی تھیں ہم اپنی مصنفات کی

ڈبل تصاویر لگاتے..... کہ کھانا کھانے سے پہلے..... اور پھر کھانا کھانے کے بعد)

بھ غزالہ نگار اور کزئی، نیویارک سے۔ ”اس مرتبہ پاکیزہ ذیشان کی شادی کے احوال کے ساتھ مزید مہر لطف لگا۔ عذر رسول کو بیٹے کی شادی بہت، بہت مبارک ہو، ماشاء اللہ بہو بھی بڑی پیاری ہے۔ اللہ معراج صاحب اور عذرا کو ان کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں (آمین) میں نے کئی مرتبہ فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر بات نہ ہو پائی، انشاء اللہ پھر آسکی..... پاکیزہ پڑھ کر ہمیشہ ہی بہت مزہ آتا ہے۔ تمام مصنفات بہت اچھا لکھ رہی ہیں..... رائٹرز کے انٹرویو بھی بہت پسند آتے ہیں۔“ (پیاری غزالہ مختصر سے خط کا شکریہ! تفصیلی تبصرہ بھی ضرور بھیجیو)

بھ ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیالہ دین اسپتال سے۔ ”حسب معمول تم نے جو کچھ کہا بہت اچھا کہا اگر ہم نہ کسی کے لینے میں رہیں گے نہ دینے میں تو حقوق العباد کیسے ادا ہوں گے۔ جن کی ادائیگی نہایت ضروری ہے۔ شاید لوگوں کے دلوں میں تمہاری بات اتر جائے، آمین۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ذکر سے سرفراز ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ آخری امید کی قسط بہت ایمان افروز تھی۔ قیصرہ حیات بہت اچھے موضوع کو لائی ہیں، گزارش ہے کہ اگر انگریزی جملوں کا استعمال نہ کریں تو ان کا یہ پیغام زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچائے گا (جی ہاں آپ کا مشورہ پہنچایا جا رہا ہے) ابھی امید باقی ہے۔ بہت اچھی کاوش ہے، موضوع کے لحاظ سے خاص کر۔ اُف عظمیٰ تمہارا بہت شکریہ انتظار ختم کروایا اور بہت پیاری کوریج کی پٹیا چلا کہ..... ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا..... مگر تصویریں ذرا زیادہ ہوتیں تو زیادہ اچھا تھا خیر قبضہ گروپ اور اس عذرا کی بچپن کی ہجولیوں کے باوجود ہم اپنا مکھڑا دکھانے میں کامیاب تو ہی گئے۔ شکریہ عظمیٰ..... ویسے تم واقعی باجی ہو..... اس طرح شہزادوں اور شہزادیوں کی شادی کے لیے دعا گور ہو اور دعائیں وصول کرو..... عذرا کی چوٹی کے ذکر نے تو ہمیں بھی پتھر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے عذرا کو ان کی نیک نیتی کا صلہ پیاری سی بیٹی، بہو کے روپ میں عطا فرمائی امید ہے فاطمہ بھی اپنی ان امی کا حق پوری طرح ادا کرے گی۔ اللہ تعالیٰ عذرا اور معراج صاحب کو ذیشان اور فاطمہ کی خوشیاں دکھائے، آمین۔ شادی کے احوال سے تفصیلات پڑھ کر ہمارا دل دھڑک کر رہ گیا کہ کہیں عذرا بھی لندن کو پیاری نہ ہو جائیں رضوانہ کی طرح..... ذیشان، فرحان، عذرا اور سین کی محبت اچھی لگی۔ عذرا کی سمدھن سے تمہاری یادگار ملاقات خوب رہی اور پیاری عقیلہ تو واقعی سونے کی ڈلی کی طرح ہی چمک رہی تھیں۔ کیا بات ہے کسوٹی کو بہت پریش میں رکھتی ہو، معصوم بچی، تم سے پوچھ کر کھاتی ہے پھر بھی تم اعتراض کرتی ہو، بچے کہیں اجازت لے کر آئیں کریم کھاتے ہیں..... شادی کے احوال پر اتنا لکھا جاسکتا ہے کہ پھر بہنوں کی محفل میں صرف ہم ہی ہوں گے۔ (دیگر خطوط کا بھی ایسا ہی انداز ہے کہ اکثر بہنیں تو تبصرہ لکھنا ہی بھول گئی ہیں) ہالہ احمد کی کہانی خاص نہ لگی حالانکہ یہ اچھا لکھتی ہیں، متاع دل میں شکر ہے انتہائی معصوم دیریکتا بخیریت محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ اب صلح تو ہو ہی جائے گی، میاں، بیوی کی۔ اسٹیل کی پتیلی ایک اچھے موضوع پر بہت اچھے انداز میں لکھی گئی۔ اعتبار و وفا کچھ تو آگے بڑھی اس کا ٹیپو ڈرائیو ہو تو اچھا ہو جائے گا۔ شیریں حیدر۔ اپنے مخصوص انداز میں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ یہ قسط بھی خوب تھی۔ پردہ اور حساب دوستاں کا موضوع اچھا تھا اور انداز بیان بھی..... اے عشق تیرے ہیں کھیل عجب پردو تین اقساط کے بعد تبصرہ کریں گے ابھی تو کرداروں کا تعارف ہو رہا ہے۔ نایاب جیلانی کی کہر میں اچھے انداز میں اختتام پزیر ہوئی۔ اقبال بالو دلچسپ تحریر لے کر آئیں۔ عنوان سے تو لگتا ہے مسٹر اے ڈی کامیاب ہو جائیں گے ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ یہ شاید ان کا بہروپ ہو۔ رخ چوہدری سے ملاقات اچھی رہی۔ اللہ تعالیٰ انہیں صبر عطا کرے، آمین۔ اختر شجاعت کا مضمون بہت بصیرت افروز تھا۔ اللہ انہیں جزا عطا کرے، آمین۔ شائستہ زریں کا سروے ایک نئی تبدیلی کے ساتھ اچھا لگا۔ اب باری ہے بہنوں کی محفل کی..... ذکیہ بلگرامی جو ہماری دوست بھی ہیں ان کے لیے دعائیں۔ ہم نے عظمیٰ کو بہت فون کیا اجیہ کی مبارک باد کے لیے مگر انہوں نے اٹھایا نہیں۔ (عظمیٰ کا نیا فون نمبر آپ مجھ سے لے لیجیے گا) مسز تنویر بخاری کا اور تمہارا مشورہ اور پیغام ماؤں کے لیے بہترین ہے۔ آج کل بچوں کی تربیت اور دینی تعلیم کی طرف ماؤں کا رجحان ہی نہیں ہے۔ نور افشاں، بیٹا میرے خطوط پسند کرنے کا شکریہ..... امینہ کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ شہلا نواز کی رائے کام والیوں کے لیے سونی صدر ست ہے۔ ہاں ہم نے عذرا سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ پاکیزہ میں کسی بہانے آئیں، بے شک ان کا دوبارہ انٹرویو ہی کیوں نہ ہو (جی ضرور ہو جائے ان کا انٹرویو دوبارہ) عظمیٰ کو بھی باقاعدگی کے ساتھ شامل پاکیزہ کریں، آخر دلچسپ تحریریں اور دلچسپ لوگوں پر ہم بہنوں کا بھی تو حق ہے۔“ (جی ضرور تبصرے کا شکریہ)

بھ امینہ عندلیب، سلا نوالی سے۔ ”سب سے پہلے ذیشان رسول کا احوال پڑھا جس میں لکھی جھلک سے معلوم ہوا کہ

عذر رسول صاحبہ کے بیٹے کی ویسے کی میزبان انجم انصار سب سے پہلے پہنچ گئی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں میں آپس میں کتنے قریبی تعلقات ہیں۔ عظمیٰ آفاق کی مزے دار تحریر نے ہم سب کو بھی اسی محفل میں پہنچا دیا۔ اختر شجاعت نے بہت اچھا لکھا۔ شائستہ زریں کا سروے تو ہمیشہ ہی اے دن ہوا کرتا ہے۔ یہ جان کر بہت خوشی ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا شروع کی جا رہی ہے۔ تمام بیمار بہنوں کے لیے صحت مندی کی دعائیں اور اپنی دعاؤں میں آپ سب مجھے بھی یاد رکھیے گا۔ (ایمنہ..... تم کو ہماری ہر قاری بہن یاد رکھتی ہیں۔ عذر رسول کے بیٹے کی ویسے کی تقریب میں میری میزبان کی حیثیت ہے۔ شکر ہے نہ صرف عذرا کو اچھی لگی بلکہ ان کی بڑی ممانی نے بھی اس بات کو بے حد سراہا۔ اور یہ بات تم کو بھی اچھی لگ رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پرانی دوستیاں..... کسی طرح بھی قرابت داریوں سے کم نہیں ہوا کرتی ہیں)

کچھ مددیکہ زہرہ، من آباد کراچی سے۔ ”پہلے میں پرانے پاکیزہ خرید کر پڑھا کرتی تھی..... مگر جب جلت رنگ بہت اچھا لگنے لگا تو میں باقاعدگی سے پاکیزہ خریدنے لگی..... مجھے شیریں حیدر کی تحریریں بہت اچھی لگتی ہیں۔ آپ یہ بات ان کو بتادیں۔ تازہ شمارے میں تو ذیشان رسول کی شادی کے احوال کے بارے میں کیا کہوں کہ کتنا اچھا ہے۔ عظمیٰ آفاق کی تحریر میں نہ بناوٹ ہے نہ تکبر ہے اور نہ ہی خود اپنے منہ میاں مٹھو والی بات ہے..... اور میں یہ بات جانتی ہوں کہ جو دل کے اچھے ہوتے ہیں، وہ اپنے قلم کے بھی سچے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ دیکھو بیٹا یہ ذیشان میاں نے پہلے اپنی تعلیم مکمل کی پھر حج کیا اور اب ان کی شادی ہوئی ہے۔ میرا بیٹا کہنے لگا..... امی یہ بھائی تو بہت اچھے ہیں۔ انجم باجی آپ میری دلی مبارک باد عذر رسول تک پہنچا دیں۔“ (پیاری مددیکہ اس محفل میں خوش آمدید..... تمہاری پیار بھری مبارک باد جب میں نے عذر رسول تک پہنچائی تو وہ جو اب تمہیں دعا میں دے رہی تھیں)

کچھ مستحیہ صدیقی، لاہور سے۔ ”پاکیزہ میں ذیشان کی شادی کا مزید ار حال پڑھا..... میں بھی حجاب لیتی ہوں اور ماشاء اللہ میری سب تندیں بھی حجاب لیتی ہیں اس لیے مجھے حجاب لینے والی شخصیات بہت پسند ہیں..... عذرا آنٹی گو بہت، بہت مبارک ہو اتنی پیاری سی دکھن..... اور عظمیٰ آپ کی آپ کا بے حد شکر یہ کہ آپ نے ہمیں شادی کی تقریب کی سیر کروادی..... اور انجم آنٹی..... آپ کو میں عرصہ دس سال سے پڑھ رہی ہوں اور مجھے آپ کی باتیں بہت اچھی لگی ہیں..... اور عذرا کی بہبود واقعی بہت پیاری ہے.....“ (آپ کی مبارک باد میں نے عذرا تک پہنچا دی ہے اور وہ جزاک اللہ کہہ رہی ہیں)

کچھ افسر سلطانہ، کراچی سے۔ ”انجم جو آپ نے کہا وہ ہم سب کے دل کی آواز ہے..... جزاک اللہ تنہائی کے تمنائی زندگی کی رعنائیوں کا گلا خود ہی گھونٹ ڈالتے ہیں اور اچھی سی عظمیٰ دل خوش کر دیا..... تمہاری کشمی میٹھی تحریر نے مزہ دو بالا کر دیا۔ تصاویر زیادہ اچھی تھیں یا تمہاری تحریر..... اندازہ کرنا مشکل ہو گیا..... عذر رسول اور معراج صاحب کو ایک بار پھر دلی مبارک باد..... ہالہ احمد، فرحین اظفر اور شمیمہ عظمت کے افسانے اچھے لگے۔ اقبال بانو یور نہیں کرتیں۔ رخ چوہدری کا انٹرویو تصویر کے بغیر بھی خوب رہا..... تصاویر ہوتیں تو چار چاند لگ جاتے۔ شمع ہدایت، اختر شجاعت دل سے سجا کر فیض یاب کرتی ہیں۔ سلسلے دار ناولز میں گلہت سیما کو سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ زندگی خاک نہ تھی غالباً اگلے ماہ اختتام پزیر ہوگی۔ شیریں حیدر کو اپنی بات کہنا آتی ہے۔ سروے میں شریک زوجین کے ساتھ معروف فنکار کیا اپنا وجود رکھتے ہیں؟ مصنفات، شاعرات اور پاکیزہ قارئین کی سرگرمیاں پڑھ کر جہاں خوشی ہوئی وہیں اپنی نسیم نیازی کا پرس اور جیولری چھن جانے کا افسوس ہوا۔ جان کا صدقہ مال..... اللہ بہتر نوازے گا۔ سعدیہ عزیز کی والدہ اور تمام مرحومین کی مغفرت کی دعائیں۔ اور جو بیمار بھی ہیں..... اسپتالوں میں گھروں میں..... اللہ رب العالمین سب کو صحت مندی عطا فرمائے، آمین عظمیٰ کی مرتب کردہ پاکیزہ ڈائری پڑھنے میں اس لیے بھی مزہ آتا ہے کہ اس میں سب کی پسند سٹ جاتی ہے۔“ (پر خلوص تبصرے کے لیے جزاک اللہ)

کچھ قانتہ رابعہ، گوجرہ سے۔ ”یکم ستمبر کو پاکیزہ منگوایا۔ ابھی بہنوں کی محفل، جلت رنگ اور عذرا کے ولی عہد کی شادی کا حال پڑھا ہے۔ عظمیٰ کی تحریر جب بھی میں نے پڑھی ہے، مجھے اس میں فطری سادگی اور روانی نظر آتی ہے۔ جب تحریر میں تصنع یا بناوٹ آجائے ہر جگہ اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کا خبط ہو تو توجیر دل میں جگہ نہیں بنا سکتی..... عظمیٰ کی تحریر کا وصف یہ ہے کہ مذاق میں ہی سبھی یہ اپنے آپ کو پیچھے رکھتی ہے۔ فطری بے ساختگی ہے اس لیے پڑھنے کا لطف آجاتا ہے..... بہت سی باتیں کوئی اور لکھنے والی ہوتی تو نہ لکھتی..... بہت سی وجوہات کی بنا پر لیکن عظمیٰ نے سب کچھ بہت اچھے انداز سے لکھا۔ عظمیٰ سے میری

درخواست ہے صرف سفر ناموں یا آنکھوں دیکھے حال کے لیے بھی قلم کو مخصوص نہ کرے بلکہ حقیقی واقعات، حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے بھی لکھے کہ اس کے لیے مطلوبہ صفت (مشاہدہ پلس جزیات نگاری) اس کے لیے اندر بدرچہ اتم موجود ہے۔ اللہ اس کے قلم کو نظر بد سے بچائے اور ایک نہ ایک تحریر کو خالص اپنے لیے پسند کرے..... جب کوئی عمرہ پر یا حج پر جانے کی توفیق ہو تو اس کا سفر نامہ انشاء اللہ بہت اچھا ہوگا..... انشاء اللہ..... میں گواہی دیتی ہوں۔“ (مجھے تو لگتا ہے کہ یہ خط پڑھ کر عظمیٰ خوب موٹی ہو جائے گی۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

بھ شگفتہ حقیق، کراچی سے۔ ”ماہ ستمبر 2015ء کا پاکیزہ اس قدر پیارا لگا ہے کہ وقت کی کمی کے باوجود میں تو مجبور ہو گئی ہوں کہ ضروری بہت، بہت ساری تعریفیں اور مبارک بادوں۔ اللہ مبارک کرے..... عظمیٰ آفاق نے اس عمدگی سے لکھا ہے کہ ہمیں یہی امید ہے کہ دور دراز رہنے والی جو بہنیں شادی میں شریک نہ ہو سکی ہوں گی وہ بھی آنکھوں دیکھا حال پڑھ لیں گی۔ خوب صورت تصاویر اور تفصیلات سے آراستہ عظمیٰ کی مبارک باد بہت پسند آئی۔ ویلڈن عظمیٰ..... انجم انصار صاحبہ کی روشن تحریروں سے ہمیشہ میں نے رہنمائی حاصل کی ہے۔ انہوں نے اس بار مجھے کچھ کہنا ہے میں بہترین تجاویز دی ہیں۔ جس پر ہم ہمیشہ سے عمل پیرا رہتے ہیں۔ اور حامی ہیں کہ دوستوں کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں میرے پاس..... رشتے دار یاں پیچھے رہ جانی ہیں یا سونے کے مقابلے میں خیال رہے کہ یہ یار سونہا سے مراد سکھی سہلی اور ہم راز دوست لیا جائے (بالکل) سارے افسانے ایک سے بڑھ کے ایک رہے..... شیریں حیدر کا منی ناول خوب رہا..... شائستہ زریں حسب معمول شاندار ترین سروے لائیں..... جلت رنگ پڑھ کر بہت لطف آیا اور بہنوں کی محفل کے دو بار پڑھ کر مزے لوٹے گئے۔ پڑھ کے سب بہنوں کے احوال کا علم ہوا۔ بہت اچھا لگا۔ اور ہاں کارنر پر لگی ہوئی شاعری بہت اچھی لگتی ہے ضرور لگایا کریں۔“ (بہت شکریہ)

بھ نسیم ماہارا، کراچی سے۔ ”دلہن سے سجا ہوا شمارہ بڑا اچھا لگا۔ ابتداذیشان میاں کی شادی کا آنکھوں دیکھا حال سے کی۔ ماشاء اللہ عظمیٰ آفاق نے اپنے قلم کا جادو خوب چلایا اور پوری تقریب ہم نے دولہا، دلہن اور تمام مہمانوں کے ساتھ جیسے گزاری خدا نظر بد سے اس خوب صورت جوڑی کو بچائے اور معراج صاحب اور عذرا کو ان کی بہت سی خوشیاں دیکھنی نصیب ہو، آمین۔ تمام سلسلے دار ناول مست خرامی سے اپنی منزلوں کی طرف رواں دواں ہیں، فرحین اظفر کی اسٹیل کی پتیلی کی کھنک نے بہت متاثر کیا..... نفیسہ سعید ابھی امید باقی ہے نے یہ پیغام دیا کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی خنجر شجاعت نے محبت الہی کے بڑے خوب صورت راز افشا کیے۔ رخ چوہدری نے بہت اچھی سی بزم سجائی، ہماری نزہت سے درخواست ہے کہ اس مسند پر سب کی پیاری انجم انصار کو بھی بٹھایا جائے۔ کیا خیال ہے؟ (ابھی پہلے میری مصنفات تو آجائیں) جلت رنگ کے تمام خاکوں نے مزہ دیا۔ بہنوں کی محفل میں جو بہنیں بیمار ہیں اللہ انہیں صحت و تندرستی عطا کرے۔ آمین، جاتے، جاتے تمام اہل اسلام کو عید الاضحیٰ کی پیشگی مبارک باد..... اور بہنوں سے درخواست ہے کہ ڈیپ فریزر کا پیٹ بھرنے سے بہتر ہے کہ قربانی کے اصل مفہوم کو سمجھیں۔“ (جی بالکل)

بھ حسنہ احمد، لاہور سے۔ ”پہلی مرتبہ کسی رسالے میں رابطہ کر رہی ہوں اور اس کی اصل وجہ عظمیٰ آفاق کا دلچسپ انداز میں لکھا گیا ذیشان کی شادی کا احوال ہے..... پڑھ کر بے حد، بے حد مزہ آیا کہ اس سے قبل بہت سے احوال پڑھے ہیں..... مگر اس کو پڑھ کر تو قاری اپنے آپ کو تقریب کا حصہ سمجھنے لگا۔ انجم باجی آپ کے جلت رنگ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں، میری شادی کو نو سال ہو گئے ہیں۔ مگر پاکیزہ سے غافل نہیں رہی اور اب میں بھی تحریری طور پر اس کا رواں میں داخل ہونا چاہتی ہوں.....“ (خوش آمدید پیاری حسنہ مہیں شامل کر کے مجھے دلی خوشی ہو رہی ہے ہاں آئندہ بھر پور تبصرے کے ساتھ شریک ہونا)

بھ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ ”محترمہ عذرا رسول کو بہت مبارک باد..... بہو پیاری ملی ہے، عظمیٰ نے بے حد مزیدار انداز میں شادی کی تقریب کی تصویر کھینچ دی ہے..... مزاج نگاری کے تڑکے نے علیحدہ لطف دیا ہے مگر عظمیٰ کو تو ہم نے دیکھ رکھا ہے۔ دہلی پتلی سی ہے..... یہ اتنی موٹی تصویر کیسے لگ گئی۔ (دراصل عظمیٰ کی تصویر شادی کے گروپس میں نہیں تھی۔ انہوں نے جلد بازی میں جو بھیجی وہ لگادی گئی..... مگر حقیقت یہ ہے کہ عظمیٰ کبھی بھی موٹی نہیں لگتی ہے، یہ شاید قریب سے لی گئی تصویر ہوگی) اس احوال کے بعد شیریں حیدر کا ناول اچھا لگا۔ بہنوں کی محفل پسند آئی اور روحانی مشورے بہترین لگے۔ ہاں بزم پاکیزہ اور رخ چوہدری کا انٹرویو بھی پسند آیا۔“ (نوازش)

بھ ساجدہ بتول، راجن پور سے۔ ”باجی پاکیزہ میں میرا خط شائع ہوا جس کی مجھے اتنی زیادہ خوشی ہوئی کہ میری بیٹی

مجھ سے کہنے لگی کہ بہنوں کی محفل فوٹو اسٹیٹ کروا کے آپ کے کمرے میں لگوا دوں..... یہ محفل مجھے بے حد ہی پسند ہے۔ اس شمارے میں، میری پسندیدہ رائٹر عظمیٰ آفاق نے مجھے بہت خوشی دی..... اتنا مزے کا شادی کا احوال لکھا ہے اور بیچ، بیچ میں اتنی ہنسی کی باتیں ڈالی ہیں کہ یہ حال ہم سب نے ہنستے مسکراتے ہوئے پڑھا ہے۔ ذیشان اور فاطمہ کو دعائیں..... میں آپ سے کہہ رہی ہوں کہ عظمیٰ سے کہیں کہ وہ ناول لکھے پاکیزہ میں۔“ (پہلی ساجدہ اس دفعہ تو آپ نے عظمیٰ کے علاوہ کسی کہانی کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی ہے۔ مجھے اس وقت بہت زیادہ خوشی ہوگی کہ آپ ہمارے پورے پرچے پر اپنی رائے دیں۔ دولہا، دلہن آپ کی پر خلوص محبت پر شکر یہ کہہ رہے ہیں)

بھ ام ایمان قاصی، کوٹ چٹھہ سے۔ ”سب سے پہلے بہنوں کی محفل کو ہمیشہ کی طرح رات میں پڑھا ہے۔ ہر ماہ قاری بہنوں سے ہونے والی اس ملاقات میں ایک الگ ہی مزہ ہے۔ علیل بہنوں کے لیے شفا اور جن بہنوں کے عزیز واقارب اس دنیا سے چلے گئے ان کے لیے مغفرت کی دعا ہے۔ ذیشان رسول کی شادی کی خوب صورت تصاویر کے ساتھ عظمیٰ کی تحریر نے گویا چار چاند لگا دیے۔ عظمیٰ کی بھی تصویر رنگین ہوتی تو زیادہ اچھا لگتا۔ عذر رسول اپنی ہمیشہ والی ڈینٹ لک میں بہت اچھی لگیں۔ دیگر رائٹرز سے بھی خوب ملاقات رہی اور دلہن، دولہا تو ماشاء اللہ ہیں ہی خوب صورت..... ہالہ احمد کی ہلکی پھلکی تحریر اچھی لگی۔ واقعی دوسروں پر تنقید دنیا کا سب سے آسان ترین کام ہے اور اپنی اصلاح سب سے مشکل..... متاع دل میں مکافات کا عمل شروع ہونے کو ہے۔ فرحین انظفر کی تحریر اچھی تھی۔ جو لوگ مادی اشیا کو انسانی جذبات پر ترجیح دیں ان کا انجام تو ایسا ہی ہوتا ہی ہے۔ اعتبار وفا کی یہ قسط بھی تسلسل بھرے بحس کے ساتھ رہی..... شیریں حیدر! آف بہت نازک موضوع پر قلم اٹھایا آپ نے یہ ماؤں کی عظمتیں کیسی کیسی قیامتیں لے کر آتی ہیں۔ ڈراموں کی تحریر کا آغاز تو اچھا ہے۔ شمیمہ عظیمت علی کی ہلکی پھلکی کہانی اچھی تھی۔ نایاب جیلانی نے انسانی رویوں کی شدت کو دکھاتے ہوئے اچھا اختتام کیا..... مگر مجھے لگا ان کو فاطمہ کو ماہر سے معافی مانگتے اور اپنے رویے کو مثبت انداز میں ڈھالتے دکھانا چاہیے تھا۔ اقبال بانو کی تحریر پر تبصرہ کھل ہونے کے بعد..... رائٹرز سے جب بھی ملاقات ہو مجھے بے حد اچھا لگتا ہے۔ رخ کی باتیں پڑھ کر بھی اچھا لگا۔ ہر ماہ کسی رائٹر سے ملاقات ہو تو کیا کہنے..... شمع ہدایت محبت الہی ایک خوب صورت سلسلہ جو کچھ دیر کے لیے اپنا احتساب کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ہم نے کیا محبت الہی کا حق ادا کیا اور کس منہ سے اپنے مالک کے سامنے جائیں گے؟ شائستہ کا سروے اس بار دلہن نمبر کے حساب سے تھا اچھا لگا۔ پاکیزہ ڈائری ہمیشہ سے زیادہ اچھی لگی۔ آپ آپ یقین کریں جلت رنگ میں واجدہ کا کردار پڑھ کر مجھے بھی ایک کردار یاد آیا۔ ایسے لگا آپ نے اسی کے اور یہی لکھا ہو یہ سب..... سب سے زیادہ مزہ جیلہ آپا کے خیالات اور عادات پڑھ کر آیا۔“ (شکر یہ)

بھ شمع ملک، رحیم یار خان سے۔ ”ماہ ستمبر کا پاکیزہ، دلہن نمبر کے حساب سے ٹاپ پر رہا۔ سرورق پر نیٹوں کے دونوں نیٹاں بہت خوب صورت تھے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں باجی انجم انصار نے درست کہا کہ ہمیں ایک دوسرے کے پاس آنا جانا چاہیے۔ عظمیٰ آفاق سید کو ذیشان کی شادی کا اتنا اچھا احوال لکھنے پر مبارک باد دیتی ہوں..... تصویروں میں مجھے تو سب سے زیادہ باجی عذر رسول کی تصویر اچھی لگی۔ کیونکہ ہر تصویر میں ان کے سر پر دوپٹا (چادر) موجود رہا۔ حالانکہ سنا ہے کہ ان کے بال بہت لائے ہیں۔ جلت رنگ حسب معمول بہت زبردست تھا۔ شمع ہدایت میں محبت کے حوالے سے بہت خوب صورت لکھا گیا۔ بہنوں کی محفل میں نور افشاں شیخ شکار پور، کا تبصرہ خوب تھا۔ میں اکثر گنگناتی ہوں میں عائشہ اعوان کا شعر بہت اچھا لگا۔ آخری امید کی تیسری قسط بھی بہت اچھی تھی۔ منی نادل زندگی خاک نہ تھی۔ زبردست چارہا ہے۔ کوئی اور کرے تو بہت مزاجیہ اور دلچسپ تحریر تھی۔ ہلکی پھلکی اور خوب صورت انداز والی اس تحریر نے بہت ہنسایا۔ محبت یہ نہیں ہوتی، پردہ اور حساب دوستاں پسند آئیں۔ مگر جس کہانی نے زیادہ متاثر کیا وہ تھی خاموش محبت۔ الفاظ جیسے موتی پروئے ہوں پھر منظر کشی، گلگت کے پہاڑوں اور پانی کے جھرنوں کا ذکر، کچھ ماضی کی یادیں تازہ کر گیا۔ ایک تو پوچھنا ہے کہ بزم پاکیزہ میں کتنے سوال بیک وقت بھیج سکتی ہوں (درجن بھر بھی سوالات بھیج سکتی ہیں۔ میں آہستہ، آہستہ لگانی جاؤں گی) اور دوسرا یہ کہ اگر کوئی افسانہ بھیجا جائے تو آپ کے نام ڈائریکٹ بھیج دیں یا ادارے کے نام پر.....“ (جس طرح آپ مناسب سمجھیں..... دونوں صورتوں میں وہ میرے پاس ہی آئے گا)

بھ خولہ عرفان، کراچی سے۔ ”رسالے کا مطالعہ مکمل کر چکی ہوں علاوہ دو ناول کے۔ سرورق پر موجود گہرے آسمانی رنگ میں نلبوس ماڈل کو دیکھ کر جو ٹھنڈک کا احساس اجاگر ہوا تھا آپ کا ادارہ پڑھ کر وہ گہرے سکون میں ڈھل گیا اور جب مطالعے کا

سفر آگے بڑھ کر اللہ مبارک کرے کے نفس مضمون پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ آپ کی شخصیت کا حسن تھا جو رسالے کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ ایک لمحہ کو ایسا لگا کہ وہاں تو ذیشان رسول صاحب کی بارابت ہے اور یہاں مصنفین ستاروں کی صورت میرے گھر میں موجود ہیں۔ آپ کے ساتھ ادب کی اور بھی معتبر ہستیوں کو دیکھنے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ عظمیٰ آفاق صاحب نے بہت اچھی تصویر کشی کے ساتھ شادی کا احوال قلمبند کیا ہیں۔ یقین جانیں طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی عذر رسول صاحب سمیت آپ سب مصنفین کا دیدار کر کے دعا کرتی ہوں جلد آپ سے ٹیلی فونک یا بالمشافہ ملاقات بھی ہو سکے، آمین۔ آگے بڑھی تو خوب صورت افسانوں اور ناولوں کی قطار کو اپنا منتظر پایا۔ پہلے سارے افسانے زیر مطالعہ لائی پھر ناول اور ناولٹ، نایاب جیلانی کا کہر میں کہانی کے تقاضوں کے عین مطابق اختتام پزیر ہوا..... اُمّ ثمامہ کی خاموش محبت موضوع اور اس کی مناسبت سے لفظوں کا انتخاب خوب تھا البتہ ایک جگہ نور نامہ کا لہجہ اور الفاظ پہاڑی لوگوں کے انداز گفتگو کی عکاسی کرتے نظر نہیں آئے۔ جہاں وہ پلوشہ سے کہتی ہے کہ یہ لوگ یہاں اس جنت نظیر وادی میں چند دن گھومنے تو آسکتے ہیں مگر ہماری طرح رہ نہیں سکتے ویسے کہانی اور انداز بیان دونوں جاندار تھے۔ اقبال بانو صاحبہ کا دلہن میں لے کے جاؤں گا بہت اچھی تحریر لگی۔ کچھ کچھ اندازہ ہو رہا ہے کہ اگلی قسط میں کیا ہوگا۔ ثمینہ عظمت علی کا حساب دوستاں بھی نیا اور مختلف موضوع تھا پسند آیا۔ روشا نے عبدالقیوم کا محبت یہ نہیں ہوتی، فرحین اظفر کا اسٹیل کی پتیلی اور نفیسہ سعید کا ابھی امید باقی ہے تینوں مختلف موضوع لیے بہترین تحریریں تھیں۔“ (تفصیلی تبصرے کا شکر یہ)

بھ عزیزیکہ عرفان، سعودی عرب سے۔ ”میرے شوہر عرفان نے پاکیزہ حاصل کرنے کے لیے نہ جانے کتنے چکر لگائے..... تب کہیں جا کر مجھے پاکیزہ ملا ہے..... اور میں پہلی دفعہ کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے اپنی رائے دیتے ہوئے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ہمیں عظمیٰ آفاق کی تحریریں بے حد بے حد پسند ہیں۔ اور انہوں نے شادی کا مزے دار حال لکھ کر نہ صرف ہماری شرکت کروادی..... بلکہ ہمیں خوش بھی کر دیا ایسی ہنستی مسکراتی تحریریں ہمیں بے حد پسند ہیں۔“ (پیاری عزیزیکہ اس محفل میں خوش آمدید..... عرفان بیٹے کا بھی شکر یہ کہ وہ تمہارا اتنا خیال رکھتے ہیں اور ہاں آئندہ پاکیزہ کے لیے تمہارا بھرپور تبصرہ ہونا چاہیے..... ہاں عظمیٰ شکر یہ کہتی ہیں)

بھ نائلہ بی بی الرحمن، بہاول پور سے۔ ”ہر ماہ کی طرح اس بار بھی شمارہ اعلیٰ ترین تھا۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے زبردست باتیں کی ہیں، میں تو پہلے کی یہ شو شا چھوڑ چکی ہوں اپنی دوستوں میں کہ جب آپ بیٹریاں چڑھتے وقت ریلنگ کا سہارا لینے لگیں تو سمجھ لیں کہ بڑھا پا آیا ہی چاہتا ہے اور باجی یقین مانیں میری ایک دوست نے تو ڈر کے مارے ریلنگ پکڑنا ہی چھوڑ دی ہے۔ آدم سے انسان تک، قائدہ رابعہ کی اچھی کاوش تھی۔ شائستہ انجم کی ضرورت مند حسب حال تھی اور اچھی تھی۔ عقیلہ حق کی عید مبارک حقیقت سے دور لگی مگر لکھنے کا انداز اچھا تھا۔ مگر اس دنیا میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے نا..... شیریں حیدر زبردست لکھتی ہیں، ماشاء اللہ۔ محترمہ شمیم فضل خالق صاحبہ کی بھی تحریر بہت اعلیٰ تھی۔ چلو شکر ہے کہ نشانہ فٹ لگا ورنہ ہیرو، ہیروئن کی ایسی کی تھی ہو جاتی..... میمونہ صدف کی کاوش یہ تیری ہے، بہترین تحریر تھی۔ بخشل ایک سبق آموز افسانہ تھا اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسی طرح نیکیاں کرنے کی توفیق دے، آمین۔ جلت رنگ ہمیشہ کی طرح اعلیٰ اور ہنسنے والا تھا۔“ (شکر یہ)

بھ فرخندہ جعفری، گاؤں مدینہ سیداں سے۔ ”آپ نے ماواگست میں میری صحت کے لیے دعا کی اور قاری بہنوں سے بھی دعا کروائی۔ آپ سب کی دعاؤں کی وجہ سے میں کچھ لکھنے کے قابل ہوئی ہوں۔ آپ کا بہت شکر یہ میرا شعر بھی پاکیزہ میں لگانے پر شکر یہ..... آپ ڈائجسٹ کے پیپر بڑھادیں۔ تمام لکھاری بہنوں کو بہت، بہت مبارک باد، سب ماشاء اللہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔“ (اللہ آپ کو کلی صحت دے آپ کی حوصلہ افزائی آئندہ بھی ہوگی)

بھ حمیرا، بفرزون کراچی سے۔ ”مجھے کبھی کسی ڈائجسٹ میں خط لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن پاکیزہ ڈائجسٹ کو اپنی دوست کے گھر وقت گزاری کے لیے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ آئی آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے اس میں خطوط بھی لکھے جاتے ہیں۔ اسی لیے میں نے بھی ایک خاص وجہ سے آپ کو خط لکھا ہے۔ (خوش آمدید) کیونکہ مجھے قسط دار ناول بغیر شروع سے پڑھے مزہ نہیں آتا لہذا میں نے افسانے پڑھنے شروع کر دیے۔ آئی موسم گل پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ واقعی ہم اپنی زندگیوں میں اتنے مگن ہوتے ہیں کہ آخرت ہمیں یاد ہی نہیں رہتی۔ صرف دنیا کو ہی سب کچھ سمجھنے والوں کے لیے نسیم منیر علوی کا یہ افسانہ اچھا لگا۔ لیکن جس افسانے نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ رحمانہ حسن کا شائع ہونے والا وارث افسانہ پڑھ کر میں

حیران رہ گئی گویا یہ بالکل سچی کہانی تھی۔ (پسندیدگی کا شکر یہ)

بھہ حمیرا توشیحین، منڈی بہاؤ الدین سے۔ ”باجی اس مرتبہ پورے رسالے کی جان اور شان ذیشان رسول کی شادی کا احوال تھا۔ تصاویر ایسی کہ بار بار دیکھنے کو دل مچلے اور عظمتی کے قلم نے تصور کی آنکھ سے ہمیں سب کچھ دکھا ڈالا۔ انجم باجی آپ بہت گریس فل اور پیاری لگ رہی ہیں۔ رفاقت جاوید بہت ڈینٹ لگیں۔ عقیلہ حق بھی پیاری لگ رہی تھیں جبکہ نگہت غفار سادہ سے سوٹ میں بہت سادہ لگیں۔ تصاویر آگے کی طرف جانے ہی نہیں دے رہیں جب سچی رسالہ کھولتی ہوں تصویروں پر نگاہیں جم جاتی ہیں۔“ (پسندیدگی کا شکر یہ)

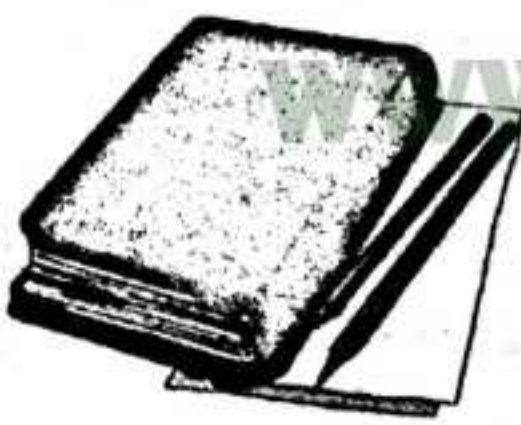
بھہ ستارہ آمین کوئل، پیر محل سے۔ ”سرورق سے پس ورق تک زبردست، ذیشان رسول کی شادی کا احوال ویلڈن عظمتی آفاق زبردست فوٹو ز بہت اعلیٰ تقریباً سب لیکن جو چیز مجھے متاثر کر گئی وہ تھا پردہ عذر رسول اور بہن، بھابیوں وغیرہ کے ڈھکے سر..... اب ہو جائے تبصرہ..... شیریں حیدر کا ناول پڑھ کر رو تکتے کھڑے ہو گئے اللہ تو بہ ہے، ڈرٹمن بلال شاباش ہے لڑکی بہت شکر یہ ہلے لے لکھنے کا آغاز ہی بہت اچھا ہے۔ متاع دل میں شکر ہے ڈرٹیکتا کو اشعر لے گیا اب آگے سب اچھا ہو جائے گا۔ نایاب جیلانی، اقبال بانو، بہت سا پیار و دعائیں۔ قیصرہ حیات اور نگہت سیماد ویلڈن آل دا بیسٹ سات کے سات افسانے بہت اچھے تھے ثمنینہ عظمت کی حاضری اچھی لگی۔ اتم ثمامہ، نفسہ سعید واہ جی واہ ایسے ہی نکھتی رہیں۔ ہالہ احمد بہت اچھا سبق دیا۔ فرحین اظفر کی اسٹیل دی پہلی نال چھا گئے او..... پردہ نائس تحریر..... واؤرخ چوہدری سے ملاقات، نزہت اصغر جیتی رہیں آپ دل خوش کر دیا۔ بہنوں کی محفل سے نازنین آفریدی، کوثر خالد، صائمہ سجاد بخش کی غیر حاضری گراں گزری..... واہ فاطمہ چوہدری گڑیا تم نے تو دل خوش کر دیا اپنی حاضری لگوا کر اور مبارک باد قبول کرو پہلی تحریر ہی سنہرے قبولیت پا گئی۔ پیار بھری تھکی بہت سی دعائیں تمہارے لیے۔ بہنوں کو ولی عید مبارک باد بوٹیاں کھانے میں اتھ ہولا رکھنا سب اپنے معدے پر دھیان دینا ہا ہا..... ویسے نزہت اصغر جیسے رخ چوہدری کے ساتھ ملوایا میرا بھی دل کیا کہ کسی نہ کسی رائٹر کے ساتھ میں بھی حاضر ہو جاؤں۔ تحریری ملاقات کرو دوں آپ کا کیا خیال ہے انجم آپنی (انٹرویو کارنر میں شرکت ہو سکتی ہے) عظمتی آپس کی بات میرے سر پر بھی پودینے کی گٹھی ہے۔“ (پسندیدگی کا شکر یہ، گڑیا سر پر بال ہونے چاہئیں کم ہوں یا زیادہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا)

پیاری بہنو! تحریری یا زبانی میری کوئی بات آپ کو گراں گزری ہو تو اس کی معافی کے بعد..... آئیے پہلے درود پاک پڑھتے ہیں اور پھر دعا مانگتے ہیں..... یا اللہ، یا رحمن، یا رحیم، یا کریم..... میرے جسم کو شفا اور دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نور بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں، اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یا رب العالمین مجھ سے، میری اولاد سے اور میرے تمام عزیز واقارب سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا..... اور ہر گناہ، ہر عظمتی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا، اپنی نظر میں چھوٹا مگر دوسروں کی نظر میں بڑا بنا دینا..... اور دونوں جہاں میں مجھے خیر عطا کرنا کہ بے شک تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے اور تیری شائب سے بڑی اور تیری پناہ عزت والی ہے۔ اس لیے صرف اپنا محتاج کرنا اور ہمیشہ، ہمیشہ اپنی شان کے حساب سے ہم سب پر اپنا رحم، کرم اور فضل کرنا اور ازل سے ابد تک سب کو معاف کرنا کہ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

دعا گو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

DOWNLOADED FROM
PAKSOCIETY.COM

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا
مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ c.63 فیزا 11 یکسٹیشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 021-35804200 , 021-35895313 EXT 107,118



حمدِ ربِّ ذوالجلال

اے رب میں کم سخن ہوں یہ اظہارِ حال ہے
لکھوں میں تیری حمد یہ دل میں خیال ہے
رحمن ہے رحیم ہے تو ذوالجلال ہے
تیری ہو کیا مثال کہ تو بے مثال ہے
کہتا ہوں لا الہ تو رکھتا ہوں یہ یقین
اک رب کائنات ہی لازوال ہے
وہ لفظ دے کہ میں تیری مدحت رقم کروں
ہونٹوں پہ یہ دعا ہے، یہ دل میں خیال ہے
اک تیرا نور ہی مرے پیش نظر ہے آج
جانِ حزیں کو ذکر تیرا اندمال ہے
ذره ہوں کائنات کا میں رب کائنات
میں جو بھی کہہ رہا ہوں یہ تیرا کمال ہے
تیرے سوا کسی پہ بھروسا نہیں مجھے
مجھ کو یقین ہے تجھے میرا خیال ہے

شاعر: محسن علوی

مرسلہ: شاز یہ محبوب..... کراچی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

سب کچھ خدا سے مانگ لو عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
دونوں جہاں سنوار لو عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
پھول کھلیں چمن، چمن مہکے ہر اک کلی، کلی
نعتِ نبیؐ لکھو اگر عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
دل کی سیاہی دھل گئی شامِ الم بھی ڈھل گئی
روشن حیات ہو گئی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
وہ اک نگاہ شوق تھی لمحوں میں سرنگوں ہوئی
روضے پر جب پڑی نظر عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
دل کو سرور مل گیا روح بھی پرسکوں ہوئی

صلی علی کہا تھا جب عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
نور کی اک کرن ملی روشن ہوئی تھی کائنات
ساری حیات جب کئی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
جدے کروں میں رات دن بھجوں درود اور سلام
جان بھی دوں تو کچھ نہیں، عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
غیر خدا کے سامنے کرنا کبھی نہ سر کو خم
دل میں رہے نہ کوئی غم عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
اے دل مضطرب تجھے کیوں نہ سکھاؤں ایک بات
سیرتِ مصطفیٰ پہ چل عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
موت ہے کیا حیات کیا عقدہ کبھی نہ کھل سکا
بالے تو رازِ زندگی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر
کیسی ملی حیات تو میرا نصیب دیکھیے
چپکے سے آنکھ موند لی عشقِ نبیؐ میں ڈوب کر

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

ایک ہنر

حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ بچہ دنیا
میں صرف ایک ہنر لے کر آتا ہے اور اسی ایک ہنر سے
اپنی ماں سے سب کام کروا لیتا ہے۔ اس لیے اپنے
رب کے سامنے رونا سیکھو اور اپنے رب کو منالو، بے
شک تمہارا رب ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا
ہے۔ سبحان اللہ.....

نایاب کرن صدیقی، کمالیہ، ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ

حضرت خولہ بنت ثعلبہ کا مقام

ایک عورت اپنے ہاتھ میں لاٹھی لیے راستہ ڈھونڈ
رہی تھی، وہ زمانے کی مصیبتوں کی ماری ہوئی تھی۔ اس
نے حضرت عمر فاروقؓ کو جو لوگوں کے درمیان کھڑے

وہ ہنس پڑا تھا سن کے مرا فسانہ دل مذاق اس نے اڑایا تو آنکھ بھر آئی جو چھوڑتا ہی نہیں تھا کسی بھی پل مجھ کو ملا جو بن کے پایا تو آنکھ بھر آئی عزیز جس کو زمانے سے ہم نے جانا تھا فریب اس سے ہی کھایا تو آنکھ بھر آئی کسی بھی غم کو میں نے کبھی نہ گردانا روتے اس کو جو پایا تو آنکھ بھر آئی انا کی جنگ میں وہ مجھ کو ہار کے خوش سے شگفتہ دل کو بتایا تو آنکھ بھر آئی

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

ایک دن

حرم کے سامنے ہوں گی میں اک دن حال دل اپنا کہوں گی سب میں اک دن تیری چوکھٹ پر رکھ دوں گی جبیں اپنی تجھے روکے منالوں گی میں اک دن تو میرا رب ہے مجھ کو چاہتا ہے کرے گانور سے روشن جیون میرا اک دن تو مجھ سے راضی ہوگا اتنا یقین ہے اسی آس پر آؤں گی تیرے گھر میں اک دن بخش دے گا تو مجھے بھی روزِ محشر یہ وعدہ تجھ سے لینے آؤں گی اک دن تیری حمد و ثنا کہتی ہوں مولا سناؤں گی حرم میں جا کے اک دن

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

عقل اور علم

ہمیں ہر اس شے سے محبت کرنی چاہیے جو محبت کرنے کے لائق ہو اور اس چیز سے نفرت کرنی چاہیے جو قابلِ نفرت ہو لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے جب ہمارے پاس دونوں کا فرق کرنے کے لیے عقل کی دولت اور علم کا شوق ہو۔

از: حلیمہ سعدیہ، کمالیہ

تھے روکا اور ایک طرف لے گئیں۔ حضرت عمر فاروقؓ قریب ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے کان اس کی طرف لگائے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کافی دیر تک اس کی نحیف آواز کی طرف کان لگائے رکھے۔ اس وقت تک انحراف نہیں کیا جب تک اس کی ضرورت کو پورا نہیں فرمایا۔ اس کے بعد جب حضرت عمر فاروقؓ لوگوں کی طرف واپس آئے کافی دیر سے کھڑے انتظار کر رہے تھے تو کسی آدمی نے کہا: "اے امیر المومنینؓ آپ نے اس بڑھیا کی خاطر قریش کے آدمیوں کو روکے رکھا۔" حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: "تیرا ناس ہو جانتے بھی ہو کہ یہ بڑھیا کون تھی؟" اس آدمی نے کہا: "میں نہیں جانتا۔" حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: "یہ وہ خاتون ہیں جن کا شکوہ اللہ تعالیٰ نے ساتویں آسمان پر سنا۔ یہ خولہ بنت ثعلبہ تھیں، خدا کی قسم اگر وہ رات تک میرے پاس سے نہ جاتیں تو میں بھی ان کی ضرورت پوری کرنے تک نہ لوٹتا۔"

مرسلہ: ایمنہ عندلیب، سلا نوالی

غزل

دھوکا اس سے جو کھایا تو آنکھ بھر آئی روگ دل کو لگایا تو آنکھ بھر آئی برس رہا ہے ساون حسین موسم ہے جو ساتھ اس کا نہ پایا تو آنکھ بھر آئی کسی انعام کی صورت ملا اچانک تھا اسی کو پا کے گنویا تو آنکھ بھر آئی وہ جس کی خاطر زمانے کو میں بھلا بیٹھی تماشا اس نے دکھایا تو آنکھ بھر آئی جو مجھ سے پوچھے بنا سانس تک نہ لیتا تھا اسی نے جی کو جلایا تو آنکھ بھر آئی میرے نام کی چپتا تھا رات دن مالا جو بھولنے پہ وہ آیا تو آنکھ بھر آئی اس سے ملنے کی خواہش بڑی تھی دل کو مرے نہ کوئی راستہ پایا تو آنکھ بھر آئی

5۔ اونچی دکان پھیکا پکوان.....
میں نے سوات میں اونچی دکان پر پھیکا پکوان
چکھا..... کیونکہ پکوان کو کنگ آئل پھیکا ہی ہوتا ہے،
جاہلو!

6۔ بھینس کے آگے بین بجانا.....
مجھے بھینس کے آگے بین بجانا پسند نہیں..... اس
لیے میں بکری کے آگے اور پیچھے بین بجاتی ہوں۔
از: نازیہ نزی، نوشہرہ کینٹ

بکرانامہ

قیمت اپنی گائے نے لکھ رکھی تھی نناوے ہزار
ساتھ ہی تاکید یہ تھی کہ بات اس کی مان جاؤں
یہ ہدایت دیکھ کے میں نے یہ پوچھا گائے سے
تیری قربانی کروں یا میں تیرے قربان جاؤں
☆☆☆

ایک بکرے نے کہا بکری سے اے جان عزیز
اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبابوں میں ملیں
☆☆☆

بکرا تلاش کر نہ قسائی کو کال کر
اس بار ہلکا جیب کو تو حسب حال کر
پر دین افضل شاہین، بہاول نگر

زندگی

کوئی لمحہ
ایسا گلاب ہو
کوئی لمحہ
ایسا اسیر ہو

یہ جو
تیرے میرے ہے درمیان
نہ کوئی

ریاضتوں کی زنجیر ہو
تیری ہر خوشی
تیری ہر ادا
میری زندگی کی تحریر ہو

شاعرہ: صائمہ سجاد بنگش، کوماٹ

☆ امینہ عندلیب، سلانوالی
دعاؤں کی اے بہار سلامت سدا رہو
میری سانسوں کی ہر پکار دیتی ہے یوں صدا
☆ جیا عباس، تلہ گنگ

تیرے نام کو سلام فن گلفام کو سلام
تیرے مقام کو سلام تیرے کلام کو سلام
☆ عالیہ بشیر، اسلام آباد

اک نعت لکھو پھر سے جو دل میں سما جائے
پاکیزہ سی محفل میں تیرا نام نظر آئے
☆ مصباح علی، فیصل آباد

تجھے چاہتے ہیں ہم سراتے ہیں ہم
پڑھتے ہیں تیری تحریر کو دل جمعی کے ساتھ
☆ سنبل ملک، لاہور

کہاں ہو تم کو ڈھونڈ رہی ہے
یہ بہاریں یہ سماں
از: کوثر خالدہ، جڑانوالہ

انعام یافتہ تحریر

مجاوروں کا صحیح استعمال

1۔ چور کی داڑھی میں تنکا.....
ایک پولیس نے چور پکڑا پھر خوب تلاش کیا مگر
انہیں چور کی داڑھی میں تنکا نہیں ملا۔ کیونکہ چور کی
داڑھی ہی نہیں تھی۔

2۔ ہوش کے ناخن لینا.....
ہوش کے ناخن لے کر انسان کو سمجھ نہیں آتی کہ
کس حوش کے پاس جائے۔

3۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی.....
آج کل بھاگتے چور نے لنگوٹی پہننا چھوڑ دی
ہے۔ وہ آج کل پورے کپڑے پہنتے ہیں۔

4۔ عقل سے پیدل.....
عقل سے پیدل چلنے کے لیے کہنا نفسیاتی مریض
ہونے کی نشانی ہے۔ وہ کون سا بس میں سفر کرتی ہے۔



عیدی

نسرین کی منگنی کو پانچ سال ہو گئے تھے، ہر چہ مہینے کے بعد یوں لگا کرتا تھا کہ اب ٹوٹی کہ تہ ٹوٹی! ایسی بات بھی نہیں تھی کہ یہ منگنی غیر خاندان میں ہوئی ہو یا دل پر پتھر رکھ کر کی گئی ہو۔ رضیہ اور رقیہ دونوں بہنوں نے بڑی محبت سے اپنے بچوں کی یہ منگنی کی تھی۔ مٹے یہ پایا تھا کہ ساجد کو نوکری ملتے ہی شادی ہو جائے گی۔

منگنی کے ایک سال بعد ہی ساجد کو نوکری مل گئی۔ رضیہ نے اپنی آپا رقیہ سے کہا۔ ”اب اپنی امانت اپنے گھر لے جاؤ۔ نسرین نے بی اے بھی کر لیا ہے، بی اے کے بعد بیاہ ہو جانا چاہیے۔“

”اے لو! اتنی جلدی کیسے کر لوں شادی، ابھی تو اس کے پاس پیسے بھی جمع نہیں ہوئے ہیں۔ نسرین تو بی اے کر کے بھی خاصی نالائق ہے، تم اس کو ایم اے کرادو۔“

”مگر میں یہ تو تم سے نہیں کہہ رہی کہ دھوم دھڑکے سے شادی کرو۔ بس سادگی سے کر لو۔۔۔۔۔ منگنی کے بعد یوں بھی لڑکیاں خاصی نفسیاتی ہو جاتی ہیں۔ دونوں گھرانوں کی کوئی بھی بد مزگی ان کے دل کو دہلا کر رکھ دیتی ہے۔“

”کہہ دیا ناں.....! میں ابھی اپنے ساجد کی شادی اتنی جلدی نہیں کرنے کی۔“ رقیہ آپا نے تنک کر کہا۔

”تو پھر منگنی کیوں کی تھی۔ نسرین تو ہرگز آگے نہیں پڑھے گی، وہ بد شوق ہے۔“

”تمہیں جلدی ہے، تو توڑ دو یہ منگنی اور کہیں اور کر لو۔“

رقیہ آپا کی یہ بات بیچاری رضیہ کو لرزا کر رکھ دیتی تھی اور تب اس سے ایک لفظ بھی نہیں بولا جاتا تھا۔

یونٹھی پانچ سال گزر گئے۔ ساجد کی دوسرے ترقی بھی ہو گئی۔ نسرین اپنی بات پر قائم رہی اور آگے پڑھ کر نہیں دیا۔ اس کے بی اے کے پرچے تو گیس پیپر والوں کی وجہ سے اچھے ہو گئے تھے اور اب وہ آگے رسک نہیں لے سکتی تھی کہ پڑھنے کا شوق بالکل بھی نہیں تھا۔

ایم اے کا نام سن کر ہی اس کو چکر سا آتا تھا اور اس کی سہیلیوں نے اسے یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ نام کے ساتھ اگر بی اے کی ڈگری ہو تو کم عمر لڑکی کا تصور آتا ہے اور اگر ایم اے، ایم فل کی ڈگری لگی ہو تو کسی عمر والی خاتون کا احساس ہوتا ہے جو کہیں لیکچر دینے جا رہی ہے۔ رضیہ نے پانچ سال انتظار بہت کر لیا تھا۔ اب ان میں ہمت تھی نہ سکت..... نسرین کے ساتھ کی سب ہی لڑکیاں خیر سے بیاہی جا چکی تھی۔

رضیہ نے اپنی آپا کے سامنے بھاری جہیز اور سلامی میں اسکو ٹر دینے کے ٹریڈ دکھانے شروع کیے تو رقیہ نے کہا۔

”اچھا عید کے بعد شادی کر لیتے ہیں۔“

رقیہ کا ہامی بھرنا تھا۔ رضیہ بھی خوش ہو گئیں اور مارے خوشی کے..... ایک بھاری سی ساڑھی اپنی بہن کو گفٹ کر دی۔

نسرین بھی خوش تھی..... عید کے بعد شادی ہو رہی ہے اور عید سے پہلے عیدی آئے گی۔ منگنی کے بعد یہ پہلی عیدی تھی جس کے لانے کا ان کی خالہ نے اقرار کیا تھا۔

نسرین مارے خوشی کے سب سہیلیوں کے ہاں فون کر رہی تھی کہ اس کی عیدی آنے والی ہے۔

سہیلیاں اپنی، اپنی عیدیوں کی تفصیل اسے بتا رہی تھیں۔ جس سے اس کے تصورات کی اڑانیں بھی خوب اونچی ہو رہی تھیں۔

”اماں میرا خیال ہے میرے لیے خالہ پانچ ریشمی

تھی۔ ایسی عیدی تو کبھی اس کی کسی پہلی کی نہیں آئی تھی۔
اماں کو کمرے میں لے جا کر پوچھا۔ ”کیا ایسی
بھی عیدی ہوتی ہے؟“ تو اماں نے اپنے آنسو پیتے
ہوئے کہا۔

”ہاں ایسی بھی عیدی ہوتی ہے، تمہاری خالہ رقیہ کی
عیدی پہلی مرتبہ ایسی ہی آئی تھی۔“ اور شاید بعض دکھ اور غم
اس وقت تک ختم نہیں ہوتے..... جب تک کہ ویسے ہی
دکھ ہم کسی دوسرے کو دے کر اسے دکھی نہ کر دیں۔

بے اختیاری میں

بقر عید آنے سے پہلے ہی بکروں کا ذکر ہر گھر
میں ہونے لگتا ہے۔ پندرہ دن پہلے یہ بکرے ہر گلی محلے
میں دکھائی دینے بھی لگتے ہیں..... کوئی بے شک اپنا بکرا
چند گھنٹے پہلے ہی لائے مگر وہ بکروں کی قیمتیں پوچھنا پہلے
سے ہی شروع کر دیتا ہے۔

دبلے پتلے، ناتواں سے بکرے ظاہر ہے سستے
ہوتے ہیں اور صحت مند، بگڑے اور اونچے بکرے مہنگے
ہوتے ہیں۔ گویا یہ سب جانتے ہیں کہ قربانی کا جانور اچھا
ہونا چاہیے مگر سب اپنی، اپنی جیب کو دیکھ کر قربانی کرتے
ہیں۔ اس لیے جہاں تین، ساڑھے تین ہزار کا لاغر سا بکرا
لوگ گود میں لے کر آتے ہیں، وہاں تین لاکھ کے بکرے بھی
نظر آتے ہیں۔ جو تخت پر بیٹھتے ہیں، بادام پتے چباتے
ہیں، پانی کی جگہ شربت پیتے ہیں، ان کی مزید خوبیاں بھی
ایسی ہوتی ہیں جو اخبارات میں ان کی تصاویر کے ساتھ
شائع ہوتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ٹی وی کے مختلف چینلوں بھی
ان کو کھاتے، پیتے، سوتے، جاگتے دکھاتے ہیں۔

بقر عید سے پہلے اور بقر عید کے ہفتہ دس دن بعد تک
بکروں سے متعلقہ گفتگو ہونٹوں پر چڑھی ہوتی ہے۔ نہیں
یہ بیس ہزار والا ہے، ارے نہیں اس کے تو پانچ بھی بہت
ہوں گے، کتنا کمزور ہے۔ یہ بات جو میں بتانے والی
ہوں، وہ بقر عید کے تیسرے دن کی ہے۔ اس شب ایک
شادی میں جانا ہوا..... ملنے والوں کی بیٹی کی شادی تھی۔
جانا بھی ضروری تھا جیسے ہی میر ج ہال میں قدم رکھا سامنے

اور پانچ کاٹن کے سوٹ لائیں گی، ہر سوٹ کے ساتھ
میچنگ جیولری ہوگی۔ میک اپ کا سامان، سینڈل،
چوڑیاں اور گولڈ کی چین تو ضرور ہوگی کہ ساجد بھی ہر وقت
اپنے گلے میں پہنے رہتے ہیں۔“

اماں نے اس کی باتیں سنیں تو ہنس کر بولیں۔
”اری پاگل ہو رہی ہے کیا..... تیری خالہ کوئی بری
تھوڑی لے کر آرہی ہیں جو اتنی ڈھیر ساری چیزیں لے کر
آئیں گی۔“

”مگر میری سہیلیوں کی عیدی تو ایسے ہی آتی ہے۔“
”جھوٹ بولتی ہوں گی تیری سہیلیاں.....“ اماں
نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”میں نے خود دیکھی ہے ان کی عیدی۔ اس
میں جھوٹ بولنے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔“
”تمہاری خالہ کنجوس ہیں، وہ اتنی عیدی
نہیں لائیں گی۔“

”ساجد بھی کنجوس ہے کیا؟“
”ساجد کی اپنے گھر میں نہیں چلتی..... جو ماں
بہنیں کہہ دیتی ہیں وہی ماننے کا عادی ہے۔“

”مگر میری تو بڑی بھاری بے عزتی ہو جائے گی۔
جب میری سہیلیوں کو پتا چلے گا کہ پانچ سال کی سنگنی میں
پہلی مرتبہ عیدی آئی اور وہ بھی تھرڈ کلاس سی۔“ نسرین نے
روتے ہوئے کہا۔

”تم کہہ دینا، خالہ نے کیش میں پانچ ہزار روپے
بھجوادے ہیں کہ جو دل چاہے لے لو۔“ اماں نے پھر تسلی
کے پھائے رکھے۔

اور پھر نسرین کی عیدی آگئی۔ سوٹیاں، چینی، کھلہ،
چینی ہر شے آدھا، آدھا کلو کے قریب تھی۔

”یہ سب کیا ہے؟“ نسرین نے حیرت سے پوچھا۔
”تمہاری عیدی ہے تاکہ عید میں جب ہم تمہارے
گھر آئیں تو تم مزے، مزے کی چیزیں ہمیں پکا کر
کھلاؤ۔“ خالہ ہنس، ہنس کر کہہ رہی تھیں۔

اور نسرین آنکھوں میں آنسو بھر کے کبھی ماں کو دیکھ
رہی تھی تو کبھی خالہ کو! اور خالہ کی ہنسی رکنے میں نہیں آرہی

سرگوشیاں بھی ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہیں۔ اس سے کسی ویسے کی تقریب میں جاتے ہوئے میں اپنے آپ کو کسی نئی نویلی دلہن سے کم نہیں سمجھتی مگر جب کسی تقریب میں پہنچتی ہوں تو اپنا خوب صورت لباس اپنی ہی نظروں میں حقیر نظر آنے لگتا ہے۔ خوب صورت جیولری معمولی سی لگتی ہے۔ بے انتہا توجہ سے کیا گیا میک اپ بھونڈا سا لگتا ہے، ارد گرد کی نظریں تسخیر آمیز دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اگر کوئی ارے یا واہ کا نعرہ بلند کر کے گفتگو کا آغاز کرنا چاہتا ہے تو اس کی کمینگی کا اندازہ اس کے شائستہ جملوں کی ادائگی کے باوجود رہتا ہے۔ سنواری ہوئی، بل کھاتی لٹ جو گھر میں حسن کا اضافہ نظر آتی تھی، وہ محفل میں تماشا اڑانے والوں کا ساتھ دیتی ہے، رخساروں کو چومنے کے بجائے سر عام ڈستی ہے۔ قدرے چوڑی کمر جو گھر میں کمریا نظر آتی ہے، میرج ہال میں کمراد دکھائی دینے لگتی ہے۔ نازک سراپوں کے مابین اپنی جسامت بے ڈھنگی اور بے موقع محسوس ہوتی ہے۔

میری مسکراہٹ کا انداز جو میاں جانی کو از حد پسند ہے، وہ خرائٹ سا ہو جاتا ہے۔ (حقیقت بھی یہ ہے کہ ساری حسیناؤں کو کچا چبا جانے کو دل چاہتا ہے) ایسے موقع پر لوگوں کے نغمہ بار جملے میرے کانوں میں زہر سا گھول دیتے ہیں۔

اپنے سے زیادہ اچھے چہرے اور قیمتی ملبوسات دیکھ کر طبیعت میں تناؤ اور کھنچاؤ بڑھ جاتا ہے۔ ٹھہکتی ہوئی چال بتدریج پختی ہوئی چال تک جا پہنچتی ہے۔ مسکراہٹ زہر آلود ہو جاتی ہے۔ آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹنے لگتی ہیں، تب میں بد ہیئت سراپے اور بد شکل چہرے کو چھپاتے، چھپاتے تھک جاتی ہوں۔ تقریب کے اختتام تک میں مہمان خواتین سے چھپنے لگتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسی تقریبات میں، میں میزبانوں کو خدا حافظ کہے بغیر لوٹ آتی ہوں اور اکثر و بیشتر نیوتے کا لفافہ دینا تک بھول جاتی ہوں مگر اپنی اس بھول پر مجھے کوئی ندامت نہیں ہوتی۔

☆☆☆

صوفے پر دو لھا بیٹھا ہوا نظر آیا۔ انتہائی چھوٹے قد کا..... بے حد بلا سا دو لھا جو دیکھنے پر ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی مریض اپنے اسپتال سے بھاگ آیا ہو..... بے حد لاغر ہونے کے باوجود اس نے شیروانی بھی پہن لی تھی اور وہ بھی انتہائی فٹ..... اور شیروانی کے بٹن حلق تک لگائے ہوئے وہ عجیب سا لگ رہا تھا۔ پانچ ہزار والا بکرا، بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور فوراً ہی اپنی آواز اپنے حلق میں گھونٹ لی کہ کسی کے دو لھا کو ایسے تھوڑی کہتے ہیں مگر جو لہجے اور گفتگو بقرعید کے دنوں پر زبان پر چڑھ جاتی ہے وہ اتنی آسانی سے تھوڑی اترتی ہے، ہے نا۔

ندامت

نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ (میں سوچ، سوچ کر تھک چکی ہوں) میرے ساتھ ہی ایسا ہوتا ہے یا دیگر خواتین کے ساتھ بھی۔ اس کا مجھے علم نہیں مگر میرے ساتھ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ (پریشانی کی بات تو ہے نا)

میں جب بھی کسی جگہ گاتی سی تقریب میں جانے کا قصد کرتی ہوں تو اپنے آپ کو خوب سنواری کرتی ہوں۔ بال پن سے لے کر اونچی ایڑی کے سینڈل تک کی میچنگ کا خیال رکھتی ہوں۔ لباس کا انتخاب ہمیشہ اعلیٰ کرتی ہوں۔ (کہ میاں جانی کا بڑا سا بوتیک ہے) اور جب تیار ہو کر اپنے اوپر ناقہ اندازہ نگاہ ڈالتی ہوں تو میرا انگ، انگ تعریف کا مستحق ہوتا..... گھر کے لوگ میری تیاری کا فائل پروگرام دیکھ کر ہی واہ، واہ کے نعرے بلند کرنے لگتے ہیں۔ (ایسا ہمیشہ ہوتا ہے)

”اللہ بھابی! آج تو کئی قتل ہو جائیں گے، ایمان سے، آپ کی ساڑھی بڑی بمبار لگ رہی ہے۔“ بڑی تند کھلے دل سے تعریف کرتی ہیں۔

”واہ..... ہر کپڑا میری بیٹی پر بجاتا ہے، آج کی تقریب میں میری بیٹی سے اچھا کوئی نہیں لگ سکتا.....“ سر صاحب کی رائے شفقت میں ڈوبی ہوتی ہے۔

”سچی بات ہے! میری بہو جو بھی پہن لے کھل اٹھتی ہے۔“ ساس کا محبت بھرا انداز بھی..... کانوں میں رس گھولتا ہے اور سب سے بڑی بات کہ میاں جانی کی



☆ سیما ممتاز عباس..... لاڑکانہ
 اس عید پہ بھی ہم نہ ملیں گے تو کیا ہوا
 جذبوں میں ہو خلوص تو عیدیں ہزار ہیں
 ☆ عروسہ شہوار، کالا گوجراں جہلم
 تحفہ میری انا کا اچھا دیا گیا
 مجھ کو ہی میری ذات میں الجھا دیا گیا
 نا معتبر رہے جو الفاظ دیر تک
 پیغام آشنائی انہی میں دیا گیا
 ☆ فریدہ جاوید فری..... لاہور
 لہو کا رنگ یہ ہرگز نہیں ہے سچ بتا ظالم
 یہ کس کا پھول سادل تونے پیروں سے کچل ڈالا
 ☆ اتم ایمان..... کوٹ چٹھہ
 مرے ہاتھوں کو قدرت نے ہنر کچھ ایسا بخشا ہے
 کبھی کھو کر بناتا ہوں کبھی پا کر بناتا ہوں
 میں جی بھی ٹوٹ جاتا ہوں کسی سے کچھ نہیں کہتا
 میں چکنا چور ہو کر بھی نئے منظر بناتا ہوں
 ☆ شہلا محمود..... واہ کینٹ
 جان کوئل سراب ہو گئے ہو
 پوری زندگی کا خواب ہو گئے ہو
 جس کو پڑھنا بہت ہی مشکل ہے
 تم تو ایسی کتاب ہو گئے ہو
 ☆ صائمہ سجاد بخش..... کوہاٹ
 عید آئی تو بڑے درد لے کر آئی ہے
 یہ شب وصل ہے یا دکھ کہ نارسائی ہے
 ☆ نگینہ ضیا..... کیاڑی
 وہی بے بسی، وہی بندشیں وہی الجھنیں اے زندگی
 میں ابھی تلک نہ سمجھ سکی تو نصیب ہے کہ نصاب ہے

☆ ناعمہ تحریم..... کراچی
 کیا خاک وہ جینا ہے جو اپنے ہی لیے ہو
 خود مٹ کے کسی اور کو مٹنے سے بچالو
 ☆ مریم کاشف..... حیدرآباد
 میں جھوٹ بول کے دریا عبور کر جاتا
 مجھے ڈبو دیا سچ بولنے کی عادت نے
 ☆ ماہ رخ..... لطیف آباد
 پہچان آدمی کی نہیں سہل آج بھی
 ایک آدمی چھپا ہوا ہر آدمی میں ہے
 ☆ مریم کاشف..... حیدرآباد
 کتابیں، تئلیاں، پر، پھول، پتے
 مرا بچپن ہے بستے میں مقید
 ☆ سامعہ ملک پرویز..... بھیرہ خان پور
 صف دشمنوں کو خبر کرو ضبط کمال ہے مجھ میں
 اک ہی آن میں پلٹ دوں گا یا ایسا جلال ہے مجھ میں
 ☆ نازیہ..... نوشہرہ کینٹ
 میرا تجھ سے اٹوٹ رشتہ ہے
 تو بحر علم ہے اور میں ہوں علم کا طالب
 ☆ جمین نیاز..... ملتان
 اے دل تجھے دشمن کی بھی پہچان کہاں ہے
 تو حلقہ یاراں میں بھی محتاط رہا کر
 ☆ نور افشاں شیخ..... شکار پور
 اس دنیا میں کون کرے وفا کسی سے فراز
 ہیں دل کے دو حروف وہ بھی جدا جدا
 ☆ فردوس شاہی..... لاڑکانہ
 یہ کہہ رہی ہے تمہیں چھو کے آنے والی ہوا
 اداس میں ہی نہیں، بے قرار تو بھی ہے

پر رکھ کر یا لیموں کے اوپر رکھ کر ذرا سا تیل ٹپکا دیں اور ڈھکن فوراً بند کر دیں۔ تکے تیار ہیں۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

کوفتہ پلاؤ

اجزاء: روکھا قیمہ، آدھا کلو۔ پسا گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، سرخ مرچ، لہسن، ادراک پیسٹ، ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ تینوں چیزیں ملا کر ایک پیالی لے لیں۔ آدھا قیمہ میں ڈالے گا آدھا تیاری پر۔ پیاز ایک درمیانی۔ تیل، حسب ضرورت۔ سفید زیرہ اور دھنیا بھون کر پیس لیں۔ ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ ڈبل روٹی کا ایک سلاکس۔ بیسن، ایک کھانے کا چمچ توڑے پر سنہرا کر لیں۔ ثابت گرم مسالا جس میں دو تین عدد تمام چیزیں شامل ہوں۔

ترکیب: قیمہ میں تمام مسالا پیس کر۔۔۔ آدھا، آدھا ملا لیں مگر ہر چیز باریک پس ہوئی ہو یہاں تک کہ قیمے کے ساتھ ایک دفعہ سب کچھ چا پر میں ڈال کر ملا لیں۔ ڈبل روٹی کے سلاکس دودھ میں بھگو کر نرم کر کے قیمہ میں ملا لیں اور چھوٹے، چھوٹے کوفتے بنا لیں۔ اب اسے فریج میں رکھ دیں۔ ایک طرف چاول صاف کر کے بھگو دیں دوسری طرف ایک دیچی میں پیاز باریک، باریک کاٹ کر گولڈن کر لیں۔ تھوڑی پیاز نکال لیں تھوڑی دیچی میں ہی رہنے دیں۔ اب اس میں لہسن ادراک ثابت گرم مسالا (حسب ضرورت) اور نمک مرچ ڈال کر بھونیں پھر کوفتے ڈال دیں اور ہلکے چمچ سے چلائیں۔ نمک اپنے اندازے سے رکھے گا کیونکہ کوفتے بھی شامل ہیں۔۔۔۔۔ کوفتے گل جائیں تو چاول ڈال دیں اندازے کے طور پر آپ کی انگلی کے ایک پور جتنا پانی چاولوں

بہاری بوٹی

پیاری بہنو۔۔۔۔۔ قربانی کے گوشت سے جب تک تکے اور بہاری بوٹی نہ بنے مزہ نہیں آتا، اس لیے اس دفعہ میں یہ ترکیب آزماؤں گی آپ بھی ثرائی کریں۔

اجزاء: گوشت کے پارچے، ایک کلو۔ کچا پپتا، ایک چوتھائی کپ یعنی دو کھانے کے چمچ بھی ہو سکتا ہے۔ (ویسے میری پڑوسن نے پکے پیتے کے چھلکوں سے بھی یہ بنائی تھی) نمک، مرچ حسب ذائقہ۔ گرم مسالا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ (بہتر ہے گھر میں پیس کر استعمال کریں)

ترکیب: گوشت کے پارچوں پر تمام مسالے کم سے کم پانچ گھنٹے کے لیے لگا کر رکھ دیں۔ پھر اسے کڑا ہی میں تھوڑا سا تیل ڈال کر بھوننے رکھ دیں جب پانی خشک ہو جائے اور پارچے گل بھی جائیں تو پیاز کے لچھوں، ہری چٹنی یا رائتے کے ساتھ سرو کریں۔۔۔۔۔ میدے کے درنی پر اٹھے خوب مزہ دیں گے۔ کچھ لوگ سینوں پر چڑھا کر کونے پر بھی انہیں سینکتے ہیں۔

مرسلہ: نیلوفر خان، بہارہ کبو

جھٹ پٹ تکے

اجزاء: ایک کلو گوشت کی چھوٹی بوٹیاں کر کے اس میں دہی کے ساتھ تکے مسالا مکس کر کے میرینٹ کر کے رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد پریشر مگر میں گوشت ڈالیں اور تین کپ پانی ڈال کر پریشر دے دیں۔ دس پندرہ منٹ کے پریشر کے بعد دیکھیں اگر پانی باقی ہے تو خشک کر لیں بوٹیاں گل جانے پر کونے کی دھونی دے دیں۔ طریقہ بہت آسان ہے۔ کونے کو آچ پر رکھ کر لال انگارہ کر لیں اب پیاز کے چھلکے یا روٹی کے ٹکڑے

پاکیزہ آبی کے آزمودہ نسخے

☆ ایک پیچ اسپغول کا چمکا نیم گرم (بالائی نکلا) دودھ میں رات سوتے وقت ڈال کر پینے سے قبض کی شکایت دور ہوتی ہے۔

☆ کالی مرچ، سونف، اجوائن، سونٹھ اور سفید زیرہ، ایک، ایک ٹی اسپون لے کر پیس کر پاؤڈر بنالیں اور ہر کھانے میں دو چٹکی چھڑکیں۔ ہاضمے کی تکلیف کبھی نہیں ہوگی۔

☆ سردیوں کی آمد آمد ہے، خصوصاً زیادہ ٹھنڈے علاقوں میں رہنے والوں کے لیے مفید نسخہ ہے کہ چھوٹے بچوں کو نہلانے سے پہلے گرم پانی میں اجوائن کی پوٹلی (جیسے دو کھانے کے پیچ اجوائن کسی کپڑے میں سی لیں) ڈال دیں اور اس پانی سے نہلائیں سردی کا اثر نہیں ہوگا۔

☆ نومولود بچوں اور ان کی ماؤں کو بھی قابل برداشت گرم پانی میں اجوائن کی پوٹلی ڈال کر نہانا چاہیے۔ نہانے کی جگہ (غسل خانے وغیرہ) اور باہر کا درجہ حرارت ایک جیسا رکھیں تو بچہ کبھی سردی نہیں کھاتا۔ براہ راست ہوا میں نہ نکلیں بلکہ اچھی طرح خود بھی پہنیں اور بچوں کو بھی اوڑھ لپیٹ لیں..... روزانہ بچوں کا نہلانا بے احتیاطی نہیں ہے بلکہ گرم اور سرد کا خیال نہ رکھنا بے احتیاطی بلکہ بے وقوفی ہے۔

مرسلہ: شامرضی، کراچی

طرح مکس کر کے اب دیکھی میں ڈالیں اور پھر بھونیں جب گولڈن ہونے لگے اور سب کچھ یکجان ہو جائے تو گہرے برتن میں نکال کر پیچ کی مدد سے اوپر سطح ہموار کر لیں۔ اب اس پر میوہ چھڑک دیں اور ٹھنڈا ہونے پر سرو کریں۔ مزید ار حلو اتیار ہے۔

مرسلہ: پینا عباس، کراچی

☆☆☆

کے اوپر ہو..... جس طرح بخنی پلاؤ بناتے وقت اندازہ رکھتی ہیں پانی خشک ہونے پر چاولوں کو دم پر رکھ دیں۔ تیاری پر ثابت ہر امسال ڈال دیں۔ راستے، ہری چٹنی یا لہسن، مرچ کی چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

مرسلہ: روبینہ حنیف، کراچی

بنٹر بیف

یوں تو ہنٹر بیف بڑی خاص ترکیب سے بنایا جاتا ہے نرم بھی ہو اور ہیک بھی نہ آئے مگر آج ہم بہت آسان گھریلو سی ترکیب بتا رہے ہیں۔
اجزاء: گوشت، (گائے یا اونٹ کا) ایک کلو کا ثابت ٹکڑا بغیر چکنائی کا۔ نمک، اجینو مو تو، حسب ذائقہ۔ کالی مرچ، آٹھ سے دس۔ ثابت سبز الائچی، چار سے پانچ۔ لیموں، دو عدد۔ ہری مرچ، چار سے چھ۔

ترکیب: ایک دیکھی میں ثابت گوشت صاف کر کے تین جگہ پانی ڈال کر چولھے پر رکھ دیں۔ اب اس میں بتائے گئے مسالے ڈالیں اور لیموں دو پیس کر کے ڈال دیں۔ ڈھکن بند کر درمیانی آنچ پر پکنے دیں۔ گھنٹے بھر تو ضرور پکے گا۔ پانی خشک ہونے لگے تو گوشت کے گلے ہونے (نرم ہونے) کا یقین کر کے بقیہ پانی سکھالیں اب اسے جالی پر رکھ کر ٹھنڈا کر لیں تاکہ اچھی طرح خشک بھی ہو جائے۔ باریک پارچے ٹائٹ کر سرو کریں۔ سینڈوچ یا برگر بنا کر سلاڈ کے ساتھ کھائیں یا مزید ذائقہ دینے کے لیے چلی گارلک مایو ساس یا ٹارٹر ساس (جو مایونیز اور کریم باہم ملا کر بہ ہسانی بن جائے گا) کے ساتھ سرو کریں۔ اس کی باریک اسٹریپس نوڈلز اور پاشا کے ساتھ بھی کھائی جاسکتی ہیں۔
مرسلہ: عرشہ جنید، کراچی

انڈوں کا حلو

اجزاء: پاؤڈر ملک، دو کپ (سوکھا)۔ انڈے، چھ عدد۔ چینی، تین کپ۔ گھی، حسب پسند۔ الائچی، چار پانچ عدد۔ (چمکا پینا کر کوٹ لیں)
ترکیب: دیکھی میں گھی ڈال کر کڑکڑائیں اور ملک پاؤڈر، ملی آنچ پر بھون لیں۔ انڈے اور چینی اچھی



محسوس ہوگا۔

(روا) سوچی اور دودھ کا اسکراب:

دو ٹیبل اسپون سوچی، آدھا کپ دودھ میں بھگو کر ایک پیسٹ سا بنالیں اب اس سے مساج کریں۔ یہ ایٹن کی طرح ہو جائے گا۔ دس سے پندرہ منٹ چہرہ گردن، بازو ملتی رہیں۔ اسکراب میں کہنیوں کو ہرگز مت بھولیں۔ ٹی وی دیکھنا بہت ضروری ہو تو وہیں چادر بچھا کر بیٹھ جائیں اور اپنا کام کرتی رہیں۔ رات سونے سے پہلے اپنی ذات کے لیے تیس منٹ نکالنا کوئی مشکل کام نہیں..... موبائل پر گرم کھینے کے بجائے اپنی جلد کے نکھار پر توجہ دیں۔

آسان نسخے.....

☆ یاد رکھیں جی خانے میں کام کرنے کے دوران اپنا خیال یوں رکھیں کہ ٹماٹر کا ایک ٹکڑا لے کر چہرے اور ہاتھوں پر اچھی طرح دس منٹ تک ملیں پھر منہ ہاتھ دھولیں۔ ہاتھوں میں مریچوں کے نہ ہونے کا یقین کر کے یہ عمل کریں ورنہ نتائج مختلف بھی ہو سکتے ہیں۔

☆ نچوڑے ہوئے لیموں یعنی رس نکال لیا گیا ہو اور چھلکے باقی ہوں تو ایک دم ڈسٹ بن کی نذر مت کریں بلکہ اسے چہرے پر گردن، انگلیوں کی پشت پر اور کہنیوں اور گٹوں پر رگڑیں پھر دس، پندرہ منٹ بعد دھولیں۔

☆ نہایت خشک اور کھردری جلد کے لیے..... دودھ کی بالائی ایک ٹی اسپون، ہلدی، چٹکی بھر، لیموں کے دو تین قطرے یہ سب مکس کر کے رات کو چہرے اور ہاتھوں پر لگائیں اور اچھی طرح مل کر جذب کریں۔ صبح نیم گرم پانی سے دھو ڈالیں۔ بالائی چہرے پر لگا کر دھوپ میں جانے سے پرہیز کریں۔

☆☆☆

حسین اور جاذبِ نظر بہنو! اپنا خیال خود رکھنا ہر کسی کا حق ہے۔

بجنا، سنورنا اچھا لگنا انسانی فطرت ہے مگر اس میں اصراف اور نمود و نمائش کا عنصر بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ بیوٹی ٹپس یا خوب صورت بننے کے مشورے دینا بہت آسان ہوتا ہے..... مگر ذہن میں یہ ضرور رکھنا چاہیے کہ ایسے مشورے اور تراکیب ہوں جو بہ آسانی قابلِ عمل ہوں لیکن جہاں ضروری ہو اور قابلِ برداشت بھی ہو تو خرچ بھی ضرور کریں۔ مگر پہلے اپنی ترجیحات کا تعین بھی ضروری ہے۔

آج کل اگر چہ ٹی وی کے ہر چینل پر اس قسم کے پروگرامز آتے رہتے ہیں۔ مگر ہمارے پیارے قارئین کی کافی عرصے سے فرمائش بھی چلی آرہی تھی کہ بیوٹی ٹپس اور حسن کے نکھارنے کے مشوروں سے سجا سلسلہ پائیزہ میں پھر سے شروع کریں۔ سو قارئین کی فرمائش سر آنکھوں پر..... ان صفحات پر آپ کو معلومات کے ساتھ، ساتھ آپ کے گئے سوالات کے جواب اور مسائل کا حل بھی ملے گا۔ تو چلیں سب سے پہلے آپ ہی کے کچن سے اسکراب کی اشیا تلاش کر کے جلد کی صفائی کے طریقے بتاتے ہیں۔

چینی کا اسکراب.....

دو ٹیبل اسپون چینی (shugar) لے کر دو ٹیبل اسپون پانی کے ساتھ ملا کر چہرے، گردن اور ہاتھوں پر ہلکے، ہلکے سے انگلیوں سے مساج کریں۔ انگلیوں کی حرکت نیچے سے اوپر کی جانب ہو..... آج کل ویسے بھی ٹی وی پر مساج کے اتنے طریقے آتے ہیں کہ لڑکیاں انگلیوں اور ہاتھوں کی حرکت دیکھ کر سیکھ جاتی ہیں۔ دس منٹ تک یہ مساج کرنے سے جلد کے مردہ خلیے اور گردوغبار نکل جاتا ہے پھر پانی سے چہرہ گردن اور ہاتھ دھولیں۔ نمایاں فرق

READING
Section

بزرگ پاکستانی پیکر

پاکیزہ بہنیں



پہلا انعام یافتہ سوال

☆ نگینہ ضیا بخش..... کراچی

سوال: کچھ لوگوں کے پیٹ کا کیرا ان کے دماغ میں چلا جائے تو.....؟
جواب: وہ سارا بھوسا کھا جاتا ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ نور افشاں..... شکار پور

سوال: اگر کسی سے کوئی کڑوا کیلا سچ کہہ دیا جائے تو پھر.....؟
جواب: اسے فوراً اپنے گھر کی جانب دوڑ لگانی ہوگی۔

☆ سونا..... لاہور

سوال: جب لوگ تعلق توڑنے پر آمادہ ہوں تو یہ بات کیسے پتا چلتی ہے؟
جواب: ان کے اندازِ گفتگو میں سب سے پہلے فرق آ جاتا ہے۔

☆ امینہ عندلیب..... سلا نوالی

سوال: بہت سے لوگوں کو پڑھنا چاہیے..... مگر.....؟
جواب: وہ لکھ رہے ہیں۔
☆ نجمہ اصغر..... کراچی

سوال: کہتے ہیں کہ محبت کمر کے درد کی طرح ہوتی ہے..... واقعی؟
جواب: ہاں، ایک سرے میں بھی دکھائی نہیں دیتی مگر ہوتی ہے۔

☆ زریں زبیر کوٹھاری..... کراچی

سوال: زندگی کب خوب صورت لگتی ہے؟
جواب: جب ہم خوش ہوتے ہیں۔

☆ شگفتہ ناصر..... فیصل آباد

سوال: نفسا نفسی اور برق رفتاری کے اس دور میں..... اور کیا نیا ہوگا؟

جواب: ہم ایک دوسرے کو یہ سوچ کر بھی کھو دیا کریں گے کہ اس نے میری تصویر کو لائیک نہیں کیا تو میں کیوں کروں۔

☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ

سوال: امیر روٹی کھاتا ہے جب بھوک لگے، غریب روٹی کھاتا ہے جب مل جائے، باجی آپ کب روٹی کھاتی ہیں؟

جواب: میں روٹی نہیں کھاتی چاول کھاتی ہوں۔

☆ ایمین زرنا ب ڈوگر..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟
جواب: آج کے انسان کے ہر گھر کا اپنا الگ، الگ مسئلہ ہے جیسے اس وقت میرا چار جرنیٹس مل رہا ہے..... اور میرے دونوں موبائل فون مرے پڑے ہیں۔

☆ ناعمہ تحریم..... کراچی

سوال: ناپسندیدہ مہمانوں کی دعوت پر ایسی کون سی ڈش بناؤں کہ جسے کھا کر ہر مہمان کہے..... کہ.....؟
جواب: اب ان کی کوئی دعوت قبول ہی نہیں کرنی چاہیے..... کہ پتا نہیں کیا مرچوں بھری آگ بھون کر کھلا دی۔

☆ فلک بنت ندیم..... حیدرآباد

سوال: عید قربان پر کس قسم کے لوگ ناراض ہو جاتے ہیں؟

جواب: جن کے ہاں ہم ہمیشہ ہڈیاں اور چھچھڑے بھیجا کرتے ہیں۔

☆ مریم کاشف..... حیدرآباد

READING
Section

298 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

سوال: سالگرہ بہانہ ہے پیسے بنورنے کا یہ سچ ہے کیا؟

جواب: تم انہیں بتادو کہ غرور ایسی بیماری ہے جو صرف کم ظرف کو ہی ہوا کرتی ہے۔
☆ مس انعم..... نیو کراچی

جواب: پیسے بنورنے کے تو بہت سے بہانے ہیں..... سالگرہ تو اس کی ایک چھوٹی سی کڑی ہے۔

سوال: پاکستانی فنکاروں نے بھارت جا کر کیا کھویا کیا پایا؟

☆ ماہ رخ..... حیدرآباد

سوال: غموں کی دھوپ سے بچنے کے لیے کون سی چھتری استعمال کی جائے؟

جواب: جو گاجر اور لوکی کے حلوے میں ڈالا جاتا ہے وہ کھویا کھایا اور نان کے ساتھ پایا کھایا..... اس سے زیادہ مجھے کیا پتا..... کیا میں وہاں فلمیں بنا رہی ہوں۔

جواب: زریں اقوال کی چھتری ہر جگہ دستیاب ہے۔

☆ مہوش سمرن..... سیالکوٹ

سوال: وہ آیا..... اس نے دیکھا..... اور.....؟

☆ عروسہ یعقوب..... لاہور

سوال: اسکول کی چھٹیوں میں جب اضافہ ہوتا ہے تو اس کی سب سے زیادہ خوشی کس کو ہوتی ہے؟

جواب: نظر لگا کر چلا گیا..... اور ہم سب کو بریانی کھا کر ہیضہ ہو گیا۔

☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

جواب: بچوں سے زیادہ ٹیچرز کو..... چلو کچھ دنوں تو سردرد سے نجات ملی۔

سوال: شادی سے پہلے میرے میاں میرے لیے آسمان سے تاڑے توڑ کر لانے کے لیے بھی تیار رہتے تھے مگر اب وہ درخت سے لیوں توڑ کر لانے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

☆ سعدیہ ہاشم..... ڈی جی خان

سوال: شعر مکمل کریں۔

جو گرم پانی میں ایلٹی ڈال کر نہاتے ہیں فراز؟

جواب: پہلے وہ صرف جھوٹے تھے اب وہ کابل بھی ہو گئے ہیں بلکہ بحر الکاہل ہو گئے ہیں۔

☆ صائمہ سجاد بخش..... کوہاٹ

سوال: کیا مرنے کے لیے زہر کی ضرورت لازمی پڑتی ہے؟

سوال: اب کی بار آنے دو دیکھتی ہوں کہ کیسے نہیں دیتے؟

جواب: نہیں، بعض مرتبہ لوگوں کے زہریلے لہجے بھی مار دیا کرتے ہیں۔

جواب: اب کی بار میاں جی پردیس سے آئیں تو پاسپورٹ کو چولھے میں جلا دو..... تاکہ جو کمائیں تمہارے ہاتھ پر رکھیں۔

☆ ساجدہ بتول..... راجن پور

سوال: کسی کے دل میں اترنے کے لیے کون سی سیڑھی استعمال کروں؟

☆ طیبہ عنصر مغل..... راول پنڈی

جواب: اچھے اخلاق کی۔

☆ عرشہ جنید..... کراچی

سوال: اس ماہ میرے ایک اپنے نے مجھے بہت مڑلایا..... آخر کیوں؟

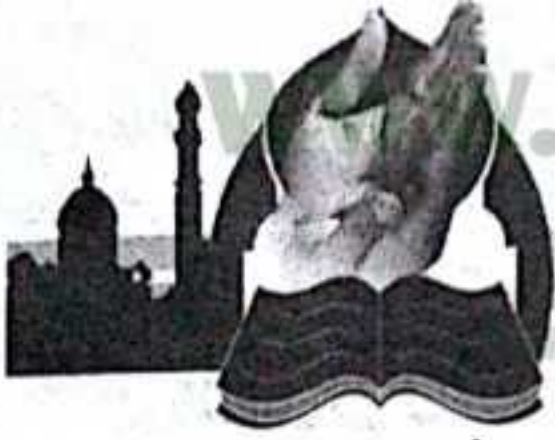
سوال: جب میاں جانی اپنے موبائل پر پاس ورڈ لگائیں اور کینڈی کرش کے آگے ہم نظر آئیں تو بتائیں ناں ہم کیا کریں؟

جواب: کرنا کیا ہے، بس میاں جی کی سہیلیوں پر گہری نظر رکھو۔

جواب: اپنے وہ نہیں ہوتے جو رونے پر آتے ہیں یا مڑلاتے ہیں جبکہ اپنے وہ ہوتے ہیں جو رونے ہی نہیں دیتے۔

☆ ارم کمال..... فیصل آباد

سوال: وہ اپنی ہر بات پر غرور کرتے ہیں، میں..... نہیں دیتے۔



شادی کے بعد کی دعائیں

دہن کو چاہیے کہ نماز کی باقاعدگی کرے..... روزانہ شکرانے کے نفل ادا کرے اور دعا سے پہلے اور آخر میں درودِ ابراہیمی لازمی پڑھے..... اور پھر یہ دعا مانگے۔

”اے اللہ! میرے اور میرے شوہر کے دل میں محبت اور الفت ایسے بھر دے اور ہمارے دلوں کو ایسے ملا دے جیسے آپ نے حضرت محمد ﷺ اور حضرت خدیجہ کے دلوں کو ملا دیا تھا اور اے اللہ!..... میرے اور میرے شوہر کے دلوں کو ایسے ملا دے جیسے آپ نے حضرت محمد ﷺ اور حضرت عائشہ کے دلوں کو الفت و محبت سے ملا دیا تھا۔“

”اے اللہ! جس طرح آپ نے اپنے کرم سے ہمیں دنیا میں اکٹھا فرما دیا، جنت میں بھی ہم دونوں کو اکٹھا فرما۔“

”اے اللہ! مجھے اپنے شوہر کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں آنکھوں کی ٹھنڈک بنا۔“

”اے اللہ! مجھے ایسی بیوی بنا جو شوہر کے نیک کاموں میں اس کی مدد کرنے والی ہو۔“

”اے اللہ! تو مجھے اپنی اطاعت اور اپنے شوہر کی جائز باتوں میں اطاعت کرنے والی بنا اور نیک بنا اور اے اللہ!..... مجھے شوہر کو خوش کرنے والی بنا، جب بھی وہ مجھے دیکھے تو خوش ہو اور شوہر کے مال، عزت اور راز کی حفاظت کرنے والی بنا، آمین یا رب العالمین۔“

یہ دعائیں تہجد کی نماز کے بعد اور ہر فرض نماز کے بعد اسی طرح رمضان المبارک میں سحر و افطار کے وقت، دورانِ حج و عمرہ، حجاز مقدس کے مبارک مقامات پر اور چلتے پھرتے خوب، خوب مانگنی چاہئیں۔ اگر اللہ

تبارک و تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مسلمان بیوی کو یہ نعمتیں عطا فرمادیں تو گویا پورے خاندان اور آنے والی نسلوں کو دنیا و آخرت کی بھلائی مل گئی۔

1۔ ہر فرض نماز کے بعد دعا ضرور قبول ہوتی ہے اس لیے فرض نماز کے بعد اہتمام سے دعا مانگنی چاہیے۔
2۔ دعا شروع کرنے سے پہلے اللہ رب العزت کی خوب حمد و ثنا کرے، پھر نبی کریم ﷺ پر درود شریف بھیجے..... پھر اپنے لیے، گھر والوں کے لیے، محلے والوں کے لیے اور سارے عالم کے مسلمانوں کے لیے دعا مانگے پھر کافروں کی ہدایت کے لیے دعا مانگے جہاں، جہاں مسلمان پریشانیوں، بلاؤں اور مصیبتوں میں ہیں ان کے لیے بھی خوب عافیت کی دعائیں مانگے۔

3۔ کم از کم روزانہ بیس پچیس منٹ دعا ضرور مانگے، اگر ایک ساتھ نہ ہو سکے تو تقسیم کر لے، ایسے وقتوں پر جو زیادہ مصروفیت کے نہ ہوں مثلاً فجر و عصر کی نمازوں کے بعد پانچ، پانچ منٹ، عشا کی نماز کے بعد دس منٹ، تہجد میں اٹھنے کی توفیق ہو تو اس میں بھی خوب دعا مانگے، کتنے افسوس کی بات ہے کہ سہیلیوں، بہنوں سے فون پر بات کرتے ہوئے کتنا وقت لگ جاتا ہے، شادی، دعوتوں، محفلوں میں کتنا وقت ہم اپنا کھود دیتے ہیں لیکن بیس منٹ دو ہاتھ پھیلائے ہوئے اپنے مالک رحیم و کریم آقا سے مانگتے ہوئے اکتاتے ہیں حالانکہ وہ آقا ایسا ہے کہ مانگنے والے تھک جائیں لیکن وہ دیتے دیتے نہ ٹھکے۔

دنیا میں جس سے بھی مانگا جائے وہ ناراض ہوتا ہے اور اللہ جل جلالہ سے نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ اس لیے شروع میں گھڑی دیکھ کر زبردستی اپنے آپ

کو پندرہ بیس منٹ بٹھائے رکھیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے خضوع و خشوع کے ساتھ مانگنے کی عادت ڈالیں۔

بیوی رات کو اٹھ کر

اللہ سے یہ دعا مانگے

میاں بیوی میں محبت پیدا کرنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے دعائیں کرتے رہیں، انشاء اللہ تعالیٰ چند دنوں میں ایسی محبت پیدا ہو جائے گی کہ جس کا دونوں کو وہم و گمان بھی نہیں ہوگا۔

یاد رکھیے.....! اینٹ کو اینٹ سے ملانے کے لیے سینٹ کی ضرورت ہے، لکڑی کو لکڑی سے ملانے کے لیے کیل کی ضرورت ہے، کاغذ کو کاغذ سے ملانے کے لیے گوند کی ضرورت ہے لیکن دو دلوں کو ملانے کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ کے خاص فضل کی ضرورت ہے..... اس کے لیے ظاہری تدبیر بیوی کی طرف سے اطاعت شوہر کی ہر بات پر ”جی ہاں“ ”جی ہاں“ ”اچھا“ ”آئندہ نہیں ہوگا۔“ ”آئندہ نہیں ہوگا“ ”جیسے آپ کہیں گے ویسے ہی کروں گی۔“ اس طرح کے کلمات کہنا ہے۔ اتنی میٹھی باتیں کرنے والی بیوی سے کون شوہر ناراض ہو سکتا ہے مگر ایک بہت پیاری عادت آپ نے اپنے میں اور ڈالنی ہے کہ روزانہ سورۃ بقرہ پڑھنی ہے۔ بے شک روزانہ پوری نہ پڑھ سکیں تو چند صفحات ہی روزانہ پڑھ لیں مگر پڑھنی ضرور ہے پھر آپ خود اللہ کا کرشمہ دیکھیں گی۔

حدیث میں آتا ہے۔

”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ شیطان اس گھر میں ٹھہر نہیں سکتا جس گھر میں سورۃ بقرہ تلاوت کی جائے۔“

خوف و پریشانی کو امن میں بدلوانے

کے لیے یہ دعا مانگنی چاہیے

گھر کے تمام افراد کو رات کو سونے سے پہلے

یہ دعا مانگنی چاہیے۔ نیا چاند دیکھ کر بھی یہ دعا لازمی مانگنی چاہیے۔

ترجمہ: ”اے اللہ! ہم درخواست کرتے ہیں کہ (تو ہمارے تمام عیوب کی پردہ پوشی فرما اور ہمارے خوف و پریشانی کو امن میں بدل دے۔“

جب مغرب کی اذان سنیں

تو یہ دعا مانگیں

”اے اللہ! یہ تیری طرف سے رات کے آنے اور دن کے جانے اور تیرے پکارنے والوں کی پکار کا وقت ہے (اس کی برکت سے) تو ہمیں معاف کر دے۔“

نوٹ: (یورپی ممالک جہاں اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی..... وہ مغرب کے وقت جب نماز پڑھیں تو اس سے پہلے یہ دعا ضرور مانگیں)

دو دعائیں

سخت سے سخت مشکل کے وقت ان دعاؤں کے ساتھ اللہ سے لو لگا کر بڑے خیر و برکت کا باعث ہے۔

1۔ سرور کائنات ﷺ کی ایک دعا جو حضور ﷺ سخت مشکل کے وقت فرماتے، حضرت قبلہ نے یوں تعلیم فرمائی۔

2۔ جناب رسول کریم ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ دعا سکھائی اگر تم بھنور میں پڑ جاؤ (سخت مشکل میں) تو یہ پڑھا کرو۔ ہر قسم کی بلا دور ہوگی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ
حضور ﷺ نے کیا خوب فرمایا، دعا مومن کا ہتھیار ہے دین کا ستون، آسمان کا نور ہے۔

☆☆☆

READING
Section



نشوائے ہومیوپیتھک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیوپیتھک لیڈنگ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

لیکوریا اور سر بھاری ہونا

سدرۃ المنتہیٰ - قصور

میرا مسئلہ لیکوریا ہے جو 8-9 سال پرانا ہے۔

میری کمر اور ناکوں میں درد رہتا ہے اور سانس بھی تھوڑا تھوڑا پھولتا ہے۔ تھکاوٹ بہت جلد ہو جاتی ہے سارے جسم میں درد رہتا ہے۔ پیریڈ ڈیٹ سے آٹھ دن بعد آتے ہیں۔ مجھے خارش اور جلن بہت ہوتی ہے۔ مہربانی کر کے اچھی سی دوا تجویز کریں تاکہ میں جلد ٹھیک ہو سکوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا سر اکثر بھاری رہتا ہے، اس دوران میری گردن میں بہت درد ہوتا ہے ساتھ ہی کمزوری بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ کندھوں میں کھنچاؤ ہو رہا ہے۔ جبکہ میری نظر بالکل ٹھیک ہے، نہ سر میں درد ہوتا ہے بس سر بھاری رہتا ہے، اگر نیچے منہ کر کے پڑھوں یا لکھوں تو گردن درد کرتی ہے، زیادہ دیر سر کو جھکایا نہیں جاتا۔ جب صبح سو کر اٹھو تو کمر میں درد ہوتا ہے لگتا ہے کہ سارا جسم اکڑ گیا ہے، گھٹنے آدھ گھٹنے بعد آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ میرا رنگ پیلا سا رہتا ہے۔ کوئی ایسی دوا تجویز کریں کہ میرے چہرے کی رنگت گلابی ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب کیا دونوں امراض کی دوائیاں اکٹھی کھا

ٹوکن

برائے شوائے ہومیوپیتھک

نومبر 2015

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام:

پتا:

READING
Section

302 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء



دودھ پیتی سے یا کبھی کبھار تھوڑا سا فروٹ کھا لیتی ہے۔ اس کی عمر کے کئی بچے قد اور وزن میں اس سے کافی بڑے لگتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ باقی بچوں کی طرح اس کا قد اور وزن بھی مناسب ہو جائے اور کھانے سے بے رغبتی بھی ختم ہو جائے۔ آپ سوچ نہیں سکتے کہ میں کتنی پریشان ہوں۔ برائے مہربانی آپ اس کے لیے اچھی سی دوا تجویز کر دیجئے۔

جواب: ہر ماں اپنے بچے کی بھوک کے متعلق فکر مند رہتی ہے۔ بچی چپس، ٹافی، چاکلیٹ، بسکٹ تو نہیں کھاتی؟ خاص طور پر کھانے سے پہلے۔ اکلوتی ہے اور پھر دادا دادی، چچا، ماموں یا نانا نانی وغیرہ اس کو اس قسم کی چیزیں تو نہیں دیتے، ضرور نوٹ کریں۔ خاندانی قد و قامت کے حساب سے بھی بچیوں کا قد اور وزن ہوتا ہے۔ ویسے ہمیں یہ لگتا ہے کہ بچی میں خون کی کمی بھی ہے۔ بچی کو ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی Ferr. Met 30 اور Calc phos 30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ دیں اور ایک ماہ بعد طبیعت سے مطلع کریں۔

لیکھو ریہا

شائکہ رشید۔ لودھراں

میں آپ کی خدمت میں پہلی دفعہ حاضر ہو رہی ہوں۔ میرا مسئلہ لیکوریا ہے جو کہ بچپن سے ہے جس کی وجہ سے میری کمر میں درد رہتا ہے۔ میں نے اس کی بہت سی دوائیاں بھی لیں لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے میں بہت کمزور ہوتی جا رہی ہوں، رنگ بھی بہت ڈم ہوتا جا رہا ہے اور اب ہونٹ کے اوپر بال بھی آنے لگ گئے ہیں اس وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں۔ بہت شکر گزار ہوں گی۔

جواب: لگتا ہے کہ آپ کے مینسز میں بھی خرابی

سکتے ہیں؟
جواب: آپ اپنا بلڈ پریشر چیک کرائیں۔ 5 دن تک مختلف اوقات میں۔ بلڈ کے ٹیسٹ %Hb اور Serum Calcium بھی کرائیں۔ ذہنی کوفت سے اپنے آپ کو دور رکھیں، خوش و خرم رہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر باغ میں چہل قدمی کریں، متوازن غذا دودھ، انڈا، گوشت، سبزیاں اور فروٹ وغیرہ کھائیں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی Magnesium Phos Pentarkan Ptk60 کی ایک ایک گولی دن میں تین مرتبہ کھائیں۔ 30 Kreosotum، Rhustox 30، Gelsemium-30 کے 3 سے 5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ ادویات پیریڈ کے دوران بھی لے سکتی ہیں اور ایک ساتھ بھی لے سکتی ہیں۔ ایک ماہ بعد رزلٹ سے مطلع کریں۔

بچی میں بھوک کی کمی

وحیدہ رحمان۔ سیالکوٹ

میں گزشتہ کئی سالوں سے پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں اور میو پیٹھک کلینک بھی بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ میں اپنی بیٹی کا مسئلہ لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔ اس کی عمر ڈھائی سال ہے۔ پیدائش کے فوراً بعد وہ بہت بیمار ہو گئی تھی۔ شروع کے پورے چھ ماہ اس کو موشن لگے رہے۔ کئی دفعہ اس کو اسپتال ایڈمٹ کرانا پڑا۔ اس نے میرا فیڈ بھی نہیں کیا۔ بازاری دودھ جو ڈاکٹر نے لکھ کر دیا تھا جب وہ پیتی تھی تو آدھا باہر نکال دیتی تھی اور صرف آدھا ہضم کر پاتی تھی۔ ہم نے اس کا بہت علاج کروایا۔ تقریباً چھ ماہ کے مستقل علاج سے وہ تندرست ہو گئی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ کمزور ہے اس کا وزن اور قد بہت کم ہے۔ کھانے پینے کی طرف اس کی توجہ بالکل بھی نہیں ہے۔ کھانے پینے میں صرف وہ بھینس کا

303 ماہنامہ پاکیزہ اکتوبر 2015ء

READING
Section



ہے اسی وجہ سے رنگ اور ہونٹوں کے اوپر بالوں کا مسئلہ بھی ہو گیا ہے۔ ذہنی تفکرات سے بچیں، کھلی ہوئی چہل قدمی کیا کریں۔ متوازن غذا کا استعمال کریں۔

ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی دوا Megnesium Phos Pentarkan Ptk-60 کی ایک ایک گولی دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔

شوہر کی بیماری

ف۔ صادق آباد

ہماری بیٹی کی پیدائش کے بعد میرے شوہر بیمار ہو گئے۔ زیادہ دوائی کھانے یا کسی ایسے تعویذ سے جو اکثر ان کے گھروالے کرواتے تھے اور دوائی زیادہ ٹھنڈی کھانے سے ان کو اندرونی کمزوری ہو گئی جس کی وجہ سے میں دوبارہ ماں نہ بن سکی، میں صادق آباد میں رہتی ہوں۔ ہر اچھے ڈاکٹر سے اپنے شوہر کا علاج کروایا لیکن میرے شوہر دوائی کھاتے ہیں تو بوا سیر ہو جاتی ہے پھر وہ علاج چھوڑ دیتے ہیں۔ اب دو سال ہو گئے ہیں میرے پیشاب میں تکلیف رہتی ہے اور میرا جسم باہر کی طرف آتا جا رہا ہے چلنے پھرنے میں مشکل اور گھر کے کام کاج نہیں کر پاتی، میں نے آج سے تقریباً تین سال پہلے خط لکھا تھا آپ نے جو دوائی بتائی تھی جو میری بیٹی کے لمبے قد کے لیے تھی اس سے فائدہ ہوا، اس یقین سے میں آپ کو دوبارہ خط لکھ رہی ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر میری تکلیف کا کوئی علاج بتائیں۔ جس سے میں ٹھیک ہو جاؤں اور میرے شوہر بھی۔

جواب: یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہم مرد کی کمزوری کو چھپاتے اور عورت کی کمزوری کو اچھالتے ہیں اور اس کو اچھالنے میں زیادہ ذمہ دار عورت ہی ہوتی ہے۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ

کے شوہر کس بیماری میں مبتلا ہوئے اور انہوں نے کون سی دوائی کھائیں جس کے بعد ان کا یہ حال ہوا۔ اپنے میاں صاحب کو ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی Damiana Pentarkan Ptk-40 ہر کھانے کے آدھے گھنٹے بعد آدھا کپ میں ۱۵ قطرے دن میں 3 مرتبہ اور ساتھ Zincum Met-30 کے ۵ قطرے ایک گھونٹ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں، اس دوران ازدواجی تعلق میں احتیاط کریں۔ آپ کے رحم میں ورم اور سوزش ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ایام میں دقت ہوتی ہے اور چونکہ وہ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے لہذا آپ کو اٹھنے بیٹھنے اور چلنے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ آپ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی Magnesium Phos Pentarkan PTK-60 ایک ایک گولی دن میں 3 مرتبہ لیں۔ Lillium Tig-30 کے 5,5 قطرے آدھے گلاس پانی میں تین مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

نفسیاتی مسائل اور ابا کا ہپاٹائٹس سی

عروہ خوش بخت۔ اسلام آباد

آپ نے مجھے کچھ ادویات تجویز کی تھیں۔ اللہ کے کرم سے اب مجھے سر کے سن ہونے، کان میں سیٹی بجنے میں افاقہ ہے۔ لیکن اب مجھے غصہ آنے لگا ہے۔ بہت زیادہ اور غصہ نکال نہیں سکتی تو رونے لگتی ہوں۔ اب چیزیں رکھ کر بھولنا بھی کم ہو گیا ہے۔ آپ نے وزن کم کرنے کے لیے کچھ نہیں بتایا تھا۔ چہرے کے دانے تو کریم لگانے سے کم ہو گئے لیکن چہرے کے بال ٹھیک نہیں ہوئے۔ ایام میں بے قاعدگی اور اس کی وجہ سے ہونے والی پرابلم کے لیے بھی کچھ بتائیں۔ بہت سی پریشانیوں میں گھر میں پڑی رہتی ہوں اور کچھ زیادہ حساس بھی ہوں تو زیادہ اثر لیتی ہوں۔ دوسرا مسئلہ میرے والد



قطرے آدھے گلاس پانی میں
دن میں تین مرتبہ دیں۔ ایک
ماہ بعد رپورٹ کرا کر حالات
سے مطلع کریں۔

کمر درد

جمیلہ بیگم۔ گلشن اقبال، کراچی

میری کمر میں درد ہے۔ میں نے پہلے کوئی دوائی
نہیں لی۔ درد بہت پرانا ہے۔ 20 سال پہلے x-ray کیا
تھا تو مہرے (Disc) اہل گئے تھے۔ میں بیلٹ لگاتی
ہوں جو وقتی علاج ہے۔ میرے Base Maker لگا ہوا
ہے اور کوئی رپورٹ نہیں ہے۔ دوائی بھی پہلے کوئی نہیں
کھائی۔ شوگر مجھ کو نہیں ہے۔ بلڈ پریشر بھی ٹھیک ہے بس
کمر میں درد ہے۔ اس کی دو بتادیں آپ کی شکر
گزار ہوں گی۔ میری ہڈیاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ میرے
کوہے کی ہڈی بڑھ گئی ہے اور میرے چہرے پر سیدھی
طرف آنکھ کے نیچے کی ہڈی بھی بڑھ گئی ہے انہیں روکنے
کے لیے کوئی دوائی ہے تو وہ بھی بتادیں۔

جواب: ہم نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ آپ
کلینک آجائیں کیونکہ آپ کو بہت سارے مسئلے ہیں اور
غالباً سال پہلے کی بات ہے۔ تین ماہ تک ڈاکٹر ولمار
شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات کھائیں اور اس
کے بعد حال بتائیں۔ Cimicifuga-30,
Arnica-30, Calc.Phos-30 کے ۱۰،۱۰ قطرے
آدھے گلاس پانی میں ہر تین گھنٹے بعد پیئیں۔

ناک کی ہڈی اور لکنت

شاہینہ اختر۔ اٹک

محترم ڈاکٹر صاحب پاکیزہ میں آپ کا کالم میں
بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ جس طرح لوگوں کی
خدمت کر رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ میرا مسئلہ کچھ

صاحب کا ہے کہ 2012 میں سب سے چھوٹے بھائی
کی وفات کے صدمے سے ابھی تک نہیں نکلے۔
میرے والد جن کی عمر 52 سال ہے Chain
smoker ہیں، ان کی اس عادت کو ختم کرنے کے
لیے ہم نے بہت چیزیں آزمائیں مگر کوئی فرق نہیں
پڑا، آپ کوئی دوائی بتادیں ان کو Diabetes اور
HCV ہے۔

جواب: اللہ آپ کو مکمل صحت و تندرستی دے
اور آپ کے مسائل کو حل کرے، آمین۔ آپ بھی
اللہ سے دعا کرتی رہیں، صلوة الحاجات پڑھ کر دعا
کریں۔ انشاء اللہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ شوہر
میں سب سے بڑی خصوصیت اس کا محنتی ہونا ہے یعنی
کمانے والا ہو حلال کی، شریف ہو، دیندار ہو، صحت
مند اور سمجھدار ہو۔ باقی دنیاوی تعلیم جتنی بھی ہو وہ
ایک یقیناً اضافی خوبی ہوگی۔ لہذا اپنے ذہن کو
کنٹرول کریں، عمر نکلنے میں دیر نہیں لگتی اور پھر ذہنی
مسائل اور پیدا ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے
جرمنی کی Magnesium Phosp Pentarkan
کی ایک گولی دن میں ۳ مرتبہ لیں۔ Asteria rub-
30، 30، 5، 5 Oleum Jecoris-30 قطرے آدھا
گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔ جو دوائیاں پہلے
سے استعمال کر رہی ہیں ان کو ابھی استعمال کرتی
رہیں۔ لگتا ہے کہ آپ کے والد مایوس ہیں۔ ان کو
کہیے کہ مایوسی کرنا اللہ کا انکار ہے جو کفر ہے۔ سب
کچھ کرنے والی اللہ کی ذات ہے اس کی طرف رجوع
ہوں، نماز، ذکر اور قرآن کی تلاوت کریں۔ پانی
زیادہ پیئیں تاکہ گردے صحیح کام کریں، کیلا، پالک،
ٹماٹر، میٹھی چیزیں اور مرغن چیزوں کا استعمال ختم
کریں، ہلکا شوربا چپاتی کھائیں۔ مچھلی کھائیں اور
ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات
استعمال کریں۔ Syzygium . Jamboہ
Chelidonium-Q کے ۱۰،۱۰ قطرے ایک
گلاس پانی میں جبکہ Merc.cor-30 کے 5،5

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

(دونوں نشتوں میں) اس کے ڈالنے سے جلن ہوگی جس کو برداشت کرنا ہوگا۔ الحمد للہ ہومیوپیتھی میں اس کا بہترین علاج ہے۔ شروع میں ہی رجوع کرنا چاہیے، لکننت کے مسئلے کے لیے پوری ہسٹری لکھیں کہ کب، کیوں اور کیسے ہوئی۔ مکمل تفصیل لکھیں تو دوا بھی تجویز کر دیں گے۔

نوجوانوں کی بڑی عادت

داؤد ضیاء۔ لاہور

مجھے بہت شرمندگی سے بتانا پڑ رہا ہے کہ میں بڑے کاموں کے بھنور میں پھنس گیا ہوں۔ پہلے میں ان چیزوں سے بہت دور تھا، نمازیں پڑھتا تھا، لیکن بڑی صحبت نے مجھے بگاڑ دیا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری ٹانگوں اور پنڈلیوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے اور سستی بہت چڑھی رہتی ہے، دل کرتا ہے بس لیٹا رہوں۔ میں اندر سے کمزور ہوتا جا رہا ہوں۔ میرے ابو آرمی میں میجر ہیں اور مجھے SSG کمانڈر بنانا چاہتے ہیں۔

جواب: شریف، کجھدار، پڑھے لکھے ماں باپ کی اولادیں دوستوں کی بڑی صحبت، ٹی وی، فلموں اور نیٹ کے ذریعے ہی بگڑتی ہیں اور پھر چونکہ والدین سے کمیونیکیشن نہیں ہوتا لہذا عادت پختہ ہو جاتی ہے۔ ان سے توبہ کریں، بڑے دوستوں کی صحبت کو بالکل ترک کر دیں۔ اچھی معلوماتی چیزوں پر توجہ دیں۔ صبح سویرے اٹھ کر ورزش کریں۔ متوازن خوراک استعمال کریں۔ مرغن غذائیں، فاسٹ فوڈ سے بچیں، نماز کی پابندی کریں۔ روزے رکھا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Bufo-30 کے 10 قطرے دن میں تین مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

☆☆☆

یوں ہے کہ میرا بیٹا جس کی عمر سولہ سال ہے اسے ناک کا مسئلہ کافی عرصے سے ہے۔ E.N.T سے چیک کروایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ناک کی ہڈی ٹیڑھی ہے، آپریشن کروانا پڑے گا لیکن میں اپنے بیٹے کا آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ مسئلہ دوائیوں سے ٹھیک ہو جائے کیونکہ بچے کا مسئلہ جوں جوں پرانا ہوتا جا رہا ہے بچے کو معدے کا پرابلم ہوتا جا رہا ہے کیونکہ ہر وقت بلغم گلے میں گرتا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ بچے کے لیے اچھا نسخہ تجویز کر دیں اور ہماری تسلی کے لیے یہ بھی بتادیں کہ کیا ہومیوپیتھی میں بڑھی ہوئی ہڈی یا ٹیڑھی ہڈی کا علاج موجود ہے؟ کیا ہم آپریشن سے بچ سکتے ہیں؟ کیونکہ میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ کیا یہ مسئلہ موروثی بھی ہو سکتا ہے؟ کیونکہ میری بھی ناک کی ہڈی کافی عرصے سے بڑھی ہوئی ہے اور ڈاکٹر نے مجھے بھی آپریشن کا بتایا ہے۔ میری عمر چالیس سال ہے۔ میں نے کوئی خاص دوائی وغیرہ نہیں لی۔ ڈاکٹر صاحب آپ سے گزارش ہے کہ آپ میرے اور میرے بیٹے کے لیے الگ الگ دوائی تجویز کر دیں بہت مہربانی ہوگی۔ دوسرا مسئلہ میرے چھوٹے بیٹے کا ہے۔ اسے لکننت کا مسئلہ ہے ”ز“ کو صحیح ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے کوئی اچھی سی دوا تجویز کر دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم عطا کرے، آمین۔

جواب: آپ ماں بیٹا نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر ناک میں پانی چڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Cinnaboris Pertarkan pt-30 کی ایک گولی دن میں تین مرتبہ بچے کو جبکہ آپ خود 2 گولیاں دن میں تین مرتبہ لیں۔ آپ Teucium 30 کے 7 قطرے دن میں تین مرتبہ پانی سے لیں اور Thuja-Q کا ایک قطرہ ناک میں ڈالیں



Dr. Willmar Schwabe Germany

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی

READING
Section

306 ماہنامہ پاکیزہ۔ اکتوبر 2015ء

